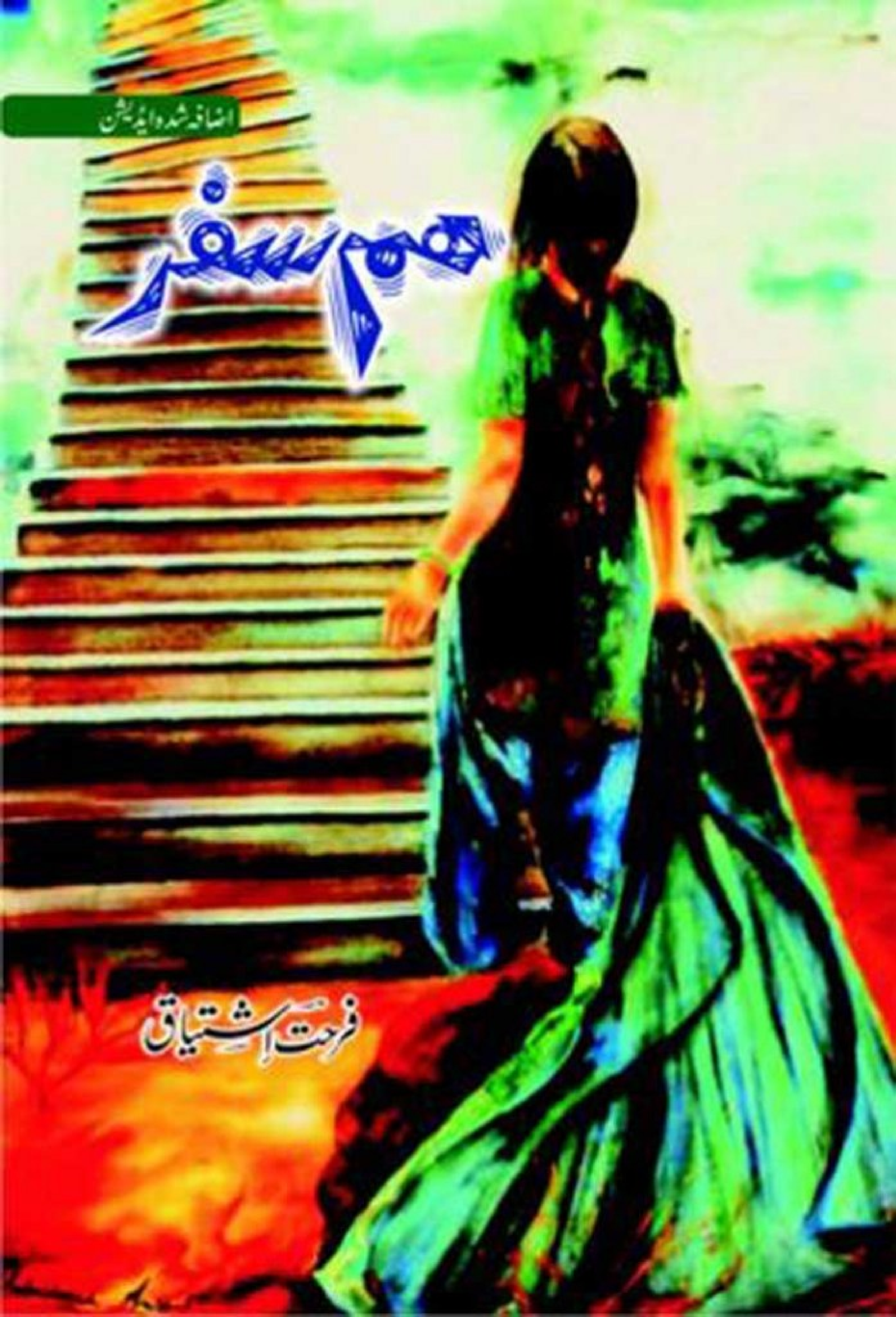
اضافہ شدہ ایڈیشن
ہم سفر
فرحت اشتیاق

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج سوا نیزے پر تھا اور زمین پر آگ اور تپش برسا رہا تھا۔ رکشے والے کو پیسے دے کر اس نے والٹ واپس ہینڈ بیگ میں رکھا اور اس پانچ منزلہ پرشکوہ بلڈنگ کی طرف گھومی جس کا آرکیٹیکچر جدیدیت کا حامل اور بے مثال تھا۔ قیمتی شیشے کے بے تحاشا استعمال کے سبب دور سے دیکھنے پر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ پوری بلڈنگ گلاس سے بنی ہے۔ شہر کے قلب میں' شہر کے سب سے اہم ترین اداروں کے دفاتر موجود تھے۔ وہاں قریب وجوار میں موجود عمارتوں میں وہ عمارت ایک شان سے سر اٹھائے کھڑی الگ ہی نظر آ رہی تھی۔

غرور و تکبر سے کھڑی یہ عمارت اس کے قد سے بہت اونچی تھی۔ اپنی حیثیت اور اس جگہ کی حیثیت کا فرق اس پر پوری طرح واضح تھا لیکن کیا کرتی کہ یہی بیش قیمت شیشوں اور پتھروں سے سجی پرشکوہ عمارت اس کی منزل تھی۔ وہ یہیں...... آئی تھی۔ اسے اس عمارت کے اندر کسی سے ملنا تھا۔ پارکنگ ایریا کو عبور کرتی وہ عمارت کے بالکل قریب پہنچی۔ چار سیڑھیاں چڑھ کر اب وہ اس شاندار شیشے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی جس کے اندر اور باہر باوردی اور مسلح سیکورٹی گارڈز چاق و چوبند کھڑے تھے۔ دروازے کو کھول کر اس نے اندر قدم رکھا۔ وہ یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی' اس لیے یہ نہیں جانتی تھی کہ جس سے اسے ملنا ہے' وہ اسے کس فلور کے کس کمرے میں ملے گا۔ چنانچہ گراؤنڈ فلور پر ہی موجود ریسیپشن سے اس نے اپنے مطلوبہ شخص کے آفس کی بابت پوچھا۔ وہاں سے دومنٹ میں اپنی مطلوبہ معلومات کے حصول کے بعد اب وہ لفٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ لفٹ کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر آ کر رکی اور اس میں سے تین مرد اور دو لڑکیاں باہر نکلیں۔ اس نے لفٹ میں قدم رکھا تو اس کے پیچھے دو مرد بھی لفٹ میں داخل ہوئے۔ لفٹ سے نکلتے اور اس میں داخل ہوتے یہ سب مرد و زن اپنی تیاریوں میں کارپوریٹ کلچر کے نمائندہ اور اس ڈریس کوڈ کو فالو کرتے نظر آ رہے تھے جو اس شاندار عمارت میں واقع ان کے ادارے کی ڈیمانڈ تھی۔ جس شخص کے یہ تمام لوگ ماتحت تھے' جس کے سامنے یہ سب جواب دہ تھے' جو ان کا باس تھا' اس کے ساتھ شرعی اور قانونی لحاظ سے اس کا کیا رشتہ ہے' وہ اسے نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ تو فقط اتنا سوچ رہی تھی کہ کہیں ان میں سے کوئی یہ نہ جان لے کہ وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے' کیا لینے آئی ہے' کیا مانگنے آئی ہے۔

اولاد کیا چیز ہے' اولاد کی محبت کیا چیز ہے' اس عمارت میں قدم رکھنے سے بھی پہلے جب اس نے خود کو اس شخص سے ملنے پر مجبور پایا تھا' تب ہی سمجھ لیا تھا۔ حالات کے گرداب میں پھنسی تو ساری عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ اپنی ذات پر سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ ایک زمانے میں بہت شکوے رہے تھے اسے اپنی مرجانے والی ماں سے۔ جس نے اپنے لیے خودداری اور عزت نفس کے معیار کچھ اور رکھے تھے اور اس کے لیے کچھ اور۔ اس کے لیے اپنی عمر بھر کی ساری خودداری' سب انا و وقار کی باتیں خود ہی مٹی میں ملا ڈالی تھیں مگر ماں سے یہ تمام شکوے تب تک تھے جب تک خود ماں نہ بنی تھی۔ خود ماں بنی تو جان لیا تھا کہ اولاد کی محبت ایسی ہی ظالم چیز ہے جو انسان کو عزت نفس' خودداری' انا جیسے تمام الفاظ ایک پل میں بھلا دیتی ہے اور یہاں وہ خود اپنی انا' عزت نفس اور خودداری کو پامال کر کے' اپنے ہی پیروں تلے کچل کر چلی آئی تھی۔ اگر اپنی بیٹی کی زندگی کے عوض اسے اپنی جان دینا پڑتی' دے دیتی۔ اپنی عزت' اپنی آبرو قربان کرنا پڑتی کر دیتی۔ جان اور آبرو سے تو کم تر ہی

چیزیں تھیں۔ انا اور خودداری۔ خود کو بہت کچھ سمجھا' بجھا کر بہت سوچ سمجھ کر اور ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ یہاں آئی تھی۔ یہ فیصلہ کوئی جذباتی یا لمحاتی فیصلہ نہیں تھا۔ کئی دنوں کے سوچ بچار اور مایوسیوں کے بعد وہ یہاں آئی تھی۔ وہ اس شخص سے مرتے دم تک دوبارہ ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی شکل دیکھنا تو کیا' اس کا نام بھی جیتے جی دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتی تھی اور آج تقدیر کی بے رحمی' سفا کی کہ وہ خود اپنے پیروں سے چل کر اپنی مرضی سے اس شخص سے ملنے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے کوئی اور راستہ ہی نہ تھا۔ وہ کرتی بھی تو کیا۔ تقدیر نے اس کے سامنے جو انتخاب رکھا' وہ کچھ یوں تھا۔

''حریم یا عزت نفس' بیٹی یا انا' جگر کا ٹکڑا یا خودداری؟''

اور ایک ماں کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔

''میری حریم' میری بیٹی' میرے جگر کا ٹکڑا جس کی زندگی' صحت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے صرف انا ہی کیا' میں خود کو بھی بیچ آؤں۔''

مگر بیٹی کی سلامتی کے لیے اپنی عزت و وقار کی پامالی کا فیصلہ کر لینے کے باوجود اس عمارت میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کے اندر کی عورت چلا چلا کر رونے لگی تھی۔

''کیوں' کیوں کیوں؟ آخر کیوں جاؤں میں اس شخص کے پاس۔ آخر کیوں؟ اس نے میری عزت' میری آبرو پر انگلی اٹھائی تھی۔ اس نے مجھے دھتکار دیا تھا پھر کیوں جاؤں میں اس ظالم اور سفاک انسان کے در پر۔'' مگر اس عورت کی روتی ہوئی آوازوں پر اس ماں کی آواز حاوی تھی۔ جو اس عورت سے کہہ رہی تھی کہ اپنی بیٹی کی جان کی سلامتی کے لیے اگر اسے اس شخص کی منت بھی کرنی پڑے' اسے اس سے بھیک بھی مانگنی پڑے تو یہ بھی کر جائے گی۔

وہ لفٹ سے نکل آئی تھی۔ یہ اس بلڈنگ کا ٹاپ فلور تھا۔ کوریڈور بہت کشادہ تھا۔ سفید رنگ کے قیمتی ٹائلز سے مزین فرش یوں جگمگا رہا تھا کہ انسان کو اس میں اپنی شکل تک دکھائی دے جائے۔ دونوں اطراف کئی بند کمرے تھے' ان کمروں کے باہر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر خوب صورت گملوں میں خوشنما تاثر پیش کرتے ان ڈور پلانٹس رکھے ہوئے تھے۔ اس فلور پر بظاہر خاموشی اور سکون کا راج تھا مگر یہی وہ فلور تھا جو اس کمپنی کے اختیارات واحکامات کا منبع و مرکز تھا۔ اس فلور پر تمام ڈائریکٹرز اور بورڈ ممبرز کے آفسز تھے۔ یہ پاور فلور تھا اور اس پاور فلور کا بھی جو پاور آفس تھا' وہ پر وقار قدموں سے چلتی اس آفس کی طرف جا رہی تھی۔ اس خاموش راہداری میں کہیں کہیں اندر کسی آفس میں بجتی فون کی گھنٹیاں اور کی بورڈ یا پرنٹر کی مخصوص آواز اسے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے عالیشان دفاتر کے اندر کھٹا کھٹ نوٹ پیدا ہو رہے ہوں۔ دھڑا دھڑ دولت کے انبار جمع ہو رہے ہوں۔ وہ اب چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو کے دفتر کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ باہر موجود پیون نے اسے اس کے پر اعتماد انداز کے سبب اندر جانے سے روکا نہیں تھا' وگرنہ ایسے ویسوں کو تو شاید اس آفس کے اندر قدم بھی نہیں دھرنے دیا جاتا ہوگا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کا آفس اتنا ہی شاندار ہونا چاہیے تھا۔ بہترین انٹیریئر اور ہر طرح کی جدید ٹیکنالوجی سے

آراستہ اس آفس کے اندر الگ الگ میزوں پر دو خوش لباس اور اچھی سی شخصیت کی حامل سیکریٹریز کام کر رہی تھیں۔ دونوں کی میزیں جدید ترین کمپیوٹر اور کئی طرح کے جدید ترین ٹیلی فون سیٹس سے مزین تھیں۔ دونوں بیک وقت کمپیوٹر پر بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں اور ساتھ ہی وقتاً فوقتاً بجتی فون کی گھنٹیوں پر بھی دھیان دے رہی تھیں۔

وہ اس ابتدائی مرحلے پر ہی اندر سے خود کو اس جگہ سے بہت زیادہ کمتر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے دونوں سیکریٹریز کی طرف دیکھا۔ اس کے اندر داخل ہونے کو انہوں نے محسوس نہ کیا ہو' یہ کس طرح ممکن تھا لیکن ان دونوں نے اپنے اپنے کاموں سے سر اٹھا کر اسے دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ ان دونوں جدیدیت کی نمائندہ مغربی وضع کے لباس میں ملبوس خواتین کے انداز میں فخر و غرور نمایاں تھا۔ وہ ان میں سے ایک کی میز کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ٹائپنگ روک کر اسے دیکھا تو ضرور مگر منہ سے کچھ کہنا غالباً مناسب نہیں سمجھا۔

''مجھے اشعر حسین صاحب سے ملنا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اتنا تو وہ طے کر کے آئی تھی کہ وہ یہاں سر اٹھا کر آئے گی۔ اپنی چال' اپنے انداز' اپنی گفتار کسی بھی چیز سے وہ اپنی کمزوری یہاں کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دے گی۔

''آپ کا نام؟ آپ نے اپائمنٹ لے رکھا ہے کیا؟''

واقعی وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک بہت مصروف اور بہت بڑے آدمی سے ملنے جا رہی ہے جس کا وقت بہت قیمتی ہے۔

''میں نے اپائمنٹ نہیں لیا مگر میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ یہ آفیشل نہیں' ایک پرسنل نوعیت کا کام ہے۔ آپ انہیں میرے بارے میں بتا دیں۔ اگر وہ ابھی مصروف ہیں تو میں انتظار کر سکتی ہوں۔''

اس کے دوٹوک لہجے میں یقیناً ایسی کوئی نہ کوئی بات اس نخریلی سیکریٹری کو ضرور محسوس ہوئی تھی جو اس نے سر یا اپنی گردن کو اقرار میں ہلاتے منقش اور بہت مضبوط دروازے کے دوسری طرف بیٹھے اپنے باس کو اس ملاقاتی کی خبر دینے کے لیے انٹرکام کی طرف مڑی۔

''میم! آپ کا نام؟''

''اُمّ حریم۔'' اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ بظاہر بہت سادہ اور عام سے انداز میں اپنا تعارف کروایا تھا اور ساتھ ہی دل میں ایک بار پھر خود کو یہ یاد دلایا تھا کہ وہ یہاں خیرات لینے نہیں' حریم حسین کی ماں کی حیثیت سے آئی ہے۔

''سر! اُمّ حریم نام کی ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ آفیشل نہیں' کچھ پرسنل اور ضروری کام ہے۔''

''نو سر! اپائمنٹ تو نہیں تھا۔ یس سر...... جی سر...... ٹھیک ہے سر......'' وہ خاموشی سے کھڑی سیکریٹری کو عاجزانہ لہجے میں یس سر اور جی سر کی گردان کرتے سن رہی تھی۔

''میم! آپ انتظار کیجیے' سر ابھی بزی ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر میں بلائیں گے۔'' انٹرکام رکھتے ہوئے سیکریٹری نے کمرے کے دوسرے کونے میں رکھے خوبصورت سے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ آہستگی سے چلتی ایک صوفے پر آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی

تھی۔

ایک......دو......تین......گھڑی میں آگے بڑھتا ہر اگلا سیکنڈ اس کے اعصاب کو توڑ رہا تھا۔ اس کے اندر شدت سے خواہش ابھر رہی تھی کہ اچانک کہیں سے کوئی غیبی مدد آ جائے۔ اتنی بھرپور کہ اسے اس شخص کی مدد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کی حریم ایک دم ہی مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔ وہ گرد و پیش سے انجان اور لاتعلق اپنے اندر کی جنگ میں الجھ رہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس پاور آفس سے سیکریٹری کو اسے بھیجنے کے لیے پیغام دیا گیا۔

''میم! آپ اندر جا سکتی ہیں۔'' اسے پیغام دے کر وہ ابھی ابھی آئے ایک فیکس کو ٹرے سے اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ وہ صوفے پر سے اٹھی تو اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

''ہمت خرد ہمت۔ اپنی بیٹی کے لیے، صرف اپنی بیٹی کے لیے تم اس ذلت سے گزر رہی ہو۔ اس کی زندگی سے زیادہ اہم تو نہیں ہے تمہاری عزت، تمہاری انا، تمہارا وقار۔''

اس نے دروازے کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھائے لیکن وہ ابھی تک جانے اور نہ جانے کی کشمکش میں تھی۔

اچانک Paediatric Surgeon کی پیشہ ورانہ لب و لہجے میں کہی باتیں اس کے اردگرد گونجیں۔

''آپ کی بیٹی کی زندگی خطرہ میں ہے۔''

''اس کی جلد از جلد اوپن ہارٹ سرجری ہو جانا چاہیے۔''

''اگر سرجری میں تاخیر کی گئی تو آپ کی بیٹی کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔''

یہ ڈراؤنی آوازیں اس کے تعاقب میں کیا آئیں، وہ باقی ہر بات بھول گئی۔ حریم اور اس کی زندگی کے سوا باقی ہر بات اس کے ذہن سے یک لخت ہی محو ہو گئی۔ وہ اگلے ہی پل اس مضبوط دروازے کو کھول کر اس کے اندر داخل ہو گئی۔

اس طویل و عریض اور قیمتی میز کے پیچھے فخر سے سر تانے وہ شخص بیٹھا تھا۔ اپنی شخصیت کی اثر انگریزی سے مکمل واقف، اپنے مقام اور مرتبے سے مکمل آگاہ۔

سیاہ رنگ کا زبردست قسم کا اٹالین سوٹ، ڈیزائنر سلک ٹائی، قیمتی ٹائی پن اور کف لنکس، دائیں ہاتھ میں سلور کلر کا ڈیزائنر قلم جس کی مدد سے سامنے میز پر رکھے کاغذ پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں ریسیور جو کان سے لگا تھا اور جس پر کسی سے بڑی مصروفیت کے عالم میں گفتگو ہو رہی تھی۔

جن کی زندگیاں خوشیوں اور خوش حالیوں سے عبارت ہوں، وقت ایسے لوگوں کو چھوئے بنا گزر جاتا ہے۔ اس نے سوچا تھا۔

قلم کو میز پر رکھ کر اس نے گفتگو کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے پھر شام میں ملتے ہیں، او کے۔ اللہ......'' اس پر نظر پڑی تو اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اسے دیکھ کر ریسیور ہاتھ میں

لیے ایک پل کے لیے تو وہ بالکل ہی خاموش ہو گیا۔ وہ ایک ایک قدم پر وقار انداز میں اٹھاتی پورے اعتماد کے ساتھ اس کے میز کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ریسیور ایک دم ہی پوری قوت سے کریڈل پر پٹخا اور اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

''آپ مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں اور میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ یہ بات میں جانتی ہوں۔ لہٰذا اپنی انرجی ضائع مت کیجیے۔ میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنے آئی ہوں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ آپ گھڑی دیکھیے' میں دس منٹ کے اندر اندر یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

استہزائیہ نگاہوں سے اس کے غصے سے سرخ چہرے کو دیکھتی وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ وہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی گھسیٹ کر اطمینان سے اس پر بیٹھ گئی۔ اس کے غصے کو ذرا سی بھی اہمیت دیے بغیر اس نے ہاتھ میں تھامی فائل کھول کر اس میں سے ایک کلرڈ تصویر نکالی اور اسے میز پر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ میری چار سال کی بیٹی حریم حسین کی تصویر ہے۔ بدقسمتی سے میری اس بیٹی کو دنیا میں لانے کا سبب آپ ہیں۔ نہ نہ...... یہ مت سمجھیں کہ میں آپ سے اپنے کردار کی کوئی گواہی لینے آئی ہوں کہ آپ اسے اپنی اولاد مان کر میرے کردار کو سرخروئی عطا فرما دیں۔ یہاں تو بات ہو رہی ہے میری بیٹی کے باپ کی۔ یہ اس کا بنیادی اور قانونی حق ہے کہ اس کا باپ اسے اپنی اولاد مانے۔ میری بیٹی بہت بیمار ہے۔ اس کی ہارٹ سرجری ہونی ہے۔ میرا آپ کے پاس یہاں آنے کا محض اتنا ہی مقصد ہے کہ میں اپنی بیٹی کو اس کے امیر و کبیر باپ سے وہ پیسہ دلوا سکوں جو اس کے علاج کے لیے درکار ہے۔''

اس کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اپنا وہ کرائے کا چھوٹا سا کمرہ یاد آ رہا تھا جس میں اس کی بیٹی نے آنکھ کھولی تھی' جہاں وہ چار سالوں سے رہ رہی تھی۔ وہ بچی جس کا باپ ایک بہت امیر آدمی تھا' کتنی محرومی کی زندگی جی رہی تھی۔

''جب میں آپ کے گھر سے گئی تو تقریباً پانچ چھ ہفتوں کی پریگنینٹ تھی۔ میرے اس دعوے کا ثبوت آپ چاہیں تو آپ کو ڈاکٹر طیبہ نادر کے کلینک سے مل سکتا ہے۔ آپ کے گھر سے جانے سے کافی روز قبل میں نے اپنا پریگننسی ٹیسٹ وہیں سے کرایا تھا اور ان کے کلینک سے یقیناً وہ ساڑھے چار سال پرانا ریکارڈ آپ کو ضرور مل جائے گا اور یہ رہا میری بیٹی حریم حسین کا برتھ سرٹیفکیٹ۔ 30 اپریل 2003ء کو یعنی آپ کا گھر چھوڑنے کے تقریباً ساڑھے پانچ ماہ بعد میری بیٹی حریم حسین پیدا ہوئی تھی۔ یہ ایک پری میچور ڈلیوری تھی۔ اس برتھ سرٹیفکیٹ کے اصلی ہونے میں کچھ شبہ ہو تو آپ اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں طنز زیادہ تھا یا نفرت اسے خود معلوم نہیں تھا۔ بغیر سانس لیے تیز رفتاری سے بولتے اسے بس اتنا معلوم تھا کہ اس مغرور اور سفاک انسان کے گیٹ آؤٹ یا گیٹ لاسٹ کہنے سے پہلے پہلے اسے اپنی بات پوری کر لینی چاہیے۔

انتہائی تیز رفتاری سے بات پوری کرتے اس نے حریم کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی اس کی تصویر کے اوپر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس نے

جس طرح تصویر کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا تھا' اسی طرح اس برتھ سرٹیفکیٹ کو بھی نہ دیکھا۔ وہ اپنی کرسی کے سامنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے کھڑا تھا۔

''اور یہ رہا میری بیٹی حریم حسین کا بلڈ گروپ۔'' اس نے ایک اور کاغذ اس کے آگے دھرا۔ ''میری بیٹی کا بلڈ گروپ B+ ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ B+ میرا بلڈ گروپ نہیں' B+ خضر عالم کا بلڈ گروپ بھی نہیں تھا۔ ہاں یہ آپ کا بلڈ گروپ ضرور ہے۔ اگرچہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلڈ گروپ میچ کر جانا اس بات کی ضمانت نہیں کہ آپ ہی میری بیٹی کے باپ ہیں مگر بلڈ گروپ کا میچ ہونا بہرحال میرے دعوے کے حق میں ایک پوائنٹ بڑھاتا تو ہے۔ آپ بہت قابل اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ یقیناً اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ بچے کا بلڈ ٹائپ اس کے ماں اور باپ کے بلڈ ٹائپ کا کمبی نیشن ہوتا ہے اور "O" اور "O" کا کمبی نیشن کبھی بھی B+ نہیں ہو سکتا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بات کر رہی تھی۔

''ویسے جو یہ سب باتیں میں آپ سے اس دوستانہ ماحول میں کر رہی ہوں بذریعہ کورٹ بھی کر سکتی تھی۔ میرا کردار چاہے جتنا بھی مشکوک ہو' کورٹ DNA Paternity Test کروانے کا حکم آپ کو دیتی اور پھر فوراً ہی ساری سچائی کھل کر سامنے آ جاتی مگر آپ ایک عزت دار انسان ہیں۔ کورٹ کچہری میں یقیناً آپ جگ ہنسائی ہوتی۔ آپ چاہیں تو DNA testing بھی کروالیں۔ مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں۔ بس آپ سے اتنی گزارش ہے کہ جو کچھ بھی آپ کو کرنا ہے۔ براہ مہربانی ذرا جلدی کر لیجیے۔ مجھے اپنی بیٹی کے آپریشن کے لیے پیسوں کی فوری ضرورت ہے۔ وہ شاید زیادہ لمبا انتظار نہ کر سکے۔''

بولتے بولتے ایک پل کے لیے وہ خاموش ہوئی مگر یہ خاموشی بھی بے مصروف نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل پوری کی پوری میز پر اپنے پہلے رکھے کاغذوں اور تصویر کے اوپر رکھ دی تھی۔

''اس فائل میں میری بیٹی کی تمام ٹیسٹ رپورٹس کی فوٹو کاپیز موجود ہیں۔ آپ کسی بھی ڈاکٹر سے تصدیق کرا سکتے ہیں کہ فوری سرجری کتنی ضروری ہے۔''

بات ختم کر کے وہ ایک جھٹکے سے کرسی پر سے اٹھی۔

''اس پتے پر میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ آپ میرے دعوے کی تصدیق میں میری بیٹی کو دیکھنا چاہیں یا اس کے بائیولوجیکل فادر ہونے کی تصدیق کے لیے DNA Testing سیمپل کلیکٹ کروانے اسے اپنے ساتھ اپنے کسی قابل بھروسا ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیں تو مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں۔''

فائل کے اوپر اس نے اس چٹ کا بھی اضافہ کر دیا جس پر افشین کی امی کے گھر کا پتا' فون نمبر اور خود اس کا اپنا موبائل نمبر درج تھا۔

''یقیناً مجھ سے مل کر آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی ہوگی مگر پھر بھی آپ نے جو مجھے اپنا اتنا قیمتی وقت دیا' اس کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔''

آٹھ منٹ بعد وہ اس کمرے سے باہر تھی۔ سر اٹھا کر باوقار اور پراعتماد قدموں سے چلتی ہوئی' وہ بلڈنگ سے باہر نکل آئی۔

جتنی توانائی اس جگہ آنے کے لیے اس نے اپنے اندر جمع کی تھی' وہ سب باہر قدم رکھتے ہی یوں لگا کسی نے ساری کی ساری نچوڑ ڈالی ہے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک کے کنارے بے سمت چلتی رہی۔

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اپنی چھوٹی اور بہت پیار بیٹی کے سامنے ہنستے مسکراتے ہوئے جانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے سب آنسو یہیں انہیں سڑکوں پر بہا ڈالے۔

وہ اشعر حسین کے ساتھ اس کی زبان میں طنز اور حقارت سے بات کر کے آئی تھی۔ اپنی تمام تر نفرتوں کے اظہار کے ساتھ لیکن پھر بھی' پھر بھی وہ گئی تو تھی نا اس کے پاس۔ اس کے در پر' بھیک مانگنے' مدد مانگنے' یہ درخواست تو کی تھی نا کہ وہ اپنی بیٹی کو اپنی بیٹی تسلیم کرلے' اپنی اولاد مان لے اور پھر اس کا حق دے۔ محض آٹھ منٹ اور اکیاون سیکنڈ لگے تھے۔ خرد احسان کی انا' آبرو' وقار اور عزت نفس کو لٹنے اور برباد ہونے میں۔ آج کے بعد وہ کبھی سر اٹھا کر کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ سر اٹھا کر یہاں آئی تھی اور سر جھکائے یہاں سے جا رہی تھی۔ لٹی ہوئی' تباہ حال' خانماں برباد۔

☆......☆......☆


# کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

وہ اس کے آفس سے جا چکی تھی اور وہ کرسی پر ایک ہی زاویے سے بغیر کسی جنبش کے ساکت بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی تصویر تک کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ خرد احسان، اس کے آفس میں؟ اگر اس میں رتی برابر بھی شرم اور غیرت تھی تو اسے زندگی بھر دوبارہ کبھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہیے تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ ذلت کے جس شدید احساس میں وہ پچھلے ساڑھے چار سالوں سے زندگی گزار رہا تھا، اس وقت وہ ذلت بھرا احساس مزید کئی گنا بڑھ گیا تھا۔

''آج کی تمام اپائمنٹس کینسل کر دیجئے۔ میں کوئی فون کال بھی ریسیو نہیں کرسکوں گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' انٹر کام پر اس نے اپنی سیکریٹری کو ہدایت کی۔

''لیکن سر! آج ساڑھے تین بجے شاہ گروپ کے ساتھ آپ کی میٹنگ ہے اور ابھی مسٹر لغاری کے ساتھ آپ کو لنچ......''

''جب کہا ہے کہ تمام اپائمنٹس کینسل کر دیجئے تو پھر اس میں میٹنگز، لنچ اور باقی سب کچھ بھی شامل ہے۔'' اس نے سخت لہجے میں بات ختم کر کے ریسیور بہت زور سے پٹخا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ وہ غیض و غضب کا زیادہ شکار تھا یا ذلت زیادہ محسوس کر رہا تھا، اسے خود اپنی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ خرد احسان اس ڈھٹائی اور بے خوفی سے اس کے سامنے آ کر یہاں سے صحیح سلامت واپس بھی چلی گئی اور وہ دیکھتا رہا؟

کیا اعلا تعلیم اور اعلا رتبہ، معاشرے میں باعزت اور نمایاں مقام، انسان کو بے غیرت بنا دیتے ہیں؟ وہ اسے جان سے کیوں نہیں مار سکا۔ اسے جان سے مار کر خود پھانسی چڑھ جاتا تو کم از کم بے غیرتی اور ذلت والی اس زندگی کو جینے سے تو اسے نجات مل جاتی۔

ساڑھے چار سال قبل اس کی وہ بیوی جسے وہ بہت چاہتا تھا، بالکل اچانک اس سے کچھ بھی کہے سنے بغیر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ کہاں کمی رہ گئی تھی اس کی محبت میں، اس کی چاہت میں جو وہ اس کے وجود کو یوں اتنی کاری چوٹ پہنچا گئی تھی۔ اسے اس سے کوئی شکایت تھی، وہ طلاق چاہتی تھی تو اپنے منہ سے اس سے یہ بات کہہ دیتی۔ وہ اس کی خوشی کی خاطر اسے باعزت طریقے سے علیحدہ کر دیتا مگر یوں......

اسے کتنے عرصے تک تو یہ یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ خرد احسان، اتنی نیچ، اور اتنی گھٹیا بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہیں فرار ہو جائے۔ کیا اس کا نفس اس پر اس حد تک حاوی ہو گیا تھا کہ اسے صحیح اور غلط کی تمیز ہی بھلا گیا تھا۔

اگر کسی کی بیوی اسے دھوکا دے تو اس کی انا اور غیرت پر چوٹ پڑتی ہے اور اگر کسی کی بیوی جسے وہ بے حد و بے حساب چاہتا بھی ہو جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اندھا اعتماد بھی کرتا ہو، اس سے بد دیانتی کی مرتکب ہو تو اس کا پورا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اشعر حسین ساڑھے چار سال قبل ایسے ہی ریزہ ریزہ ہو کر بکھرا تھا۔

اس کا حقیقتاً یہ دل چاہا تھا کہ وہ خرد کو بھی مار ڈالے اور خود کو بھی ختم کر لے۔ مگر اس میں تو اپنی زندگی کا خود اپنے ہاتھوں سے ختم

کرنے کی بھی جرات نہیں تھی۔سو یہ ذلت آمیز زندگی وہ پھر سے جینے لگا تھا۔

وہ بظاہر زندہ لوگوں جیسے سب کام کرتا تھا۔کھانا، پینا، دفتر جانا، لوگوں سے ملنا، زندگی کے تمام معمولات وہ نبھار ہا تھا مگر وہ اندر سے ختم ہو چکا تھا، اس کے لب ہنسنا بھول گئے تھے۔

خرد نے جو دھوکا اسے دیا تھا۔جو درد اسے پہنچایا تھا اس کے بعد اب وہ زندگی میں کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرسکتا تھا، اب وہ زندگی میں دوبارہ کسی سے محبت نہیں کرسکتا تھا۔

اس نے اسے تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔اگر کرتا تو اتنا با اثر اور طاقت ور تھا کہ اسے پاتال سے بھی نکال لاتا۔ اسے ایک اذیت ناک موت دیتا، اس کی لاش چیل کوؤں کے آگے ڈال دیتا۔مگر اپنا یہ اثر ورسوخ، یہ طاقت استعمال کرنے کا اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔وہ اس کی ناموس اس کی عزت، اس کے وقار کو جو زک پہنچا گئی تھی۔اس کا کوئی بھی جوابی عمل خرد احسان کی دی ہوئی ذلت کے احساس کو مٹا نہیں سکتا تھا۔اور آج۔

وہ اس کے آفس میں اس کی میز کے سامنے موجود تھی۔بڑی بے خوفی اور دیدہ دلیری کے ساتھ۔اور وہ مٹھیاں بھینچے اپنے اندر سے ابلتے نفرت کے لاوے کو بہہ نکلنے سے روک رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پوری قوت سے چیخ چیخ کر اسے گالیاں دے۔وہ اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔اور ایسا کر کے وہ اپنے ہی آفس میں خود اپنا ہی تماشا بنا ڈالتا۔مگر وہ بزدل تھا۔

ہاں وہ بزدل تھا۔وہ لوگوں کے سامنے تماشا بننے سے ڈرتا تھا، خرد احسان نے آج اس کے سامنے آ کر کیا کیا کہا اس نے کچھ سنا نہیں تھا۔خرد احسان نے اس کے سامنے کیا کیا دھرا اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا۔اس کے سچے جذبوں، اس کی محبتوں اور چاہتوں کا مذاق اڑانے والی، اس کی عزت کو سر بازار نیلام کرنے والی، بیوی کے نام پر ایک بدنما گالی، وہ عورت کس ڈھٹائی کس بے خوفی اور کس دیدہ دلیری سے اس کے روبرو کھڑی تھی۔کوئی ندامت، کوئی اعتراف جرم، یا شرمندگی کا رتی بھر شائبہ بھی اس کی آنکھوں میں نہ تھا۔

☆......☆......☆

اس کی شادی اتنے آنا فانا اور اتنے دقیانوسی طریقے سے بھی ہو سکتی ہے ایسا اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ٹھیک ہے ابھی تک اس کی کہیں کسی کے ساتھ کوئی کمٹ منٹ نہیں ہوئی تھی۔یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والا کوئی بہت زیادہ رومنٹک انسان نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت پسند اور میچور سوچ رکھنے والا شخص تھا۔مگر بہت حقیقت پسند اور میچور سوچ رکھنے والے لوگ بھی تو اپنی زندگی اور شریک زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ آرزوئیں اور خواہشات رکھتے ہیں۔خرد احسان اس کے شریک حیات کے تصور پر کتنی پوری اترتی تھی۔یہ تو وہ تب جانتا اگر وہ اسے جانتا ہوتا۔ایک چھوٹے سے شہر میں رہنے والی پھوپھی زاد کزن جس کا نام تک بھی اسے ڈھنگ سے یاد نہیں تھا۔جس سے بچپن میں دو، ایک بار سرسری سا ملنے کے بعد وہ دوبارہ کبھی ملا نہیں تھا۔تقدیر کے پھیر نے اسی گمنام اور اس کی زندگی میں

کبھی کوئی اہمیت نہ رکھنے والی اس کزن کو بالکل آناً فاناً اس کی بیوی بنا دیا تھا۔

یہ شادی زبردستی نہیں کروائی گئی تھی۔ اس نے خود اپنی رضامندی سے نکاح کے وقت خرد احسان کو بطور اپنی بیوی قبول کیا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ کبھی کبھی محبت بھی انسان کو بے حد مجبور کر دیتی ہے۔

اس کے ڈیڈی بصیرت حسین نے اس پر کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو شاید وہ انہیں انکار بھی کر دیتا۔ مگر یوں کیسے کرتا کہ انہوں نے تو بڑی بے بسی سے آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بیٹے سے ایک التجا کی تھی۔ ان کی مرتی ہوئی بہن کی اس آخری خواہش کو پورا کر دے۔

''مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی، اشعر بہت بڑی زیادتی ہوگئی۔ اپنی دنیا میں مگن ہو کر، زندگی کے ہنگاموں میں مصروف رہ کر میں پوری زندگی اپنی اکلوتی بہن سے غافل رہا۔ وہ انا والی تھی، خود دار تھی۔ کبھی اپنی کوئی پریشانی بتاتی نہیں تھی تو مجھے بھی خود سے یہ خیال نہیں آیا کہ کہیں وہ شوہر کے مرنے کے بعد کسی طرح کے فنانشل کرائسس میں تو نہیں۔ میں یہاں لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہا تھا۔ اور وہ...... میری بہن وہاں زندگی کو نجانے کس کس طرح گھسیٹ رہی تھی۔ شوہر کی بہت معمولی سی پینشن اور اپنی چند ہزار روپے ماہوار والی ملازمت میں وہ کس طرح گزارا کرتی ہوگی، میں نے کبھی پلٹ کر بیوہ بہن اور یتیم بھانجی کی خبر گیری نہیں کی۔ وہ اتنے جان لیوا اور خطرناک مرض میں مبتلا ہوگئی اور میں اپنے بزنس کو آگے سے آگے بڑھانے، کامیاب بزنس ڈیلز کرنے میں مصروف رہا۔ اور اس کی بیماری سے باخبر بھی ہوا ہوں تو اب، اب جب کچھ بھی ہو نہیں سکتا۔ اور وہ بھی خود سے بہن کا خیال آنے پر نہیں، بلکہ اس کے بلانے پر، اس کے خود بتانے پر کہ۔

''بھیا! میں جا رہی ہوں۔ میرے بعد میری بیٹی دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ اس لیے تمہیں پکار رہی ہوں۔''

وہ بیٹے کے آگے بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ وہ اپنے بہت بہادر اور حوصلہ مند باپ کو یوں ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر بالکل چپ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا۔ ان پر ایک ہی وقت میں کئی قیامتیں ایک ساتھ ٹوٹ پڑی تھیں۔ اس کی پھوپھو ان کی اکلوتی چھوٹی بہن کی زندگی ختم ہونے والی تھی، وہ کینسر جیسے خطرناک مرض میں مبتلا تھیں یہ ان کی بیماری کی آخری اسٹیج تھی۔ ڈاکٹرز انہیں جواب دے چکے تھے۔ وہ اب چند ہفتوں یا بہت سے بہت ایک آدھ مہینے کی مہمان تھیں۔

اس کے ڈیڈی اپنی بہن سے اتنی محبت کرتے ہیں یہ اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں نہ اپنی اکلوتی پھوپھو کو کبھی زیادہ آتے جاتے دیکھا تھا نہ ہی ان کا ایسا کوئی خاص ذکر اپنے گھر میں سنا تھا۔ وہ نواب شاہ میں رہتی تھیں اور مہینوں میں ہونے والی کبھی کبھار کی فون کالز کے سوا ان کا اس کے گھر سے ایسا کوئی گہرا رابطہ نہیں تھا۔ پانچ سال قبل جب اس کے پھوپھا کا انتقال ہوا تھا تب وہ پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ ہاں اتنا اس کے علم میں تھا کہ اس کے ڈیڈی ان کے انتقال پر نواب شاہ پھوپھو کے پاس گئے ضرور تھے۔ اور ان کی تدفین میں شرکت کر کے وہ فوراً ہی واپس آ بھی گئے تھے کہ ان کی لندن کی فلائٹ تھی۔ ایک بہت اہم بزنس ڈیل فائنل کرنے انہیں لندن روانہ ہونا تھا۔ اس کے ڈیڈی نے بڑی محنت سے اپنا یہ شاندار بزنس جمایا تھا۔

وہ کام کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ وہ ایک بہت ہی قابل دیانت دار اور محنتی انسان تھے۔ اپنے کام کو اتنی زیادہ محنت اور لگن سے کرنے کی یہ عادت اس میں اپنے ڈیڈی ہی سے آئی تھی۔ وہ آج ملک کی ایک کامیاب کاروباری شخصیت مانے جاتے تھے۔ مگر ترقی اور کامیابی کے اس سفر میں آگے سے آگے بڑھنے کی لگن میں وہ اپنے قریبی کچھ ایسے اہم لوگوں کو نظر انداز کر گئے تھے جو ان کی زندگی میں براہ راست شامل نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی ہی کا ایک حصہ تھے۔

ان کی اکلوتی، چھوٹی اور بیوہ بہن ان کی یتیم بھانجی، جو ان کی محبت اور توجہ کی حق دار تھیں۔ جن کی خبر گیری کرنا ان پر فرض تھا اور وہ اپنے اس فرض سے ارادتاً نہ سہی۔ غفلت برتنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ بہن سے فون پر جب بھی بات ہوتی وہ، یہ سوچ کر شرمندہ ہوتے کہ ''میں مصروفیت میں فون کرنا، خیریت معلوم کرنا، بھول جاتا ہوں۔ ہمیشہ وہی فون کرتی ہے۔ اچھا ذرا اس ڈیل سے فارغ ہو جاؤں، پھر فون کروں گا۔ نہیں بلکہ خود نوابشاہ جا کر بہن سے مل کر آؤں گا۔ دو، چار روز اس کے پاس رہ کر آؤں گا'' مگر یہ ''پھر'' کبھی بھی نہ آ پاتی تھی۔ اس لیے کہ اس ڈیل کے بعد کوئی اور اہم ڈیل، اس ڈیلی گیشن کے بعد کوئی دوسرا ڈیلی گیشن، اس کاروباری سفر کے بعد کسی اور ملک میں کوئی اور اہم کاروباری کام، ایک کام کے بعد دوسرا پہلے سے بھی زیادہ اہم کام تھا۔ جو بہن کے پاس جانے کی راہ میں حائل رہنا۔ وہ بہن سے ملنے جانے کے لیے بھی فرصت، لمبی فراغت کا انتظار کرتے رہے اور وہاں بہن کے پاس فرصت ہی ختم ہونے لگی۔ اس کے پاس زندگی ہی ختم ہونے لگی۔

مہینہ بھر قبل ایک روز بہن نے انہیں فون کر کے اپنی بیماری کی اطلاع دی تھی۔ وہ ہر مصروفیت چھوڑ کر اندھا دھند بہن کے پاس بھاگے تھے اشعر ان کے ساتھ تھا اور وہاں اس نے اپنے ڈیڈی کو جس طرح پھوپھو سے لپٹ کر روتے دیکھا اس سے اسے زندگی میں پہلی بار یہ پتا چلا تھا کہ وہ اپنی بہن سے اتنی شدید محبت کرتے ہیں۔ بصیرت حسین، بہن اور بھانجی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ زندگی بھر پھوپھو یا ان کی فیملی کی اس کے گھر میں ایسی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ جو اسے ان سے کسی طرح کی محبت یا انسیت ہوتی، مگر اپنے ڈیڈی کو ان سے اتنی زیادہ محبت کرتے دیکھ کر وہ بھی انہیں بہت اہمیت اور احترام دے رہا تھا۔ بصیرت حسین اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کے پاس بہن کو لے جا رہے تھے۔ حالانکہ اب اس سب کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہر ڈاکٹر کے پاس وہی جواب تھا جو وہ سب پہلے سے جانتے تھے مرض ان کے جسم میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بصیرت حسین پر بیک وقت دکھ، غم، پریشانی ندامت و شرمساری کئی طرح کی کیفیات طاری تھیں کہ اگر وہ پہلے بہن سے اتنے غافل نہ رہے ہوتے تو اس کی بیماری سے پہلے آگاہ ہو جاتے۔ اس کا بہترین علاج کرواتے، تب ان کی بہن بچ سکتی تھی۔ اور اگر نہ بھی بچتی تب بھی یہ پچھتاوا تو دامن گیر نہ ہوتا کہ انہوں نے، ایک بہت امیر کبیر بھائی نے مالی مشکلات کا شکار اپنی بیوہ بہن کی مالی معاونت نہ کی، اس کا اچھا علاج نہ کروایا۔ زندگی کی مشکلات میں اس کا ساتھ نہ نبھایا۔

وہ بطور رشتے دار اور مہمان ان دونوں کے ساتھ بڑی عزت اور احترام سے پیش آ رہا تھا پھوپھو مسلسل بستر پر تھیں۔ وہ کسی اسپتال کے کمرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے نہیں بلکہ اپنے بھائی اور بیٹی کے قریب مرنا چاہتی تھیں۔

سو بصیرت حسین نے انہیں گھر پر ہی رکھا ہوا تھا۔ چوبیس گھنٹے ایک نرس ان کی خدمت کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ آکسیجن سے لے کر دیگر تمام طبی سہولیات کا بندوبست بھی انہوں نے ان کے کمرے ہی میں کر دیا تھا۔ ان کے گھر کا وہ کمرہ کسی ہسپتال کے کمرے ہی کی سی شکل اختیار کر گیا تھا۔

بصیرت حسین نے آفس جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارا وقت بہن کے سرہانے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کبھی ہوش میں ہوتیں تو اشاروں میں تھوڑی بہت بات چیت کرتی تھیں اور کبھی بالکل بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ وہ آفس آتے جاتے پھوپھو کی خیریت معلوم کر لیتا تھا۔ مسلسل روتی' کلام پاک کی تلاوت کرتی' نماز پڑھتی یا ماں کی خدمت کرتی اپنی کزن کے لیے اسے افسوس ہوتا مگر صحیح معنوں میں جو فکر اور پریشانی اسے تھی وہ اپنے ڈیڈی کی تھی۔ انہیں یوں ٹوٹا بکھرا اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس سے دو سال بڑی سمونا شادی کے بعد اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آسٹریلیا میں رہائش پذیر تھی۔ اور اس سے تین سال چھوٹی کنزیٰ شادی کے بعد اب اسلام آباد میں مقیم تھی۔ دونوں بہنیں چونکہ اپنے اپنے گھروں کی تھیں۔ لہٰذا ماں باپ کا خیال رکھنا اور ان کا دھیان رکھنا وہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ کر اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ اسے اپنے والدین سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کی ممی اور ڈیڈی دونوں اسے والہانہ چاہتے تھے۔ اس کی ممی فریدہ کی محبت اگر لاڈ پیار کرنے اور نخرے اٹھانے والی محبت تھی تو بصیرت حسین کی ذرا سنجیدہ سی' تھوڑا سا رعب رکھتی ہوئی کچھ ایسی جیسی ایک شہنشاہ اپنے ولی عہد سے کرتا ہے۔ ''تمہیں میری جگہ سنبھالنی ہے۔ تمہیں میرے جیسا بننا ہے۔ اپنے آپ کو میرا بیٹا ثابت کر کے دکھانا ہے۔'' جیسی بلند توقعات رکھنے والی محبت' جس نے اسے ایک متوازن شخصیت کا حامل بنا دیا تھا۔

چھ سال امریکہ میں رہ کر وہاں اعلا تعلیم حاصل کر کے وہ چار سال قبل وہاں سے وہ تمام ڈگریاں لے کر لوٹا تھا جو اس کے باپ کی خواہش تھی۔ سو اعلا تعلیم کے حصول کے بعد چار سال قبل جب اس نے اپنے ڈیڈی کی کمپنی کو باقاعدہ جوائن کیا تو خود دن رات محنت کر کے گویا باپ کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ ان ہی کے جیسا ہے۔

فریدہ کافی عرصے سے اس سے شادی کے متعلق کہہ رہی تھیں کہ وہ انہیں اپنی پسند بتائے اور اگر اس کی کوئی پسند نہیں تو پھر خاندان یا دوستوں کے حلقے میں سے کسی کا انتخاب کر لے۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی بیٹے کی شادی کا بہت ارمان تھا۔ مگر وہ فی الحال شادی کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی اس کی توجہ صرف اور اپنے کام پر تھی۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی تک اسے کوئی لڑکی اس حد تک اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ سنجیدگی سے شادی کے متعلق سوچتا۔ لیکن سب کچھ ایک طرف یونہی رہ گیا تھا۔

''مجھے پتا ہے اشعر! میں تم پر دباؤ ڈال رہا ہوں' مگر میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بیٹے! میری بہن مر رہی ہے اور مرنے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھ سے زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا ہے' میں اس کی یہ خواہش اور کس طرح پوری کروں؟ اتنی جلدی کوئی رشتہ اگر ڈھونڈ بھی لاؤں تو بہن کو یہ گارنٹی کیسے دوں گا کہ یہ شخص جسے میں تمہاری بیٹی کی زندگی کا ساتھی بنا رہا ہوں اس کے ساتھ

تمہاری بیٹی ہمیشہ بہت خوش رہے گی۔ یہ گارنٹی تو میں صرف تمہاری' اپنے بیٹے ہی کی دے سکتا ہوں۔ تمہاری کچھ آرزوئیں' خواہشات اور خواب ہوں گے میں ان سب کو پامال کر رہا ہوں میں جانتا ہوں بیٹا! مجھے معاف کر دو بیٹا! مگر وہ میری بہن مر رہی ہے۔ اگر وہ بیٹی کا گھر بسا دیکھے بغیر اس کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں دیکھے بغیر مر گئی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا بیٹے۔''

انہوں نے روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے اور وہ بہت بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

''آپ اس طرح مت کریں ڈیڈی! آپ مجھ پر ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ آپ مجھ سے کسی بات کے لیے التجا کریں' اس سے پہلے میں مرجانا پسند کروں گا۔ آپ مجھے حکم دیں۔ پلیز ڈیڈی' اس طرح کر کے مجھے گناہ گار مت کریں۔''

باپ کے بندھے ہاتھوں کو کھولتا وہ بہت شرمندہ سا بولا تھا' اس پل ہر بات بھلا کر اس نے صرف یہ سوچا تھا کہ کیا وہ اتنا برا' اتنا نافرمان بیٹا ہے کہ اس سے کوئی بات منوانے کے لیے اس کے ڈیڈی کو اس کے آگے منت کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کے باپ نے اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ بس ایک لمحے میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ سوچنے' فیصلہ کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت تو لوگ اپنے لیے کوئی لباس' کوئی کتاب خریدنے میں لگا دیا کرتے ہیں۔ جس سے بہت کم وقت میں اسے خرد احسان سے شادی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا۔ وہ جو دوستوں کے انتخاب تک کے معاملے میں بے حد محتاط تھا اس کے معیار اور اس کی ذہنی سطح سے کم کوئی شخص اس کا دوست نہیں ہو سکتا تھا تو پھر شریک حیات۔ ایک فرماں بردار بیٹے کو اپنے بہت چاہنے والے باپ کی محبت نے مجبور کر دیا تھا ایک ایسے رشتے کو جوڑنے کی ہامی بھرنے پر جس میں اس کے دل کی رضا' شامل نہیں تھی۔ ہاں مگر اس ''ہاں'' کے نتیجے میں اسے یہ فخر ضرور حاصل ہوا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو مایوس نہیں کیا' ان کی بات مان کر ان کی خواہش پوری کر کے ایک اچھا اور فرمانبردار بیٹا ہونے کا ثبوت دے دیا۔

بصیرت حسین کے اندر جیسے کسی نے نئی توانائیاں بھر دی تھیں۔ میمونہ کی بیماری کے سبب شادی کی تقریب' منعقد تو گھر پر ہی کی جا رہی تھی مگر اس میں انہوں نے کمی کوئی نہیں رہنے دی تھی۔ دور و نزدیک کے اپنے تمام رشتے داروں دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو شادی کی اس تقریب میں انہوں نے مدعو کیا تھا۔

سمونا تو اتنی جلدی آسٹریلیا سے آ نہیں سکتی تھی' ہاں کنزیٰ اسلام آباد سے آ گئی تھی۔ اکلوتے بھائی کی شادی کے حوالے سے دونوں بہنوں کے بہت سے خواب تھے اور بھائی کی اس طرح کی شادی سے ان دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ خوش نہیں تھی۔ مگر جب ان کا بھائی ہی سولہویں صدی کی اس دقیانوسی طرز کی شادی کے لیے برضا و رغبت تیار ہو گیا تھا تو وہ دونوں کیا کہتیں۔

گو شادی گھر کے وسیع و عریض گارڈن میں ہی ہو رہی تھی مگر میمونہ پھوپھو کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ وہاں تک بھی لائی جا سکتیں۔ وہ اپنے کمرے میں بے بسی اور لاچاری کی مجسم تصویر بنی بستر پر لیٹی تھیں۔ ان دونوں کا نکاح ان ہی کے کمرے میں ہوا تھا۔

نکاح کے بعد میمونہ نے بڑی مشکلوں سے اشعر کو اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تھا اور جب وہ ان کے قریب جا کر جھکا تو انہوں نے اس کے سر دھیرے سے ہاتھ پھیرا' منہ ہی منہ میں محض لب ہلا کر شاید اسے کوئی دعا دینے کی کوشش کی۔ اسے ان کی آنکھوں میں

موت ٹھہری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مگر موت کی اس موجودگی کے ساتھ اسے ان کی آنکھوں میں بہت سا اطمینان بھی نظر آیا تھا۔

اس کے برابر میں کھڑی عروسی لباس پہنے' پوری طرح دلہن بنی اس کی بیوی زار و قطار رو رہی تھی۔ روایتی شادیوں والے ہر اہتمام اور ہنگامے کے باوجود بھی اس شادی کی تقریب میں موت کی دستک سنائی دے رہی تھی۔

ادھر کھانا ختم ہوا' مہمان رخصت ہوئے۔ سب ہنگامے سرد پڑنا شروع ہوئے' ادھر میمونہ کی حالت بگڑنا شروع ہوئی۔ شاید بیٹی کی فکر ہی میں ان کی سانسیں اب تک چل رہی تھیں۔ ادھر اس کا مستقبل محفوظ ہوتے' اس کا گھر بستے دیکھا ادھر موت کو گلے لگا لیا۔

☆......☆......☆

ایک ایسی موت جس کے لیے ہر ایک ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس کے واقع ہو جانے نے بصیرت حسین اور خرد دونوں کو غم سے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ وہ دونوں روتے تھک جاتے تو مرنے والی کی باتیں یاد کرنے لگتے۔ وہ ایک مہینہ پہلے جب ان کے گھر آئی تھی تب سے سارا وقت ماں کے ساتھ لگی رہی تھی اور اب ہر وقت ماموں کے ساتھ لگی رہتی۔ جیسے اس گھر میں وہ اپنے ماموں کے سوا اور کسی کو جانتی ہی نہ ہو۔

ہر وقت مغموم اور سوگوار رہنے والی وہ لڑکی اس کی بیوی ہے اس کے دل میں کبھی یہ سوچ آتی ہی نہیں تھی۔ اس شادی نے اگر اس کے دل کی دنیا نہیں بدلی تھی' اگر خرد احسان کو اس کے لیے اہم نہیں بنایا تھا' تب بھی اس شادی' اس نکاح کی اہمیت کم تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ خرد احسان نام کی اپنی کزن سے چاہے اسے کوئی دلچسپی' کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر اب وہ اس کی بیوی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی اور اس سچائی سے منہ نہیں موڑا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

بصیرت حسین نے بہن کی موت کے بعد بیس' پچیس دن بالکل خاموشی سے گزارے تھے۔ اور پھر اس کے بعد انہوں نے شادی کی تقریب ہی کی طرح ان کے ولیمہ کی تقریب کا پروقار اہتمام کیا تھا۔ ولیمہ کی یہ تقریب اپنے انتظام و اہتمام میں شادی کی تقریب سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔

وہ اپنی بہن کو سوچ رہے تھے جس کی روح کو زیادہ سکون اپنی موت کا ماتم منائے جاتے رہنے سے نہیں بلکہ بیٹی کی نئی زندگی کا خوشیوں بھرا آغاز دیکھنے سے ملتا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیٹے کو بھی سوچ رہے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کی خاطر جبراً اور مجبوراً جس رشتے کو اشعر نے قبول کیا ہے اب آگے بڑھ کر وہ خرد کو دل سے اپنا لے۔ ولیمہ کی اس بھرپور اور شاندار تقریب کے بعد دلہن بنی خرد احسان کو اس کے کمرے میں لایا گیا تھا۔

اس رشتے سے پہلے اور اس رشتے کے بعد اب تک اس نے خرد کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس رشتے کو اب تک قبول ہی نہیں کر پایا تھا۔ ایک بالکل انجانی لڑکی جس کے نام کے سوا وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کی بیوی کی حیثیت

سے لا کر بٹھادی گئی تھی۔ لیکن خود کو سمجھا کر اس نے اس انجان اور ناواقف لڑکی کو اپنے ہاتھ سے ڈائمنڈ رنگ پہنائی تھی۔ ایک شوہر کے اپنی بیوی کے ذمہ جو حقوق واجب ہوتے ہیں وہ ادا کیے تھے۔ اور دل میں سوچا تھا کہ شاید اس کی زندگی یونہی حقوق و فرائض کی ادائیگی کرتے گزرے گی۔

اس پہلی شب اس کے اپنے ذہن میں اتنی الجھنیں تھیں کہ جسے اس کی بیوی بنایا گیا ہے وہ کیا سوچ رہی ہے اس کا اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے بیل بجانے پر اپارٹمنٹ کا دروازہ افشین کی امی ریحانہ نے کھولا۔ وہ کہاں گئی تھی۔ یہ انہیں نہیں پتا تھا پھر بھی اتنا جانتی تھیں کہ وہ بیٹی کے آپریشن کے سلسلے میں پیسوں کا انتظام کرنے ہی گئی ہوگی۔

''بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو بیٹا؟'' اس نے انہیں سلام کیا تو وہ اسے محبت بھری تشویش سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرادی۔

''فکر کیوں کرتی ہو خرد! اللہ مسبب الاسباب ہے۔ بہتری کی کوئی نہ کوئی راہ وہ ضرور نکالے گا۔ ان شاءاللہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہوگا۔ چلو آؤ منہ ہاتھ دھولو' میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔''

''نہیں آنٹی! پلیز آپ آرام کریں۔ ابھی مجھے بھوک نہیں اور میں یہاں کوئی مہمان تھوڑی ہوں جس وقت مجھے بھوک لگے گی' میں خود کچن میں جا کر اپنے لیے کھانا نکال لوں گی۔''

ان کا خلوص اسے ہر بار حقیقتاً شرمندگی سے دوچار کردیا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سمیت بن بلائے نجانے کتنے طویل قیام کے لیے ان کے گھر آ کر پڑ گئی تھی اور وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھتے کہ وہ ان کی بیٹی کی بہت عزیز اور بہت پیاری سہیلی ہے' اس پورے خلوص اور چاہت کے ساتھ مہمان نوازی کر رہی تھیں۔

افشین اس کی کولیگ کے ساتھ اس کی دوست اور غم گسار بھی تھی۔ بہت برے حالات میں ملنے والی وہ ایک بہت اچھی دوست تھی۔ ایسی دوست جس سے اس کا کوئی پردہ نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بار بار روئی تھی۔ حریم کے علاج کے لیے مالی تنگی کا شکار ہونے پر' آپریشن کے لیے کہیں سے بھی پیسوں کا بندوبست نہ ہوسکنے پر' اس کے دل میں پہلی بار یہ خیال بھی افشین ہی نے ڈالا تھا کہ وہ اشعر حسین سے' اپنے بیٹی کے باپ سے جا کر ملے۔ بیوی کے پریگننٹ ہونے کی خبر نے اس کے دل میں رحم' ہمدردی' ترس کچھ نہیں جگایا تھا مگر کیا خبر اپنی بیٹی کے وجود سے آشنا ہو کر اس کے دل میں خرد کے لیے نہ سہی' حریم کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو جائے' مگر اس نے صاف انکار کردیا تھا۔ لیکن بہت جلد ہی ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد جب اسے اپنی اوقات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوا اور یہ تلخ حقیقت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی کہ ہارٹ سرجری تو بہت دور کی بات ہے' اس سے پہلے ہی بیٹی کے علاج کے لیے اپنے چھوٹے سے شہر سے اس بڑے شہر آنے

میں' ایک اچھے کارڈیالوجسٹ کے پاس اس کی بیماری کے علاج کا آغاز کرنے میں' مہنگے مہنگے تمام ٹیسٹ کروانے اور بہت مہنگی ادویات خریدنے ہی میں اس کی تمام جمع پونجی ٹھکانے لگ چکی ہے۔ ہاں کھانا پینا افشین کی بدولت مفت تھا۔ ایک مناسب قسم کی فرم میں اس کی معقول جاب تھی۔ سیلری ایسی تھی جس میں اس کا اور اس کی بیٹی کا اچھا گزارا ہو جایا کرتا تھا مگر اس پرائیویٹ فرم میں ملازمین کو میڈیکل کی مفت سہولیات فراہم کیے جانے کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس نے میتھس' فزکس اور اسٹیٹس کے ساتھ گریجویشن کر رکھی تھی اور اسے اس فرم کے اکاؤنٹس کے شعبے میں ڈھائی سال قبل کافی کوششوں کے بعد ملازمت ملی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی اور گھر پر سیکنڈری کلاسز کے بچوں کو ٹیوشنز دے رہی تھی۔ یہ جاب اسے افشین کی وساطت سے ملی تھی۔ وہ ہاں پہلے سے جاب کر رہی تھی اور اسی نے خرد کے لیے اپنی فرم میں کوشش کی تھی۔ اس جاب سے ملنے والی سیلری' اسکول کی سیلری سے بدرجہا بہتر تھی پھر گھر پر اس کی ٹیوشنز تو ساتھ ساتھ چل ہی رہی تھیں۔ لہٰذا ان ماں بیٹی کا گزارا اچھی طرح ہو رہا تھا۔

جب تک حریم بیمار نہ پڑی تھی۔ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن بھی تھی اور ہر ماہ اپنی تنخواہ سے کچھ نہ کچھ حریم کی تعلیم کے لیے' اس کے مستقبل کے لیے پس انداز بھی کر لیا کرتی تھی۔ حریم کے آنے والے کل اور اس کی تعلیمی ضروریات کے لیے اس کے پاس ابھی سے پیسے جمع ہونے شروع ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک دو کمیٹیاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ اس کا بوجھ بانٹنے کو اس بچی کا باپ اس کے ساتھ کہیں نہیں تھا۔ ایسی غیر معمولی اور شاندار کوئی ڈگری اس کے پاس نہیں تھی کہ اسے کہیں کسی ایگزیکٹو پوسٹ پر جاب مل جاتی۔ ذہین بہت تھی مگر ہاتھ میں صرف ایک بی ایس سی کی ڈگری تھی۔ مزید یہ کہ کسی بڑے تعلیمی ادارے کے نام اور مہر سے آراستہ اسناد جو ہر بڑی فرم کا دروازہ اس پر کھول دیتے' اس کے پاس نہ تھے۔ وہ روزانہ صبح سے شام تک آفس میں اور شام سے رات تک گھر آ کر ٹیوشنز میں بے تحاشا محنت کرتی تھی' تب کہیں جا کر اتنے پیسے کما پاتی تھی کہ اپنی بیٹی کو اچھا لباس' اچھی خوراک اور اچھی تعلیم فراہم کر سکے۔

اس کا خواب تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو بہت اچھی اور بہت اعلا تعلیم دلائے گی۔ اتنی اچھی کہ کل خدا نہ کرے زندگی اسے کسی آزمائش میں ڈالے تو وہ کسی اشعر حسین کے ٹھکرا دینے پر در بدر نہ ہو۔ اور اب زندگی اس کے لیے ایک بار پھر نئی آزمائش لیے چلی آئی۔ اس کی بیٹی بہت شدید بیمار پڑ گئی تھی اور اس کی بیماری کی وجہ بھی وہ خود ہی تھی۔ پریگننسی کے دوران اس کی گری صحت' مشکلات' اور غموں کے باعث اس کی بیٹی پری میچور اور بہت زیادہ کمزور اور بیمار پیدا ہوئی تھی۔

اشعر حسین کے گھر سے رسوا ہو کر نکلنے کے بعد وہ اس بڑے شہر سے نکل کر واپس اپنے اسی چھوٹے سے شہر میں لوٹ آئی تھی' جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ ایک کرائے کے مکان سے یہاں سے گئی تھی۔ تو اب جب ماں باپ تھے' نہ ان کا چھوڑا کوئی مکان۔ میکے کے نام پر ایک جھونپڑی جتنا آسرا بھی اسے میسر نہیں تھا مگر دنیا میں جہاں بہت برے لوگ موجود ہیں' وہیں بہت اچھے لوگ بھی ہیں۔ یہاں اس کے اپنے اس شہر میں محدود آمدنی میں انتہائی سادہ اور بہت عام سی لوئر مڈل کلاس زندگی گزارتے وہ چند سادہ و مخلص لوگ بھی اللہ نے اسے عطا کر دیے تھے جو اس کٹھن وقت میں اس کے کام آئے تھے۔

اس کی شادی سے قبل ان کے پڑوس میں رہنے والی بتول بانو جن کا خاندان اور اس کے بابا کا خاندان تقسیم سے قبل انڈیا میں ایک ہی محلے میں برسوں ساتھ رہتے آئے تھے اور تقسیم کے وقت ایک ساتھ ہی ہجرت کی تھی اور پھر بعد میں ایک ساتھ ہی نواب شاہ میں ایک ہی محلے میں رہائش اختیار کی تھی۔ رشتے داری کوئی نہیں تھی مگر تعلق سگے رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر تھا۔ خونی رشتہ کوئی نہیں تھا مگر وہ اس کے بابا کے لیے ان کی سگی بہن ہی کی طرح تھیں۔ اس کے بابا کے بعد انہوں نے بابا کے قائم کیے اس رشتے کی ہمیشہ لاج رکھی۔ ہمیشہ اس کا اور اس کی امی کا سگے عزیزوں ہی کی طرح خیال رکھا۔ وہ بابا کی بہن بنی تھیں مگر اس کی امی کو بھی انہوں نے ہمیشہ چھوٹی بہنوں ہی کی طرح چاہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بابا کے انتقال کے بعد تنہائی اور اکیلے پن کے خوف سے نمٹنے کے لیے اس کی امی نے اپنے پرانے محلے کو چھوڑ کر بتول بانو کے پڑوس میں رہائش اختیار کر لی۔ انہوں نے جو اسے بہت برے حالوں میں اجڑا' بکھرا یہاں واپس آتے دیکھا تو ایک ماں ہی کی طرح بنا کچھ کہے بڑی محبت سے اپنے گھر اور دل کے دروازے خرد کے لیے وا کر دیے۔ جب تک حریم پیدا نہیں ہوئی' وہ واقعی ان کے گھر مفت خوروں کی طرح پڑی رہی تھی۔ بتول بانو جنہیں وہ بتول خالہ کہا کرتی تھی' اس کا بہت خیال رکھتی تھیں ان بے چاری کے خود کون سے بہت اچھے حالات تھے جو اسے کوئی غیر معمولی اور اچھی خوراک مہیا کر پاتیں۔ اسے کسی اچھی گائنا کولوجسٹ کے پاس لے جاسکتیں۔ اسے وہ عمدہ خوراک' وہ دوائیں وغیرہ فراہم کر پاتیں جو اس کے اور اس کے ہونے والے بچے کی صحت' تندرستی اور زندگی کے لیے درکار تھیں اور اگر مہیا ہوتیں بھی تو بھی جو ذلت وہ سہہ رہی تھی' اس کے ہوتے وہ خوراک اور قوت بخش ادویات کیسے اس کے حلق سے اتر سکتی تھیں۔ کیسے اسے صحت اور توانائی فراہم کر سکتی تھیں۔ اسے تو گھر کی سادہ دال، روٹی بھی حلق سے اتارنی مشکل ہوتی تھی۔ اس کا کچھ کھانے کو تو کیا زندہ رہنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔

اپنی اس کمزور و لاغر بچی کو جنم دیتے وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ قبل از وقت پیدا ہوئی اس کی بچی زندہ رہ بھی پائے گی یا نہیں، یقین سے کہنا مشکل تھا۔ حریم کے پیدا ہونے سے قبل کا ہر لمحہ اس نے دروازے پر نظریں جمائے، کسی آنے والے کی آہٹیں سننے کی آس میں گزارا تھا، مگر جس روز اس کی بچی پیدا ہوئی وہ اکیلے موت سے لڑی۔ تب اس درد اور اذیت سے تنہا لڑتے صرف اس کا انتظار ہی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اشعر حسین کے لیے اس کے دل میں موجود محبت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ اگر وہ آج اس کے ساتھ نہیں تو پھر اب زندگی کے کسی موقع پر وہ ہوتا ہے یا نہیں، کیا فرق پڑتا ہے۔

اگرچہ کہ اس کی یہ سوچ بے معنی ہی تھی، وہ اس کے پاس کبھی بھی آنے والا نہیں تھا، وہ اسے دھتکار چکا تھا۔ یہ تمام کڑوی سچائیاں اپنی جگہ لیکن اب اگر کسی وقت وہ خود چل کر بھی اس کے پاس آتا تو اب وہ ظالم، سفاک، متکبر انسان اسے قبول نہیں تھا۔ اس نے اس کا نسوانی غرور، اس کا اپنی ذات پر مان، فخر سب چھین لیا تھا۔ وہ اس شخص کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔

اس شخص کے ظلم کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں وہ تنہا اپنی کمزور سی بیٹی کو لیے پڑی تھی۔ وہ بچی جس کا باپ ایسے کتنے سرکاری اسپتالوں میں لاکھوں روپے پابندی سے بطور چندہ دیا کرتا تھا، اپنی ماں کے برابر کسمپرسی کی حالت میں پڑی ٹکر ٹکر اس ظالم دنیا سے پہلا تعارف حاصل کر رہی تھی۔

وہ اپنی بچی کے نصیبوں پر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ کل یہ بچی بڑی ہوگی، تب وہ اس سے کیا کہے گی، اسے اس دکھ بھری ذلت سے کیونکر بچا پائے گی۔ جب تک حریم پیدا نہیں ہوئی تھی، تب تک اس کی کیفیات کچھ اور تھیں، مگر حریم کی پیدائش کے بعد اب اسے اپنے اور اپنی بچی کے آنے والے کل کو پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنا تھا۔ جتنے مہینے بتول بانو اور ان کے اہل خانہ نے اسے اپنے گھر میں مہمان بنا کر رکھا، اتنے دن کوئی کسی کو نہیں رکھتا۔ بتول بانو تو خیر اس سے محبت کرتی تھیں، مگر ان کے گھر کے باقی افراد بھی برسوں پرانے تعلقات کا لحاظ کرتے جس طرح اسے اپنے گھر میں برداشت کر رہے تھے، ایسے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی وقت بتول بانو کی کسی بہو کے ماتھے پر اپنے لیے ناگواری کی شکن نظر بھی آتی تو اس کے لیے وہ انہیں ہرگز بھی قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ شوہروں کی لگی بندھی تنخواہ اور محدود آمدنی میں ایک اضافی مہمان کا بوجھ آخر مزید کتنے دنوں تک اٹھایا جا سکتا تھا۔

اس لحاظ کے ختم ہونے اور کسی کے بھی نگاہ بدلنے سے پہلے اسے اپنی اور اپنی بچی کی زندگی کے بارے میں سوچنا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش ہو یا نہیں مگر اسے اپنی بیٹی کے لیے زندہ تو رہنا تھا اور اس ننھی سی بچی کو زندگی کی ہر بنیادی چیز کی ضرورت تھی۔

اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی اور بتول بانو کے گھر مفت رہنے کے بجائے ان ہی کے گھر کے ایک نسبتاً الگ سے کمرے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہنے لگی تھی۔ وہیں اس اسکول میں ملازمت کے دوران اس کی افشین سے دوستی ہوئی تھی۔

اس کا بیٹا خرد کی کلاس میں پڑھتا تھا اور بیٹے کو اسکول چھوڑنے، لینے آنے اور پیرنٹس میٹنگ وغیرہ کے دوران ہی دھیرے دھیرے وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ خرد سے عمر میں چار، پانچ سال بڑی وہ لڑکی بہت مخلص اور سادہ مزاج کی تھی۔ وہ گھر کے اخراجات میں شوہر کا ہاتھ بٹانے اور تعاون کرنے کے لیے خود بھی ملازمت کرتی تھی۔

بتول بانو کے بعد افشین ہی وہ واحد ہستی تھی جو ہر مشکل میں اس کی مدد کے لیے تیار رہا کرتی تھی۔

اسے لگتا تھا زندگی میں جتنی آزمائشیں آنی تھیں، آ چکیں۔ جتنے امتحان آنے تھے آ چکے۔ اب وہ اور اس کی بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پوری زندگی ہنسی خوشی گزار لیں گے۔ مگر نہیں، زندگی کے ترکش میں خرد احسان کو آزمانے کے لیے ابھی کئی تیر موجود تھے۔ حریم پونے تین سال کی ہونے والی تھی جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی محنت اور کوششوں کی بدولت حریم کا وزن اپنی عمر کے لحاظ سے بڑھنے تو لگا ہے، وہ بظاہر تندرست بھی لگتی ہے مگر بظاہر کسی بیماری کے نہ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں کسی بھی کام کو کرتے جلدی تھک جاتی ہے۔ تھوڑی سی دیر کھیلنے یا بھاگنے سے ہی اس کی سانس بری طرح پھول جاتی۔ کافی دیر تک پھر اس کی سانس ہموار نہ ہو پاتی۔ ''اس کی بیٹی پیدائشی طور پر بہت کمزور ہے، باقی کوئی مسئلہ نہیں۔'' خود کو یہ اطمینان دلاتے اس نے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کی خوراک اور آرام کا خیال رکھنا شروع کر دیا، مگر تھوڑے ہی دنوں میں صرف بھاگنے اور کھیلنے کودنے ہی سے کیا حریم زندگی کے دوسرے کاموں سے بھی اسی طرح بہت جلد تھکنے اور نڈھال ہونے لگی۔ تب اسے حقیقتاً تشویش لاحق ہوئی۔

بری طرح پریشان ہوتے وہ فوراً ہی حریم کو لے کر ایک اچھے چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس پہنچی۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کروائے،

دوائیں دیں۔اس نے وہ دوائیں حریم کو استعمال کروانی شروع کردیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ڈاکٹر نے چند وزٹس کے بعد اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی اچھے کارڈیالوجسٹ کو دکھائے۔وہ ڈاکٹروں کے منہ سے یہ بات سنتے ہی کانپ گئی تھی۔وہ ایک کارڈیالوجسٹ کے پاس حریم کو لے کر پہنچی تھی۔انہوں نے حریم کا تفصیلی چیک اپ کرنے اور ای سی جی، چیسٹ ایکسرے، ایکو، ایکسرسائز ٹیسٹنگ وغیرہ سے لے کر کئی طرح کے بلڈ ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد جو انتہائی خوفناک خبر اسے سنائی، وہ یہ تھی کہ اس کی بیٹی کے دل میں پیدائشی طور پر ایک نقص موجود تھا۔

وہ یہ سنتے ہی کانپ کر رہ گئی تھی۔اس کارڈیالوجسٹ نے حریم کو کراچی کے کسی اچھے کارڈیالوجسٹ کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔یہاں بچوں میں دل کے امراض اور خاص طور پر پیدائشی دل کے امراض کے علاج کے لیے وہ تمام سہولیات موجود نہیں تھیں جو اسے کراچی میں کسی بڑے ہاسپٹل میں مل سکتی تھیں۔وہ اس شہر میں کیسے جائے گی، کہاں رہے گی، کیا کرے گی، اس کی پریشانی اور بے بسی دیکھ کر افشین اس کے ساتھ کراچی آئی تھی۔غیر شادی شدہ بہن اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتی تھیں۔وہ سب ٹیسٹ جو وہاں جدید سہولیات کی عدم دستیابی کے سبب ہونے سے رہ گئے تھے، وہ سب یہاں ہوئے تھے اور ان تمام کی رپورٹس دیکھنے کے بعد کارڈیالوجسٹ نے جو بات بتائی وہ اس کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھی۔اس کی بیٹی کے دل کا نقص ایسا تھا کہ سرجری کے علاوہ اس کا دوسرا اور کوئی علاج نہیں تھا۔وہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔اس نے کوئی دعا اور کوئی منت نہ چھوڑی تھی کہ اس کی بیٹی کے دل کی چیر پھاڑ کی نوبت ہی نہ آئے۔اللہ کچھ ایسا معجزہ کردے کہ بغیر سرجری کے صرف دواؤں ہی سے اس کی بیٹی تندرست ہوجائے۔

وہ حریم کی بیماری کا الزام خود کو دے رہی تھی جو بات اسے حریم کے تین، سوا تین سال کا ہونے پر پتا چلی، وہ اس سے قبل کیوں نہ پتا چل پائی۔اس کی بیٹی پیدائشی طور پر ایک نقص لیے بیمار دل کے ساتھ زندہ تھی اور وہ اس کی ماں ہو کر اس بات سے لاعلم تھی۔

اس کے نواب شاہ سے کراچی اور کراچی سے نواب شاہ مسلسل چکر لگ رہے تھے۔ریحانہ کا گھر یہاں اس کی عارضی قیام گاہ تھا۔اس کی جاب متاثر ہو رہی تھی۔اس کے پاس بینک میں جمع شدہ رقم تیزی سے ختم ہو رہی تھی مگر زندگی میں بہتری کے کہیں کوئی آثار پیدا ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔پہلی مرتبہ اس نے آپریشن کے اخراجات کی بابت ڈاکٹر سے استفسار کیا۔کراچی آنے کے ان چکروں اور کارڈیالوجسٹ کے پاس متواتر وزٹس اور ٹیسٹوں اور ادویات جیسے ان عام میڈیکل اخراجات ہی نے اسے نڈھال کر دیا تھا تو پھر ہارٹ سرجری، اچھے ڈاکٹروں تک رسائی اور بہترین علاج؟

''کسی بھی Congenital Heart Defect کی سرجری صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی اتنی ہی مہنگی ہے۔''

اسے اس آپریشن پر آنے والے خرچ کے بارے میں بتاتے ہوئے کارڈیالوجسٹ نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا تھا۔

اب تک تو صرف بیٹی کی صحت کی فکر تھی، صرف یہی پریشانی تھی کہ اس کی بیٹی کب اور کیسے ٹھیک ہوگی۔تو اب یہ سوچ کر ہوش گم

ہو رہے تھے کہ اس سرجری کے لیے درکار اتنی خطیر رقم وہ لائے گی کہاں سے؟ بتول بانو جتنی بھی اچھی اور محبت کرنے والی ہوں مگر ان بے چاری کے حالات تو ایسے بھی نہیں تھے کہ وہ چند ہزار روپے بھی کسی کو ادھار دے سکیں اور افشین جو اس سے بہت مخلص اور بہت محبت کرنے والی دوست تھی، اتنی خطیر رقم اسے ادھار دینا اس کی استطاعت سے بھی باہر تھا۔

آفس سے مدد ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حریم کی بیماری اور پھر اسے ڈاکٹروں کے پاس کراچی لانے لے جانے میں اس کی آفس سے جتنی زیادہ چھٹیاں ہونے لگی تھیں، اس پر جو کچھ اسے اپنے منیجر سے سننے کو ملتا تھا، وہ یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ اس کے مالکان اس کی کارکردگی سے ناخوش ہیں۔ اس کی بیٹی کی بیماری ان کا مسئلہ نہیں۔ انہیں اس سے وہی سو فیصد کارکردگی چاہیے۔ جو وہ پہلے دیتی رہی ہے۔

☆......☆......☆

''تم اشعر سے کیوں نہیں مل لیتیں۔ اس سے ملو اور کہو کہ یہاں وہاں چیریٹی میں واہ واہ کروانے کے بجائے اپنی بیٹی کے علاج کے لیے پیسے دے۔ جو فرض ہے پہلے وہ تو ادا کرلے، ان نفلی عبادات کا نمبر تو بہت بعد میں آئے گا۔''

اس کی پریشانی اور بے بسی دیکھ کر افشین نے ایک روز اسے یہ مشورہ دیا تھا۔

''اشعر؟'' اس نے طنزیہ حیرت سے افشین کو دیکھا۔ ''وہ حریم کو اپنی اولاد نہیں مانتا تو اس کے علاج کے لیے۔''

افشین نے بے ساختہ اس کی بات کاٹی اور سنجیدگی سے بولی۔ ''بیوی کے پریگنٹ ہونے کی اطلاع پانے میں اور اولاد وہ بھی بیٹی کے وجود سے آشنا ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے خرد!''

''ہاں مگر تب جب انسان بیٹی کو اپنی اولاد مانتا ہو۔ جب میں اس کے ساتھ دن، رات رہتی تھی، تب اسے قابل اعتبار نہ لگی تھی تو اب جب ساڑھے چار سال اس سے بالکل دور گزار دیے ہیں۔ کیا اب وہ میرا اعتبار کرے گا؟''

''تم کوشش تو کرو۔''

''کیا کوشش کروں افشین انسانیت سے عاری اس بے رحم اور ظالم انسان کے در پر پھر پہنچ جاؤں۔ اس سے رحم کی بھیک مانگوں؟''

''تم اس سے رحم کی بھیک نہیں مانگو گی خرد تم اس سے حریم کا وہ حق مانگو گی جو اسے دینا اس کے باپ پر فرض ہے۔'' افشین رسانیت سے اسے سمجھا رہی تھی جب کہ وہ چہرے پر ناگواری اور غصے کے تاثرات لیے بیٹھی تھی۔

''وہ اگر انکار بھی کردے، تب بھی کل تمہارے پاس یہ پچھتاوا تو نہیں رہے گا۔''

افشین کے سمجھانے پر اس وقت وہ بالکل چپ رہی تھی۔

مگر جب پیسوں کا بندوبست ہوتا کہیں سے بھی کسی بھی طرح نظر نہ آیا تو پتا چلا اب جو آخری رستہ بچا ہے، وہ سیدھا اشعر حسین تک

پہنچتا ہے۔حریم اس کی کل کائنات تھی۔وہ یہ آخری کوشش اپنی زندگی کے لیے، اپنی کائنات کے لیے اپنی بیٹی کے لیے، اپنی حریم کے لیے کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

اس کے آفس میں گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا۔رات ہو چکی تھی مگر اسے وقت کا کوئی احساس نہیں تھا۔دفتر کب کا بند ہو چکا تھا۔سب اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

شام ساڑھے چھ بجے اس کی سیکریٹری اور پھر پیون اس کے آفس میں آئے تھے اور اس نے دروازے پر سے ہی انہیں لوٹا دیا تھا۔

اس کا پورا وجود جیسے کسی نے جلتے الاؤ میں اٹھا کر ڈال دیا تھا۔بالآخر رات دو بجے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔اس کی میز پر خرد احسان کی رکھی گئی وہ فائل اور اس فائل کے نیچے دبی وہ تصویر اور چند کاغذات سب کچھ یونہی ان چھوئے پڑے تھے۔اس نے ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔وہ مرے مرے قدموں سے چلتا اپنے آفس سے باہر نکلا۔رات دو بجے پورا فلور ہی کیا، پوری بلڈنگ ویران ہو رہی تھی۔سوائے وہاں موجود سیکورٹی گارڈز کے کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

وہ گاڑی میں آ کر بیٹھا تو گاڑی اسٹارٹ کرتے اس کی نظر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑی۔اپنی بے تحاشا سرخ ہوتی آنکھوں میں اسے وحشت ہی وحشت بھری نظر آئی۔یہ وحشت صرف اس کی آنکھوں میں نہیں، اس کے پورے وجود بلکہ اس کی زندگی میں سرایت کر چکی تھی۔آج سے نہیں ساڑھے چار سالوں سے۔اس کی آنکھوں میں چھائی یہ وحشت اس وقت کوئی دیکھ لیتا تو بری طرح ڈر جاتا۔

اس کا اپنے گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔وہ بے مقصد یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہنا چاہتا تھا، وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد سے ملنا، بات کرنا نہیں چاہتا تھا، مگر پھر بھی اس نے گاڑی اپنے گھر کے ہی راستے پر ڈالی ہوئی تھی۔اس گھر میں اس کی ایک ماں بھی تھیں جو پچھلے کئی گھنٹوں میں اسے کئی بار فون کر چکی تھیں۔وہ اس کے لیے پریشان تھیں۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ طویل روش کو عبور کرتا گھر کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا تو دروازہ کھلنے کی آواز پہلے ہی سنائی دے گئی۔سامنے ہی وہ کھڑی تھیں۔اس کی گاڑی کے اندر آنے کی آواز سن کر وہ ادھر آ گئی تھیں۔ان کے چہرے پر پریشانی بکھری ہوئی تھی۔وہ خود کو کاموں میں غرق کر کے اکثر پوری پوری رات آفس میں گزار دیا کرتا تھا مگر یوں کہ آفس میں بیٹھے ان کی کوئی کال بھی ریسیو نہ کرے، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔وہ روزانہ اپنی دوائیں کھا کر رات کو جلدی سو جاتی تھیں مگر اس وقت شدید پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا اشعر! سب خیریت تو ہے؟'' تم کہاں تھے؟ میں رات گیارہ بجے سے تمہارے موبائل پر اتنی بار کال کر چکی ہوں۔تمہیں آفس میں بھی کال کی، تم کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟''

انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''کچھ نہیں ہوا ممی! کچھ پرانے دوست مل گئے تھے۔ان کے ساتھ تھا۔'' وہ ان کے باقی تمام سوالوں کو نظر انداز کر کے سیدھا اندر داخل ہوا۔وہاں ایک پل بھی ٹھہرے بغیر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

فریدہ اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ ماں کا بے چینی سے اپنے پیچھے آنا محسوس کر رہا تھا مگر وہ ان کی کوئی بھی بات سننے کے لیے رکا ہرگز نہیں۔اور تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا۔اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر ایک سگریٹ سلگائی۔ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری۔باقی رہ جانے والی رات کے یہ چند گھنٹے اس نے ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتے گزاری تھی۔

☆......☆......☆

''سوری ممی! رات آپ میری وجہ سے پریشان ہوئیں۔اصل میں رات ایک بزنس ڈنر میں گیا تھا' وہاں پر کچھ پرانے دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی۔موبائل غلطی سے گاڑی میں بھول گیا تھا اور دوستوں سے باتوں میں مجھے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی ہے۔آپ گھر پر پریشان ہو رہی ہوں گی اور مجھے کال کر رہی ہوں گی۔اتنے دنوں بعد ملے تھے نا تو بس پرانے قصے کہانیوں کو دہراتے وقت کا احساس ہم میں سے کسی کو ہوا ہی نہیں۔''

صبح ناشتے کی میز پر وہ فریدہ سے کہہ رہا تھا۔زندگی میں جو آزمائشیں اس کے نام تھیں' ان میں اس کی ماں کا کیا قصور تھا۔وہ جانتا تھا' کہ زندگی سے اس کی یہ دوری' یہ بے رغبتی انہیں کتنا دکھی کرتی ہے۔مگر وہ مجبور تھا۔

معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے کل رات کے رویوں کی وضاحت کرتے اس نے فریدہ کو دیکھا' ان کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ انہیں اس کے کسی جھوٹ پر یقین نہیں آیا ہے۔

''ساڑھے چار سال ہوگئے ہیں اشعر! بہت ہوگیا بیٹا اور کتنا خود کو برباد کرو گے اس کے پیچھے؟ تمہاری زندگی کی یہ ویرانی' یہ اجڑا پن مجھ سے نہیں دیکھا جاتا بیٹا۔'' وہ دکھ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اسے بھول جاؤ' اس سے وابستہ اس ماضی کو بھول جاؤ۔زندگی ختم نہیں ہوئی۔''

وہ ٹوسٹ واپس پلیٹ میں رکھ کر ایک دم ہی کرسی سے اٹھ گیا۔وہ اپنی ماں کا اکلوتا اور بہت لاڈلا بیٹا ہے' وہ اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا دیکھنا چاہتی ہیں۔وہ اسے یوں خود کو برباد کرتا نہیں دیکھ سکتیں۔یہ سب وہ جانتا تھا مگر خرد احسان ...... یہ وہ موضوع تھا جس پر وہ اپنی ماں تک سے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔وہ کتنی ہی بار کبھی پیار سے' کبھی لجاجت اور کبھی منت تک سے بھی اسے سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کر چکی تھیں کہ وہ زندگی کو نئے سرے سے جینا شروع کرے' وہ شادی کر لے مگر ادھر وہ یہ بات شروع کرتیں اور ادھر وہ ان کی پوری بات سنے بغیر کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا جاتا۔

''اشعر! ناشتہ تو پورا کر لو بیٹا!''

اس کا توسٹ' انڈا' چائے کا کپ سب کچھ یونہی پڑا تھا۔فریدہ بیٹے کو گھر سے ناشتہ کیے بغیر جاتا دیکھ کر بری طرح بے چین ہو رہی تھیں۔اشعر' خرد کا نام بھی کسی قیمت پر سننا گوارا نہیں کرتا یہ بات وہ جانتی تھیں مگر کل رات پونے تین بجے جس حالت میں انہوں نے اشعر کو گھر واپس آتے دیکھا اور پھر باقی رات اس کے کمرے کی جلتی لائٹ کو دیکھتی رہی تھیں۔اس نے انہیں سخت مضطرب کیا تھا۔

وہ ماں تھیں اور بیٹے کی زندگی کی یہ ویرانی اور اس کی یہ خود اذیتی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

''میں ناشتہ کر چکا ممی!'' ان کے پکارنے پر مڑے بغیر اس نے جواب دیا اور پھر تیزی سے ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔آفس جانے والے راستے پر گاڑی دوڑاتے وہ اپنی ماں کو ہی سوچ رہا تھا۔وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اسے ذلتیں بخشنے والی وہ عورت جس نے اس کا انسانوں پر سے اعتبار ہی اٹھا دیا ہے۔کل کس بے خوفی اور ڈھٹائی سے اس کے آفس میں اس کے روبرو آ کر کھڑی ہوئی تھی۔وہ پچھلی زندگی کی بات کرتی ہیں اور وہ عورت تو آج اس کی زندگی میں مزید نجانے کیا تباہی اور کیا ذلت لانے پھر چلی آئی ہے۔

☆......☆......☆

بورڈ روم میں اس سمیت کمپنی کے تمام ڈائریکٹرز' سینئر مینجمنٹ اور ایگزیکٹو موجود تھے۔کمپنی کی فنانشل اسٹریجی کے حوالے سے یہ میٹنگ اس کی بلائی ہوئی تھی۔میٹنگ سے سات روز قبل اس نے تمام ڈائریکٹرز مینجمنٹ اور ایگزیکٹو کو اس کا ایجنڈا بھجوا دیا تھا اور اب اپنی ہی بلائی ہوئی اس میٹنگ میں تمام ڈائریکٹرز اور ایگزیکٹو کے چہروں کو بے دھیانی سے دیکھتا وہ یہ بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج کی اس میٹنگ کا ایجنڈا کیا ہے۔وہ ایک بہت اچھا اور کامیاب کانفرنس لیڈر تھا۔کسی بھی میٹنگ اور کانفرنس میں ڈسکشن کس سمت میں اور کتنی رفتار سے آگے بڑھنا چاہیے' اس چیز پر اس کا مکمل کنٹرول رہتا تھا۔وہ کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیتا کہ اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت ملی ہے۔اس کی بات اور اس کے مشوروں کو باقی سب پر ترجیح دی گئی ہے اور نہ کسی کو یہ احساس ہونے دیتا کہ وہ کسی دوسرے کے مقابلے میں نظرانداز کیا گیا ہے۔مگر آج اس کا دھیان کسی بھی طرف نہیں تھا۔رضوان ہمدانی چارٹس اور گرافکس کی مدد سے نجانے اسے اور باقی سب کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اپنی آنکھیں بے توجہی سے اس پر مرکوز کیے اسے پریزنٹیشن دیتے دیکھ رہا تھا۔اس کے ذہن پر کل اپنے آفس میں تماشا کرنے والی وہ عورت اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکنے والی اپنی خاموشی' اپنی بے غیرتی طاری تھی اس کے علاوہ اور کوئی بات اس کا ذہن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔اسے نیند آ رہی تھی مگر وہ جان بوجھ کر کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھا کچھ زبردستی کا نکالا ہوا غیر اہم سا کام کر رہا تھا۔وہ روز کی طرح بیڈ پر ایک میگزین لے کر بیٹھی۔اس کے اوراق پلٹ رہی تھی۔روز یہی سب ہوتا تھا' اس لیے وہ جانتا تھا کہ وہ میگزین پڑھ نہیں رہی ہوتی بلکہ کمرے کی لائٹ بند ہونے کا انتظار کیا کرتی ہے تاکہ سونے کے لیے لیٹ سکے۔ایک مہینے کی اپنی اس شادی شدہ زندگی میں خود سے سوائے چند انتہائی مختصر جملوں کے کوئی بات نہ کرنے والی اس کی یہ گونگی بیوی اس کی برداشت کا امتحان تھی۔

وہ گونگی' مٹی کی مادھو ٹائپ ایسی لڑکی تھی کہ اکثر اوقات اس پر شدید قسم کی کوفت طاری ہو جاتی۔ آخر وہ کس قسم کی لڑکی تھی' باپ کی خاطر اس نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا لیکن ایک دم ہی اس انجان لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت میں قبول کرنا' اسے اپنے بیڈ روم میں صبح' شام دیکھنا' وہ اس چیز کو دل سے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ حقوق و فرائض سارے ادا ہو رہے تھے مگر ان لمحات کے سوا باقی اوقات میں اس کے ساتھ بیٹھنا' وقت گزارنا' باتیں کرنا' اس کے ساتھ کہیں باہر آنا جانا' وہ ابھی اس سب کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پایا تھا۔

صبح سے شام تک وہ آفس میں مصروف ہوتا تھا اور اس کے بعد بھی فوراً گھر آنے کے بجائے جم چلا جاتا۔ کبھی سوئمنگ' کبھی ٹینس' کبھی دوستوں کے ساتھ یونہی گپ شپ۔ اس زبردستی کی شادی سے پہلے بھی اس کی یہی مصروفیات تھیں اور اب بھی اس نے اپنی مصروفیات تبدیل نہیں کی تھیں۔ پہلے بھی رات کا کھانا اگر باہر کہیں مدعو نہ ہوتا یا دوستوں کے ساتھ کوئی اور پروگرام نہ ہوتا تو وہ گھر پر ماں' باپ کے ساتھ ہی کھانا پسند کیا کرتا تھا۔ اب بھی رات کا کھانا زیادہ تر وہ گھر پر کھایا کرتا تھا اور صبح کے بعد رات کے کھانے کے وقت ہی اس کی اپنی نئی نویلی بیوی سے ملاقات ہوا کرتی تھی جس میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

اس کی آواز' اس نے بہت ہی کم سنی تھی۔ وہ باقی وقتوں کی طرح کھانے کے وقت بھی چپ بیٹھی رہتی۔ بصیرت حسین اس سے باتیں کرتے رہتے' جس بات کے جواب کی ضرورت ہوتی' وہ اس کا جواب دیتی' ورنہ خاموشی سے محض مسکرانے پر اکتفا کرتی۔ وہ اس کی بیوی تو بنادی گئی تھی مگر ایک چھوٹے سے شہر کی اس انیس بیس سالہ کی لڑکی کی سوچ اور خیالات بھلا کس سطح کے ہو سکتے تھے۔ ایک محدود سوچ اور معمولی ذہنی سطح کی لڑکی اس کی بیوی بنادی گئی ہے۔ اس سے کسی گفتگو کے نتیجے میں یہ تلخ حقیقت جاننے سے کہیں بہتر یہ تھا کہ وہ کمرے میں آنے کے بعد سونے سے پہلے اپنے لیے کوئی نہ کوئی دلچسپی ڈھونڈ لے۔ بیڈ روم میں آنے کے بعد وہ بجائے اس کی طرف متوجہ ہونے کے کبھی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا' کبھی ٹی وی پر اپنی پسند کا کوئی پروگرام دیکھنے لگتا' کبھی کسی دوست سے فون پر گپ شپ کرنے لگتا' کبھی کمپیوٹر پر آفس کا کوئی ادھورا کام اور کبھی یونہی نیٹ پر وقت گزاری کرتا۔ اگر صرف اس کے ظاہر کی بات کی جاتی تو وہ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی تھی۔ حالانکہ بالکل سادہ رہا کرتی تھی۔ لباس بے شک عمدہ اور فیشن کے مطابق پہنتی تھی مگر میک اپ اور جیولری سے بے نیاز رہتی تھی۔ اس کے گہرے سیاہ بال جن کی وہ چوٹی گوندھے رکھتی تھی' بہت لمبے اور بہت گھنے تھے۔ ان بالوں کی نرماہٹ اس نے محسوس کی تھی اور جب کبھی وہ نہا کر نکلتی' تب انہیں کھلا ہوا بھی دیکھا تھا۔ کم از کم اپنے جاننے والوں میں اس نے اتنے لمبے اور خوب صورت بال کسی لڑکی کے نہیں دیکھے تھے اس کا قد دراز اور سراپا انتہائی متناسب تھا مگر یہ سب چیزیں انسان کو وقتی طور پر تو آسودہ کر سکتی ہیں مگر ان کے سہارے زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی۔

وہ اپنی بیوی کو اپنے جیسی ذہنی سطح کا حامل دیکھنا چاہتا تھا جس کے ساتھ وہ اپنی سوچیں' اپنے خیالات سب کچھ شیئر کر سکے اور یہ کم عمر سی ڈری سہمی لڑکی کسی بھی طرح ایسی نہیں لگتی تھی۔ اگر وہ ضرورت سے ہٹ کر اس سے کوئی فالتو بات نہیں کرتا تھا تو وہ بھی اسے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ وہ جتنی دیر ٹی وی' کتاب' کمپیوٹر یا ٹیلی فون پر مصروف رہتا' وہ اتنی دیر بیڈ پر جس طرف وہ لیٹا کرتی تھی' اس طرف بیٹھ کر میز پر رکھے میگزینز میں سے کوئی سا میگزین اٹھا کر اس کے اوراق پلٹتی رہتی۔ وہ جو بھی کام کر رہا ہوتا جیسے ہی اسے ختم کر کے لائٹ بند کرنے اٹھتا' وہ بھی

فوراً ہی میگزین بند کر کے سونے لیٹ جاتی۔ کتنی بار اس نے دیکھا کہ وہ میگزین کے صفحے پلٹتے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائیاں روک رہی تھی' اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوتی مگر اسے شدید ترین کوفت کا احساس ہوتا کہ اس نے کبھی ایک بار بھی اس سے یہ نہیں کہا کہ ''لائٹ بند کر دو' مجھے نیند آ رہی ہے۔''

مٹی کی مادھو بنی' گم صم بالکل چپ وہ ایسے بیٹھی رہتی کہ اسے اس کی اس مظلومانہ سی چپ سے شدید چڑ ہونے لگتی۔ اس نے چڑ کر کمرے کی لائٹ کسی نہ کسی بے مقصد کام کو طول دے کر مزید دیر تک جلائے رکھنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ایک رات جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ لیٹر پیڈ اور قلم ہاتھ میں لیے شاید کسی کو خط لکھ رہی ہے' تب صرف اسے بولنے پر اکسانے کے لیے اس نے انتہائی بدتمیزی کا ثبوت دیتے ہوئے کھٹاک سے لائٹ بند کی اور بے نیازی سے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ تب بجائے اس کی اس بدتمیزی پر اسے کچھ کہنے کے اس نے خاموشی سے لیٹر پیڈ اور قلم سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے اور خود بھی فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی اور اس رات اسے حقیقتاً اس لڑکی پر شدید غصہ آیا تھا۔

خوشی سے یا ناخوشی سے' بہر حال وہ اسے اپنی بیوی بنا چکا تھا مگر جسے اس نے اپنی بیوی بنایا' وہ اتنی بے چاری قسم کی دبو اور احساس کمتری میں مبتلا لڑکی تھی کہ اسے اپنے حقوق کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اگر تھی تو انہیں حاصل کرنے کا اعتماد پاس نہیں تھا۔ حدود سے تجاوز کرتی مگر اپنی مشرقی اقدار کے اندر رہتی بولڈ اور کونفیڈنٹ لڑکیاں اسے متاثر کرتی تھیں۔ یہ گم صم' احساس کمتری میں مبتلا لڑکی اس کے کسی بھی معیار پر تو پوری نہیں اترتی تھی۔

اس کی اپنی کوئی مرضی' کوئی خواہش جیسے تھی ہی نہیں۔ وہ رات میں اس کی طرف متوجہ ہو تو ٹھیک' وہ لیٹتے ہی کروٹ دوسری طرف کر کے سو جائے تو بھی ٹھیک۔ اس کے بڑھے ہاتھ کو اس نے کبھی جھٹکا نہیں تھا اور خود سے کبھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ برابری کے درجے پر رکھتا' برابری کی سطح پر کھڑا کرتا مگر سامنے والا اس برابری کی خواہش تو ظاہر کرتا۔

☆......☆......☆

ان کی اس عجیب و غریب اور ابنارمل شادی شدہ زندگی کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ جب اس رات اس پر ایک انتہائی مختلف قسم کا انکشاف ہوا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ باہر ڈنر کر کے آج رات روزانہ سے کچھ دیر سے آیا تھا۔ فریدہ کسی پارٹی میں گئی ہوئی تھیں۔ البتہ بصیرت حسین گھر پر تھے وہ باپ سے ملنے ان کے کمرے میں آیا تو اندر سے آتی اپنی گونگی بیوی کی آواز اور گفتگو میں اپنا ذکر سن کر وہ ٹھٹک کر دروازے پر ہی رک گیا۔

''ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ماموں! امی نے میرے ساتھ اور آپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ ہر انسان کی اپنی پسند' ناپسند' اپنی مرضی' اپنی خواہش ہوتی ہے۔ کہیں سے کوئی لڑکی اٹھا کر کسی کے سر پر مسلط کر دی جائے کہ یہ ہے تمہاری بیوی' اب تمہیں اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔''

پہلے سے کیا بات ہو رہی تھی' وہ نہیں جانتا تھا۔ہاں جو بھی بات اس کے ڈیڈی نے کہی تھی' اس کے جواب میں اپنی گم صم اور خاموش بیوی کی یہ بات اس نے ضرور سنی تھی۔

اسے بولنا آتا ہے؟ یہ اتنے مکمل اور واضح جملے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟

وہ حیرت میں گھرا دروازے کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا۔

''میں اشعر کی نہیں' تمہاری بات کر رہا ہوں بیٹا! مجھے لگتا ہے تم اس رشتے سے خوش نہیں۔''

اس کے ڈیڈی اپنی اس بھانجی سے کتنی شدید محبت کرتے ہیں۔وہ بخوبی جانتا تھا' تب ہی ان کے اس سوال کا خرد نے جو جواب دیا' وہ اس سے بری طرح بوکھلا گیا۔

''میں اس رشتے سے خوش نہیں ماموں!'' اس کے سامنے گونگی بنی' وہ اس کے باپ سے کیا کہہ رہی تھی۔وہ خوش نہیں' یہ کہہ کر تو اس نے سیدھا سیدھا اپنی ناخوشی کا سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا تھا۔اس کا دل چاہا' وہ اس لڑکی کو جا کر ایک ہاتھ جڑ دے۔اس کے باپ کے سامنے وہ اسے کیسا مجرم بنا رہی تھی۔

''میں اس رشتے سے خوش کیسے ہو سکتی ہوں ماموں! امی نے میرے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا اور آپ نے ان کی بات مان کر اچھا نہیں کیا۔کیا میں آپ کی بہو نہ بنتی تو یہاں آپ کے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی؟ اس شادی کے بغیر بھی تو میں آپ کے' اپنے سگے ماموں کے پاس رہ سکتی تھی۔آپ ماموں کے رشتے سے تو میرے سرپرست بن سکتے تھے پھر یہ زبردستی کا رشتہ کیوں؟ مجھے اچھا نہیں لگتا ماموں! کہ میں کسی کے اوپر زبردستی مسلط کی گئی ہوں۔میں زبردستی کسی کی زندگی میں شامل ہو گئی ہوں۔آپ کو پتا ہے بتول خالہ' امی' بابا سے میرے بارے میں کیا کہتی تھیں۔''بڑے نخرے ہیں تمہاری بیٹی کے۔دس بار اسے منت سماجت کر کے گھر بلاؤ تو ہزار نخروں سے ایک بار آتی ہے۔'' میں بن بلائے کبھی کسی کے گھر نہیں گئی تھی اور آج بن بلائے کسی کے گھر میں نہیں' کسی کی زندگی میں گھس گئی ہوں۔مجھے بہت انسلٹنگ لگتا ہے یہ سب۔وہ آپ کی خاطر اس زبردستی کے رشتے کو خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں مگر میرا فخر' میری عزت نفس تو اس سوچ کے ساتھ ہی بری طرح ہرٹ ہوتی ہے کہ میں زبردستی کسی کے سر پر مسلط کی گئی ہوں۔''

پھوپھو کے انتقال کے بعد کے اس تمام عرصے میں وہ اس کے ڈیڈی کے بہت قریب ہو گئی ہے' یہ تو وہ جانتا تھا' اکثر اس نے اسے بصیرت حسین کے ساتھ ان کی اسٹڈی یا ان کے کمرے میں بیٹھے بھی دیکھا تھا مگر یہ بے تکلفی اور دوستی اتنی زیادہ ہے' یہ اندازہ اسے بہرحال ابھی ابھی ہی ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ابھی ابھی ہی پتا چلا تھا کہ جسے وہ دبو اور احساس کمتری کی ماری بے چاری قسم کی لڑکی سمجھتا ہے' وہ اتنے کونفیڈینس کے ساتھ' اتنے مربوط اور واضح انداز میں بات بھی کر سکتی ہے۔اپنا نکتہ نظر' اپنی سوچ بھی واضح کر سکتی ہے۔بصیرت حسین کے ساتھ اس کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بے تکلف دوست سے بات کی جاتی ہے۔اپنی بات کے اختتام تک آتے اس کی آواز بھرا ضرور گئی تھی مگر لہجہ پراعتماد تھا۔

اندر مزید کیا گفتگو ہو رہی ہے یہ سنے بغیر وہ خاموشی سے وہاں سے واپس لوٹ گیا تھا۔ شاید بصیرت حسین نے خرد سے ''وہ اس شادی سے خوش ہے؟'' جیسا کوئی سوال کیا ہوگا اور اس سوال کے جواب میں یہ تمام گفتگو ہو رہی تھی۔

بیٹے کو ایک بار جذبات کا سہارا لے کر مجبور کر کے اپنی بات منوانے کے بعد اب وہ اس سے کچھ بھی کہہ نہیں پا رہے تھے۔ تو اس کے اوپر خرد کے رشتے کے ابنارمل پن کو ختم کرنے کے لیے بھانجی ہی سے بات کرنے لگے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

اس پر بیک وقت کئی طرح کے انکشافات ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ احساس کمتری کی ماری اور دبو نہیں۔ وہ بولنا جانتی ہے۔ اس سے کھنچی کھنچی اور خاموش رہتی ہے تو اس کا سبب احساس کمتری نہیں بلکہ یہ احساس ہے کہ وہ اس کے سر پر زبردستی مسلط کر دی گئی ہے۔

ایمانداری سے اس نے اپنا اور اس لڑکی کا تجزیہ کیا تو احساس ہوا کہ اس کے ایسا سوچنے کی وجہ خود اسی کے رویے ہیں۔ اس ڈیڑھ مہینے میں وہ لاشعوری طور پر اپنے ہر انداز سے اسے یہ باور کراتا رہا ہے کہ وہ زبردستی اس کے گلے پڑی ہے۔ زبردستی اس کی زندگی میں گھسی ہے۔ اس نے بغیر اسے جانے، بغیر اس سے کبھی کوئی گفتگو کیے اسے چھوٹے شہر کی محدود سوچ رکھنے والی' اپنے سے کم تر ذہنی سطح کی لڑکی تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن جو لڑکی فخر اور عزت نفس کی بات اس انداز میں کر رہی تھی وہ کم تر اور معمولی کیونکر ہو سکتی ہے؟ اسے باوقار اور خود دار لوگ اچھے لگا کرتے تھے۔ جس شخص میں عزت نفس کا احساس نہیں وقار نہیں' وہ انسان بھی کوئی انسان ہے۔ کمرے کی لائٹ جل رہی ہے یا بجھ رہی ہے۔ وہ اس کے پاس آ رہا ہے یا نہیں آ رہا۔ ان میں سے کسی بھی بات پر اگر وہ کچھ نہیں بولتی تھی تو اس لیے کہ اس نے ابھی تک ان میں سے کسی بھی چیز پر اپنا حق سمجھنا شروع ہی نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ کمرے میں آئی تو روز ہی کی طرح بالکل خاموش تھی۔ وہ اس پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر خاموشی سے ٹی وی دیکھتا رہا تھا۔ مگر ان کی ڈیڑھ مہینے کی اس شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کی توجہ ٹی وی یا کسی بھی اور دوسری چیز پر نہیں بلکہ پوری طرح اس پر مرکوز تھی۔ اس کی نگاہیں بظاہر ٹی وی اسکرین پر تھیں مگر وہ کن انکھیوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

اور یہ اس رات سے اگلی ہی رات کی بات تھی جب رات میں گہری نیند سوتے سوتے اس کی آنکھ کسی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سے کھلی۔ خرد کی کروٹ دوسری طرف تھی۔ اسے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر ہولے ہولے لرزتا اس کا جسم بتا رہا تھا کہ وہ بری طرح رو رہی ہے۔ وہ آنکھیں کھولے خاموشی سے لیٹا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ بیڈ پر سے اٹھنے لگی ہے۔ وہ پہلے بھی تین چار بار اس کے رونے سے رات میں یونہی جاگ گیا تھا اور پھر اسے یونہی ہلکی آواز میں روتے ہوئے بیڈ پر سے اٹھ کر ڈریسنگ روم یا باتھ روم میں جاتے بھی دیکھتا رہا تھا۔ مگر اس نے کبھی خرد پر یہ ظاہر نہ کیا تھا کہ وہ جاگا ہوا ہے۔ لیکن آج جیسے ہی وہ بیڈ پر سے اٹھنے لگی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے سے روک لیا۔ اسے جاگا ہوا دیکھ کر وہ بہت بری طرح گھبرا گئی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے اس نے جلدی جلدی آنسو صاف کرنے کی کوشش کی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' اپنے لہجے کی گھبراہٹ پر قابو پاتے وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''کچھ نہیں ہوا؟ تو کیا آدھی رات کو یونہی شوقیہ رو رہی ہو؟'' وہ اس کے بلاوجہ بات کو چھپانے پر جھنجلایا تھا۔ ''میں نے کچھ کہا ہے؟ میری کوئی بات بری لگی ہے؟''

''مجھے میری امی یاد آ رہی ہیں۔ میں نے ابھی انہیں خواب میں دیکھا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے تھے۔

میمونہ احسان اس کی پھوپھی تھیں۔ ان کے ساتھ اس کا ایسا کوئی خاص محبت کا رشتہ نہیں تھا نہ ان سے کوئی جذباتی وابستگی جو ان کی موت کا صدمہ اتنے سارے دنوں بعد بھی اس کے لیے تازہ ہوتا مگر اس لڑکی کی وہ ماں تھیں' پہلی بار اس نے اس لڑکی کے لیے ہمدردی اور نرم دلی سے سوچا تو احساس ہوا کہ وہ واقعی بہت دکھی اور بہت تنہا ہے۔ اس سے صرف اس کی ماں ہی نہیں' اس کا گھر' اس کی اپنی زندگی سب کچھ چھن گیا ہے۔

اس کا دایاں ہاتھ جو اس نے تھاما ہوا تھا اسے ذرا زور سے کھینچ کر اس نے ایک جھٹکے سے اسے بیڈ پر اپنے برابر لٹا لیا۔

''پھوپھو کو یاد کر کے رونا آ رہا تھا۔ اس لیے کمرے سے اٹھ کر جا رہی تھیں؟'' دل میں چاہے ہمدردی تھی مگر لہجہ اس کا غصیلا تھا۔

''آپ کی نیند خراب ہوتی......''

''میری نیند خراب ہوتی ہے یا نہیں' آئندہ رات میں آپ کو رونا ہو یا ہنسنا ہو' سونا ہو یا جاگنا ہو۔ آپ کمرے سے اٹھ کر کہیں نہیں جائیں گی۔''

غصے سے کہتے اس نے بے دھیانی میں اس کے چہرے پر بکھرے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

اس کے غصے سے بھرے لہجے کے ساتھ اس کا یہ انداز بڑی اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

وہ بصیرت حسین کے ساتھ جتنی زیادہ بے تکلف ہو چکی تھی۔ اس کے اور فریدہ کے ساتھ اتنی ہی محتاط تھی۔ خاص طور پر اپنے ساتھ تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی ہے۔ وہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ بے تکلفی سے دنیا جہان کی باتیں کر رہی ہوتی اور اگر وہ بھی وہاں جا کر بیٹھ جاتا تو وہ ایک دم یوں چپ ہو جاتی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلا جاتا تھا۔

ہفتہ دس دن قبل خرد کی اور اپنے ڈیڈی کی جو گفتگو اتفاقیہ طور پر اس نے سن لی تھی۔ اس کے بعد اس کا خیال تھا کہ بصیرت حسین اس سے خرد کے متعلق ضرور بات کریں گے۔ مگر ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے۔

ہاں وہ خود خرد کو بہت زیادہ وقت دیتے تھے۔ ان تینوں کی ہمیشہ اپنی اپنی مصروفیات رہی تھیں۔ بصیرت حسین کے لیے ان کا کام اگر بہت اہمیت کا حامل تھا۔ تو فریدہ بھی بہت مصروف اور بامقصد زندگی گزارنے کی قائل تھیں۔ وہ اپنی ایک این جی او چلا رہی تھیں۔

مگر اب اس نے نوٹ کیا تھا کہ بصیرت حسین نے اپنی مصروفیات خاصی محدود کر دی تھیں۔ وہ آفس سے بہت جلدی گھر واپس آ جایا کرتے تھے اور اس کے بعد کا سارا وقت پھر ان کا اپنی بھانجی کے ساتھ گزرتا تھا۔

اس روز بھی وہ آفس سے کہیں اور جانے کے بجائے شام سات بجے سیدھا گھر آ گیا تھا۔ بصیرت حسین تو کچھ بھی ہو جائے شام چار، ساڑھے چار بجے دفتر سے اٹھ جایا کرتے تھے۔ وہاں سے انہیں اپنی بھانجی کے پاس گھر واپسی کی جلدی ہوتی تھی۔ وہ خیر جلدی تو نہیں اٹھ سکا تھا، ہاں اپنے معمول برخلاف وہ آفس سے سیدھا گھر ضرور آ گیا تھا۔ لیکن گھر آتے ہی یہ دیکھ کر اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا کہ وہاں اس کے استقبال کو نوکروں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

ان کی ملازمہ نور افزا نے اسے بتایا کہ فریدہ کسی سیمینار میں شرکت کے سبب دیر سے گھر آئیں گی اور اس کے ڈیڈی اور خرد کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بہت خراب موڈ کے ساتھ وہ لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔ پون گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئے تھے۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں وہ بیٹھا ہے۔ اسی لیے کسی بات پر خوب زور زور سے بولتے اور ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر اندر گھستے ہی جو اس پر نظر پڑی تو لب بھینچ کر فوراً یوں سنجیدہ ہو گئی جیسے وہ کوئی اجنبی ہے۔ جو اس کے گھر میں آ بیٹھا ہے۔

"ارے واہ، آج تو بہت بڑے اور بہت مصروف لوگ بھی جلدی گھر واپس آ گئے ہیں۔"

بصیرت حسین نے یہ بات مذاقاً کہی تھی مگر اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے روز دیر سے آنے پر طنز کر رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے مگر خرد بجائے لاؤنج میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کے سیڑھیوں کی طرف غالباً بیڈ روم میں جانے لگی تھی۔ اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔ حالانکہ ایک ہی نظر میں وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ آج اپنی مشہور زمانہ دقیانوسی طرز کی چوٹی بنانے کے بجائے اس نے بالوں کو بینڈ لگا کر ایک ڈھیلی ڈھالی سی پونی کی شکل دے رکھی ہے۔ وہ پلٹی تو اس کی پشت پر بکھرے وہ سیاہ ریشمی بال بہت بہت صورت لگے تھے۔

"تم کہاں چلیں؟ ہمیں اچھی سی چائے تو پلاؤ۔ کیوں اشعر، خرد کے ہاتھ کی بنی چائے پی ہے؟ یہ چائے واقعی بہت مزے کی بناتی ہے۔"

وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔ خرد فوراً ہی چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ اسے کیا بات بری لگ رہی ہے۔ وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ چائے کی ٹرے لے کر آئی تو وہ اسے نظر انداز کیے بصیرت حسین سے بزنس کی بات چیت میں مصروف رہا۔ خرد نے چائے میں شکر ملا کر پہلا کپ بصیرت حسین کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کپ تھام لیا تو دوسرے میں بغیر شکر ملائے کپ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ یعنی وہ جانتی تھی کہ وہ کس طرح کی چائے، کافی پیتا ہے۔ لیکن اس نے اس کا کپ اس کے ہاتھ میں کیوں نہیں پکڑایا۔ میز پر کیوں رکھا۔ وہ کیا کوئی جن بھوت ہے، جو وہ یوں اس سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ اس کی عادتوں کی خبر ہے، وہ اس کی سب باتوں کا دھیان رکھتی ہے۔ اس بات پر خوش ہونے کے بجائے چائے کا کپ اپنے ہاتھ میں نہ پکڑانے پر جھنجلایا تھا۔

☆......☆......☆

اسے اس کے ایک دوست نے ڈنر پرائیوٹ کیا تھا۔ یونہی دوستوں کی گیٹ ٹوگیدر تھی۔ آفس سے گھر واپس آنے کے بعد اس نے خرد سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

''میں......؟'' اس حیرت میں کم اور انکار زیادہ چھپا تھا۔

''ہاں تم...... کیوں تمہیں میرے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض ہے......؟'' اس نے ابرو اچکا کر اسے قدرے رعب سے دیکھا۔

''نہیں......'' وہ منمنائی۔

''آدھے گھنٹے بعد ہمیں جانا ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔'' وہ وارڈروب کھول کر پریشان سی کھڑی تھی اور وہ اسے اس پریشانی میں گھرا چھوڑ کر نہانے گھس گیا تھا۔

اس کے بارے میں اس کے ابتدائی بہت سے اندازے غلط تھے۔ اگر وہ بہت خاموش رہتی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اسے گفتگو کا' محفلوں میں شرکت کا' موقع کی مناسب سے اچھی طرح تیار ہونے کا سلیقہ نہیں۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ شام کی تقریب کے لحاظ سے لباس اور زیورات کے انتخاب میں بھی اس کا ذہن نمایاں تھا۔ وہ تیار ہو کر ڈریسنگ روم سے باہر نکلا تب وہ بالوں کو برش کر کے غالباً انہیں کسی نہ کسی انداز میں باندھنے کی تیاری کر رہی تھی۔

''اتنی دیر لگا دی تیار ہونے میں؟ رہنے دو بس ایسے ہی۔ جلدی نیچے آؤ' دیر ہو رہی ہے۔''

گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھا کر وہ رعب سے کہتا فوراً گھر سے باہر نکلا۔ یہ اس سے کہنا تو کیا خود اعتراف کرنا بھی گویا انا کا مسئلہ تھا کہ اسے اس کے کھلے بال اچھے لگ رہے تھے۔ وہ اس کے بارعب لہجے اور عجلت بھرے انداز کو دیکھتی بالوں کو کھلا چھوڑ کر ہی اس کے پیچھے آ گئی تھی۔ بالوں کی بیچ کی مانگ نکال کر انہیں دونوں طرف سے کانوں کے پیچھے کیا ہوا تھا تا کہ بالوں کی لٹیں چہرے پر آ کر الجھن میں مبتلا نہ کریں۔ اگر ستائشی نگاہوں سے اس نے اسے دیکھا بھی تھا تب بھی منہ سے تعریفی ایک جملہ تو کیا' ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔

یہ اس کے قریبی اور خاص دوستوں کی محفل تھی اور وہاں سب ہی نے اس کی بیوی کو بڑے پرجوش طریقے سے خوش آمدید کہا تھا۔ جو دوست شادی شدہ تھے اور ان کی بیویاں ساتھ تھیں۔ اپنے ان دوستوں کی بیویوں سے اسے متعارف کروا کر ان کے پاس اسے چھوڑ کر وہ خود اپنے باقی دوستوں سے ملنے لگا تھا۔ دوستوں کے ساتھ وہ چاہے گفتگو میں جتنا بھی مصروف رہا ہو مگر تمام وقت وہ اسے بھی اپنی نظروں کے حصار میں لیے رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ وہاں بہت ریزرو رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس تقریب میں اس کا کوئی انداز ایسا نہیں تھا جو اسے خجالت میں مبتلا کرتا' جو اپنے دوستوں کی اعلا تعلیم یافتہ بیویوں کے آگے اسے اپنی بیوی کی کم علمی پر شرمندہ کرتا۔ اس نے نوٹ کیا تھا کہ اس کے دوستوں کے حلقے میں سب نے اس کی بیوی کو پسند کیا تھا۔ وہ سب کو خاموش طبع ضرور لگی تھی مگر دبو' جاہل یا گنوار نہیں۔

جس طرح یہاں آتے وقت وہ گاڑی میں سارا راستہ بالکل خاموش رہی تھی۔ اسی طرح واپس جاتے وقت بھی وہ نگاہیں گود میں رکھے اپنے ہاتھوں پر جمائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

''ڈیڈی کے ساتھ کیسی اس کی فر فر زبان چلتی اور میرے ساتھ کیسے زبان کو تالے لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''میوزک سنو گی؟'' اس نے بری طرح چونک کر اپنا سر اوپر اٹھایا' ایک نظر اسے دیکھا' جو بغور اسی کو دیکھ رہا تھا۔

چند سیکنڈ کی سوچ بچار کے بعد لفظوں کو تولتے' وہ محتاط سے لہجے میں بولی۔

''آپ کا موڈ ہے تو لگالیں۔''

اس کا دل چاہا وہ اپنا سر کسی چیز سے دے مارے۔ اس شاندار جواب کے بعد میوزک تو اسے کیا لگانا تھا ہاں غصے میں کھولتے اس نے گاڑی کی رفتار انتہائی تیز ضرور کر دی تھی۔ اس کی تیز رفتاری سے لاتعلق وہ اپنے ہاتھوں کو گھورتے' پھر مراقبے میں چلی گئی تھی۔

ان کی گاڑی اس وقت جس سڑک پر سے گزر رہی تھی اس کے دونوں اطراف کئی اچھے اچھے ریسٹورنٹس اور آئس کریم پارلر موجود تھے۔ چھ روز قبل اس شام جب وہ آفس سے گھر جلدی واپس آ گیا تھا تب خرد بصیرت حسین کے ساتھ کہاں سے واپس آ رہی تھی یہ اسے اسی شام ہی باتوں کے دوران اپنے ڈیڈی سے پتا چل گیا تھا۔ وہ دونوں روز شام میں گھر کے قریبی ایک پارک میں واک کرنے کے نتیجے میں جو کیلوریز خرچ کر کے آتی ہے' انہیں پارک سے گھر واپسی میں باقاعدگی سے آئس کریم کھا کر دوبارہ بحال بھی کر لیتی ہے۔ اس بات سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید اسے آئس کریم بہت زیادہ پسند ہے۔ گاڑی ایک آئس کریم پارلر کے سامنے لا کر روکتے اس نے اسے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''آئس کریم کھاؤ گی؟ یا اگر میرا موڈ ہے تو میں جا کر کھا آؤں؟''

اور وہ بے وقوف ہرگز نہیں تھی۔ اس کا طنز سمجھ گئی تھی۔ تب ہی اس کی طرف دیکھے یا کچھ بھی کہے بغیر وہ گاڑی سے باہر اتر گئی تھی۔

یہاں سیلف سروس تھی۔ کاؤنٹر پر آئس کریم لینے کے لیے جانے سے پہلے اس نے اسے دیکھا۔

''کون سا فلیور لو گی؟ یا جو میرا موڈ ہو وہ لے آؤں؟'' وہ اسے اتنی آسانی سے بخشنے کے موڈ میں نہ تھا۔

''اسٹرابیری'' اس کے طنز کو اچھی طرح سمجھتے اس نے آہستہ سے جواب دیا تھا۔ وہ آئس کریم لے آیا اور اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب یہ دیکھ کر اسے نئے سرے سے غصہ آنے لگا کہ وہ اس کے علاوہ آئس کریم پالر میں موجود ہر جاندار اور بے جان شے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ قابل توجہ لکڑی کی میز' اس پر رکھا ہوا پھولوں سے سجا گلدان' یہاں تک کہ سامنے دیوار پر بنے نقش و نگار تک اس سے زیادہ توجہ کے لائق نظر آ رہے تھے اس لڑکی کو۔

''تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟'' اس کا خیال تھا اب وہ پھر مراقبے میں چلی جائے گی۔

اب یا تو یہ سوال اتنا مشکل نہیں تھا یا شاید اس کا طنز اثر دکھا گیا تھا۔ اس بے معنی اور فضول سی گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے اب اصولاً اسے اشعر سے اس کے کھانے پینے میں پسند پوچھنی چاہیے تھی۔ عام طور پر ہوتا بھی یہی ہے کہ ہم گفتگو برائے گفتگو کے لیے کسی نہ کسی معاملے میں پسند یا ناپسند پوچھتے ہیں تو جواب دینے کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے وہ اخلاقاً ہماری پسند بھی ضرور دریافت کرتا

ہے۔مگر اس نے اس سے ایسا کچھ نہیں پوچھا۔وہ نظریں اپنے آئس کریم کپ پر مرکوز رکھے خاموشی سے آئس کریم کھاتی رہی۔

اسے بے اختیار اپنے حلقہ احباب میں شامل وہ تمام لڑکیاں یاد آئیں' جو اس کی ایک نگاہ التفات کی منتظر رہا کرتی تھیں۔وہ خود سے کسی کو غیر معمولی اہمیت دے کر کوئی بات کرے' یہ تو خیر بہت ہی بڑی بات تھی۔اس کی صرف ایک سے دوسری بار اٹھنے والی نگاہ ایک سے ایک مغرور اور حسین لڑکی کو کشاں کشاں اس کے پیچھے لے آیا کرتی تھی۔اس کے نرم و نازک سراپے نے'اس کے ساتھ'اس تنہائی نے اگر اس کے دل میں کوئی نرم اور لطیف سے جذبات جگائے بھی تھے تو اس کے اس ٹھس انداز نے اس کے سارے جذبات پر پانی پھیر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس رات اگر اس کا موڈ بری طرح خراب ہوا تھا تو اگلے ہی روز کئی خوشگوار باتیں ایک ساتھ ایسی ہوئی تھیں جنہوں نے اسے حیران بھی کیا تھا اور بہت زیادہ خوش بھی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا اور اپنے معمول کے مطابق وہ چھٹی کے دن بھی صبح سویرے ہی بیدار ہو گیا تھا۔صبح صبح وہ جاگنگ کر کے آیا تھا اور اب لان میں ایکسرسائز کر رہا تھا۔اس کی تمام تر توجہ اپنی ایکسرسائز پر تھی مگر جھک کر پیروں کے انگوٹھوں کو چھوتے ہوئے بھی اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔جھکے ہوئے ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ سامنے کی طرف کہیں کوئی نہیں ہے۔اسے پیچھے سے دیکھا جا رہا ہے۔واپس سیدھا ہوتا ہوا وہ یک دم ہی بڑی سرعت سے مڑا اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔اپنے کمرے کی بالکونی میں ریلنگ سے بازو ٹکائے اسے خرد کھڑی نظر آئی۔اسے مڑتا دیکھ کر اس نے اپنی نظریں فوراً یوں ہٹا لی تھیں جیسے وہ یہاں صرف اور صرف صبح کے اس خوب صورت منظر اور تر و تازہ ہوا کا مزا لینے کھڑی ہو۔کل رات اس کے علاوہ دنیا کی باقی ہر چیز کو دیکھنے والی اس وقت اسے دیکھ رہی تھی۔چپکے سے۔اسے صبح صبح یہ خوشگوار سا انکشاف بہت اچھا لگا۔

صبح کی اس خوشگواری کا اثر ہی ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ لنچ کے بعد فراغت کے عالم میں بہت دنوں بعد جب وہ اور بصیرت حسین کارڈز کھیل رہے تھے۔تب اسے ایک دوسری بہت خوشگوار بات پتا چلی۔وہ دونوں باپ' بیٹا شطرنج' کارڈز باقاعدہ ایک دوسرے کو ہرانے کا چیلنج دے کر کھیلا کرتے تھے۔

آج کا ان کا یہ مقابلہ لاؤنج میں ہو رہا تھا۔فریدہ بھی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر ان دونوں کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھیں۔وہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور بیچ بیچ میں کوئی نہ کوئی تبصرہ ان کے کھیل کے حوالے سے بھی کرتی جا رہی تھیں۔بصیرت حسین کی فرمائش پر خرد ان لوگوں کے لیے کافی بنا رہی تھی۔وہ کافی بنا کر لے آئی اور سب کو کپ دینے لگی تب بصیرت حسین اس سے بولے۔

''جانامت خرد! بیٹھو یہاں۔ذرا دیکھو آج میں اسے کیسا ہراتا ہوں۔'' فریدہ نے اپنے برابر صوفے پر خرد کے لیے جگہ بنا دی تھی۔وہ خاموشی اور سنجیدگی سے ان کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔اپنے پتوں پر توجہ مرکوز رکھتے اس نے سرسری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا تو احساس ہوا وہ بصیرت حسین کے نہیں اس کے پتوں کو بغور دیکھ رہی ہے۔کافی کے سپ لیتی وہ بظاہر سنجیدگی اور خاموشی سے ان دونوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ

رہی تھی مگر ذرا توجہ سے اس نے اسے تھوڑی دیر بعد دیکھنا شروع کیا تو اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے ڈیڈی کو نہیں اسے جتوانا چاہتی ہے۔ ان کے اس کھیل کی یہ دونوں تماشائی خواتین اس کی حمایتی ہیں۔ یہ جاننا اسے بے حد اچھا لگا۔ شطرنج میں اگر بصیرت حسین اکثر اوقات اسے ہرا دیا کرتے تھے تو کارڈز میں زیادہ تر وہ جیتا کرتا تھا۔ سوا سی روات کو برقرار رکھتے اس نے آج بھی انہیں ہرا دیا تھا۔ انہیں ہراتے ہی اس نے فوراً انہیں نہیں بلکہ اسے دیکھا تھا۔ اور اس کے چہرے پر اسے اپنی جیت کی ایک بے ساختہ سی خوشی نظر آئی تھی۔

یعنی وہ اشعر حسین اس کے لیے اہم تو تھا۔

بے ساختہ مسکراتے ہوئے وہ صوفے پر سے اٹھ گیا تھا۔

اور یہ آخری بات بھی اسی روز کی تھی۔ رات کو وہ دونوں اپنے بیڈ روم میں تھے۔ خرد روز کی طرح کسی میگزین کا مطالعہ کرنے کا تاثر دے رہی تھی اور وہ فون پر رضا زیدی سے بات کر رہا تھا۔ جو چھٹی کے دن بھی حسب عادت دفتر اور دفتری کاموں ہی سے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔

''اچھا دو روپے پچاس پیسے؟ یعنی 2.5x9500 یعنی کہ۔'' کسی شیئرز کے نفع سے متعلق بات تھی۔ ''یعنی'' کہہ کر اس نے ذہن میں کیلکولیشن کرتے آس پاس کیلکولیٹر تلاشا۔

''23750'' آہستہ آواز میں اسے یہ جواب رضا زیدی نے نہیں بلکہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے اس خاموش وجود نے دیا تھا۔ حیرت سے اس کا منہ پورے کا پورا کھل گیا تھا۔ حیرت سے منہ پھاڑے وہ خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے اس جیتے جاگتے کیلکولیٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اسے جواب دے کر خرد نے ایک نظر اسے دیکھ کر نظریں دوبارہ میگزین کے صفحات پر جما دی تھیں۔ وہ ابھی ذہن میں کیلکولیٹ کر رہا تھا اور کس تیزی سے اس نے اسے جواب دے دیا تھا۔ وہ MIT سے MBA کر کے واقعی جھک ہی مار کر آیا تھا۔ اس سے کہیں اسمارٹ تو یہ لڑکی تھی جسے وہ چھوٹے شہر کی کم علم اور کم عقل لڑکی قرار دیتا رہا تھا۔ رضا سے فون پر گفتگو کو مختصر کر کے فون رکھنے کے بعد وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

''اسکول میں بچوں کو one سے Twenty تک ٹیبلز یاد کروائے جاتے ہیں۔ آپ کو 2.5 (ڈھائی) کا ٹیبل بھی یاد ہے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی جگہ تعریف محسوس کر کے وہ مسکرائی۔

''میرا میتھس بہت اچھا ہے۔ میرے میتھس میں ہمیشہ ہنڈریڈ پرسنٹ مارکس آتے تھے۔ میرے بابا میتھس کے ٹیچر تھے۔ مجھے میتھس ہمیشہ وہی پڑھاتے تھے۔''

اس کی ذہانت نے اسے اتنی حیرت اور خوشی سے دوچار نہیں کیا تھا جتنا اس کی اس بات نے۔ اس کے ساتھ اتنا طویل جملہ وہ بھی خود سے پہلی مرتبہ بولی تھی۔

''تم کیا پڑھ رہی تھیں؟''

''میں نے اس سال بی ایس سی کیا ہے۔ فزکس' میتھ اور اسٹیٹکس کے ساتھ۔''

''بی ایس سی؟ بی ایس سی کر چکیں؟'' وہ حقیقت میں حیران ہوا تھا اور وہ اس کی حیرت پر حیران ہوئی تھی۔

''ہاں' کیوں؟''

''اتنی چھوٹی سی لگتی ہو۔ میں سمجھا تھا تم کہو گی' میں نے اس سال تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن لیا ہے۔''

''میں بیس سال کی ہو چکی ہوں۔'' اس نے جھٹ اس کی تصحیح کی تھی۔

''بیس سال کی؟ ہاں تب تو تم واقعی بہت بڑی ہو چکی ہو۔''

وہ محظوظ ہونے والے انداز میں بے ساختہ ہنسا۔ جب کہ وہ بے اختیاری میں عمر بتانے والی اپنی بات اور اس پر اس کے جوابی تبصرے سے جھینپ سی گئی۔

''جب تمہارا میتھس اتنا اچھا ہے پھر تو تم نے اس سبجیکٹ کو آگے پڑھنے کے متعلق بھی سوچا ہوگا؟''

وہ پہلی بار اس کے ساتھ اپنے بارے میں اس طرح بات کرنے کے لیے آمادہ تھی تو اس گفتگو کو وہ اتنی جلدی ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اپنا مذاق اڑاتا انداز ترک کر کے فوراً ہی سنجیدگی سے دوستانہ انداز میں بولا۔

''ہاں میرا ارادہ تھا۔ میں اپلائیڈ میتھس میں ماسٹرز کروں گی۔ بابا کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن پھر امی بیمار ہو گئیں۔ تو بی ایس سی فائنل ایئر میں تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں فیل ہو جاؤں گی۔ میری بالکل بھی پڑھائی ہو ہی نہیں سکی تھی۔'' اس کے لہجے میں کچھ اداسی سی اتر آئی۔ شاید وہ ماں کی بیماری کے دن یاد کر کے دکھی ہو گئی تھی۔

''لیکن پھر بھی تم اچھی ڈویژن کے ساتھ پاس ہوئی ہو گی' ہے ناں؟'' اس کے پر یقین انداز کے جواب میں اس نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

''ہاں' میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔''

''تم اپنی اسٹڈیز دوبارہ سے شروع کر دو۔ اب یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہوں تو تم ماسٹرز میں ایڈمیشن لے لینا۔''

خرد نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی حیرت کو بھانپتے ہوئے فوراً بولا۔

''اس میں اتنے تعجب کی کیا بات ہے؟''

''میں خوش ہو رہی ہوں۔'' اس نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔

''اچھا' پہلی بار پتا چلا ہے خوشی کا اظہار اس طرح حیران ہو کر بھی کیا جاتا ہے۔'' وہ مسکراتا ہوا بیڈ پر سے اٹھا اور پہلی بار لائٹ بند کرنے سے پہلے اس سے پوچھا۔

''لائٹ آف کردوں یا تمہیں ابھی میگزین اور پڑھنا ہے؟''

پڑھنے کا لفظ اس نے قصداً خاصا کھینچ کر ادا کیا تھا اور وہ جتنی ذہین لڑکی تھی۔ سمجھ بھی گئی تھی کہ وہ اس کی کون سی بات اسے جتا رہا ہے مگر بظاہر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

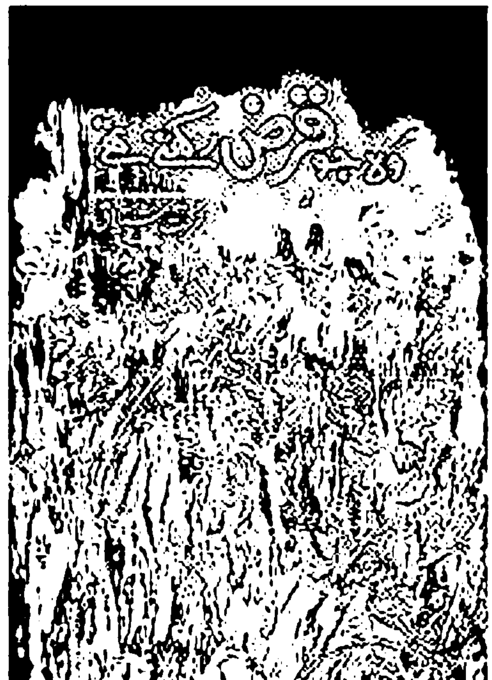

علم و عرفان پبلشرز پیش کرتے ہیں...... محترمہ فرحت اشتیاق کے 8 خوبصورت ناول

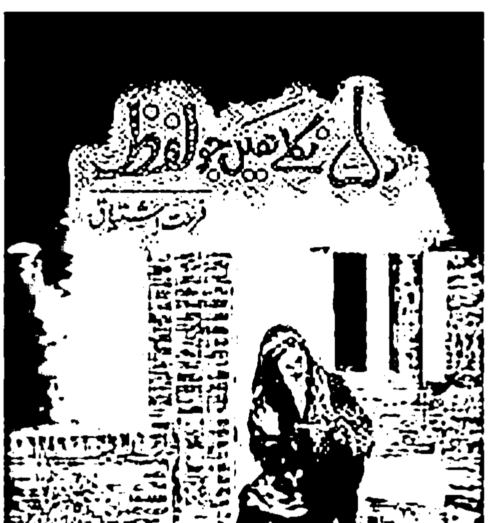

اس روز کے بعد ان کے بیچ حائل تکلفات کی بہت سی دیواریں گر گئی تھیں۔ دوستانہ قسم کی بے تکلفی تو اسے ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا مگر محتاط ہو کر ہی سہی، کم از کم اب وہ اس سے بات کرنے تو لگی تھی۔ اب رات سونے سے پہلے وہ کوئی ایسی دلچسپی ڈھونڈتا جس میں اسے بھی اپنے ساتھ شریک کر سکے۔ اکثر وہ مشترکہ دلچسپی ٹی وی ہی ٹھہرتی۔ وہ اس سے چائے یا کافی بنانے کو کہتا اور پھر اسے اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔

اگر اسپورٹس، نیوز یا اسی نوعیت کا کوئی اور بے ضرر چینل ہوتو ٹھیک لیکن اگر کوئی مووی چینل لگا ہوتا اور اس میں ہیرو، ہیروئن کے بیچ ذرا بھی کوئی بولڈ سین آ تا تو اسکرین پر اداکاری کرتی وہ ہیروئن تو نہیں ہاں اس کے برابر میں بیٹھی وہ شرمندہ سی ہو کر نظریں چرا رہی ہوتی۔ اور اسے وہ فلم اور وہ سین نہیں بلکہ اس کا بلش کرتا وہ انداز دلچسپ لگا کرتا۔ پہلی بار ہنسی آنے کے ساتھ اسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے حلقہ احباب میں شامل کسی لڑکی کو اتنی معمولی باتوں پر تو کیا بڑی بڑی باتوں پر بھی شرماتے کبھی نہ دیکھا تھا اور اگلی بار سے اس چیز کا عادی ہونے کے بعد پھر وہ صرف ہنسا کرتا تھا۔

کئی بار وہ اسے آؤٹنگ کے لیے یا ڈنر کرانے بھی اپنے ساتھ باہر لے گیا تھا۔ اگر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پٹر پٹر باتیں نہیں کرتی تھی تو اب کہیں جا کر اتنا تو ہو ہی گیا تھا کہ وہ اس سے خود سے بھی مخاطب ہونے لگی تھی۔ اس سے مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب کم از کم وہ اس سے دور نہیں بھاگتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ سنجیدگی اور خاموشی کے خول میں خود کو بند نہیں کر لیا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

اس شخص کے پاس اپنی انا اور عزتِ نفس گنوا کر آئے اسے پورے پانچ دن ہو چکے تھے۔ ان پانچ دنوں میں زندگی میں دوسری بار اس نے اتنی شدتوں سے اس شخص کا انتظار کیا تھا۔ مگر اس کا یہ انتظار کل بھی لاحاصل ثابت ہوا تھا اور ساڑھے چار سال بعد آج بھی لاحاصل ہی رہا تھا۔ اس شخص کو نہ کل اپنی بیوی اور ہونے والے بچے پر رحم آیا تھا اور نہ آج بیٹی کی بیماری نے اس کا دل نرم کیا تھا۔

''کیا ہوا خرد! اشعر نے تم سے رابطہ کیا، کچھ بات بنی؟'' اس رات افشین کا فون آیا تھا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا فیشن! کچھ بھی نہیں۔ میں ایک بار پھر اس شخص کو آزمانے چلی تھی۔ اس سے نرم دلی اور انسانیت کی توقع وابستہ کرنے لگی تھی جس کے پاس دل اور انسانیت جیسی چیزیں موجود ہی نہیں ہیں۔ میں ہار گئی۔ افشین! یہ آخری در بھی کھٹکھٹا لیا اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اس کی بیٹی کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔ اس کی دنیا، اس کی زندگی اندھیرے میں گم ہونے جا رہی تھی۔

''تم ہمت مت ہارو خرد! اللہ کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کرے گا۔ تم کہو تو میں تمہارے پاس کراچی آ جاتی ہوں۔''

اس کی دوست کے پاس اس کے لیے تسلیاں تھیں، دلاسے تھے۔ خلوص تھا، محبتیں تھیں۔ وہ ان سب کی دل سے قدر کرتی تھی مگر یہ

بھی جانتی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی چیز اس کی مشکل کو آسان نہیں بنا سکتی۔ اسے اپنا وجود تاریکیوں میں کسی پاتال میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

''ماما! کیا ہوا؟'' وہ موبائل ہاتھ میں لیے بے بسی سے کھڑی رو رہی تھی۔ جب حریم نے کمرے میں آ کر جھانکا تھا۔

''کچھ نہیں جانو۔'' اس نے جلدی سے دوپٹے سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ حریم اسے روتا دیکھ کر اس بارے میں کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ اس نے فوراً اس کی توجہ بدلی۔

''دیکھ لیا ٹام اینڈ جیری۔ یہ جیری آخری ٹام کو اتنا تنگ کیوں کرتا ہے؟''

''ٹام جیری کو کھانا چاہتا ہے ماما۔''

اس نے جیسے اسے یہ سمجھانا چاہا کہ حق پر اور اچھے کردار کا حامل جیری ہے نا کہ ٹام۔''

''بھئی کچھ بھی کہو میرا فیورٹ تو ٹام ہے۔ اتنا کیوٹ دیکھتے ہی پیار کرنے کو دل چاہے۔''

''ماما! ٹام گندا ہے۔ جیری اچھا ہے۔'' حریم برا مانتے ہوئے فوراً بولی۔

وہ اس کا دھیان اپنے آنسوؤں سے ہٹا لینے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

صرف اس روز کی اس بورڈ میٹنگ تک ہی بات محدود نہیں تھی۔ پچھلے پانچ دنوں میں دیگر تمام دفتری امور میں بھی اس کا یہی رویہ رہا تھا۔ اس سے درحقیقت کوئی کام نہیں کیا جا رہا تھا۔

آج چھٹا دن تھا اسے اس الاؤ میں نئے سرے سے جلتے ہوئے۔ نیند، سکون اور آرام تو زندگی سے بہت پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے مگر پچھلی پانچ راتوں میں وہ ایک پل بھی نہیں سویا تھا۔

یہ پانچ راتیں پوری کی پوری خود اذیتی میں جلتے سلگتے اس نے سگریٹوں کا دھواں اپنے اندر اتارتے گزاری تھیں حالانکہ اسموکنگ سے اسے شدید نفرت تھی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی اشعر! تم کچھ دنوں کے لیے گھر پر ریسٹ کیوں نہیں کر لیتے۔'' یہ ان کے ادارے کا ڈائریکٹر فنانس رضا زیدی تھا۔ اس کے ساتھ اشعر کے بہت پرانے اور گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ امریکہ میں Yale میں اسٹڈیز کے دوران ان کی دوستی ہوئی تھی۔

وہ اشعر سے کئی سال سینئر تھا۔ عمروں میں بھی فرق تھا مگر اس سب کے باوجود ان کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

''میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے پرزور انداز میں کہا تھا۔

وہ سنگاپور کی ایک کمپنی کے ساتھ وہ جوائنٹ وینچر کرنے جا رہے تھے۔ اسی حوالے سے تفصیلات طے کرنے اور ڈیل پر سائن کرنے

اس کمپنی کے سینئر ایگزیکٹوز اور ٹاپ مینجمنٹ پر مشتمل ایک وفد آیا ہوا تھا۔

ملٹی میڈیا پر پریزینٹیشن کے ذریعے اس کمپنی کے ایک سینئر ایگزیکٹو اسے اور باقی سب کو پروجیکٹ کی تفصیلات بتا رہے تھے اور وہ ان گرافس، چارٹس اور ان اعداد وشمار کو بے توجہی سے دیکھ رہا تھا۔ جب پریزینٹیشن ختم ہونے کے بعد وہ خود سے کچھ بھی نہ بولا تو وہاں کے ایک ایگزیکٹو نے از خود اس سے اس کی رائے طلب کی۔ اس نے کچھ دیکھا اور سمجھا ہوتا تو بول پاتا، وہ تو غائب دماغی سے سارا وقت اس لیپ ٹاپ اور آس پاس کی دیواروں کو دیکھتا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ مقابل بیٹھی کمپنی کے سینئر ارکان اس کی بے توجہی پر کچھ برا محسوس کرتے، رضا زیدی اور ان کی کمپنی کے چند دوسرے ایگزیکٹوز نے صورت حال کو بخوبی سنبھال لیا تھا۔

میٹنگ کے بعد اب اپنے آفس میں بیٹھا وہ خود اپنے آپ پر جھلاتا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے خود کو سنبھالنا اور لوگوں کے سامنے بالکل نارمل ظاہر کرنا چاہئے کہ رضا زیدی اس کے آفس میں داخل ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی دفتری باتیں کرنے کے بعد اس نے اس کی طبیعت کے متعلق استفسار کیا تھا۔

''یا تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا پھر تم کسی ٹینشن میں ہو۔''

''تمہاری دونوں ہی باتیں بالکل غلط ہیں۔ میں نہ تو بیمار ہوں اور نہ ہی کسی ٹینشن میں۔'' اپنے سامنے رکھی فائل بند کرتے ہوئے اس نے رضا زیدی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''چلو مان لیتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر تیسری ایک ہی بات بچی ہے اور وہ یہ کہ تم مسلسل کام سے بہت زیادہ تھک گئے ہو۔ ذرا خود کو بریک دو، تھوڑا آرام کرو۔ ان شاء اللہ تم بہت بہتر محسوس کرو گے۔''

''اگر آپ کی نصیحتیں...... ختم ہوگئی ہیں اور میرا بزرگ بننے کا شوق بھی پورا ہو چکا ہے تو کیا ہم کام کی بات کر سکتے ہیں۔ ٹریڈ شو کے لیے ہماری پریزینٹیشن میں، پروفائل میں امپروومنٹ کی ضرورت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' خود کو مزید موضوع گفتگو بننے سے بچانے کے لیے اس نے فوراً ہی گفتگو کا رخ موڑ کر اسے ترکی میں عنقریب منعقد ہونے والے ایک ٹریڈ شو کی طرف کر دیا تھا اور رضا بچہ تھا نہ بے وقوف جو یہ نہ سمجھ پاتا کہ وہ اپنے بارے میں کوئی بات فی الحال سنجیدگی سے کرنے کے موڈ میں نہیں ہے یوں وہ خاموش ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

باغبانی سے اسے شوق اور مشغلے سے بڑھ کر عشق تھا۔ اپنے گھر کے اس وسیع وعریض گارڈن کی خوب صورت، ہریالی، شادابی، اور خوشنمائی کا سارا کریڈٹ سو فیصد اسی کو جاتا تھا۔ ہر طرح کے پھولوں، پودوں، اور درختوں سے اسے محبت تھی، وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ انسانوں کی طرح یہ بے زبان پودے بھی محبت کی زبان بخوبی سمجھتے ہیں۔ انہیں پیار اور توجہ دو تو کھل کر اپنے رنگ، خوشبو اور خوب صورتی بکھیر کر یہ اس محبت کا محبت ہی سے جواب بھی دیتے ہیں۔ وہ ایک بہت ماہر اور بہت اچھا گارڈنر تھا۔ دو چار کرنے والی ایک پکا بزنس مین کہیں سے باقاعدہ کوئی تعلیم حاصل کئے بغیر باغبانی کے بارے میں اتنا کچھ جانتا تھا۔ جتنی باقاعدہ تعلیم حاصل کئے کسی

Horticulturist کو حاصل ہوسکتی ہیں۔ اگر باغبانی ایک فن ہے تو وہ اس فن کا واقعی ماہر تھا۔

ایسے کتنے ہی لوگ تھے جن کے ساتھ نہ اس کا عمر کا جوڑ بنتا تھا۔ نہ پیشے اور قومیت کے لحاظ سے وہ اس جیسی تھے۔ مگر صرف اس ایک دلچسپی کے مشترک ہونے کے سبب بیرون ملک اس کی ان سے دوستیاں ہوگئی تھیں۔ جو انٹرنیٹ کے ذریعے برقرار بھی تھیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو فن باغبانی کے بارے میں نئی تحقیقات سے آگاہ کرتا رہتا۔

دفتری مصروفیات کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا جتنا وہ اپنے گارڈن کو دینا چاہتا تھا۔ روز صبح ایکسر سائز کے دوران ہی اس کا ایک پورا چکر اپنے گارڈن کا لگتا۔ خود کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا سو مالی ہی کو جس پودے کے بارے میں کوئی ہدایت دینا ہوتی، دے دیتا۔ ہاں ہفتہ وار چھٹی کے دن وہ کئی گھنٹے اپنے گارڈن کو سجانے، سنوارنے میں گزارتا۔

اس روز چھٹی کا دن تھا اور وہ ناشتے کے بعد سے بڑے جی جان سے گارڈن کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا، سردیاں رخصت ہو رہی تھیں، اب نئے موسم کے لحاظ سے نئے پھول اور نئے پودے گارڈن میں لائے جانے تھے۔ گھر آتے جاتے روز ایک نظر تو پڑتی ہی تھی کہ کہیں کوئی پودا، کوئی بیل، کوئی کیاری یا کوئی گملا نظر انداز تو نہیں ہو رہا۔ کوئی پھول یا پودا مرجھایا ہوا تو نہیں لگ رہا۔ مالی صحیح طرح ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے کہ نہیں مگر اس چھٹی کے دن جب وہ اپنے گارڈن کو پورا وقت دے رہا ہوتا تب حبیب جوان کا مالی تھا، اس کی شامت آئی رہتی تھی۔ ذرا جو کوئی ایک پودا بھی اسے مرجھایا ہوا نظر آ جاتا یا کسی کیاری میں ذرا بھی کسی پودے کی کاٹ چھانٹ درست نہ ہوتی تو وہ حبیب کی ٹھیک ٹھاک خبر لے ڈالتا۔ آج صبح سے بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ گھر کے اندر کیکٹس کے جتنے گملے رکھے تھے انہیں دھوپ میں رکھوانے کے بعد اس نے گھر کے اندر موجود تمام ان ڈور پلانٹس جنہیں ہر پانچ چھ روز بعد دھوپ اور روشنی کی ضرورت ہوتی تھی باہر رکھوائے۔

دوپہر تک وہ اسی کام میں مصروف رہا پھر وہ حبیب کو ساتھ لے کر کچھ نئے پودے خریدنے نرسری چلا گیا۔ وہاں سے ایک گھنٹے بعد واپس ہوا۔ وہ گارڈن کی طرف آیا تو یہ دیکھتے ہی اس کا پارہ ایک دم ہائی ہوگیا کہ درختوں کے نیچے اور دیوار کے ساتھ اس کے چھاؤں میں رکھے گئے فینسی گملے سارے کے سارے کسی نے بڑی ترتیب سے بڑی اچھی سی قطار بنا کر عین سورج اور دھوپ کے نیچے رکھ دیے ہیں۔ غصے سے اس کا دماغ کھول گیا۔

''یہ کس نے کیا ہے؟ ان گملوں کو یہاں لا کر کس نے رکھا ہے پتا بھی یہ شیڈ لونگ پلانٹس ہیں، ڈائریکٹ سورج کی روشنی پڑ کر ان کا کیا حشر ہوگا۔ میں کیا پاگل تھا، جو انہیں چھاؤں میں رکھا ہوا تھا، میں نے؟''

غصے سے کھولتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔

اسے گلاب کی کیاری کے پاس قدرے چھاؤں والی جگہ پر خرد بیٹھی نظر آئی۔

''خرد یہ گملے یہاں کس نے رکھے ہیں؟ تم نے دیکھا کسی کو یہ یہاں رکھتے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کی غصے سے بھری تیز آواز سن کر حبیب اور جمال بھی وہاں آ چکے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ مل کر اس نے جلدی جلدی سارے گملے واپس چھاؤں میں جہاں وہ پہلے رکھے ہوئے تھے، رکھوا دیے۔

خرد وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ گملے واپس رکھ دیے گئے تب وہ دوبارہ اپنے ادھورے تمام کاموں میں مصروف ہو گیا۔ موسم کے پھولوں کے بیج اور پنیریاں گملوں میں لگانے کے ساتھ وہ اپنے گارڈن کے لینڈ اسکیپ میں بھی کچھ نئی تبدیلیاں کر رہا تھا۔ گارڈن کے بیچوں بیچ موجود تالاب کے گرد خوشنمائی پیدا کرتے چھوٹے چھوٹے رنگین پتھر اور مختلف اقسام کے پودوں اور پھولوں کی بہار دکھاتے گملے رکھوا رہا تھا۔

صبح سے کاموں میں بری طرح مصروف رہتے اسے نہ بھوک نے ستایا تھا اور نہ ہی لنچ ٹائم کے گزر جانے کا کوئی خیال آیا تھا۔ اب سب کاموں سے فارغ ہوا اور گارڈن کی نئی سج دھج سے جب وہ مطمئن ہوا تب اسے لنچ کا خیال آیا۔ فریدہ اور بصیرت حسین آج ایک دوست کے ہاں لنچ پر مدعو تھے۔ دو بجے وہ وہاں چلے گئے تھے اور ابھی ان کی واپسی ہوئی تھی۔ دھول، مٹی کھاد میں اٹا وہ اندر آیا تو خرد لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی نظر آئی۔

''خرد! پلیز ذرا جلدی سے کھانا لگوا دو۔ بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس سے کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر لگی کھاد، مٹی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ بہت ہی کوئیک قسم کا شاور لے کر وہ چند ہی منٹوں بعد نیچے آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگائے اسے خرد اپنے انتظار میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ وہ یونہی اسے کمپنی دینے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی ہے مگر جب وہ پلیٹ میں اپنے لیے کھانا نکالنے لگی تب وہ بری طرح چونکا۔

''کیا مطلب، تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟''

''میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس مشرقی ادا سے خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ اس کے انتظار میں وہ شام کے پانچ بجے تک بھوکی بیٹھی تھی۔ کوئی تک بھی تھی اس فضول حرکت کی۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلتے غصے اور ناگواری کو بھانپ گئی تھی۔ اسی لیے مدافعانہ انداز میں فوراً وضاحت کرنے لگی تھی۔

''آج لنچ میں نے بنایا ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ ہم ساتھ.....'' وہ بولتے بولتے خود ہی جھجک کر چپ ہو گئی۔

ابھی تک اس نے میز پر سجے کھانے پر توجہ سے نظر نہیں ڈالی تھی۔ اب تفصیلی نظر ڈالی تو میز پر اپنی پسند کی کئی ڈشز رکھی نظر آئیں۔ ویجی ٹیبل رائس، اسموکی آلمنڈ چکن، ڈھیر سارے سبز زیتون والی اس کی من پسند اٹالین سلاد اور میٹھے میں اسٹرابیری ٹارٹ اس کی بیگم نے پہلی بار اس کے لیے کھانا بنایا تھا اور وہ بھی اس کی پسند کو مدنظر رکھ کر، خوشی تو ہونی ہی تھی۔

''یہ بات تھی تو مجھے پہلے بلا لیتیں کھانے کے لیے۔''

''آپ اتنے بزی تھے اپنے کام میں۔''

''تو کیا ہوا۔ کام تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ کر میں آ سکتا تھا۔'' اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ خرد کا خود کو اہمیت دینا،

اپنے لیے خاص طور پر لنچ تیار کرنا اور پھر اپنے ساتھ لنچ کرنے کی خواہش رکھنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔

''تمہیں ککنگ آتی ہے؟ میں تو سمجھتا تھا تمہیں صرف چائے اور کافی بنانا آتی ہے۔''

''آتی ہے، لیکن یہ آلمنڈ چکن اور اسٹرابری ٹارٹ میں نے فرسٹ ٹائم بنائے ہیں۔ بی بی سی فوڈ پر ریسپی دیکھی تھی میں نے۔ آپ ٹیسٹ کر کے بتائیں، دونوں چیزیں کیسی ہیں۔''

اگر کھانا خوش ذائقہ نہ بھی ہوتا تب بھی اسے تو وہ اچھا ہی لگتا، لیکن وہ واقعی بہت مزے دار تھا۔ وہ کھانے کی دل کھول کر تعریف کرتا، خوب مزے لے کر اور بہت خوشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ لیکن کھانے کے دوران ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ خرد کچھ بے چین سی ہے۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی۔

''کیا بات ہے خرد! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

کھانے کے بعد بھی جب اس نے اس کا الجھا ہوا انداز دیکھا تو پوچھ بیٹھا مگر وہ نفی میں سر ہلاتی اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

رات بارہ بجے وہ دونوں سونے کے لیے لیٹ چکے تھے جب لیٹنے کے کچھ دیر بعد اس نے خرد کی آواز سنی۔

''آپ سو گئے؟'' وہ کروٹ لیے لیٹا تھا۔

خرد کی آواز پر اس نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر وہ بہت سنجیدہ آواز میں بولی۔ براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو وہ کبھی اسے دیکھتی ہی نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوتا تو وہ ہمیشہ نظریں ادھر ادھر کسی دوسری چیز پر مرکوز رکھتے اس سے بات کیا کرتی تھی۔ شروع میں ان باتوں پر حیران ہونے کے بعد اب وہ اس کی اس دقیانوسی طرز کی مشرقیت کو انجوائے کیا کرتا تھا۔

''میں نے دوپہر میں آپ سے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ شرمندہ سی آواز میں نظریں جھکائے بولی۔

''آپ نرسری گئے ہوئے تھے۔ تب وہ سارے گملے میں نے دھوپ میں رکھے تھے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ شیڈ میں رکھنے والے پلانٹس ہیں۔ مجھے گارڈننگ کی الف، ب بھی نہیں آتی۔ پلانٹ کو کس طرح اور کس جگہ رکھا جاتا ہے، سمجھے بالکل نہیں پتا۔ مجھے تو بس آپ کی گارڈننگ میں اتنی زیادہ انوالومنٹ دیکھ کر شوق ہوا تھا کہ میں بھی یہ کام کروں۔ میں سمجھی، وہ پلانٹس آپ نے غلطی سے یا جلدی میں درختوں کے نیچے اور دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیے ہیں۔ وہ اتنے خوب صورت گملے تھے اور ان میں موجود پلانٹس بھی اتنے خوب صورت لگ رہے تھے، میرے خیال سے انہیں اتنی دور اور اتنا الگ تھلگ تو نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ جہاں ان پر کسی آنے والے کی فوراً نظر بھی نہ پڑ سکے۔ میں سمجھی کہ شاید نرسری سے واپسی آ کر آپ کو بھی یہی کام کرنا ہوگا۔ انہیں سامنے ہی سجانا ہوگا۔ اس لیے خود ہی انہیں ان کے سائز کے لحاظ سے ترتیب دے کر رکھ دیا۔''

وہ جتنی سادگی سے اپنی پوری کارگزاری اسے سنا رہی تھی۔ وہ اسے حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اتنے گھنٹوں سے اتنی معمولی سی بات کی وجہ سے پریشان تھی اور وہ پتا نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔ اسے خاموش پا کر خرد نے نظریں اٹھا کر ایک پل اسے دیکھا پھر دوبارہ نظریں جھکا کر بولی۔

''میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔ لیکن اس وقت آپ اتنے غصے میں تھے مجھے یہ بتاتے ڈر لگا تھا کہ یہ گملے کسی ملازم نے نہیں بلکہ میں نے یہاں لا کر رکھے ہیں۔''

''اس وقت ڈر لگا تھا اب نہیں لگ رہا؟ غصہ تو مجھے ابھی بھی آ سکتا ہے۔'' اس سادگی اور معصومیت بھرے انداز سے مبہوت سا ہوتے اس نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔ گویا اپنے غصے سے ڈرانا چاہا۔

''لگ رہا ہے، لیکن میں جھوٹ بول کر سو نہیں سکتی۔ بات معمولی ہے، لیکن جھوٹ تو جھوٹ ہے، چاہے بڑی بات پر بولا جائے چاہے چھوٹی اور معمولی بات پر۔''

وہ حیرت سے آنکھیں کھولے اس بہت مختلف لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

''بابا کہتے تھے جھوٹ بولنا صرف پہلی بار آسان لگتا ہے اس کے بعد ہمیشہ مشکل ہوتی ہے اور سچ بولنا صرف ایک بار مشکل لگتا ہے اس کے بعد آسانی ہی آسانی ہوتی ہے۔''

وہ حیرت میں گھرا ایک ٹک خود سے تھوڑے سے فاصلے پر لیٹی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں، اس کے جاننے والوں، ملنے والوں میں اس کے دوستوں میں ایسی کوئی ایک بھی تو لڑکی نہیں تھی۔ جہاں ایسی معمولی معمولی بے ضرر باتیں کیا، لوگوں کی پوری پوری زندگیاں جھوٹ کے اوپر کھڑی تھیں۔ ایسی سادگی، ایسی معصومیت اور ایسی سچائی اس نے زندگی میں کبھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے اتنی خالص، اتنی نایاب اور اتنی انمول سی لگی کہ بے اختیار اسے اپنے آپ پر رشک سا آیا۔ یہ اتنی منفرد اور اتنی خاص لڑکی بن مانگے اسے مل گئی ہے؟ وہ تو اپنی شریک حیات میں صرف ذہنی سطح، ذہانت، خود اعتمادی اور مزاج کی ہم آہنگی جیسی باتیں چاہتا تھا اور قسمت نے بن مانگے اسے وہ کچھ دے دیا تھا جو اسے طلب کرنا شاید آتا بھی نہیں تھا۔ اس نے بے ساختہ اسے اپنے قریب کیا۔ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر ایک پیار بھری سرگوشی اس کے کانوں میں کی۔

''تمہیں پتا ہے خرد! تم بہت اچھی ہو۔ تم سے اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہمیشہ ایسی ہی رہنا خرد! تمہاری یہ سادگی، تمہاری یہ سچائی انمول ہے۔''

پہلے اگر اسے لگتا تھا کہ وہ خرد کے ساتھ اپنے رشتے کو قبول کرنے لگا ہے، وہ اس سے مانوس ہونے لگا ہے، اسے پسند کرنے لگا ہے۔ تو اب جا کر پتا چلا تھا کہ اسے اس سے صرف انسیت نہیں ہوئی ہے۔ وہ اسے پسند بھی نہیں کرنے لگا بلکہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اب سے نہیں بلکہ کافی دن پہلے سے اور اس محبت کی وجہ نہ اس کی خوبصورتی ہے نہ ذہانت۔

وہ جیسے خاص اس کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی کسی نیکی کا انعام، کسی کی سچے دل سے دی دعا یا خالق کا اس پر لطف و کرم، اتنی مختلف منفرد، سب سے الگ کہ اسے یہ سوچ کر خود پر فخر محسوس ہوتا کہ وہ اس کی ہے۔ صرف اور صرف اس کی۔ کوئی بھی مرد، خواہ کتنا بھی ماڈرن اور کتنا بھی لبرل کیوں نہ ہو، عورت کی حیا اسے ہمیشہ اپیل کرتی ہے۔ اپنی طرف کھینچتی ہے اور جو لڑکی اسے ملی وہ تو اس سے، اپنے شوہر تک سے آنکھوں میں حیا لیے اس طرح پلکیں گرا کر بات کرتی کہ وہ مبہوت ہی رہ جاتا۔

وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ گو لفظوں میں کبھی اس نے کہا نہیں تھا، پر اس کی محبت کو وہ اس کے رویوں سے پہچان سکتا تھا۔

وہ خود کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس کی پسند، ناپسند کا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔ بار ہا اس نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ جب وہ...... کسی دوسرے کام میں مصروف ہوتا ہے تب وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ جس رشتے کے لیے اسے لگا تھا کہ وہ اسے کس طرح نبھا پائے گا، صرف نبھانا کیا، وہ تو اس رشتے کو اپنے دل کی بھرپور آمادگی اور سچی خوشی کے ساتھ قبول کر چکا تھا۔

ہاں یہ سچ تھا کہ اشعر حسین نے خرد احسان کو محض اپنے باپ کے کہنے پر اپنایا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا سچ یہ تھا کہ وہ اپنی بیوی خرد احسان سے محبت کے اظہار میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس کی زندگی کی ترتیب ہی دوسرے لوگوں سے تھوڑی مختلف تھی۔ پہلے شادی، پھر محبت اور اس کے بعد اظہار محبت۔

☆......☆......☆

آج میٹنگ میں جو رویہ اس کا رہا تھا اور پھر بعد میں رضا نے اسے اس کی غیر حاضر دماغی کا احساس دلایا اس کے بعد سے وہ واقعی بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

اسی لیے وہ شام میں آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا۔ اس کے ایک کاروباری دوست ہارٹ اٹیک کے سبب ہاسپٹلائز تھے۔ ایک ہفتے سے اسے یہ بات پتا تھی مگر نہ تو خود ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گیا نہ ہی بزنس ایٹی کیٹس کا خیال رکھتے پھولوں کا ایک گلدستہ، نیک تمناؤں اور جلد صحت یابی کی دعاؤں سے مزین کوئی کارڈ ہی انہیں بھجوایا۔

سو آج وہ آفس سے سیدھا ان کی عیادت کے لیے ہسپتال آ گیا تھا۔

گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ گارڈن کے قریب سے چلتا ہوا جا رہا تھا۔ گارڈن میں وہیل چیئر پر کچھ مریض بھی نظر آ رہے تھے اور ان کے عزیز و اقارب بھی۔ وہ ایک سرسری نگاہ سے گارڈن کو دیکھتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اچانک ہی سرخ، سبز، نیلی اور نجانے کتنے رنگوں اور کتنے ہی مشہور کارٹون کیریکٹرز کی تصاویر سے سجی ایک کلرفل سی ہوا سے پھلانے والی بڑی سی بال آ کر اس کے پیروں سے ٹکرائی۔ سامنے سے سرخ فراک میں ملبوس جو چھوٹی سی بچی تیز قدموں سے اسی طرف آ رہی تھی۔ یہ گیند یقیناً اسی کی تھی۔ بیچ کی مانگ نکال کر بالوں کی دو پونیاں بنا کر ان میں سرخ ہی رنگ کے پھولوں والے خوبصورت بینڈز لگائے وہ بچی بہت خوبصورت تھی۔ اپنے پیروں میں

پڑی بال اس نے جھک کر اٹھائی اور پھر اپنی طرف تیزی سے آتی اس بچی کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ بچی اب اس کے قریب آ چکی تھی۔

''انکل! میری بال......'' وہ اس کے پاس بھاگتی ہوئی نہیں بلکہ چلتی ہوئی آئی تھی۔ پھر بھی اس کی سانس بہت زیادہ پھولی ہوئی تھی۔ وہ بہت پیاری اور خوبصورت بچی تھی مگر بہت ہی کمزور اور دبلی پتلی بھی تھی۔ شاید وہ کچھ بیمار تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے کافی گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے اور چہرے کی رنگت اور خاص طور پر ہونٹ بجائے گلابی ہونے کے ہلکے نیلے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے بالکل سامنے بیٹھا۔ اس طرح کہ اس کے قد کے برابر آ سکے۔ اور پھر مسکراتے ہوئے بال اس کی طرف بڑھا دی۔

''تھینک یو انکل۔'' بال اس کے ہاتھ سے لینے کے لیے بچی نے ہاتھ آگے بڑھایا پھر کچھ ٹھٹک کر وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔

''آپ پاپا ہیں؟'' بولتے ہوئے اس بچی نے اس کے چہرے پر آہستہ سے یوں ہاتھ پھیرا۔ جیسے کسی جانے پہچانے نقش کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ ہونق بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی بات بالکل بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

''آپ پاپا ہیں۔ آپ فوٹو والے پاپا ہیں۔'' اس بار وہ سوالیہ انداز میں نہیں بلکہ بہت یقین سے بولی۔

''ماما! دیکھیں پاپا، فوٹو والے پاپا۔'' بچی کی جوش میں گھری اس پکار پر وہ بے اختیار گردن گھمانے پر مجبور ہوا۔ سامنے سے چل کر اسی طرف آتی خرد احسان کو اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ ان دونوں ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ سیدھا کھڑا نہ ہو سکا۔ وہ وہاں سے ہل تک نہ سکا۔ اس نے گردن موڑ کر پھر اس بچی کو دیکھا۔ جس کے ننھے ننھے ہاتھ ابھی بھی اس کے رخساروں پر جمے ہوئے تھے وہ بالکل ساکت ٹکٹکی باندھے اس بچی کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو حریم! ہمارا نمبر آنے والا ہے۔'' قریب آ کر خرد نے خشک سے لہجے میں بچی کو مخاطب کیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اشعر کے پاس سے ہٹایا۔ پھر اسے مکمل نظر انداز کرتی وہ بچی کو......ساتھ لیے ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ گم صم، بالکل منجمد سا، جہاں تھا وہیں کا وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھا رہ گیا۔

''آپ پاپا ہیں؟'' اس نے بے اختیار اپنے گالوں، ہونٹوں اور ناک پر ویسے ہی ہاتھ پھیرا جیسے وہ پھیر رہی تھی۔

''آپ پاپا ہیں۔'' اب لہجے میں سوال نہیں بلکہ یقین تھا۔ اتنا یقین، اتنی Surety، اتنی خوشی، اتنی معصومیت، اتنی سچائی، اسے لگا جیسے اس کے گرد کائنات کے ہر گوشے سے صرف ایک ہی پکار سنائی دے رہی ہے۔

''آپ پاپا ہیں؟''

☆......☆......☆

یک لخت ہی اس کے اندر بہت عجیب، بہت ناقابل فہم جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ابل نکلا۔ ایک ان جانی سی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اسے پکار پکار کر اپنی سمت بلا رہی تھی۔

اس کے جسم میں دوڑتا تمام خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ بے خودی کی کیفیت میں وہ کسی بہت زور آور قوت کے زیر اثر

کھنچتا ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ چند منٹوں کے اندر اس نے خود کو ہسپتال کے اندر اس جگہ کھڑا پایا جہاں ابھی ابھی وہ گئی تھی۔ وہ ننھی پری۔ وہاں کرسیوں اور بینچوں پر اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے بہت سے بچے نظر آ رہے تھے، مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہیں تو آئی تھی۔ پھر کہاں چلی گئی؟ اس نے دیوانوں کی طرح چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ اس کے دل کی دنیا ایک ہی پل میں ایسی بدلی تھی کہ اسے اس ننھے وجود کی تلاش کے سوا، دنیا کے کسی منظر اور کسی شخص سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ اس کی بے قرار نگاہوں کو یک لخت ہی قرار ملا تھا۔ وہ اسے نظر آ گئی تھی۔ کوریڈور کے آخری سرے پر جو ایک کمرہ نظر آ رہا تھا، وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اس نے کمرے کے باہر لگی نیم پلیٹ پڑھی۔

''ڈاکٹر انیس رضوی۔'' اس نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس ننھی پری کا کمزور، بیمار چہرہ آنے لگا، اس کی آنکھوں کے نیچے پڑے گہرے حلقے، اس کا دبلا پتلا کمزور جسم، اور بری طرح پھولی ہوئی سانسوں کو قابو کرتی ہوئی۔ سانسیں آنے لگیں۔

اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھمنے سی لگیں۔ وہ یہاں کسی کاروباری دوست کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ وہ بھول گیا۔ اسے یہاں سے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ وہ بھول گیا۔ اشعر حسین اب زندگی میں دوبارہ کبھی کسی سے کوئی رشتہ جوڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا۔ وہ اب مرتے دم تک بھی کسی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ بات بھی بھول گیا۔ اسے یاد تھی تو صرف ایک بات، ایک آواز، ایک پکار اور ایک لمس۔

''آپ پاپا ہیں؟'' بے خودی کی سی حالت میں اس نے اپنے چہرے کے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔

وہ مڑا اور تھکے تھکے قدموں سے چلتا واپس ہسپتال کے گارڈن میں آ گیا۔ وہ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ میری چار سال کی بیٹی حریم حسین کی تصویر ہے۔

بدقسمتی سے میری اس بیٹی کے۔ بائیولوجیکل فادر آپ ہیں۔''

چھ روز قبل خرد احسان اس کے آفس میں آ کر کیا کہہ کر گئی تھی، اس پر کون سی بجلی گرا کر گئی تھی وہ اسے اب سوچ رہا تھا۔ اب یاد کر رہا تھا۔ خرد احسان کو اپنے سامنے اس ڈھٹائی سے جیتا جاگتا کھڑا دیکھ کر جس ناقابل بیان اذیت ناک احساسات میں وہ گھرا تھا۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی نوبت ہی نہ آ پائی تھی کہ وہ اس کی ڈھائی ہوتی باقی قیامت کو سوچ پاتا۔ سمجھ پاتا۔

اس عورت کے گناہوں کی کوئی حد بھی تھی۔ اس کی پستیوں اور اس کے نیچ پن کی کوئی انتہا بھی تھی۔ چار سالوں تک پورے چار سالوں تک وہ اس سے اسی کی اولاد کو چھپائے کہیں روپوش رہی تھی۔

اپنے پریگننٹ ہونے کی بات، اتنی بڑی بات اس سے چھپائی اور صرف اتنا ہی نہیں اسے اسی کی اولاد کی موجودگی سے، اس کی پیدائش سے بھی آگاہ کرنا تک ضروری نہ سمجھا۔ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے یہ اطلاع تک بھی کبھی اسے دینا گوارا نہ کیا۔

وہ اس عورت کو باقی ہر بات کے لیے اگر کبھی معاف کرنے کا ظرف اپنے اندر پیدا کر بھی سکے تب بھی اس بات کے لیے کیسے معاف کر سکے گا۔ وہ صرف اس کی ہی نہیں اس کی بیٹی کی بھی مجرم تھی۔

وہ ظالم عورت اس سے بیٹی کے علاج کے لیے پیسے ہی مانگنے آئی تھی۔ اگر پیسے درکار نہ ہوتے تو وہ اب بھی اسے اس کی بیٹی کے وجود سے لاعلم ہی رکھتی۔ اگر ایسا کوئی رشتہ اس کا اس عورت سے قائم ہوتا تو وہ ایک بار اسے جھنجھوڑ، جھنجھوڑ کر یہ ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے کس گناہ کی سزا کے طور پر اس نے اس کی بیٹی کو اس سے چار سالوں تک چھپائے رکھا تھا؟

اس کی بیٹی، اس کا خون، اس کی اولاد، وہ اپنے وجود کی آپ گواہی تھی۔ وہ ایک پل میں اس کے دل کا مضبوطی سے بند دروازہ بڑی آسانی سے کھول کر اس میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ اس کا باپ ہے، یہ بولتے وہ ننھی بچی، اتنی پر یقین تھی کہ اس کے اس یقین کے آگے وہ اپنی پوری حیات ہارنے کو تیار تھا۔

اس نے وہاں بیٹھ کر ان دونوں کے باہر آنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر بہت تیزی سے فوراً اپنے آفس آ گیا تھا۔ چھ دنوں میں آج پہلی بار اس نے ان چیزوں کو ہاتھ لگایا۔ جو اس کی میز پر اسی حالت میں جوں کی توں اور ان چھوئی پڑی تھیں۔ اس نے صرف تمام میڈیکل رپورٹس کی وہ فائل اور وہ تصویر اٹھائی اور باقی جو تمام گھٹیا پن لیے کاغذات اپنی ذہنی پستی کا ثبوت دیتی خرد احسان اس کے پاس چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے ان سب پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر انہیں پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ وہ اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

بہت طویل عرصے بعد کسی کو دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کا بہت سچا احساس جاگ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر خوشی سے بھری ایک بھرپور مسکان ابھری تھی۔

''اب تک کہاں تھیں ننھی پری؟'' اس نے اس تصویر کو پیار کیا۔ اس کی شکل اس سے نہیں ملتی تھی پھر بھی اسے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش میں اپنی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تصویر میں کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اسے اس کی ہنسی بالکل اپنے جیسی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ، بالکل اسی جیسا تھا۔ گہرا سیاہ۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ بالکل اسی کے جیسی تھی۔ وہ اس تصویر کے ایک ایک نقش کو پیار کرتا رہا۔ خوشی کے ساتھ دل درد اور کرب سے بھی بھرا ہوا تھا۔ ایک درد اس بات کا کہ وہ اپنی بیٹی کے وجود سے اتنی دیر بعد آگاہ ہوا ہے اور دوسرا درد یہ کہ بہت دیر سے ملنے والی اس کی بیٹی بیمار ہے۔ اس کی تصویر کو اس نے بڑی احتیاط اور محبت سے اپنے والٹ میں رکھ لیا۔

وہ اب اس کی میڈیکل رپورٹس دیکھ رہا تھا۔

''میرے خدا۔'' بری طرح پریشانی میں مبتلا ہوتے اس نے فائل بند کی۔ وہ اس کی بیٹی جس سے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی متعارف ہوا ہے۔ وہ......اتنی زیادہ بیمار ہے۔ ایک شاک کی سی کیفیت میں کافی دیر تک سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔

اسے پہلی فرصت میں شہر کے سب سے اچھے کارڈیالوجسٹ سے اپائمنٹ لینا تھا، اسے اپنی بیٹی کا بہترین علاج کروانا تھا۔ اس کی

زندگی ہر قیمت پر بچانی تھی۔ اس نے فائل اور تصویر کے ساتھ رکھی وہ چٹ اٹھائی جس پر اس جگہ کا پتا درج تھا جہاں اس کی بیٹی رہتی تھی۔ اس چٹ کو لیے وہ فوراً کرسی پر سے اٹھا۔ وہ تیز رفتاری سے چلتا اپنے آفس سے باہر نکل آیا تھا۔ پارکنگ میں آ کر اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے بہت تیز رفتاری سے دوڑا لے گیا۔

ایک گنجان آباد کمرشل ایریا میں وہ بہت تنگ اور گھٹے ہوئے فلیٹس تھے جگہ جگہ پان کی پیکیں تھیں، صفائی ستھرائی کا فقدان تھا، ایسی جگہ لفٹ کی توقع ہی عبث تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ پانچویں منزل پر پہنچا تو ان دڑبا نما تنگ و تاریک فلیٹوں کو دیکھ کر اس کا دل دکھ اور کرب سے کٹنے لگا۔ اس کی بیٹی یہاں رہتی تھی؟ اس گندگی کے ڈھیر میں؟ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے بیل پر انگلی رکھی۔ دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا تھا۔

''میں اشعر حسین ہوں، مجھے.....'' ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں ابھی اس نے کہنا چاہا تھا کہ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آیئے، آیئے پلیز، اندر آ جایئے۔''

''خرد! اشعر صاحب آئے ہیں۔'' اسے اندر آنے کی پرجوش سی دعوت دینے کے ساتھ ہی انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی آواز لگائی۔

اس دڑبے کی وہ چھوٹی سی کائنات اسے دروازے سے داخل ہوتے ہی پوری کی پوری نظر آنے لگی تھی۔ سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھی خرد اور اس کی گود میں بیٹی حریم بھی اسے وہیں سے نظر آ گئی تھی۔ ابھی تین گھنٹے پہلے ہی وہ اس سے ملا تھا۔ سو وہ اس بچی کو اچھی طرح یاد تھا۔ اسے پہچانتی وہ ماں کی گود سے اتر کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آنے لگی۔

''حریم! بھاگو مت۔'' خرد نے اسے ٹوکا، مگر وہ اس کی بات نظر انداز کر کے اسی طرح دوڑتی اس کے پاس چلی آئی۔ اس نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے گال پر پیار کیا۔

''آپ پاپا ہیں ناں؟ حریم نے آپ کی فوٹو دیکھی تھی۔'' اس کی زبان بڑی صاف اور واضح تھی۔ وہ تتلا کر نہیں بولتی تھی اور بولنے کا انداز اس کا ایسا معصومانہ اور اتنا کیوٹ سا تھا کہ کسی راہ چلتے انجان شخص کو بھی اس پر بے ساختہ پیار آ جائے۔ اس نے سر اثبات میں ہلا کر دوبارہ اسے پہلے سے بھی زیادہ والہانہ انداز میں دونوں گالوں پر پیار کیا۔

خرد کرسی پر سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ گئی تھی۔ جب کہ اس کے لیے دروازہ کھولنے والی خاتون ان لوگوں کو پرائیویسی فراہم کرنے کو منظر سے ہٹ گئی تھیں۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کا اندر آنے اور بیٹھنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ جگہ اس کی بیٹی کے لائق نہیں تھی۔ اس گھٹے ہوئے تنگ و تاریک فلیٹ کو دیکھ کر اس نے ایک پل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

''بیٹا! آپ اپنا سارا سامان پیک کر لو۔ پاپا آپ کو کل یہاں سے لے جائیں گے۔'' خرد کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اس نے بیٹی کو

مخاطب کیا۔

''کہاں؟''

''ایک دوسرے گھر میں، ٹھیک ہے؟ پاپا کے ساتھ رہوگی؟'' اس کے استفسار پر حریم نے بہت جوش وخروش سے گردن اقرار میں ہلائی۔

''آپ حریم کو ڈول دلائیں گے؟ وہ بری (بڑی) والی جو بولتی ہے۔'' اس کا بے ساختہ سا اپنائیت جتاتا انداز اس کے دل کو ایک بڑی انوکھی خوشی سے ہم کنار کر رہا تھا۔

''سب کچھ دلاؤں گا بیٹا! جو جو کچھ کہوگی وہ سب کچھ۔'' اس نے اسے پھر پیار کیا، اور بولا۔

''ابھی میں جا رہا ہوں۔ کل تمہیں لینے آؤں گا۔ ٹھیک ہے؟'' اس نے حریم کو گود سے اتارا تو خرد فوراً بولی۔

''حریم! جاؤ، فضہ باجی کو دیکھو کیا کر رہی ہیں۔'' اس نے حریم کو وہاں سے ہٹایا۔ جیسے ہی وہ وہاں سے گئی۔ خرد جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے آپ سے صرف اپنی بیٹی کے علاج کے لیے پیسے مانگے تھے۔ اسے کہیں لے جانے کو نہیں کہا تھا۔''

اس عورت کی جرأت اور ہمت پر اس کا دل چاہا وہ کھینچ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرے۔ اپنے کسی جرم پر اسے کوئی احساس ندامت نہیں۔ وہ ایک چار سالہ بیٹی کا باپ اب سے تین گھنٹے قبل زندگی میں پہلی بار اس بات سے آگاہ ہوا تھا کہ اس کی کوئی اولاد بھی ہے۔ وہ کسی کا باپ بھی ہے۔ اس سے اتنی بڑی بات کو چھپائے رکھنے والی یہ عورت کس ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے اس کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔

''تم......'' آگے مزید کچھ بولنے سے قبل اس نے اپنے شدید ترین غصے کو کنٹرول کیا۔ نفرت اور غیض وغضب سے بھرے انداز کو سرد اور سپاٹ انداز میں تبدیل کیا۔

''میری بیٹی کہاں رہے گی، اور اس کا کہاں علاج ہوگا۔ اب سے یہ فیصلہ صرف میں کروں گا۔ تم سے نہ میں نے تمہاری رائے مانگی ہے نہ مرضی پوچھی ہے۔ اتنی چھوٹی بچی کو میں اس کی ماں سے جدا نہیں کر سکتا اس لیے اگر تم آنا چاہو تو شوق سے ساتھ آ جانا، ورنہ کل اپنی بیٹی کو تو میں یہاں سے ہر حال میں لے ہی جاؤں گا۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ اس کے تاثرات دیکھے بغیر ایک سیکنڈ کے اندر دروازے کا لاک کھول کر اس تنگ اور بدبودار جگہ سے باہر نکل آیا تھا۔

اب اس کے سامنے دو اہم ترین کام تھے۔ پہلا یہ کہ شہر کے سب سے بہترین کارڈیالوجسٹ سے نزدیک ترین اپائنٹمنٹ لے لے اور دوسرا اپنی بیٹی کے لیے اس کے شایان شان رہائش کا انتظام۔ جو اس کا گھر تھا، وہ اس کی بیٹی ہی کا تھا۔ اس کا حق تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر جائے، وہاں رہے۔ مگر وہ اسے اس طرح بالکل اچانک اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا، وہ وہاں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ وہاں اس کی ایک ماں

بھی رہتی تھیں۔ ساری دنیا میں وہ واحد شخصیت جو خرد احسان کے ہر کرتوت سے واقف تھیں۔ وہ ایک دم سے حریم کو ان کے پاس لے جا کر ان کے اعصاب اور ان کے جذبات کو کسی کڑی آزمائش اور توڑ پھوڑ سے نہیں گزارنا چاہتا تھا، کیا کہے گا وہ اپنی ماں سے۔

''میری گھر سے بھاگی بیوی ساڑھے چار سال بعد گوشہ گمنامی سے نکل کر اچانک ہی واپس آ گئی ہے۔ میری ایک بہت بیمار چار سال کی بیٹی بھی اس کے ساتھ ہے؟''

وہ مرد تھا، اتنی بڑی بات آسانی سے جھیل گیا مگر اس کی ماں ایک کمزور بوڑھی عورت ہیں۔ وہ اپنی چار سالہ پوتی کے ہونے کی خبر پا کر وہ بھی اس اطلاع کے ساتھ کہ وہ شدید بیمار ہے نجانے کس اذیت، کس دکھ اور کس اضطراب سے گزریں۔

وہ اتنے بڑے بڑے صدمے دیکھ چکی تھیں کہ اب انہیں ایسی کوئی بھی بات ایک دم سے بتا کر وہ انہیں آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ انہیں حریم کے وجود سے آگاہی کچھ وقت ٹھہر کر اور حریم کے صحت یاب ہو جانے کے بعد دے گا۔

اس نے چند فون گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کیے۔ رات ہو گئی تھی۔ شہر کے تمام اچھے کارڈیالوجسٹ کے متعلق معلومات حاصل کر لینے کے باوجود وہ ابھی کہیں پر بھی اپائنٹمنٹ نہیں لے سکا تھا۔ اپائنٹمنٹ لینے کے لیے اسے صبح کا انتظار کرنا تھا مگر اپنا دوسرا کام وہ ابھی کر سکتا تھا۔ وہ اسی وقت دو تین اسٹیٹ ایجنٹس سے ملا۔ پیسہ ہاتھ میں ہو تو کوئی کام ناممکن نہیں رہتا۔ رات بارہ بجے جب ایک پوش علاقے کی شاندار رہائشی عمارت سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ تب اس بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر چار کمروں کو ایک فرنشڈ لگژری اپارٹمنٹ وہ کرائے پر حاصل کر چکا تھا۔ کل صبح ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لینے کے بعد اسے یہاں آ کر ضرورت کا کچھ دوسرا سامان رکھنا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کل شام یا رات تک اس سارے کام سے فارغ ہو کر اپنی بیٹی کو یہاں لے آئے گا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے خرد! اشعر نے حریم کو اپنی بیٹی تسلیم کر لیا ہے۔ بجائے اس بات پر خوش ہونے کے تم نجانے کہاں کا قصہ لے بیٹھی ہو۔'' اشعر کے چلے جانے کے چند گھنٹوں بعد رات میں اس کی افشین سے فون پر بات ہو رہی تھی۔

''صرف تسلیم نہیں کیا، وہ اس پر حق جتا رہا ہے۔ میں نے اس سے صرف حریم کے علاج کے لیے پیسے مانگے تھے اور وہ......'' افشین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اس میں برائی کیا ہے خرد! صرف اپنی انا کا مت سوچو، حریم کا سوچا۔ اگر اس سنگ دل انسان کے دل میں اللہ نے رحم ڈال ہی دیا ہے کہ وہ حریم کو اپنی اولاد مان رہا ہے تو تم بچکانہ پن کا ثبوت مت دو۔ اس وقت تمہارے سامنے صرف حریم کا علاج ہونا چاہئے۔ فی الحال اہمیت اس کی صحت اور اس کی زندگی کی ہے۔'' افشین اسے تدبر سے سمجھا رہی تھی۔

حریم کو اس شخص نے ''میری بیٹی'' کہا تھا تو اسے خوشی نہیں ہوئی تھی، اپنے دامن پر پڑے چھینٹے دھلنے پر کوئی مسرت نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے غصہ آیا تھا۔ یہ زبانی دعوے کرنے والا باپ جو بیٹی کی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اس کے سامنے نہ تھا۔ تقدیر نے اسے اس موڑ پر لا کر نہ کھڑا کیا ہوتا، وہ اتنی بے بس نہ ہو گئی ہوتی تو اس شخص کے سائے سے بھی اپنی بیٹی کو بہت دور رکھتی، مگر اب اس کے پاس کوئی اور راستہ

نہیں تھا۔

افشین سے بات ختم کر کے وہ موبائل میز پر رکھ کر حریم کے پاس آئی تو وہ گدے پر لیٹی اس کے لاکٹ سے کھیلتی نظر آئی۔ زمرد اور ڈائمنڈز سے سجا یہ بہت بیش قیمت اور خوب صورت لاکٹ تھا۔ اسے اپنے وجود سے کبھی جدا نہ کرنے کا اس نے خود سے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر خود سے کیا ہر وعدہ اسی روز ٹوٹ گیا تھا جب اس سرکاری اسپتال میں موت سے لڑتے اس نے اپنی بیٹی کو جنم دیا تھا۔ تب ان تنہائیوں میں نفرتوں کی انتہا پر پہنچ کر اس نے وہ نیکلس گلے سے اتار کر پھینک دیا تھا اور جو بعد میں غالباً کسی ایماندار نرس نے وہاں فرش پر پڑا دیکھ کر اس کے بیگ میں ڈال دیا تھا پھر وہ نیکلس اسی بیگ کی سامنے والی جیب میں سالوں تک پڑا رہا تھا۔ یہ تو ابھی چھ ماہ قبل جب وہ کارڈیالوجسٹ کے پاس علاج کے لیے حریم کو لے کر کراچی آ رہی تھی، تب اس بیگ کو الماری سے نکالا تھا تا کہ اس میں اپنا اور حریم کا سامان رکھ سکے، تب اس بیگ میں سے یہ نیکلس نکلا تھا۔ حریم بیڈ پر اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے اٹھانے سے قبل ہی اس نے وہ نیکلس اٹھا لیا تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر توجہ سے دیکھتے اس کے ہاتھ سے اس میں موجود لاکٹ کھل گیا تھا اور اس لاکٹ میں موجود وہ تصویر بھی اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔

''ماما! یہ کون ہیں؟''

''یہ تمہارے پاپا ہیں حریم!'' ایک نہ ایک دن وہ اس سے اپنے باپ کے متعلق سوال ضرور کرتی۔

وہ حریم کا ذہن خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر اس نے حریم کے ذہن پر باپ کا ایک اچھا سا نقش بٹھانا شروع کیا تھا۔ حریم کو اس تصویر سے متعارف کراتے اس نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پاپا کہیں بہت دور، دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ وہ حریم سے بہت پیار کرتے ہیں اور تب ہی اس نے اس بہت چھوٹی اور ناسمجھ بچی کی ذہنی سطح کے مطابق اس کے باپ کے کہیں دور دراز جگہ پر رہنے کی ایک بہت خوبصورت اور فرضی کہانی اسے سنائی تھی۔ اس نے اسی روز خود سے یہ پختہ عہد کیا تھا کہ وہ حریم کے سامنے اس کے باپ کا ایک بہت اچھا خاکہ بنا کر پیش کرے گی اور دو تین سالوں بعد جب حریم ذرا اور سمجھدار ہو جائے گی، یہ سوچنے کے قابل کہ وہ دوسرا شہر آخر ہے کتنا دور جو اس کا باپ اس سے ملنے آ ہی نہیں پاتا، تب اس کے ایسی کسی بھی بات کے سوچنے سے پہلے ہی وہ اس کے لیے اس جیتے جاگتے باپ کو مار دے گی۔ اس کا بہت اچھا، بہت محبت کرنے والا، ایک آئیڈیل باپ جو اس کے پاس آنے ہی والا تھا کہ موت نے اسے آ لیا۔ حریم کے لیے باپ کی موت کو قبول کرنا آسان ہوگا۔ بہ نسبت اصل تلخ اور ذلت آمیز سچائی کے جاننے کے۔

حریم نے وہ لاکٹ اس سے لینا چاہا تو اس نے چین میں سے نکال کر وہ لاکٹ اسے دے دیا تھا۔ وہ لاکٹ حریم کے دیگر کھلونوں کے ساتھ پڑا رہتا تھا اور دن بھر اپنے کھلونوں سے کھیلنے کے دوران ان پانچ چھ ماہ میں وہ اس تصویر کے ایک ایک نقش کو بہت اچھی طرح پہچان ہو چکی تھی۔ اور اس کے خیال میں اس کی ماما نے ٹھیک کہا تھا فوٹو والے پاپا اس سے پیار کرتے تھے اور وہ دوسرے شہر سے جو بہت دور تھا آ بھی گئے تھے اس سے آگے سوچنے سمجھنے والی اس کی عمر ہی نہیں تھی۔

وہ خاموشی سے آ کر حریم کے برابر گدے پر لیٹ گئی۔ اپنے کھلونے سے کھیلتی لاکٹ کو کھولتی بند کرتی حریم اپنے کام میں مگن رہی۔
یہ کمرہ جو ریحانہ نے سونے کے لیے اسے اور حریم کو دے رکھا تھا، دراصل ان کے اس چھوٹے سے فلیٹ کا وہ دوسرا کمرہ تھا جسے وہ لوگ بطور ڈرائنگ روم استعمال کرتے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے کمروں کا وہ فلیٹ ان کی کائنات تھا۔ ان دنوں خرد اور حریم کے زیر استعمال تھا۔ خرد کو اس کا بہت زیادہ احساس تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے فضہ بے چاری کے پڑھنے تک کے لیے فلیٹ میں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ اتنی زحمت اٹھانے کے باوجود مجال تھی جو ریحانہ یا فضہ اس پر ایسی کوئی بات ظاہر کرتیں کہ اس کی وجہ سے انہیں کچھ مشکل پیش آ رہی ہے۔ ان کی مہمان نوازی اور خلوص کی وجہ سے وہ ان کی احسان مند تھی۔

☆......☆......☆

''بھائی شادی کے لیے کیوں نہیں مان جاتے۔ ممی! آپ انہیں فورس تو کریں۔ آخر اس طرح تنہا زندگی کب تک گزارتے رہیں گے۔'' یہ بات ان سے ابھی کچھ دیر قبل فون پر کنزیٰ نے کہی تھی۔ دونوں بہنیں دور رہتی تھیں، پر اس دوری میں بھی انہیں اکلوتے بھائی کی زندگی کی تنہائی اور ویرانی کی فکر ستائے رکھتی تھی۔
''میں جتنا سمجھانے کی کوشش کر سکتی ہوں، کرتی ہوں بیٹا! دیکھو شاید اسے قائل کر پاؤں۔ کوشش تو پوری کر رہی ہوں۔'' ایک دکھ بھری سانس بھرتے ہوئے انہوں نے کنزیٰ کو جواب دیا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران تو انہوں نے خود کو بدقت رونے سے روکے رکھا تھا مگر اب فون بند کر دینے کے بعد وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی بری طرح رو رہی تھیں۔ وہ ایک بہت بہادر اور حوصلہ مند عورت تھیں۔ اپنی این جی او چلانے والی ایک مشہور سوشل ورکر، لوگ انہیں ایک کامیاب سوشل ورکر اور پروفیشنل کے طور پر جانتے تھے، کبھی کسی نے انہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اکلوتے بیٹے کی زندگی کی بربادی۔ ان کا دل کٹتا تھا، وہ انہیں کیا بتاتیں کہ اشعر اس موضوع پر ان کی ایک بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جو کچھ خرد نے اس کے ساتھ کیا، اس کی سزا وہ خود اپنے آپ کو دے رہا تھا۔ کتنی بار انہوں نے چاہا تھا اشعر ان سے خرد کے متعلق بات کرے۔ اس کے لیے جتنی نفرت اور جتنا غصہ اس کے اندر ہے، وہ سب بول کر اپنے اندر کا سارا غبار نکال دے، مگر وہ خرد کے بارے میں بات کرنا تو کجا، اس کا نام سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔
خرد نے درحقیقت اشعر کے ساتھ کیا کیا تھا، یہ انہوں نے کسی بھی فرد کو یہاں تک کہ اپنی دونوں بیٹیوں تک کو بھی پتا نہیں چلنے دیا تھا۔
سمونا اور کنزیٰ بس یہ جانتی تھیں کہ خرد کسی بھی وجہ کے بغیر اشعر کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اشعر نے خرد کے چلے جانے کو اتنا زیادہ دل پر لے لیا تھا کہ وہ اب زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔
وہ پوری پوری رات آفس سے گھر نہیں آتا۔ گھر آ جاتا تو ساری ساری رات کمرے میں جاگ کر سگریٹیں پیتے ہوئے گزار دیا کرتا تھا۔ ان کا وہ خوش مزاج زندگی کو بھرپور انداز میں جینے والا بیٹا جیسے ہمیشہ کے لیے کہیں کھو گیا تھا۔ تین ساڑھے تین سال پہلے تک وہ سوچا

کرتی تھیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اشعر خود کو سنبھال لے گا، مگر وہ تو اتنے سالوں بعد آج بھی اول روز جیسا ہی تھا۔

☆......☆......☆

خرد سے اس کی محبت بھرپور تھی، اس کا اظہارِ محبت والہانہ تھا، لیکن اس کی اس محبت اور اظہارِ محبت کے باوجود خرد کے دل میں پتا نہیں کس طرح کے وسوسے تھے۔ اشعر، بصیرت حسین اور فریدہ ان تینوں ہی کا سوشل سرکل بہت وسیع تھا۔ سو آئے دن گیٹ ٹوگیدرز اور پارٹیوں کا اہتمام رہا کرتا۔ کبھی یہ لوگ کہیں مدعو ہوتے اور کبھی ان کے گھر پر کوئی پارٹی، کوئی ڈنر ہو رہا ہوتا۔ اس نے نوٹ کیا کہ خرد ان تمام پارٹیز میں اپنی تیاری کے حوالے سے بہت کانشس رہتی تھی۔ ایسا کب سے ہوا اور کیوں ہوا۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس کے حلقۂ احباب میں شامل ماڈرن اور اسٹائلش لڑکیوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرتی ہے اور یہ بات اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ اگر وہ کسی مل اونر یا انڈسٹریلیسٹ کی بیٹی نہیں تھی۔ اگر اس نے کسی نامی گرامی مشہور اور بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی تو یہ کوئی کمی نہیں تھی، یہ کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ خرد اپنے بارے میں ویسی ہی کانفیڈنٹ، ویسی ہی پراعتماد رہے جیسے پہلے تھی۔ کسی بیوروکریٹ، کسی صنعت کار کی بیوی یا بیٹی اگر اس سے، وہ شادی سے پہلے کہاں رہتی تھی اور اس کے والد کیا کرتے تھے۔ جیسی باتیں مغرورانہ انداز میں پوچھتے تو ان سوالوں کے جواب دیتے وہ خود کو ان کے مقابل کم تر نہ سمجھنے لگے۔ وہ جانتا تھا اس کی کلاس کی اکثر خواتین انسانوں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں سے نہیں، ان کی حیثیت اور فیملی گراؤنڈ سے تولا کرتی تھیں، لیکن وہ خرد کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ نہ پہلے کسی سے کم تر تھی، نہ اب کسی سے کم تر ہے، لیکن اسے کوئی مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔ پھر اس روز جب انہیں ایک پارٹی میں جانا تھا، تب اسے یہ موقع خود خرد ہی نے دے دیا تھا۔ وہ آفس سے آنے کے بعد کمرے میں رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھا ایک فائل کے مطالعے میں مگن تھا۔ ایک اہم رپورٹ تھی جو اسے آج شام ہی ان کے دبئی کے برانچ آفس میں مارکیٹنگ منیجر کی جانب سے موصول ہوئی تھی۔ وہ کافی سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ خرد بھی کمرے میں تھی۔ وہ وارڈروب کھولے پارٹی میں جانے کے لیے اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

''زیادہ اچھا کام گرین ساڑھی پر بنا ہے مگر رات کے فنکشنز میں بلیک کلرز زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ہے نا؟''

''ہوں۔'' فائل سے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھتے اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ اس کی توجہ پوری کی پوری اپنی زیرِ مطالعہ رپورٹ پر ہی تھی۔ خرد نے ہاتھوں میں دو ہینگرز پکڑ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک پر سیاہ رنگ کی ساڑھی تھی اور ایک پر سبز رنگ کی۔

''یہ بلیک ساڑھی زیادہ اچھی لگے گی نا پارٹی میں؟''

''ہاں۔'' اس کا جواب پھر سرسری تھا۔

''آپ میری بات سن رہے ہیں نا؟''

''سن تو رہا ہوں۔'' اس کے خفگی لیے سوال کا اس نے پھر بے دھیانی سے ایک نظر اس پر ڈالتے جواب دیا۔

''سن نہیں رہے بلکہ سننے کا تاثر دے رہے ہیں۔ اس فائل کو سامنے سے ہٹا کر میری بات دھیان سے سنیں۔''

وہ اس کے خفا خفا سے چہرے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔

''میرا سارا دھیان آپ کی طرف ہے جناب اب آپ فرمائیے کیا کہہ رہی تھیں۔'' اس نے فائل بند کر کے اپنے سامنے سے ہٹائی۔

''کچھ نہیں کہہ رہی تھی میں۔ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ کسی بھی لڑکی کو کبھی کسی ایسے کام کے جنونی سے شادی نہیں کرنی چاہئے جو شام میں آفس سے واپس آتے پورا کا پورا آفس گھر اٹھا کر لے آتا ہو۔''

خرد کا اپنے ساتھ بے تکلف انداز گفتگو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لیے کہ اس بے تکلفی تک اسے لانے کے لیے اس نے حقیقتاً بڑی محنت کی تھی۔ اسے اپنی محبت، اپنی چاہت کا ہزار طرح سے یقین دلایا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کے لفظوں سے زیادہ اس کے ناز بھرے حق جتاتے انداز کو پوری طرح محسوس کرتا، مسکراتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل پر سے فوراً اٹھا۔

''خدایا اتنی بدگمانی! اتنا کھویا ہوا بھی نہیں بیٹھا تھا میں۔ مجھے پتا ہے اس وقت کون سا مسئلہ زیر غور ہے۔ میری بیگم پارٹی میں بلیک ساڑھی پہن کر جائیں یا گرین۔''

''یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا مذاق اڑایا جائے۔'' وہ اس کے غیر سنجیدہ انداز کا برا مانتے ہوئے منہ پھلا کر بولی۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''مذاق اڑاؤں گا، وہ بھی اتنے سنجیدہ مسئلے کا؟'' لبوں پر ایک شرارت بھرا تبسم لیے وہ خرد کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ سیریس نہیں ہو رہے۔ میں پارٹی میں اچھی لگنا چاہتی ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ اس کے اعصاب پر اس وقت صرف اور صرف وہ پارٹی سوار تھی جہاں آج انہیں جانا تھا۔

''کس کے مقابلے میں؟'' وہ اپنی غیر سنجیدگی ترک کر کے یک دم ہی سنجیدگی سے بولا۔ اتنی دیر سے وہ غیر سنجیدہ تھا مگر اب اچانک ہی اسے احساس ہوا تھا کہ شاید یہی وہ مناسب وقت ہے جب وہ خرد سے وہ بات کر سکتا ہے۔ اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ وہ نازک سی لڑکی ہرٹ نہ ہو، مگر اب تو اسے اس کے دل کی بات کرنے کا موقع خرد خود ہی دے رہی تھی۔ اگر اس کے حلقہ احباب یا خاندان کے کسی فرد نے خرد سے کوئی ایسی بات کہی تھی جو اس کے اس کامپلیکس کا سبب بنی تھی تو وہ اسے باور کرا دینا چاہتا تھا کہ اس کے مڈل کلاس بیک گراؤنڈ کے حوالے سے اسے کچھ کہنے والا انسان دراصل اس سے جلن اور حسد میں مبتلا ہو گا۔

''احمق ہو تم جو ان فیشن زدہ فضول لڑکیوں کے ساتھ اپنا کمپیریژن کرتی ہو۔ تم ان سب سے کہیں زیادہ اچھی ہو۔ مجھ سے پوچھو تو تم سب سے اچھی ہو۔ تمہاری سادگی تمہاری سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ تم اندر باہر سے ایک جیسی ہو جو نہیں، وہ ظاہر بھی نہیں کرتیں، ان مصنوعی لڑکیوں کی طرح۔''

اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر محبت بھری مضبوطی کے ساتھ جما کر وہ سنجیدگی اور رسانیت سے کہہ رہا تھا۔ خرد کے ہاتھوں سے

اس نے وہ دونوں ہینگرز لے کر پیچھے بیڈ پر اچھالے اور دوبارہ اس کے شانوں کے گرد باز و پھیلا کر بولا۔

''مائی سویٹ وائف! تمہیں اچھا لگنے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں، تمہیں کسی فیشن پریڈ میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ تم ان نیلی پیلی ساڑھیوں اور ڈھیر ساری جیولری اور میک اپ کے بغیر اس سادہ انداز میں بھی بہت اچھی لگتی ہو۔ تم ہمیشہ اور ہر انداز میں اچھی لگتی ہو۔ تمہارے جتنا اچھا کوئی اور لگ ہی نہیں سکتا۔''

وہ بہت سچائی اور پورے دل سے اس کی تعریف کر رہا تھا اور وہ لبوں پر مدھم سی مسکان لئے تعریف وصول کر رہی تھی، لیکن اسے اپنے کچھ اور قریب کر کے جو اس نے ذرا گہری نگاہیں اس پر ڈالیں، وہ حسب عادت فوراً پلکیں جھکا گئی۔ اس کے اس شرمیلے انداز سے محظوظ ہوا۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ جن لڑکیوں کو خود سے برتر محسوس کر کے وہ ان جیسا بننے کی کوشش کر رہی تھی، لاکھ کوششیں کر لیتی، تب بھی ان جیسے بے دھڑک اور بے باک نہیں بن سکتی تھی۔

''تمہیں تو واقعی میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اور پھر ہولے سے اس کے سرخ پڑتے رخسار کو چھو کر بولا۔

''مجھے نہیں پتا تھا، اکیسویں صدی میں لڑکیاں اب بھی شرماتی ہیں اور شرمائیں تو ان کے گال بلش بھی کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے بازوؤں کا پیار بھرا حصار اس کے گرد مزید مضبوط کیا اور پھر آہستہ سے ایک پیار بھری سرگوشی کی۔ ''تمہیں پتا ہے خرد! تم میرے لئے کتنی خاص ہو، کتنی اہم ہو۔ کبھی خود کو کسی سے کم تر مت سمجھنا۔ اگر تم نے کبھی خود کو کسی کے مقابلے میں کم تر سمجھا تو مجھے لگے گا کہ شاید میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے جو تمہیں میری زندگی میں اپنے سب سے اہم اور سب سے خاص ہونے کا یقین نہیں۔''

اور پھر اس رات جب وہ دونوں اس پارٹی میں آئے، تب گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوتے اس نے خرد کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاتھ چھوڑیں پلیز۔'' اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

مگر وہ ان سنی کرتا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر داخل ہو چکا تھا۔

وہ اسے ساتھ لیے اپنے تمام جاننے والوں سے یوں مل رہا تھا جیسے کوئی خود کو ملنے والے کسی اعلا ترین اعزاز کو سب کو دکھاتا پھرے۔ پاگل تھی خرد جو اسے اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ خود کو دوسروں سے بہت بلند اور خاص سمجھتی یہ فیشن زدہ لڑکیاں درحقیقت اس کے آگے خود کو کتنا کم تر اور حقیر سمجھتی ہیں۔ اس سے کس قدر حسد کرتی ہیں۔

اس روز اپنے ہر ہر انداز سے اس نے خرد کو یہ باور کرایا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے چٹ پر نمبر دیکھ کر خرد کا موبائل نمبر ملایا۔

''ہیلو!'' کال فوراً ریسیو کی گئی تھی۔

''میری حریم سے بات کراؤ۔'' اس نے سرد اور بے تاثر لہجے میں فوراً کہا۔

اسے ''ہولڈ کیجئے۔'' وغیرہ جیسا کوئی جملہ کہے بغیر دوسری طرف اسی کے سے سرد لہجے میں حریم کو پکارا گیا تھا۔

''حریم...... آؤ بات کرو، تمہارا فون ہے۔'' حریم کی آواز اس نے فوراً ہی سنی تھی۔

''ہیلو پاپا!'' شاید خرد اسے پہلے ہی اشارتاً سمجھا چکی تھی کہ اس کے باپ کا فون ہے۔

''ہیلو بیٹا! کیسی ہو؟''

''فائن پاپا!''

''ویری گڈ۔ اچھا بیٹا! میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ میں تھوڑی دیر میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔ آپ تیار ہو جاؤ۔''

''جی پاپا!'' اسے اپنی بیٹی کے بات کرنے کا مہذب انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چار سال کی عمر کے لحاظ سے وہ کافی سمجھدار، مہذب اور شائستہ سی بچی تھی۔

اس نے حریم کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا اور ایک آخری نگاہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کے لیے سجائے اس اپارٹمنٹ پر ڈالی۔ صبح سویرے سے وہ یہاں کی تزئین و آرائش میں مصروف تھا۔ اپارٹمنٹ کی سجاوٹ کے ساتھ ہی وہ شہر کے سب سے نامور اور قابل کارڈیالوجسٹ اور بچوں کے دل کے امراض کے ماہر سرجن ڈاکٹر عابد انصاری سے کل کا اپائنٹمنٹ بھی لے چکا تھا۔

اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ وہ ایک بار پھر اس تنگ و تاریک فلیٹ پر پہنچا تو اس کے بیل کرنے پر اندر سے ''کون ہے؟ کیا پاپا ہیں؟'' کی باریک سی سوالیہ آواز نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''جی، پاپا ہیں۔'' اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اشعر کی اس پر نظر پڑی تو وہ پنک بلاؤز اور بلیو اسکرٹ پہنے بالکل تیار نظر آئی۔ اس نے پیروں میں بلاؤز سے میچ کرتے پنک کلر کے شوز پہن رکھے تھے اور سر میں جو ڈھیر سارا آرائشی سامان پھلوں، پھولوں اور اسٹارز سے مزین ہیئر کلپس اور بینڈ کی صورت میں سجا نظر آ رہا تھا، وہ سب بھی تمام تر پنک اور بلیو کلرز ہی کا تھا۔ شاید اس کی بیٹی کو سجنے سنورنے کا بے حد شوق تھا۔

وہ اس کی تیاریوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حریم نے اسے سلام کر کے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو بجائے اس کا ہاتھ تھامنے کے اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔

''چلیں، تیار ہو؟'' اسے پیار کرتے اس نے پوچھا۔

''یس پاپا! ماما...... چلیں، پاپا آ گئے۔'' اسے جواب دینے کے ساتھ اس نے زور سے خرد کو آواز دی۔ وہ سامنے نظر آتے کمرے کے باہر ہاتھوں میں دو بڑے بڑے سائز کے بیگز پکڑے کھڑی تھی۔ جن خاتون نے کل اس کے لیے یہاں دروازہ کھولا تھا، وہ خرد اور حریم کو رخصت کرنے دروازے تک آئی تھیں۔ خرد ان کی مہمان داری کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

پھر وہ تینوں وہاں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ حریم کو گود میں لیے تیز رفتاری سے سیڑھیاں اتر رہا تھا، جب کہ دونوں بیگز ہاتھوں

میں اٹھائے خرد ان دونوں سے کافی پیچھے تھی۔ وہ وزن اٹھا کر اترا رہی ہے۔ اس بات سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا مگر اس کی بیٹی اب مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی، وہ اس کا سامان خود اٹھانا چاہتا تھا، لیکن ایسا کرنے کے لیے اس سے مخاطب ہونا پڑتا اور اس عورت سے مخاطب ہونا، اس کے ضبط اور اس کی برداشت کا کڑا امتحان ہوا کرتا تھا۔ نیچے آکر جب وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو اس نے حریم کو گود سے اتارا اور اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔

''یہ کار کس کی ہے پاپا؟'' حریم نے گاڑی کو حیرت اور خوشی سے دیکھتے اس سے پوچھا۔

''یہ حریم کی ہے۔'' اس کی حیرت اور بے تحاشا خوشی نے اسے ایک ناقابل برداشت کرب میں مبتلا کیا تھا۔ وہ حریم کے لیے اگلی نشست کا دروازہ کھول چکا تھا۔ جب کہ وہ گاڑی کو شوق اور دلچسپی سے بغور دیکھتی پہلے ہی پچھلی نشست کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

''آؤ بیٹا! بیٹھو۔'' دروازہ کھولے وہ اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔

''پاپا! حریم یہاں بیٹھے گی۔ آگے مام، ڈیڈ بیٹھتے ہیں۔'' اس نے بڑی سمجھداری اور بچے کی بات اسے بتاتے جیسے ساتھ ہی اس کی کم عقلی پر افسوس کرتے اپنے سر پر ہاتھ بھی مارا۔ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی ذہانت، اس کی سمجھداری اسے خوش کر رہی تھی۔

''اچھا.....آپ کو یہ بات کیسے پتا؟'' وہ جھکا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''حریم نے کارٹون پر دیکھا ہے پاپا!'' سر کو دائیں بائیں زور زور سے جھٹکے دے کر وہ کتنی معصومیت سی پیاری پیاری باتیں کرتی تھی۔ اس کی باتوں کو انجوائے کرنے، ان پر مسکرانے کے ساتھ اس کے دل میں نئے سرے سے محرومی سے بھرا ایک احساس بھی جاگا۔ چار سال، چار سال کی ہے اس کی بیٹی، چار سال کی عمر میں وہ اسے ملی ہے اور اس سے پہلے تمام ماہ و سال، تمام روز و شب، وہ اس کی ایسی کتنی معصومانہ باتوں اور شرارتوں کو انجوائے نہیں کر سکا۔ اس کی بیٹی کے پروان چڑھنے کے وہ سارے مرحلے، وہ سارے دن، وہ سب راتیں، جن میں وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہو سکتا تھا، جن میں اسے اپنی بیٹی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ وقت کا وہ ایک ایک لمحہ اس سے اور حریم سے خرد احسان نے چھین لیا تھا۔

''وہ چار سال جو تم نے مجھ سے، حریم سے چھین لیے، ان کا حساب دو خرد احسان! میرا حق تھا اپنی بیٹی کے وجود سے آشنا ہونا، اس کی زندگی کے ہر لمحے میں اس کے ساتھ ہونا، میری بیٹی کا حق تھا، اپنے باپ کو جاننا۔ جو میری ذمہ داریاں تھیں، چار سالوں تک ادا نہ کر سکا، صرف تمہاری وجہ سے۔ جو میری بیٹی کا حق تھا، چار سالوں تک اسے نہ مل سکا صرف تمہاری وجہ سے۔''

حریم پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ خرد نے دونوں بیگز گاڑی کے پاس لا کر رکھے، اس نے وہ دونوں بیگز ڈکی میں رکھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے برابر آگے کی نشست کا دروازہ اس نے کھولا ہوا تھا، پر وہ اس عورت کے لیے نہیں کھولا گیا تھا مگر وہ اس کھلے دروازے سے بغیر کسی ہچکچاہٹ یا شرمندگی کے اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا انداز اتنا غیر متعلق سا تھا جیسے وہ کہیں بھی

بیٹھ جائے، یہ کوئی اہم بات تھی ہی نہیں۔ وہ اس سے اور حریم سے بالکل لاتعلق خاموشی سے بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ حریم، باپ سے کیا کیا باتیں کر رہی ہے، اس سے بھی اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔

''پاپا! Songs لگائیں۔'' حریم کو گانے سننے کا شوق ہو رہا تھا۔ میوزک جیسی تفریحات سے وہ عرصے سے دور تھا۔ کوئی سی ڈی، کوئی کیسٹ گاڑی میں نہ ہونے کے سبب اس نے ریڈیو لگا دیا۔ ایف ایم کا کوئی سا چینل تھا جس پر گانے چل رہے تھے۔ گاڑی اس نے بلڈنگ کے بیس منٹ میں موجود پارکنگ میں لا کر کھڑی کی۔

گاڑی سے اتر کر وہ پیچھے آیا۔ پچھلا دروازہ کھول کر اس نے حریم کو گود میں اٹھالیا اور پھر ڈکی کی طرف آ گیا۔ ان بیگز میں سے ایک بیگ جس پر کچھ کارٹون کریکٹرز بنے ہوئے تھے، اس نے پنک کلر کا وہ بیگ دوسرے ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔ تب تک خرد بھی گاڑی سے اتر چکی تھی۔ وہ ڈکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ خرد نے دوسرا بیگ ہاتھ میں اٹھالیا اور سنجیدہ انداز میں کھڑی رہی۔ حریم کو گود میں لیے اس نے چلنا شروع کیا، تب وہ بھی چلنے لگی۔ وہ اس سے کافی پیچھے چل رہی تھی۔ وہ اس سے بے زار ہے، وہ اس سے نفرت کرتی ہے، وہ اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی، یہ سب کچھ اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھا۔ زندگی میں یہ تماشا شعر حسین واقعی پہلی بار دیکھ رہا تھا جب ایک مجرم اپنے جرم پر شرمندہ ہونے کے بجائے اسی کو نفرت سے یوں دیکھے جیسے ایک مظلوم کسی ظالم کو دیکھا کرتا ہے۔ یہ نجانے ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کا کون سا انداز تھا۔

وہ لفٹ کی طرف آ گیا۔ خرد احسان کے ہاتھ میں موجود بھاری بیگ اسے لفٹ کی طرف لے آیا تھا اور لفٹ کا بٹن دباتے پہلے وہ خود پر جھنجلایا پھر یہ سوچ کر خود پر جھنجلانا بند کیا کہ ایسا اسے اللہ نے بنایا ہے۔ وہ اپنے بدترین دشمن کے ساتھ بھی جواب میں کبھی وہ کچھ نہیں کر سکتا جو اس دشمن نے اس کے ساتھ کیا ہو۔ جو خرد نے اس کے ساتھ کیا، اگر جواب میں وہ بھی وہی کر رہا ہوتا تو اپنی بیٹی کو اس سے چھین کر لے آیا ہوتا۔ آج خرد احسان یہاں اس کے ساتھ نہ آ رہی ہوتی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر وہ حریم کو گود میں لیے اندر داخل ہوا۔

''یہ حریم کا گھر ہے۔ کیسا لگ رہا ہے یہ گھر، اچھا ہے؟''

اندر آ کر اس نے حریم سے کہا۔ وہ دلچسپی سے چاروں طرف نظریں گھماتی اپنے اس نئے گھر کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم ریحانہ آنٹی کے گھر نہیں جائیں گے؟''

''اب سویٹ ہارٹ، تم کہیں بھی نہیں جاؤ گی۔ ہمیشہ پاپا کے ساتھ رہو گی۔ یہ ہمارا گھر ہے، پاپا بھی یہیں رہیں گے اور پاپا کی پرنسس بھی یہیں رہے گی۔'' وہ پیار سے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے بولا۔

''اور ماما بھی تو...... ہیں نا ماما؟'' حریم نے فوراً ہی کہا اور فوراً ہی پاس کھڑی خرد سے تصدیق بھی چاہی۔

خرد جواب میں لاتعلقی اور خاموشی سے کھڑی رہی تو ایک گہری سانس لیتے ہوئے اسے آہستگی سے حریم کو جواب دینا پڑا۔

''ہاں، تمہاری ماما بھی۔''

''پہلے کچھ دیر بیٹھنا ہے یا پہلے سارا گھر دیکھنا ہے؟''

''گھر دیکھنا ہے پاپا!'' خرد کو وہیں چھوڑ کر وہ حریم کو اپنے ساتھ اندر لے آیا تھا۔ اس کی گود سے اتر کر اب وہ خود چلتی اس سے پہلے ہر کمرے میں بہت شوق سے داخل ہو رہی تھی۔ دلچسپی سے سب چیزوں کو دیکھ رہی تھی ڈرائنگ روم۔ لیونگ روم۔ کچن۔ بالکونی اور دیگر سب جگہیں دکھا لینے کے بعد وہ آخر میں حریم کو لے کر اس کمرے میں آ گیا جو اس نے بڑی محبت سے خاص طور پر اس کے لیے تیار کیا تھا۔ فرنیچر پہلے سے موجود تھا تو اس نے کارپٹ۔ کشنز وغیرہ سے لے کر دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا یہاں ایسا اہتمام کیا تھا جنہیں دیکھ کر حریم خوش ہو۔ حریم آنکھوں میں بے تحاشا دلچسپی لیے اس کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بیڈ پر تکیے کی جگہ رکھے Pooh کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی پھر جب بیڈ پر چڑھ کر اسے ہاتھ میں لیا تو پتا چلا کہ وہ تکیہ ہی ہے۔ خوش ہو کر ''وِنی دا پوہ'' کا نعرہ لگاتے وہ اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''تھک گئیں؟'' اس کے استفسار پر حریم نے ہنستے ہوئے نفی میں زور و شور سے گردن ہلائی۔ اپارٹمنٹ کے اندر آ کر سب کمرے میں دیکھنے میں جو اتنا تھوڑا سا وہ چلی تھی۔ اس تھوڑے سے چلنے ہی سے اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ جیسے اسے میلوں دوڑایا گیا ہے۔ وہ متفکر ہوا مگر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہونے لگی۔ اس کی طبیعت نارمل ہوتی دیکھ کر وہ خود بھی بیڈ پر اس کے برابر لیٹ گیا۔ حریم نے اچانک ہی پورے حق کے ساتھ اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ بیٹی کی اس محبت بھری ادا پر اس کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ کم از کم انسانیت کی اتنی رمق تو باقی تھی خرد احسان میں کہ اس نے حریم کو اس کے باپ سے کسی نہ کسی طرح متعارف کروا رکھا تھا۔ وہ حریم کے ماتھے پر آیا پسینہ ہاتھ سے آہستہ آہستہ صاف کرنے لگا اور دوسرا ہاتھ اس کے گرد اس نے یوں لپیٹ رکھا تھا جیسے اسے اپنی بانہوں میں چھپا کر دنیا کی ہر آزمائش سے بچا لینا چاہتا ہو۔ حریم کو اپنے سینے سے لگائے وہ کچھ دیر یونہی اس کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''بھوک لگی ہے حریم! کچھ کھاؤ گی؟'' اس نے فوراً سر اقرار میں ہلایا۔

''کیا کھاؤ گی؟''

''نوڈلز اور کیچ اپ اور ایپل جوس اور اسٹرابری آئس کریم۔'' وہ اس کی اس بے تکلفانہ سی لسٹ پر مسکرا دیا۔

''تمہارے لیے یہ سارا کھانا تو پھر مجھے جا کر لانا پڑے گا۔ کل سے یہاں پر ایک میڈ آ جائے گی۔ تمہیں جو کھانا ہو، اسی سے پکوا لینا اور اپنے باقی سارے کام بھی۔''

''کھانا ماما پکائیں گی پاپا!'' حریم کو ماما کا کھانا اچھا لگتا ہے۔''

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموشی سے بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ اس عورت کو اپنی بیٹی کی زندگی سے نکال کر کہیں دور نہیں پھینک سکتا تھا۔ حریم ساتھ ہو گی، تو وہ بھی ہو گی۔

وہ حریم کو آرام کرنے کا کہہ کر خود گاڑی کی چابی لے کر اٹھ گیا۔ باہر نکل کر اس نے دیکھا تو خرد اسے سامنے ہی لیونگ روم میں صوفے پر بیٹھی نظر آئی۔ بیگ اپنے پیروں کے پاس رکھ کر وہ صوفے پر بالکل لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ یوں جیسے اسے اس جگہ اور اس منظر سے کوئی

دلچسپی نہ ہو۔

''حریم کو ڈاکٹر نے کچھ خاص پرہیز تو نہیں بتایا ہوا؟'' اسے مخاطب کرنا مجبوری تھی سو بحالت مجبوری اس نے بے تاثر لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس نے بھی اسی خشک انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

پھر کھانا لا کر اس نے خود ہی ڈائننگ ٹیبل پر سب کچھ لگایا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی حریم بھی کمرے سے نکل آئی تھی مگر اس بار اس نے اسے چلنے پھرنے سے منع کر کے کچن میں کاؤنٹر پر چڑھا کر بٹھا دیا تھا۔ ٹیبل پر سب کچھ لگا چکا تو اس نے حریم کو گود میں اٹھا لیا اور اسے ڈائننگ ٹیبل پر لے آیا۔

''اپنی ماما کو بلاؤ۔'' ڈائننگ روم اور لیونگ روم کے بیچ کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ وہ اتنی دیر سے یہیں بیٹھی برتنوں کی کھٹر پٹر یقیناً سن رہی تھی مگر گردن گھما کر اس سمت اس نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔

''ماما! کھانا کھالیں۔'' اس نے چیئر پر بیٹھتے ہوئے ماں کو آواز دی۔

''تم کھالو حریم! مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔''

یہ حق وہ عرصہ دراز پہلے کھو چکی تھی کہ وہ اس کے نخرے اٹھاتا۔ اس کی ناز برداریاں کرتا۔ نہیں کھا رہی تو نہ کھائے۔ وہ اس پر اور اس کے نخروں پر چار حرف بھیجتا کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک اچھے سے چائنیز ریسٹورنٹ سے وہ حریم کے لیے بہت مزے کے نوڈلز لایا تھا جس میں چکن اور ویجیٹیبلز بھی شامل تھے۔ اس نے حریم کے لیے پیالے میں نوڈلز ڈالے اور کیچ اپ کی بوتل جو وہ خرید کر ساتھ لایا تھا وہ بھی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ حریم نے نوڈلز پر کیچ اپ ڈلوانا چاہا تو اس نے تھوڑا سا کیچ اپ اس کے پیالے میں نوڈلز کے اوپر ڈال دیا۔

''پاپا! کیچ اپ اور.....'' وہ تھوڑا سا ڈال کر بوتل واپس بند کرنے لگا تو وہ فوراً بولی۔

''یہ آپ نوڈلز کے اوپر کیچ اپ ڈال کر کھا رہی ہیں یا کیچ اپ میں تھوڑے سے نوڈلز ملا کر کھا رہی ہیں؟'' کیچ اپ اس کے پیالے میں مزید ڈالتے وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''حریم کو کیچ اپ اچھا لگتا ہے پاپا! ماما اتنا اچھا کیچ اپ بناتی ہیں۔ حریم وہ سارا Finish کر دیتی ہے۔'' نوالہ منہ میں رکھتے اس نے جواب دیا۔ اس کے اوپری ہونٹ کے اوپر جو کیچ اپ لگ گیا تھا وہ اسے اور کیوٹ بنا رہا تھا۔

''جب میں تمہارے جتنا تھا تو مجھے بھی کیچ اپ بہت اچھا لگتا تھا۔ میری ماما بھی کیچ اپ بہت اچھا بناتی تھیں مگر میں کیچ اپ کے ساتھ ساتھ باقی کھانا بھی کھاتا تھا۔'' اس کے لیے گلاس میں ایپل جوس ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ حریم زبان سے ہونٹ کے اطراف لگا کیچ اپ صاف کرتے ہوئے اس بات پر بہت حیران ہوئی۔

''ماما؟ پاپا کی ماما......؟'' وہ اس کے حیرت بھرے بچکانہ انداز سے جی بھر کر محظوظ ہوا۔ پھر اپنی حیرت میں مریم نے دور بیٹھی خرد کو

بھی شامل کرنا چاہا۔

''ماما! پاپا کی ماما؟''

''حریم! باتیں مت کرو۔ کھانا جلدی ختم کرو۔ پھر تمہیں میڈیسن بھی لینی ہے۔'' وہ اپنی لاتعلقی اور بے گانگی ترک کر کے ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھی اور حریم کے پاس آ کر غصے سے بولی۔

پھر حریم کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھی اور حریم کے ہاتھ سے چمچہ اور کانٹا لے کر خود اسے جلدی جلدی کھانا کھلانے لگی۔

''ماما! کیچ اپ اور......'' اور منمنائی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے جو پلیٹ میں یہ ڈھیر لگا رکھا ہے اسے ختم کرو۔'' الفاظ سے بھی زیادہ اس کا لہجہ اور نگاہیں غصے سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے غصے کو بمشکل پیتا۔ حریم کی طرف دیکھ کر بدستور مسکرا رہا تھا جو ماں کے غصے سے خائف سی ہوتی جلدی جلدی کھانا کھانے لگی تھی۔ اسے اپنے لیے نہیں اپنی بیٹی کے لیے اس عورت پر غصہ آیا۔ اس کی بیٹی معصومانہ باتیں کرتی باپ کے ساتھ اپنا پہلا ڈنر انجوائے کر رہی تھی اور اس سنگ دل عورت نے اس کے چہرے کی ہنسی بجھا کر اس پر ڈر اور خفگی طاری کر دی۔ ماں کے غصے سے ڈری حریم اس کے ہاتھوں سے بہت جلدی جلدی پیالے میں موجود سب نوڈلز ختم کر چکی تھی۔ خرد اسے فوراً ہی کرسی سے اٹھانے لگی۔

''ماما! حریم کی سویٹ ڈش۔''

حریم نے اٹھنے سے انکار کرتے کچھ احتجاجی انداز میں کہا۔ حریم نے اس سے اسٹرابیری آئس کریم کی فرمائش کی تھی۔ حریم کے لیے کھانے کا کوئی پرہیز نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کے کھانے میں نمک کی مقدار کم ہو اور چکنائی اس کی خوراک میں شامل نہ ہو۔ حریم کے لیے آئس کریم لانا اسے ٹھیک نہ لگا تو آئس کریم کے متبادل کے طور پر وہ اس کے لیے فروزن اسٹرابری یوگرٹ لے آیا تھا جو کہ فیٹ فری بھی تھا۔ اور حریم کے لیے اسٹرابیری آئس کریم کا ایک بہترین اور صحت مند متبادل بھی وہ دیگر بھی کئی فلیورز لے آیا تھا۔

''بس اب سویٹ ڈش کل کھا لینا۔ تمہاری دوا کو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی کھانے بیٹھیں تو تمہاری میڈیسن اور نیند دونوں اور بھی لیٹ ہو جائیں گے۔''

حریم کو مزید کسی احتجاج کا موقع دیے بغیر اس نے اسے گود میں اٹھایا اور سیدھی اس کمرے میں لے گئی جو اشعر نے حریم کے لیے سجایا تھا۔ اس کا کھانا کھانے کا موڈ مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ اپنی پلیٹ میں موجود کھانا یونہی چھوڑ کر وہ میز پر سے اٹھ گیا۔ شیشے کا سلائیڈنگ ڈور کھول کر وہ بالکونی میں نکل آیا۔ ریلنگ پر اپنے بازوؤں کا وزن ڈالے وہ سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو بے توجہی سے کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ یونہی کھڑے کھڑے اسے سگریٹ کی طلب ہوئی تو اپنے کمرے سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھانے کے لیے وہ بالکونی سے واپس اندر آیا۔ اس کے بالکل ساتھ والا کمرہ حریم کا تھا اور اس کمرے کے پاس سے گزرتے اسے خرد کی غصیلی آواز سنائی دی تھی۔

''حریم! میرا دماغ مت خراب کرو۔ دوائی کھانے میں اتنے نخرے۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے تمہاری منتیں کرتے۔ اب اگر تم نے مجھے

تنگ کیا اور دوا نہیں لی۔ تو میں واقعی تمہیں ماروں گی۔''

وہ ایک زوردار دھماکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ حریم اور خرد دونوں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ خرد ایک ہاتھ میں چمچہ جس میں کوئی سیرپ لیے کھڑی تھی۔ حریم بیڈ پر منہ بسورے بیٹھی تھی۔ وہ کھانے کے وقت سے ضبط کر رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں کا اور کس کس کا غصہ وہ اس معصوم بچی پر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک دم بہت تیزی سے حریم کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھالیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا۔

''موڈ کیوں آف ہے میری پرنس کا؟'' مسکراتے ہوئے اس نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اس کا چہرہ ہاتھ سے پکڑ کر اپنے بالکل سامنے کیا۔

''پاپا!'' باپ کو اپنا ہمدرد پا کر اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور وہ آنسو دیکھ کر اشعر حسین کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے دل میں سوئیاں چبھو رہا ہو۔ جیسے کسی نے اس کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہو۔

''پاپا! ماما دوا دے رہی ہیں۔ پاپا دوا کروی ہوتی ہے۔'' وہ اس کے آنسو صاف کرتا اسے پیار کر رہا تھا جب وہ کڑوی کو کروی بولی۔ ''ڑ'' کی جگہ۔ ر۔ بولنے کا اس کا انداز اتنا پیارا سا تھا کہ باوجود شدید ترین غصے کے وہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔

''ہاں دوا کروی تو ہوتی ہے مگر کھانی تو پڑے گی پرنس۔ ورنہ جلدی سے ٹھیک کیسے ہو گی۔ ہوں؟'' وہ اس کی ناک سے اپنی ناک ملائے ہنستے ہوئے بولا۔

''اچھا یوں کر لیتے ہیں کہ پہلے ہم دوا لے لیتے ہیں اور پھر فوراً اسٹرابری یوگرٹ کھالیں گے۔ وہ اتنی میٹھی اور اتنی ٹیسٹی ہو گی کہ اسے کھا کر پھر پتا ہی نہیں چلے گا کہ دوا کتنی کروی تھی۔''

وہ اسی کے سے انداز میں بولا۔ پھر اسے گود میں لیے کمرے سے باہر کچن میں آ گیا۔ فریزر سے ایک کپ اور کٹلری کے اسٹینڈ سے ایک چمچہ لے کر وہ اسے گود میں اٹھائے واپس کمرے میں آ گیا۔ جہاں ہاتھ میں دوا سے بھرا چمچہ لیے خرد ابھی تک کھڑی تھی۔

''دوا دو......'' بغیر دیکھے اس نے سرد لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے چمچہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''جلدی سے۔ شاباش۔ تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میری پرنس کتنی بہادر ہے۔'' اسے پیار کرتے بہلاتے اس نے چمچہ اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ پھر خود کو بہادر ثابت کرنے کے لیے یا شاید اس ٹھنڈی میٹھی اسٹرابیری یوگرٹ کے لالچ میں اس نے منہ کھول دیا۔''

''دوا کروی ہے پاپا! سوئیٹ ڈش دیں۔'' ابھی چمچ منہ میں گیا بھی نہیں اور اس نے کڑوے ہونے کا شور مچا دیا تھا۔ اس نے فروٹ یوگرٹ کا ایک چمچہ بھر کر پکڑا ہوا تھا۔ دوا حلق سے اترنے بھی نہیں پائی ہو گی کہ حریم نے وہ چمچہ جھٹ منہ میں لے لیا۔ بغیر دیکھے یا کچھ کہے اس نے خرد کی طرف دوسری دوا مانگنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''بس اور نہیں دینی۔'' باقی دوا شاید وہ پہلے ہی دے چکی تھی۔ حریم اب کپ اپنے ہاتھ میں لیے جلدی جلدی یوگرٹ کھا رہی تھی۔

خرد حریم کو اس کی گود سے اٹھانے لگی تو خفگی سے منہ پھیر کر اس نے اس کے کندھے پر منہ چھپا لیا۔

''حریم! دانت برش کر کے سونا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔''

''حریم آپ سے کٹی ہے۔ پاپا اچھے ہیں۔ پاپا حریم کے فرینڈ ہیں۔''

''پاپا کے ساتھ سوؤ گی حریم......؟'' اس نے آہستہ سے اس سے کان میں پوچھا۔ اس کے کندھے میں منہ چھپائے چھپائے اس نے سر کو زور زور سے اقرار میں ہلایا۔

وہ اسے گود میں اٹھائے وہاں سے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر لٹا کر اے سی چلایا اور پھر خود اس کے برابر میں تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر اس نے منہ میں دبائی سگریٹ کو شعلہ دکھانے ہی لگا تھا کہ اس کی حریم کے چہرے پر نظر پڑی۔ وہ آنکھیں حیرت سے وا کیے بڑی معصومیت اور دلچسپی سے اس کی اس تمام کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔ جتنی کثرت سے وہ راتوں کو جاگ جاگ کر سگریٹس پیا کرتا تھا۔ وہ اس کی صحت کو کس طرح متاثر کرے گا' یہ پرواہ اسے کبھی نہیں رہی تھی۔ مگر سگریٹ کا یہ دھواں اس کی بیمار بیٹی کی صحت پر کیا اثرات ڈالے گا۔ یہ فکر اسے ایک پل میں لاحق ہوئی تھی۔ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا تھا اسے اس شعلے کو بجھانے میں۔ بڑی بے اختیاری کی کیفیت میں اس نے ایک لمحے میں سگریٹ واپس منہ سے نکالی تھی۔ سگریٹ اور لائٹر دونوں دوبارہ میز پر رکھ دیے تھے۔ حریم کے من موہنے چہرے کو محبت سے تکتا وہ اس کے برابر میں لیٹ گیا۔ وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ شاید اسے ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

''حریم......نیند نہیں آ رہی......؟''

اس نے سر اقرار میں ہلایا پھر فوراً ہی اس سے کہا۔ ''پاپا۔ کہانی سنائیں۔'' اس نے اپنا ننھا منا سا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

''کہانی......؟'' وہ ایک پل کے لیے چپ ہوا۔ پھر اس کی آنکھوں میں کہانی سننے کی خواہش کو دیکھتے سر اثبات میں ہلا گیا۔ یہ کام زندگی میں کبھی کیا نہیں تھا مگر کوشش کر کے وہ یاد کر کر کے جانوروں کی ایک کہانی اسے سنانے لگا۔ لیکن کچھ ہی دیر میں حریم کے چہرے پر جوش و خروش کم ہوتا نظر آنے لگا تھا۔

''کیا ہوا پرنسس......کیا کہانی اچھی نہیں ہے......؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''ماما کے پاس جانا ہے۔'' بغیر ہچکچاہٹ کے اس نے اسے اپنی بے چینی کی وجہ بتا دی۔ ابھی ماں سے ناراض ہو کر' اس سے منہ پھلا کر اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور اب تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ وہیں جانا تھا۔ وہ ماں اس کی بیٹی کے لیے اتنی زیادہ ناگزیر ہے۔ یہ احساس دل کو خوشی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی مجبوری تھی بیٹی کی خواہش پوری کرنا۔ وہ حریم کو گود میں اٹھا کر واپس اسی کمرے کے پاس آ گیا۔ اس بار اس دروازے پر ناک کیا تھا۔ شرعی اور قانونی لحاظ سے یہ عورت ابھی بھی اس کی بیوی تھی جس نے اس کے ناک کرنے پر دروازہ کھولا تھا۔ اسے اگنور کرتا وہ سائڈ سے نکل کر کمرے کے اندر آ گیا اور حریم کو بیڈ پر لٹا دیا۔ خرد واپس بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ حریم کو لٹا کر اسے پیار کرتا وہ

وہاں سے ہٹنے لگا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پاپا......اسٹوری تو Finish کریں۔''

''پرنسس! اب باقی کی اسٹوی کل سنیں گے' ٹھیک ہے......؟''

''نہیں آج۔'' وہ ضدی انداز میں بولی۔

اس نے خرد کی طرف تھوڑا سرکتے بیڈ پر اشعر کے لیے جگہ بنائی اور بولی۔''پاپا۔اسٹوری۔''

''سوئٹ ہارٹ۔باقی اسٹوری کل سن لیں گے۔ابھی تمہیں سونا ہے ناں۔''

''اسٹوری سنائیں' نہیں تو حریم روئے گی۔''

اس دھمکی پر ہار مان کر مسکراتا وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔''ہاں تو ہم کہاں پر تھے؟'' اس نے حریم سے پوچھا۔

''ایسے نہیں۔لیٹ کر سنائیں۔'' اس بار بغیر حجت اس کی ضد سے پہلے ہی ہار مان کر وہ اس کے پاس لیٹ گیا۔

''ماما۔پاپا کو Animals کی بہت اچھی اسٹوری آتی ہے۔'' اس نے بیڈ کے دوسرے کونے پر لاتعلق بیٹھی خرد کو مخاطب کیا۔وہ جواباً کچھ نہ بولی۔

''ماما۔ادھر آئیں ناں۔لیٹیں ناں۔'' حریم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی لاتعلقی سے باہر نکال کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

کچھ دیر قبل اس معصوم بچی پر بلاوجہ غصہ اتارتی۔خرد نے اس بار مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کی ضد پر اسے ڈانٹنے یا اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس کے کچھ قریب ہوگئی۔وہ لیٹی نہیں تھی ہاں مگر وہ حریم کے قریب ضرور ہوگئی تھی۔وہ بیڈ پر بہت فارمل طریقے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ٹانگیں سمیٹ کر بالکل سیدھی۔حریم ان دونوں کے بیچ میں مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔ایک ہاتھ اس نے اشعر کے اوپر رکھا ہوا تھا اور دوسرے سے مضبوطی سے خرد کو پکڑ رکھا تھا۔وہ اسے کہانی سنانے لگا تھا اور کہانی صرف دس۔بارہ منٹ سن کر ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔خرد آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی اور صرف چند منٹوں ہی میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

اس کے سونے کے بعد وہ ایک سیکنڈ میں اس کمرے سے باہر آ گیا تھا۔اس عورت کے ساتھ ایک کمرے میں اپنی موجودگی اس کی برداشت کا کڑا امتحان تھی۔آج جو رویہ اس نے صرف اس پر اپنا غصہ اور اپنی نفرت ظاہر کرنے کے لیے حریم کے ساتھ اپنایا۔وہ اس پر اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔مگر حریم کی نیند خراب نہ ہو اس خیال سے اس وقت کچھ کہا نہیں تھا۔

صبح وہ معمول کے مطابق اپنے وقت پر بے دار ہوا۔اپنے کچھ کپڑے اور ضروری سامان وہ کل گھر سے یہاں لے آیا تھا' اس لیے آرام سے آفس جانے کے لیے تمام تیاری کرلی۔کچن میں آ کر ناشتے کے طور پر اس نے فریج میں دودھ کا ڈبا نکالا اور اس میں سے ایک گلاس ٹھنڈا دودھ یونہی بغیر شکر ملائے پی لیا۔

کچن سے نکل کر اس نے کوٹ پہنا۔بریف کیس۔موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔اپارٹمنٹ سے نکلنے سے قبل وہ حریم کے

کمرے میں آیا۔ اس نے آہستگی سے دستک دی۔ خرد جاگی ہوئی ہی تھی تب ہی اس ہلکی سی دستک پر اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ حریم کروٹ لیے خوب گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آیا۔ بہت آہستگی سے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور پھر خرد کو اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کرتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ اس کے پیچھے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

''آج دوپہر دو بجے کا ڈاکٹر عابد انصاری کے پاس اپائنٹمنٹ لے رکھا ہے میں نے۔ اسے لنچ کرا کر تیار رکھنا میں ایک۔ سوا ایک بجے تک آ جاؤں گا۔ اس کا اب تک جو جو ٹریٹمنٹ ہو چکا ہے اور جو کچھ میڈیسنز اسے دی جاتی رہی ہیں ان سب کی Details (تفصیل) اور اس کے اب تک ہوئے تمام ٹیسٹوں کی رپورٹس سب کچھ تیار رکھنا۔'' اس نے سرد لہجے میں اس سے کہا۔ خرد کے چہرے پر اس وقت لاتعلقی نہیں تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ ہاں اس کی طرف دیکھنے والی اس کی نگاہیں ضرور سپاٹ اور بے تاثر تھیں۔

''میں نے حریم کے لیے ایک میڈ کا بندوبست کیا ہے۔ زینت خاتون نام ہے اس کا۔ شاید ابھی ایک۔ دو گھنٹے میں وہ یہاں آ جائے گی۔ اس کے آ جانے کے بعد حریم کے سارے کام وہ کیا کرے گی۔ میرے بیٹی اسے نخرے دکھائے یا اس کا وقت برباد کرے۔ میں اسے اس سب کی تنخواہ دوں گا۔ تمہیں اب میری بیٹی کے کاموں اور اس کے دوا نہ لینے پر چڑنے اور غصہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل رات میں نے برداشت کر لیا۔ آئندہ کبھی تم اس پر چلائیں اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔''

اس کے لہجے میں برف کی سی ٹھنڈک تھی اور اس کے تاثرات دوٹوک اور نفرت سے بھرے۔ اپنی بات ختم کر کے' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس شام وہ آفس سے قدرے جلدی آ گیا تھا۔ بصیرت حسین تو اپنے معمول کے مطابق پہلے ہی گھر آ چکے تھے۔ یہ شام کی چائے کا وقت تھا۔ چنانچہ خرد ان لوگوں کے لیے چائے اور اس کے ساتھ چند ایک ہلکے پھلکے سے اسنیکس لے آئی تھی۔ ابھی ان لوگوں نے چائے پینی شروع ہی کی تھی کہ فریدہ بھی گھر آ گئیں۔

''اچھے وقت پر آ گئیں۔ آ جاؤ چائے پیو۔'' چیز کیک کھاتے بصیرت حسین نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''اگر چائے خرد نے بنائی ہے تو پیوں گی۔ ورنہ نہیں۔'' پرس اور گاڑی کی چابی سینٹر ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ تعریف پر خرد بے ساختہ مسکرائی تھی۔

''چائے بھی میں نے بنائی ہے ممی اور یہ چیز کیک بھی۔ آپ چکھ کر بتائیں۔ کیسا بنا ہے۔'' خرد بصیرت حسین کو ابھی بھی ماموں ہی کہتی تھی جبکہ فریدہ نے شادی کے ابتدائی کچھ عرصے بعد ہی خود کو ممانی کہنے سے روک دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ انہیں اپنی بہو کے منہ سے خود کو ممانی کہلوانے سے اجنبیت اور فاصلے کا احساس ہوتا ہے۔ سو ان کی خواہش پر خرد انہیں اشعر ہی کی طرح ممی کہنے لگی تھی۔ بصیرت حسین ہوں یا فریدہ دونوں ہی کو چائے اور کافی صرف اور صرف خرد ہی کے ہاتھ کی پسند آتی تھی۔

شام کی چائے پر تو سب کا اکٹھا ہونا بہت ہی کبھی کبھار ہوا کرتا تھا۔ ہاں رات کے کھانے کے بعد یا چھٹی والے دن ضرور خرد سے فرمائش کر کے چائے یا کافی بنوا کر وہ دونوں پیا کرتے تھے۔ فریدہ نے خرد کا بنایا کیک چکھنا شروع کیا۔ وہ ڈائٹ کانشس تھیں جم جاتی تھیں۔ بھرپور ایکسرسائز اور یوگا کرتی تھیں۔ کھانے پینے میں کیلوریز کا پورا پورا دھیان رکھتی تھیں۔ مگر یہ کیک چونکہ خرد نے خود بنایا تھا' اس لیے وہ اسے تھوڑا سا چکھنے لگی تھیں۔ اتنی دیر میں خرد ان کے لیے چائے نکال چکی تھی۔

اس نے ان کے ہاتھ میں کپ پکڑا دیا اور خود بھی چائے پینے لگی۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ وہ سب ساتھ مل کر شام کی اس چائے کو انجوائے کر رہے تھے۔ ابھی فریدہ نے چائے کا کپ خالی کر کے واپس ٹرے میں رکھا ہی تھا کہ نورافزا نے ان کی کچھ ملنے والی خواتین کی آمد کی اطلاع دی۔

''میری بہت اچھی جاننے والی ہیں۔ اسلام آباد سے آئی ہوئی ہیں' آؤ خرد! تمہیں بھی ملواؤں۔'' انہوں نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے خرد کو بھی اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں آنے کے لیے کہا۔

وہ دونوں ساس' بہو ڈرائنگ روم میں چلی گئیں تو حسب عادت ان کے درمیان دفتری معاملات زیر گفتگو آ گئے تھے۔

''تم خرد کے ساتھ خوش ہو ناں اشعر؟'' بزنس کی باتیں کرتے کرتے انہوں نے اچانک ہی اس سے پوچھا۔

''آپ کو کیسا لگتا ہوں......؟'' ان کے یک دم ہی موضوع تبدیل کرنے پر لمحہ بھر حیران ہونے کے بعد وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔

''لگتے تو خوش ہو۔'' وہ بھی جواباً مسکرائے۔

''پھر تو آپ کو بالکل غلط لگتا ہے۔'' ان کی بات کی سنجیدگی سے نفی کر کے اس نے ایک پل کا توقف کیا اور پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔

''میں صرف خوش نہیں۔ بلکہ بہت بہت بہت زیادہ خوش ہوں۔ آپ کا انتخاب بہترین ہے ڈیڈی! میں خود اپنے لیے ڈھونڈنے نکلتا تو ایسی لڑکی کبھی نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ وہ تو بہت انمول' بہت نایاب سی ہے دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔''

بصیرت حسین طمانیت بھرے انداز میں سرشاری سے مسکرائے ''تمہیں خرد کے ساتھ خوش دیکھ کر میں بہت خوش ہوں اشعر۔ ورنہ شادی کے بعد شروع میں تم مجھے جتنے الجھے ہوئے اور ناخوش نظر آتے تھے اس سے ہر پل میرے اندر ایک مجرمانہ احساس کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید اچھا بھائی ہونے کا ثبوت دیتے۔ میں ایک بہت برا باپ ثابت ہو گیا ہوں۔''

انہوں نے توقف کیا۔

''خرد۔ مجھ سے تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہے۔ پتا ہے تمہیں......؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ ''اور اب تم نے اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا ہے' اس سے تو وہ بہت زیادہ خوش ہے۔''

خرد کی خوشی کو تو وہ بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ یونہی رواروی میں وہ اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوانے کی بات کر گیا تھا اور اب اتنے دنوں بعد اپنی اس رات کی اسے ماسٹرز میں ایڈمیشن دلوانے کی بات اسے بھول بھی چکی ہو گی مگر ایڈمیشن شروع

ہونے پر جب اس نے خرد سے ایڈمیشن لینے کی بات کی تب اس کی حیرت اور پھر خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''تم اور خرد ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہو۔ میرا دل یہ دیکھ کر بہت خوش ہے۔ اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تم دونوں یونہی ہنسی خوشی زندگی گزارو۔ اپنی اولاد کو خوش دیکھنے سے بڑی خوشی والدین کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بس اب اللہ سے دعا ہے' وہ مجھے میرے پوتا پوتی کی خوشی اور دکھا دے۔ پھر ایسا لگے گا جیسے دنیا کی ساری نعمتیں مجھے مل گئیں۔''

وہ باپ کی محبت بھری دعاؤں کو بڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا مگر اپنے دعائیہ جملوں کے اختتام پر جو بات انہوں نے کہی' اسے سنتے اس کے ذہن میں بے ساختہ خرد آئی۔ اگر ابھی وہ یہاں موجود ہوتی تو ڈیڈی کی دعا کے اس آخری حصے پر اس کا کیا ردعمل ہوتا۔ اس کا بے تحاشا سرخ پڑتا چہرہ اس کے تصور میں آ کر اسے ہنسنے پر مجبور کر رہا تھا اور وہ اپنی ہنسی بمشکل باپ سے چھپا رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے دفتری کام سے لندن گیا تھا۔ مگر خرد کے لیے کچھ شاپنگ کیے بغیر وہ کیسے واپس آ سکتا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے خرد سے پوچھا کہ وہ اس کے لیے کیا لائے تو وہ...... پکی مشرقی بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ''کچھ بھی نہیں۔ بس آپ خیریت سے واپس آ جائیں، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔'' کہہ کر بات ختم کر دیتی تھی۔

اس نے لندن میں مختلف جگہوں پر جو۔ جو کچھ سمجھ آیا۔ وہ سب اس کے لیے لے ڈالا۔ ڈیزائنر سوٹرز۔ ہینڈ بیگز، سن گلاسز، قیمتی پرفیومز، میک اپ کا سامان اور بھی کافی کچھ۔ مگر جو سب سے خاص اور سب سے قیمتی چیز اس نے اس کے لیے لی، وہ ایک نیکلس تھا۔ خرد کی سالگرہ آنے والی تھی اور وہ یہ نیکلیس اسے اس کی برتھ ڈے پر دینا چاہتا تھا۔ وائٹ گولڈ کی بہت وزنی چین تھی جس میں بیضوی شکل کا ڈائمنڈ اور زمرد سے مرصع نازک سا لاکٹ لٹک رہا تھا۔ بے حد خوب صورت اور نفیس تھا۔ وہ لاکٹ درمیان سے کھلتا تھا اور ایک شرارت بھری مسکراہٹ آنکھوں میں لیے اس نے اس کے دونوں طرف اپنی ہی تصویریں لگائی تھیں۔

اس کے واپس آنے کے اگلے روز خرد کی سالگرہ تھی اور اس روز اس نے وہ نیکلس خود اپنے ہاتھوں سے اسے پہنایا تھا اور خود جیولری باکس ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

''خبردار ابھی آنکھیں نہیں کھولنیں۔'' نیلے رنگ کے باکس میں سے نیکلس باہر نکالتے اس نے اسے تنبیہہ کی۔ وہ اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔

''ہاں۔ اب آنکھیں کھولو۔'' بڑی محبت سے وہ نیکلس اس نے اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا تھا۔ وہ چین کا لاک لگا رہا تھا اور خرد اپنی گردن میں سجے اس خوب صورت سے نیکلس کو اور کبھی آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی بکھری ہوئی تھی۔

نیکلس پر آہستگی سے ہاتھ پھیرتے اسے یہ احساس ہوا کہ لاکٹ کھل سکتا ہے تو اس نے فوراً ہی لاکٹ کو کھول لیا۔ وہ متبسم نگاہوں

سے اسے دیکھ رہا تھا۔''اس میں میری تصویر کیوں نہیں؟ دونوں طرف اپنی تصویر کیوں لگائی؟''

''تاکہ تمہارے آس پاس ہر طرف بس میں ہی رہوں۔تم خود اتنی اپنے پاس نہ ہو، جتنا میں تمہارے پاس ہوں۔ چاہو تو میری سالگرہ پر اپنی تصویر والا ایسا ہی کوئی گفٹ تم بھی مجھے دے دینا۔''

پھر اس سالگرہ کو ذرا اور اچھی طرح منانے وہ اسے ایک اچھے سے ہوٹل ڈنر کرانے لے آیا تھا۔ بہت رومینٹک سا کینڈل لائٹ ڈنر۔خرد نے سرخ رنگ کا بہت خوبصورت لباس پہنا تھا اور بالوں کو اس کی فرمائش پر کھلا رہنے دیا تھا۔اس کی گردن میں اس کا گفٹ دیا نیکلس سج رہا تھا تو دائیں ہاتھ میں فریدہ کا دیا ہوا بریسلٹ۔خرد کو آج اپنی سالگرہ کے موقع پر ساس اور سسر سے بھی سرپرائز گفٹس ملے تھے بصیرت حسین کی تو وہ تھی ہی لاڈلی چہیتی بھانجی۔وہ اسے بہو کی حیثیت سے زیادہ ابھی بھی بھانجی کے رشتے ہی سے پیار کرتے تھے اور فریدہ جن کے ساتھ شادی کے بعد کے ابتدائی دنوں میں خرد اسی طرح دور دور اور کھنچی کھنچی رہتی تھی جیسے اس کے ساتھ، اب وہ ان کے بھی کافی نزدیک ہوگئی تھی۔شروع میں فریدہ اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں تھیں۔ان کا اعتراض یہ تھا کہ جب ان میاں بیوی نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ان کے زندگی کے ساتھی چننے کی پوری پوری آزادی دی تھی تو پھر بیٹے کے ساتھ یہ جبر کیوں؟ مگر اشعر اور خرد کی شادی کے ابتدائی ایک دو ماہ بعد ہی خرد کی عادات اور اس کے مزاج کی خوبیاں جب ان پر ظاہر ہوئیں تو خود بخود ہی ان ساس، بہو کے بیچ حائل دوری اور تکلفات بھی دور ہوتے چلے گئے۔سونے کا وہ خوبصورت بریسلٹ جو فریدہ ہر وقت پہنے رہتی تھیں۔خرد نے کسی وقت اس کی ان سے تعریف کر دی تھی۔اس وقت تو انہوں نے اس کی تعریف پر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔مگر آج اس کی سالگرہ پر انہوں نے اپنے جیولر سے بالکل اپنے بریسلٹ جیسا ہی ایک بریسلٹ خرد کے لیے بنوا کر اسے تحفے میں دیا تھا۔ان کے دیے بریسلٹ کا یہ تحفہ بہت قیمتی تھا۔مگر خرد کے لیے اس کی اصل قیمت وہ محبت تھی جس کے ساتھ انہوں نے وہ اسے دیا تھا۔

سجی سنوری خرد اس کے ساتھ بیٹھی اپنی سالگرہ کے دن کو یادگار بناتے اس کینڈل لائٹ ڈنر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کسی سیانے نے کہا ہے کہ Olives (زیتون) کھانے اور انہیں پسند کرنے کے لیے آپ کو پہلے وہ ٹیسٹ ڈیولپ کرنا پڑتا ہے کہ آپ ان کے ذائقے کو انجوائے کر سکیں۔'' خرد نے اپنی پلیٹ میں کانٹے سے ہٹا ہٹا کر جو تمام زیتون ایک جگہ جمع کیے تھے، وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس کی پلیٹ میں جمع شدہ وہ تمام زیتون اپنی پلیٹ میں منتقل کر لیے۔ وہ Garlic stuffed Olives Green اس کی جان تھے۔زیتون اسے جتنے مرغوب تھے، خرد کو اتنے ہی ناپسند تھے۔وہ خوب مزے لے لے کر سیاہ، سبز، ہر رنگ اور ہر قسم کے زیتون خوب شوق سے کھایا کرتا تھا۔اسے ان کی کوالٹی کی بھی خوب پہچان تھی۔اٹلی میں زیادہ اچھی زیتون پیدا ہوتی ہے یا اسپین میں یا یونان میں، اسے اپنے پسندیدہ پھل کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔

جتنی دیر میں اس نے کانٹے کی مدد سے اس کے جمع شدہ زیتون اپنی پلیٹ میں منتقل کیے، اتنی دیر میں وہ اس کا ایپل جوس کا گلاس اٹھا کر سارا جوس پی گئی تھی جب کہ اپنا جوس کا گلاس تو وہ پہلے ہی خالی کر چکی تھی۔اپنے گلاس کو خالی پایا تو اس نے اسے گھور کر دیکھا، وہ لاپروائی

سے شانے اچکا کر ہنس دی تھی۔

''آپ پھیکی چائے اور کافی کیسے پی لیتے ہیں۔ میں تو کبھی نہیں پی سکتی۔'' ڈنر کے بعد وہ دونوں کافی پی رہے تھے جب خرد نے اس سے کہا۔

''اپنی اپنی پسند اور عادت کی بات ہے۔ مجھے چائے، کافی وغیرہ کا ٹیسٹ یونہی زیادہ اچھا لگتا ہے۔'' کافی کا گھونٹ لیتے اس نے اسے جواب دیا پھر کپ واپس پرچ پر رکھتے مسکرا کر بولا۔

''ممی بتاتی ہیں جب میں چار، پانچ سال کا تھا اور ممی میرے فیورٹ مگ میں میرے لیے دودھ لے کر آتی تھیں تو اگر انہوں نے اس میں چینی ملا دی ہوتی تو ایک گھونٹ کے بعد میں دودھ پینے سے صاف انکار کر دیتا۔''

''بہت انوکھی سی عادت تھی آپ کی۔ بڑوں میں تو میں نے بہت سوں کو بغیر کسی بیماری یا پرہیز کے شوقیہ اور عادتاً پھیکی چائے وغیرہ پیتے دیکھا ہے مگر کسی بچے کو کبھی نہیں دیکھا۔''

☆......☆......☆

''پاپا کہاں ہیں؟'' سو کر اٹھنے کے ساتھ ہی حریم کو باپ کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ رات مما، پاپا دونوں اس کے پاس سوئے تھے مگر اب صبح کے وقت اپنے کمرے میں تو کیا اسے اپارٹمنٹ کے کسی حصے میں پاپا نظر نہیں آ رہے تھے۔

''وہ دوسرے شہر چلے گئے۔ حریم کو ڈول بھی نہیں دلائی۔'' جو بات اس نے اسے اشعر سے ملنے سے قبل کئی بار بتائی تھی، وہ اسے یاد تھی۔ کچھ دیر وہ حریم کی ''پاپا کہاں ہیں؟'' کی گردان کو نظر انداز کیے اس کا ناشتہ تیار کرنے میں مصروف رہی۔ فریج میں اور کچن کے کیبنٹس میں ہر طرح کی اشیائے خورد و نوش موجود تھیں۔ اس نے بہت اچھا سا ناشتہ حریم کے لیے تیار کیا مگر اس نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسے اپنی بہت چھوٹی اور معصوم سی بیٹی کے چہرے پر یہ خوف پھیلا نظر آ رہا تھا کہ اس کے پاپا پھر اس سے کہیں دور چلے گئے ہیں۔ سو کر اٹھنے پر اسے وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، تب وہ کیسے منہ بسور کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنے آپ کو درمیان سے نکال کر دیکھتی، صرف حریم کا سوچتی تو وہ واقعی اپنی بیٹی کے لیے بہت خوش تھی۔ صبح وہ اس سے جو کچھ بھی تلخی اور غصے سے کہہ کر گیا تھا، اگر چاہتی تو وہ جواب میں اسی وقت اسے بہت کچھ کہہ سکتی تھی مگر وہ چپ رہی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ اس شخص کی نفرت اور غصے سے خائف ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ اسے بس اپنی بیٹی کی صحت یابی سے غرض تھی۔ وہ اس دوران چاہے اسے جتنا بھی تند و تلخ کہہ لے، اسے جتنا بھی بے عزت کر لے، وہ پلٹ کر جواب نہیں دے گی۔

''حریم! جانو، ناشتہ تو کر لو۔ تمہارے پاپا آفس گئے ہیں، تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔'' وہ ناشتے کی ٹرے لے کر اس کے پاس بیٹھی تھی اور وہ تکیے میں منہ دے کر رو رہی تھی۔

''پاپا چلے گئے، پاپا دوسرے شہر کیوں گئے؟'' اس کی ضد سے ہار مان کر اس نے اپنا موبائل اٹھایا، اشعر کا موبائل نمبر ملایا اور پھر بیل جاتی دیکھ کر کال ریسیو کیے جانے سے پہلے موبائل حریم کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔

''لو خود بات کر لو۔ دیکھ لو، تمہارے پاپا کہیں نہیں گئے ہیں۔''

☆......☆......☆

وہ ایک فائل پر دستخط کرتے، انٹر کام پر اپنی سیکریٹری کو کچھ ہدایات دینے میں مصروف تھا، جب اس کے موبائل پر بپ بجی۔ شدید مصروفیت کے دوران اس وقت وہ کسی دوسری کال کو نظر انداز کر دیتا مگر خرد کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً وہ کال ریسیو کی۔

''ہیلو پاپا!'' یہ روئی روئی سی آواز حریم کی تھی۔

''میں ابھی کچھ دیر میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے سیکریٹری کو عجلت میں فارغ کیا۔

''ہاں بیٹا! بولو کیا ہوا؟''

''آپ دوسرے شہر چلے گئے ہیں نا؟ حریم کو بری (بڑی) والی ڈول بھی نہیں دلائی۔ حریم! آپ سے کٹی۔ حریم آپ سے بات نہیں کرے گی۔''

''ارے ارے...... اتنی ناراضی؟ پرنسس! پاپا آفس میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں آپ کے پاس آ جائیں گے اور بری سی ڈول بالکل حریم کے جتنی آج ہی اسے دلائیں گے بلکہ ایک نہیں، بہت ساری ڈولز دلائیں گے اور بھی ڈھیر سارے کھلونے حریم کو دلائیں گے۔'' بالکل اسی کے انداز میں ''بڑی'' کو ''بری'' کہتے اس نے اسے پیار سے یقین دلایا۔

''پرامس؟''

''بالکل پکا پرامس۔'' وہ اس کی بے اعتباری پر دکھ بھرے انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''اور اب رونا نہیں ہے، ناشتہ کیا ہے؟''

''نہیں، ماما لائی ہیں۔ حریم نے نہیں کھایا۔''

''بری بات۔ اچھے بچے ماما، پاپا کی بات مانتے ہیں۔ شاباش جلدی سے ناشتہ کرو پھر ٹی وی دیکھو، بس تھوڑی دیر میں، میں بھی آ جاؤں گا۔'' فون بند ہو جانے کے بعد وہ کئی منٹ موبائل ہاتھ میں لیے یونہی بیٹھا رہا۔

''آپ دوسرے شہر چلے گئے ہیں نا؟'' اس کی چار سال کی ننھی، معصوم سی بیٹی، اس بچپنے ہی میں کیسے کیسے خوف اور اندیشے اپنے دل میں پیدا کر بیٹھی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

☆......☆......☆

ٹھیک سوا ایک بجے اشعر گھر آ گیا تھا۔ چابی پاس ہونے کے باوجود اس نے بیل کی۔ اس کی آمد پر اس کی بیٹی دروازہ کھولنے خوشی خوشی کیسے آتی ہے، یہ منظر وہ کل دیکھ چکا تھا اور آج پھر دیکھنا چاہتا تھا۔

''پاپا آ گئے۔'' کا نعرہ لگاتے دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ ریڈ ٹراؤزر اور وائٹ سلیولیس ٹاپ میں وہ اسے بہت پیاری، بہت کیوٹ لگی۔

"You Are looking very pretty darlig"

جھک کر اسے پیار کرتے اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''تھینک یو پاپا!'' بڑی ادائے بے نیازی سے اس نے شکریہ یوں ادا کیا جیسے اپنی تعریفیں صبح، شام سننا اس کے لیے معمول کی بات ہے۔

''ماما! پاپا آ گئے۔ پاپا دوسرے شہر نہیں گئے۔'' اس نے جوش و خروش سے ماں کو آواز دی۔

''پاپا اب تمہیں چھوڑ کر کسی دوسرے شہر نہیں جائیں گے سوئیٹ ہارٹ۔ ہمیشہ ہمیشہ اپنی پرنس کے ساتھ رہیں گے۔'' اس کی آواز بھرا سی گئی۔ وہ اپنی ذات سے زیادہ اپنی بیٹی کے لیے آزردہ تھا۔ خرد کمرے سے نکل کر اس طرف آئی تو اسے دیکھ کر وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اپنی کوئی بھی جذباتی کمزوری وہ اس عورت پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اب ہم ایک بہت اچھے ڈاکٹر انکل کے پاس جا رہے ہیں۔ وہ ہماری پرنس کا ٹھیک سے چیک اپ کریں گے اسے میٹھی میٹھی میڈیسنز دیں گے تاکہ ہماری پرنس جلدی سے بالکل ٹھیک ہو جائے۔'' اس نے گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی حریم سے کہا۔

''پھر ماما! حریم کو اسکول جانے دیں گی؟''

''بالکل جانے دیں گی۔ جب پاپا کی پرنس بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو پاپا اسے بہت اچھے والے اسکول بھیجیں گے۔''

''نہیں حریم کو اچھے اسکول نہیں جانا۔ حریم کو اپنے اسکول جانا ہے۔ وہاں سی سا بھی ہے۔ سی سا میں بہت مزا آتا ہے پاپا'' وہ اپنے اسکول، دوستوں اور ایک نارمل لائف کو کس قدر مس کر رہی تھی، اپنے ہم عمر بچوں کی طرح وہ نہ اسکول جا سکتی تھی، نہ کھیل کود، تفریحات اور دوستوں کی سنگت کو انجوائے کر سکتی تھی۔ بھاگنا، دوڑنا اور کھیلنا کودنا کیا اس کے لیے ذرا سا چل لینا ہی کڑی مشقت بن جایا کرتا تھا۔

ان کی گاڑی جس جگہ سے گزر رہی تھی، وہاں اس سڑک پر آگے پیچھے کئی اسکولز تھے اور ان اسکولز کی یہ چھٹی کا ٹائم تھا۔ حریم ان اسکولوں سے نکلتے یونیفارم پہنے صحت مند، تندرست، بھاگتے، دوڑتے، ہنستے، مسکراتے بچوں کو آنکھوں میں حسرت لیے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ بیک ویو مرر میں وہ اس کا ہر تاثر پڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ حسرت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

''میری پرنس کس کلاس میں پڑھتی تھی۔ اپنے اس سی سا والے اسکول میں؟''

''کے جی ون میں۔''

''کے جی ون میں۔ زبردست بھئی۔''

''پاپا! حریم کو اسکول جانا ہے۔ ماما اسکول نہیں جانے دیتیں پاپا! ماما رمشہ اور علی کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتیں پاپا!'' منہ بسورے اس نے اس سے ماں کی شکایت کی۔

''ابھی آپ کی طبیعت تھوڑی سی خراب ہے بیٹا! اس لیے ماما منع کرتی ہیں۔ آپ ڈاکٹر انکل کا کہنا مانو گی جو میڈیسنز وہ دیں گے،

وہ سب لوگی تو دیکھنا کتنی جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ رمشہ اور علی کے ساتھ کھیلو گی بھی اور پھر پاپا اور حریم سی سا پر بیٹھیں گے اور دوسرے بھی بہت سارے جھولوں پر بیٹھیں گے اور جب تک ہماری پرنس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتی، تب تک ایسا کر لیتے ہیں کہ حریم گھر پر ماما اور پاپا کے ساتھ پڑھائی کرلے گی اور ماما اور پاپا کے ساتھ ہی کھیلے گی بھی۔ ماما اور پاپا کو بھی بہت سارے اچھے اچھے گیمز آتے ہیں، وہ حریم کو بور نہیں ہونے دیں گے۔ کیوں بھئی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

حریم سے بات کرتے جملے کے اختتام پر اس نے اپنے برابر والی نشست پر بیٹھی خرد کو مخاطب کیا جو کل کی طرح لاتعلقی سے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ اس کی اور حریم کی باتیں دھیان سے سن رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر حریم کی طرف مسکرا کر دیکھا اور سر اثبات میں ہلایا۔ بیٹی کی خوشی کے لیے دل پر جبر کر کے اسے مخاطب بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی بیمار بیٹی جس کی زندگی میں اور کچھ بھی نارمل نہیں، وہ اسے اتنی تھوڑی سی خوشی ماں، باپ کے سنگ گزارے چند خوشگوار روز و شب بھی کیا بیماری کے ان دنوں میں نہیں دے سکتا تھا۔ بیماری کے ان دنوں میں اس چھوٹی، ناسمجھ بچی کے لیے خوشیوں بھرے دن، رات کے یہ ڈرامے بہت اہم تھے، بہت ضروری تھے۔

☆......☆......☆

وہ ہسپتال پہنچے اور کچھ دیر کے انتظار کے بعد ان کی باری آئی تو آخر کار وہ ملک کے اس نامور ترین Pediatric heart surgeon کے روبرو پہنچے جن کی بھاری فیسوں کے سبب کوئی عام آدمی ان سے علاج کرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر عابد انصاری، بچوں میں دل کے امراض کے علاج کے حوالے سے ایک ملکی ہی نہیں بین الاقوامی طور پر ایک تسلیم شدہ کامیاب اور قابل احترام نام۔

''واہ رے مولا تیری شان۔ پیسے میں اتنی طاقت ہے۔ اتنی زیادہ طاقت۔'' اس مشہور ہستی کے روبرو پہنچنے پر اس کے دل نے کہا۔ وہ حریم کو علاج کے لیے ڈاکٹر عابد انصاری کے پاس بھی لاسکتی ہے۔ یہ تو شاید اس نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ دوسری جانب ڈاکٹر عابد انصاری نے مسکرا کر بڑی خوش دلی کے ساتھ ان لوگوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

''ڈاکٹر عابد انصاری نے دو منٹ اشعر کے ساتھ ہلکی پھلکی سی تعارفی گفتگو کی پھر وہ حریم کی طرف متوجہ ہوئے۔'' کیا نام ہے اس سویٹ گرل کا؟'' انہوں نے حریم سے پوچھا۔

''حریم حسین۔ پر پاپا حریم کو پرنس کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر انصاری اس جواب سے محظوظ ہوتے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اس ہنسی میں اشعر کی ہنسی بھی شامل تھی۔ جب کہ وہ بھی بیٹی کی بچکانہ سی سنجیدگی پر مسکرا رہی تھی۔

''بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ سویٹ گرل تو واقعی بالکل کسی پرنس جیسی ہی لگ رہی ہے۔'' ڈاکٹر انصاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حریم کے لبوں کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے ڈاکٹر انکل پسند آ گئے ہیں۔ انہوں نے اشعر کے ہاتھ سے حریم کی رپورٹس والی فائل لی۔ چند منٹ ان رپورٹس کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے پہلے حریم سے گفتگو شروع کی۔

ڈاکٹر انصاری اس سے بچکانہ انداز میں باتیں کر کے اس کی بعض کیفیات کے متعلق اندازے قائم کرنا چاہ رہے تھے۔ حریم کے بعد

وہ خرد کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

زبانی طور پر حریم کی یہ تمام میڈیکل ہسٹری لے لینے کے بعد اس کے فزیکل ایگزام کے لیے انہوں نے اسے مریضوں کے لیے مخصوص میز پر بلایا اور پھر وہاں لٹا کر اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔

خرد نے اتنے ڈاکٹروں کی خاک چھانی تھی اور اتنے سارے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا کہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ سرجری کے علاوہ دوسرا کوئی علاج حریم کو صحت یاب نہیں کر سکتا، پھر بھی وہ نئے سرے سے یہ دعا کرنے لگی تھی کہ یہ کامیاب اور قابل ڈاکٹر کچھ ایسا طریقہ علاج انہیں بتائے کہ حریم کسی major یا minor سی سرجری کے بھی بغیر ہی صرف میڈیسنز ہی سے ٹھیک ہو جائے۔

پہلی وزٹ کے اختتام پر ڈاکٹر انصاری نے انہیں بتایا کہ حریم کے تمام ٹیسٹ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ اس کی اوپن ہارٹ سرجری ہونی ہے اور جلد از جلد ہونی ہے۔ یہ ایک بالکل طے شدہ حقیقت ہے۔ کچھ ٹیسٹ جو حریم کے پہلے بھی ہو چکے تھے۔ انہوں نے وہ دوبارہ کروانے کو کہا تھا اور باقی وہ tests...... جو حریم کے ہو تو چکے تھے مگر وہ انہیں اپنے ہاں کی لیبارٹریز میں دوبارہ کروانا چاہتے تھے۔ غالباً وہ ان کے نتائج سے سو فیصد مطمئن نہیں تھے۔

انہوں نے اشعر اور خرد کو بتایا تھا کہ بعض اوقات بچوں میں پیدائشی طور پر دل کے ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ نقائص موجود ہوتے ہیں اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر تو بچے کے دل میں صرف کوئی ایک ہی نقص ہوتا ہے، مگر وہ نقص اپنی شدت کے سبب دل کی ساخت اور اس کے کام کرنے کے طریقۂ کار میں بری طرح بگاڑ لا چکا ہوتا ہے۔ ایسے کسی نقص کا پتا ان جدید اور advanced tests ہی کے ذریعے چل پاتا ہے وہ ان کے نتائج دیکھنے کے بعد سرجری کے وقت اور طریقہ کار کے بارے میں بتائیں گے۔

''آپ سرجری کے نام سے اتنا کیوں ڈر رہی ہیں مسز اشعر!؟'' ان کے لبوں پر مقابل کو حوصلہ اور اطمینان دلانے والی ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔

''بچوں میں Congenital in deart defects بہت عام بات ہے اور ان کو بذریعہ سرجری درست کرنا اس سے بھی زیادہ عام بات۔ آپ کی بیٹی تو پھر چار سال کی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے چند ماہ کے بچوں کے تو کیا چند ہفتوں کے بچوں تک کی اوپن ہارٹ سرجریز کی ہیں۔ ابھی 10 دن پہلے ہی میں نے ایک 20 دن کی بچی کی کامیاب اوپن ہارٹ سرجری کی ہے۔ ماشاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''کیا اوپن ہارٹ سرجری ہی اس کا واحد علاج ہے؟''

''بچوں میں چند ایک پیدائشی نقائص جو بہت معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ بچے کے ڈھائی تین سال کی عمر کے آتے آتے یا تو اپنے آپ درست ہو جاتے ہیں یا پھر دواؤں کے ذریعے انہیں درست کر دیا جاتا ہے۔ مگر جو دل کے بڑے نقائص ہوتے ہیں۔ جیسے کہ حریم کا نقص۔ اس طرح کے بڑے نقائص کو تو سرجری ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر انصاری کے پاس سے اٹھنے کے بعد اب وہ لوگ وہیں پر حریم کے ٹیسٹ کروا رہے تھے۔ کچھ ٹیسٹ آج ہی ہو رہے تھے اور کچھ کے لیے انہیں کل اور پھر آنے والے مزید چند دنوں میں یہیں آنا تھا۔ وہ شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ہسپتال میں تھے۔ وہاں حریم کو لے کر ادھر سے ادھر انہیں کہیں نہیں دوڑنا پڑ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود نرسوں اور دیگر اسٹاف کی خوش اخلاقی اور مستعدی دیکھ رہی تھی۔ پیسے کی طاقت دیکھ رہی تھی۔ انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ قیمت صرف پیسے کی ہے۔ یہ دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی اسے اپنی وہ خودداری۔ وہ دھکے۔ وہ مارا مارا پھرنا یاد آ رہا تھا۔ پیسے کی طاقت کے آگے ہار مان لینے والی وہ لڑکی ایک بار پھر اس سچائی کو تسلیم کر رہی تھی کہ بغیر پیسے کے آدمی کچھ نہیں، اس کی کوئی اوقات نہیں۔ اس ملک کے حکمران چاہے ترقی اور کامیابی حاصل کر لینے کی کتنی ہی بڑی بڑی باتیں کیوں نہ کرتے ہوں، سچائی تو یہی ہے کہ یہاں عام آدمی کو دیگر بنیادی سہولتوں کے ساتھ ساتھ علاج معالجے کی بھی کوئی سہولیات حاصل نہیں۔ اچھا علاج اور دوائیں عام آدمی کی دسترس سے پہلے سے بھی زیادہ دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اس کی بیٹی کو آج اچھا علاج میسر آ رہا تھا مگر نجانے کیوں اسے وہ بہت سے ننھے ننھے بچے یک دم ہی یاد آنے لگے تھے۔ جنہیں وہی مرض لاحق تھا جو حریم کو تھا جن کے والدین کو حریم کے علاج کے دوران اس نے مختلف ہسپتالوں میں اپنی ہی طرح خوار ہوتے اور یہاں سے وہاں پریشان حال بھاگتے دیکھا تھا۔

باقی سب حریم نے آسانی سے کرا لیا تھا مگر بلڈ ٹیسٹ کے وقت وہ بدک گئی تھی۔ سرنج دیکھتے ہی وہ خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی۔

خرد نے اپنا ہاتھ حریم کے گرد رکھا ہوا تھا۔ حریم اس سے چمٹی خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرنج کو دیکھتے خوف تھا اور لبوں پر مسلسل انکار۔ اشعر اسے پیار سے بہلانے لگا تو وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''پاپا! بہت درد ہوتا ہے۔''

''پر پاپا کی پرنس تو بہت brave (بہادر) ہے۔ ہے کہ نہیں؟'' وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''ہمیں جلدی سے یہاں سے جا کر ڈول بھی خریدنی ہے۔ ایسا کریں گے۔ ایک ڈول ہاؤس بھی لے لیں گے۔''

''بری (بڑی) والی ڈول لیں گے اور اس کے ڈریسز بھی اور وہ والی ڈول بھی جو پریم میں بیٹھتی ہے۔ روتی ہے تو اس کی eyes سے tears آتے ہیں۔ آواز بھی آتی ہے اور اس کی فیڈر بھی ہوتی ہے۔''

اپنے مطلب کی بات سمجھانے کا اس کا طریقہ اتنا دلچسپ اور مزے دار تھا کہ سنجیدہ تاثرات والی نرس بھی بے اختیار مسکرائی تھی۔ اشعر نے جتنی دیر سامنے گھٹنوں پر بیٹھ کر اسے گڑیا کے قصوں میں لگایا تب تک نرس اپنے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔

''حریم بہادر ہے ناں پاپا؟'' وہاں سے نکلتے حریم نے اشعر سے پوچھا۔

''بالکل پرنس۔ اتنا بریو تو کوئی بچہ میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔'' پونے دو بجے سے یہاں آئے۔ اب تمام ٹیسٹوں وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے ان لوگوں کو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ حریم کی بیماری کی شدتوں اور ڈاکٹرز کے

تجزیوں سے پہلے سے بخوبی آگاہ تھی۔ مگر اشعران سے یوں آگاہ نہیں تھا۔ تب ہی وہ یوں متفکر سا نظر آ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ حریم کی خاطر زبردستی ہنس رہا ہے اور باتیں کر رہا ہے۔ اسے اس کے ماتھے پر تفکر سے پڑی گہری لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

شہر کے مہنگے ترین کمرشل علاقے میں بنے اس ڈپارٹ منٹل اسٹور کی دوسری منزل پر موجود اس بہت بڑی سی کھلونوں کی دکان میں داخل ہونے سے پہلے تک حریم، اشعر کی گود میں تھی۔ مگر دکان میں گھستے ہی وہ اشعر کی گود سے نیچے اتر گئی۔ وہ بہت شاندار دکان تھی، وہاں تمام کھلونے امپورٹڈ تھے اور کھلونے بچوں کی دلچسپی کے لیے ریکس میں سجا کر اس طرح رکھے تھے کہ بچے انہیں خود ہاتھوں میں اٹھا کر چلا پھرا کر دیکھ لیں۔ پسند کرلیں۔

آج ایک ہی دن میں دوسری بار اسے اپنی کم مائیگی اور کم حیثیتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

اس نے بیٹی کے خوشی سے سرشار، ہنستے کھلکھلاتے چہرے کی طرف دیکھا۔ تو اپنی کم مائیگی کے احساس کو بھلا کر اس کی خوشی پر خوش ہونے لگی۔ حریم جس کھلونے پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔ اشعر اسے دلا رہا تھا۔ تب ہی ایک گھنٹے بعد جب وہ دکان سے باہر نکلے تو اشعر کے ساتھ ساتھ خود اس کے ہاتھوں میں بھی کئی بڑے بڑے شاپنگ بیگز موجود تھے۔

''اب ہم کسی اچھی سی جگہ پر ڈنر کریں گے اور پھر گھر جائیں گے۔ جھولے پر بیٹھیں گے۔''

''حریم۔ بیٹا! پارک آج نہیں۔ کل چلی جانا۔ زیادہ چلو پھرو گی تو تھک جاؤ گی۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' اسے اشعر سے ضد کرتا دیکھ کر اس نے پیار سے سمجھایا۔

''آپ پارک کبھی نہیں لے جاتیں۔ آپ حریم کو کھیلنے کبھی نہیں دیتیں۔'' وہ ماں سے خفا ہوتی ضدی لہجے میں بولی۔

''پرنسس! آپ کی ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پارک کل چلیں گے اور ویسے بھی آج تو آپ کو اپنی اتنی ساری ڈولز سے کھیلنا ہے۔ ہم دیر سے گھر پہنچیں گے تو پھر ڈولز سے کس وقت کھیلو گی، ہوں؟''

یہ لالچ ایسا تھا کہ وہ فوراً مان گئی تھی۔ ورنہ اسے ماں سے یہ شکایت ہر پل رہتی تھی کہ وہ اسے دوڑنے۔ بھاگنے۔ کھیلنے اور جھولے جھولنے نہیں دیتی۔

اشعر نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے آگے لا کر روکی۔ وہ تینوں اندر آ گئے۔ کیچ اپ تو لازمی تھا۔ اس کے ساتھ چکن اور مشروم والی اسپاگاٹیز۔ اورنج جوس اور فروٹ ٹرائفل حریم نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔

''تمہیں کیا کھانا ہے بتا دو۔'' حریم کی لسٹ پوری ہو گئی تو مینو دیکھے بغیر اشعر نے اپنے لیے ایک سلاد اور ایک پرانز اور چاولوں پر مشتمل سادہ سی ڈش کا آرڈر کرتے اس سے کہا۔ اس کی طرف دیکھ کر۔ مگر بغیر کسی تاثر کے۔ بہت عام سے لہجے میں۔ جس میں کسی بھی طرح کے کوئی جذبات شامل نہیں تھے۔ بھوکے، پیاسے رہنے والی اپنی بچی، کچھی نام نہاد انا سے وہ آج صبح ہی تائب ہو گئی تھی۔ صبح اس نے حریم کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔ اشعر حسین کے گھر میں۔ اسی کے کمائے ہوئے پیسوں کا ناشتہ۔ حریم کی تیمارداری کرنی تھی۔ اس کی بیماری سے لڑنا تھا

تو خود بھی تو بالکل صحت منداور تندرست رہنا تھا۔اس نے ویٹر کو اپنے لیے ایک بہت سادہ سی ڈش آرڈر کردی۔ جب تک کھانا سرو نہیں ہوگیا۔ حریم ان دونوں سے مشترکہ بچکانہ قسم کی باتیں کرتی رہی۔ وہ اس سے بات کر رہی ہوتی تو اس گفتگو میں اشعر کو بھی گھسیٹتی اور اشعر سے بات کر رہی ہوتی تو اسے بھی ان باتوں میں زبردستی شامل کرتی۔ ''ہے ناں ماما''۔ ''ہے ناپاپا'' کر کے۔

''ماما! نرس کہہ رہی تھی حریم کی شکل پاپا جیسی ہے۔'' وہ حریم کی پلیٹ میں کیچ اپ ڈالتے ہوئے اس بات پر کچھ بھی نہیں بولی۔

''ماما بتائیں ناں۔حریم پاپا جیسی ہے؟''

''بالکل پاپا جیسی ہو پرنس۔تب ہی تو اتنی خوب صورت ہو۔'' وہ اشعر کے جواب پر خوشی سے تالی بجاتی کھلکھلا کر ہنسی۔

''حریم پاپا جیسی ہے۔'' جب وہ یوں کھلکھلا کر ہنستی اور ہنستے ہوئے اس کی آنکھیں بھی جگمگانے لگتیں۔تب وہ اسے نظر بھر کر دیکھتے ڈرنے لگتی تھی۔اس کی بیماری کے علم میں آنے کے بعد سے اسے ایسا ڈر لگتا تھا کہ کہیں اس کی من موہنی پیاری سی بیٹی کو خود اس کی نظر نہ لگ جائے۔ پہلے ہی نجانے کس کی نظر لگی تھی جو ہنستی۔کھلکھلاتی، اس کی خوب صورت بیٹی جس نے زندگی کا ابھی صحیح معنوں میں آغاز بھی نہ کیا تھا یوں بیمار پڑگئی تھی۔

''پرنس! تمہاری ہنسی بہت زیادہ پیاری ہے۔''

حریم اب ٹرائفل کھا رہی تھی اور اس کی بچائی اسپگا ٹیز وہ ختم کر رہی تھی۔ پلیٹ میں فورک چلاتے اس نے اشعر کی یہ بات سنی۔بے اختیار سر اٹھا کر اس نے اسے دیکھا تو وہ حریم کے مسکراتے چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔ان دونوں ہی نے بہت تھوڑا اور برائے نام کھانا کھایا تھا۔ ہاں حریم نے اس ڈنر کو بے تحاشا انجوائے کیا تھا۔گھر واپس آکر حریم لیونگ روم میں کارپٹ پر کھلونوں سے بھرے سارے شاپنگ بیگز لے کر بیٹھ گئی۔وہ بھی حریم کے ساتھ وہیں بیٹھی تھی۔

''آپ اپنی ڈولز سے کھیلو بیٹا۔میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔''

وہ گھر واپس آتے ہی دوبارہ کہیں جارہا تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے، حریم کے کھلونوں کو ان کی دلکش پیکنگز سے باہر نکالتی رہی مگر حریم نے ''کہاں جارہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔'' جیسے سوالات کی اشعر پر بوچھاڑ کر دی۔ وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ جائے۔وہ چاہ رہی تھی کہ اتنی ساری خوبصورت ڈولز اور جو دیگر ڈھیر کھلونے اس کے گرد بکھرے ہیں۔ان سے کھیلتے وقت ماما کے ساتھ ساتھ پاپا بھی اس کے پاس موجود رہیں۔

''ابھی ہمیں ٹی پارٹی کرنی تھی۔'' منہ بسور کر اس نے اپنے کھلونے کے پنک کلر کے ٹی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ٹی پارٹی کرنا مس مس اور اسکول اسکول کھیلنا۔اسکول سے آکر ٹیچر بن کر بورڈ پر ABC الف ب پ لکھنا۔مختلف پکچرز بنانا اور اپنی گڑیوں کو سامنے کرسی پر اسٹوڈنٹ بنا کر بٹھا کر مس بن کر پڑھانا یہ سارے کھیل خرد کے لیے نئے نہیں تھے۔وہ حریم کے ساتھ اس کی پسند کے تمام کھیل کھیلنے کی عادی تھی۔وہ اکثر و بیشتر حریم کے ساتھ مس مس۔گھر گھر اور ٹی پارٹی کرنے جیسے کھیل اس کی خواہش اور فرمائش پر اس کی خوشی کے لیے اس کے

ساتھ کھیلتی تھی، مگر اشعر کے لیے یقیناً ایک بہت نئی سی بات تھی۔ ایک پل کے لیے وہ ٹی پارٹی کے الفاظ پر حیران ہوا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ آنکھوں میں دلچسپی اور محبت لیے حریم کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہوگی ٹی پارٹی۔؟'' اشعر نے حریم سے پوچھا جو چھوٹی چھوٹی ساسرز پر پھول دار کپوں کو سیٹ کر کے رکھ رہی تھی۔ اس نے تین کپ، ساسرز میں سجائے۔ ساسرز میں شکر ملانے کے لیے چھوٹے چھوٹے چمچے رکھے۔ کیتلی کو ڈھکن لگایا۔ شوگر پاٹ ٹھیک سے رکھا۔ جب سب چیزیں اشعر اور خرد کے سامنے ٹھیک سے رکھ لی گئیں تب اس نے پہلے اشعر کے کپ میں کیتلی سے فرضی چائے انڈیلی۔ پھر خرد کے اور آخر میں اپنے کپ میں پھر اشعر اور خرد کے کپوں میں شوگر پاٹ اٹھا کر فرضی چینی ڈالی۔ اسے چمچے سے ملایا اور پھر بہت سنجیدگی سے بولی۔ ''چائے پئیں پاپا۔'' مسکراہٹ ضبط کرتے اشعر نے بڑی سنجیدگی سے کپ اٹھالیا اور اس چھوٹے سے کھلونے کے کپ سے ایک فرضی گھونٹ بھرا۔

''واؤ۔ اتنی مزے کی چائے تو میں نے آج تک کبھی نہیں پی۔''

اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ مگر اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ بیٹی کے اس معصومانہ اور بچگانہ کھیل کو انجوائے کر رہی تھیں۔ خرد خود بھی مسکراتے ہوئے اس فرضی چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اس کھیل کو صرف انجوائے کر رہی تھی۔ اس پر حیران نہیں ہو رہی تھی۔ حریم نے بھی چائے کا کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا پھر اس سے بولی۔

''ماما۔ چائے کیسی ہے؟'' یعنی صرف باپ کی تعریف کافی نہیں تھی۔

''بہت مزے کی۔ اب سے ہم لوگوں کے لیے چائے بس حریم ہی بنایا کرے گی۔''

''آپ چائے اور لیں گے پاپا؟'' ایسے جیسے کسی گھر آئے مہمان سے کوئی میزبان مزید کھانے پینے پر اصرار کرتا ہے۔ اخلاق دکھاتا ہے اس طرح اس نے اشعر سے پوچھا آہستہ آہستہ گھونٹ لینے کی اداکاری کرنے کے بعد اشعر نے اپنا کپ واپس ساسر پر رکھ دیا تھا۔

''نہیں بس بہت پی لی۔ آپ نے چائے بہت ہی زیادہ اچھی بنائی تھی۔''

اپنی ہنسی ضبط کرتے اس نے کسی مہمان ہی کے جیسا لہجہ اختیار کرنا چاہا۔ یہ کھیل اس کے لیے بہت ہی انوکھا، دلچسپ اور بالکل ہی نیا ہے۔ یہ اس کی آنکھوں کی دلچسپی، حیرت بھری مسکراہٹ واضح طور پر بتا رہی تھی۔

''ختم ہوگئی ٹی پارٹی؟ اب پاپا جائیں؟'' کچھ دیر بعد اس نے حریم سے پوچھا۔ اس بار اس نے سر اثبات میں ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اشعر چلا گیا تو وہ سارے کھلونے لے کر حریم کو اس کے کمرے میں لے آئی۔ آج حریم کافی تھک گئی تھی۔ کافی چلی پھری تھی۔ اس لیے اب وہ چاہ رہی تھی کہ حریم سو جائے۔ کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے اس کو نیند آ جائے یہ بہت بہتر تھا۔

اشعر کی رکھی میڈ زینت...... جو دوپہر ہی ان کے ہاں آ چکی تھی، اس نے کھانے وغیرہ کا اس سے آ کر پوچھا اور اس کے انکار کر دینے پر بالکونی کے ساتھ بنے سرونٹ روم میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

''ٹی پارٹی کرنی ہے۔'' زیرلب دہراتا وہ بے ساختہ ہنسا۔ اس کی بیٹی کتنی مزے مزے کی اور معصومانہ باتیں کرتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری کی امید بھری خوش آئند باتوں کو ذہن میں رکھ کر باقی تمام تفکرات کو کہیں پیچھے دھکیل کر اس وقت وہ حریم کی کچھ دیر پہلے کی گئی ٹی پارٹی کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ ''آپ چائے اور لیں گے پاپا؟''

اس کا معصومانہ انداز اس کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ لے آیا تھا۔ کیا بات ہے۔ اکیلے بیٹھے کس بات پر مسکرا رہے ہو؟'' لاؤنج میں داخل ہوتی فریدہ نے اسے تنہا آنکھیں بند کر کے بیٹھے کسی بات پر مسکراتے دیکھا تو فوراً پوچھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ اس کے لبوں پر ہنوز مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ فریدہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور ان کے پیچھے داخل ہونے والی ان کی ملازمہ شاہین نے کافی کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ'' اسے کافی سرو کرنے سے منع کرتے وہ پھر اشعر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ مسلسل اپنے گھر سے غائب کیسے رہ سکتا تھا۔ صبح آفس جانے سے قبل وہ ماں سے مل کر گیا تھا اور اب بھی حریم کے ساتھ ٹی پارٹی کو انجوائے کرنے کے بعد ماں کے پاس گھر آ گیا تھا۔ حریم اگر اس سے خود سے دور نہیں جانے دیتی تھی تو وہ بھی اب بیٹی سے دور ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ جب تک حریم کا علاج مکمل نہیں ہو جاتا۔ وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہو جاتی۔ وہ اس وقت تک ماں کو اپنی بیٹی اور ان کی پوتی سے ملوانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس دوران وہ ان سے کیا کہہ کر مسلسل گھر سے غائب رہے گا، یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''کچھ نہیں یونہی۔ ایک دوست سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کی کچھ دلچسپ باتوں کو یاد کر کے ابھی تک ہنسی آ رہی ہے۔''

فریدہ نے بغیر شکر ملائے کافی کا کپ اس کے آگے رکھا اور پھر اپنے کپ میں شکر ملاتے بولیں۔

''چلو جس بھی وجہ سے۔ کم از کم مجھے میرے بیٹے کی مسکراتی شکل تو دیکھنے کو ملی۔ میں تو ترس گئی تھی۔ تمہیں مسکراتا اور خوش دیکھنے کے لیے۔''

''آپ بلاوجہ فکر کرتی ہیں ممی۔ میں اللہ کا شکر ہے، بہت خوش اور بہت مطمئن ہوں۔''

اس نے مسکرا کر انہیں اطمینان دلایا اور یہ مسکراہٹ مصنوعی نہیں تھی۔ یہ بہت سچی مسکراہٹ تھی۔

''زلزلے سے متاثر ہونے والی عورتوں اور بچوں کے لیے ہم لوگ کچھ چیریٹی شوز۔ اور ان ہی کی مدد کے لیے فنڈ ریزنگ کے لیے مختلف طرح کے پروگرامز ملک کے تمام بڑے شہروں میں کر وا رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد زلزلہ زدگان کی دوبارہ آبادکاری میں خصوصیت کے ساتھ عورتوں اور بچوں ہی کے حوالے سے نادرن ایریاز میں بھی کافی دنوں تک ہم لوگوں کا قیام رہے گا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔ مگر میں سوچ رہی ہوں، اتنے دنوں تک گھر سے دور رہوں گی تو تم۔''

''آپ جائیں ممی! میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جس کی آپ کو فکر رہے گی۔''

کافی کا سپ لیتے اس نے انہیں اطمینان دلایا۔ ماں کے اس پروگرام اور مصروفیت کو جان کر وہ بے انتہا خوش ہوا تھا۔ ایسا لگا تھا

جیسے اس کا مسئلہ از خود ہی با آسانی حل ہو گیا ہے۔ فریدہ اپنی این جی او کے علاوہ دیہی و پسماندہ علاقوں میں رہنے والی عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم دیگر کئی اداروں سے بھی وابستہ تھیں اور اس طرح کے چیریٹی سے متعلق کاموں کے لیے ان کا ملک اور بیرون ملک اکثر و بیشتر آنا جانا رہا کرتا تھا۔ ان دنوں خصوصیت کے ساتھ 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے سے متاثرین کی بحالی کے حوالے سے وہ اور ان کا ادارہ خاصی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔

☆......☆......☆


# جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالبؔ ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ''انسان'' درحقیقت وہی ہے جس کا ''شر'' اس کے ''خیر'' کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ''خیر'' کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزر گئے** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بصیرت حسین کی طبیعت خراب تھی۔ وہ ہسپتال میں داخل تھے۔ دن میں فریدہ اور خرد ان کے پاس ہوتیں اور رات میں وہ ان کے پاس رہتا۔ اس رات بھی وہ ان کے پاس تھا۔ وہ بیڈ پر بہت بیمار اور بہت نڈھال سے لیٹے تھے اور وہ ان کے سرہانے بیٹھا ان کا سر دبا رہا تھا تاکہ انہیں نیند آ جائے۔ سانس کی تکلیف تو انہیں رہتی ہی تھی۔ اس بار طبیعت ذرا زیادہ ہی بگڑ رہی تھی۔

''اشعر۔'' انہوں نے نحیف آواز میں اسے پکارا۔

''جی ڈیڈی۔''

''اشعر! پتا نہیں میری کتنی زندگی بچی ہے۔ میں کچھ باتیں تم سے۔''

''کیا ہو گیا ہے آپ کو ڈیڈی۔ اتنی معمولی سی بیماری سے ہمت ہار رہے ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو رہا۔ ابھی آپ کو بہت سالوں تک زندہ رہنا ہے ان شاء اللہ۔''

''اشعر! میری بات سنو بیٹا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے کہنے دو۔''

وہ اس کی بات نظر انداز کر کے دوبارہ بولے۔ پھر ایک پل کا توقف کر کے انہوں نے دھیمی آواز میں آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

''اشعر۔ میرے بعد میری جگہ تم سنبھالو گے گھر میں بھی اور آفس میں بھی۔ تمہیں بزنس میں میرے مشوروں کے بغیر تنہا تمام فیصلے کرنے ہوں گے۔ تمہیں بہت سے رشتے نبھانے ہوں گے بیٹا۔ تمہیں ایک بہت اچھا بیٹا بننا ہوگا۔ اچھے شوہر کے سب فرائض نبھانے ہوں گے اور تمہاری بہنیں، بیٹا، میری طرح بہنوں سے غافل نہ ہو جانا۔ بھائیوں پر بہت مان ہوتا ہے بہنوں کو۔''

وہ بغیر مداخلت کے خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ کمزور آواز میں آہستہ آہستہ اسے نصیحتیں کر رہے تھے۔

''اشعر! خرد کا بہت خیال رکھنا بیٹا۔ خرد بہت سادہ اور معصوم ہے۔ ابھی اسے دنیا کی کوئی سمجھ نہیں تم سمجھ دار۔ میچور ہو اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اسے اس کی سادگی اور معصومیت جان کر اس کی غلطی کو نظر انداز کر دینا۔ اس کے پاس میکے کا سہارا نہیں۔ اسے یہ احساس کبھی مت ہونے دینا اشعر۔ میں نے اپنی مرتی ہوئی بہن کو وعدہ دیا تھا کہ اس کی بیٹی کو ہمیشہ تحفظ دوں گا۔ خوشیاں دوں گا۔ اب میرا کیا ہر وعدہ تم کو نبھانا ہے۔''

انہوں نے اپنے سر پر رکھا اس کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی! آپ جانتے ہیں۔ میں خرد سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے۔ میں کیوں اس کا خیال نہیں رکھوں گا۔؟''

''تم پر تو پورا یقین ہے بیٹا۔ پورا بھروسا ہے۔ بس خرد کی معصومیت سے ڈرتا ہوں۔ دراصل اس نے ماں کے ساتھ ایک بہت بند، بہت محدود اور سادہ زندگی گزاری ہے۔ ڈرتا ہوں، کبھی کوئی اس کی سادگی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا جائے۔ اشعر! وہ بالکل کچی مٹی کی طرح ہے

ابھی۔تم جس سانچے میں چاہو اسے ڈھال لو۔اسے دنیا کی سمجھ دینا بیٹا۔اسے اعتماد سے جینے کا قرینہ سکھانا بیٹا۔''

اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہوئے پھر ایک گہری اداسی بھری سانس لے کر بولے۔

''بہت خواہش تھی میری۔اللہ مجھے تمہاری اولاد کی خوشی بھی دکھا دے۔لیکن خیر، جو میرے اللہ کی مرضی۔''مسلسل بولنے سے وہ تھکنے لگے تھے۔اس لیے پھر ایک پل کے لیے رکے۔اس کے بعد کمزور آواز میں دوبارہ بولے۔

''اللہ جب بھی تمہیں اولاد کی نعمت سے نوازے تو وہ میرا پوتا یا پوتی جو بھی ہو۔اسے میری، اس کے دادا کی طرف سے بھی ضرور پیار کر لینا اور اسے یہ بھی بتانا کہ اس کے دادا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔''

اشعران کی باتوں سے پریشان ہوگیا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیماری سے ڈپریسڈ ہوگئے ہیں۔

سات دن ہسپتال میں رہ کر انہوں نے بڑی خاموشی سے رخصت لی تھی۔خرد اور اشعر کی شادی کو ابھی صرف سات مہینے ہوئے تھے۔شاید انہیں اپنی اکلوتی بہن سے اتنی والہانہ محبت تھی کہ اس کی موت کے کچھ مہینوں بعد ہی خود بھی اس کے پیچھے پیچھے اس دنیا سے ناتا توڑ گئے تھے۔

☆......☆......☆

جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن زندگی......زندگی تو چلتی رہتی ہے۔ماں کو، بہنوں کو، خرد کو سہارا دیتا، سنبھالتا وہ اپنا ہر غم اپنے ہی اندر اتارتا رہا تھا۔

اپنے باپ کا اسٹیبلش کیا بزنس، ان کی بنائی یہ عزت، یہ ساکھ، یہ وقار اب سب کچھ اسے سنبھالنا تھا۔اس نے اپنے کندھوں پر آئی ہر ذمہ داری کو پوری ذمہ داری کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

آخر اس کی کوششیں کامیاب ہوگئی تھیں۔وہ ماں اور خرد دونوں کو ان کے پہلے والے معمولات زندگی کی طرف لے آیا تھا۔فریدہ، شوہر کی دائمی جدائی کے دکھ کو قبول کرتے زندگی کی طرف لوٹیں تو انہیں اپنے گھر اور اپنے بچوں کی فکر لاحق ہوئی۔اشعر نے تو خود کو سنبھال لیا تھا، مگر خرد ماں کے انتقال کے بعد اب بے تحاشہ چاہتیں لٹانے والے ماموں کی جدائی کے غم سے بجھی بجھی رہنے لگی تھی۔اس کی یونیورسٹی میں کلاسز کب کی شروع ہوچکی تھیں۔فریدہ کے کہنے اور سمجھانے پر اس نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

خرد اپنی پڑھائی کو بہت سنجیدگی سے لے رہی تھی۔وہ بہت پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی اور پڑھنا اس کے نزدیک وقت گزاری یا ہنسی مذاق کی بات نہیں تھی۔اشعر کے ساتھ باتوں میں اب وہ کیمپس لائف اور اپنی پڑھائی کو زیادہ موضوع گفتگو بنائے رکھا کرتی تھی اور وہ اس کی دلچسپی کو دیکھتا اس کی ہر بات پوری دلچسپی ہی سے سنتا تھا۔بصیرت حسین کے بعد خرد، فریدہ کے پہلے سے بھی زیادہ نزدیک ہوگئی تھی۔یوں لگتا

تھا جیسے ماموں کے رشتے کی کمی بھی فریدہ ہی کے ساتھ اپنے رشتے کو مزید مضبوط بنا کر پوری کرنا چاہتی تھی۔اس شام اشعر آفس سے گھر واپس آیا تو خضر آیا بیٹھا تھا۔فریدہ اور خرد بھی وہاں بیٹھی تھیں۔سب کو لان میں دیکھ کر وہ بھی وہیں چلا آیا۔

''آپ کی بیگم سے یہ لیکچرز لیے تھے، صبح یونیورسٹی میں۔انہوں نے دھمکی دی تھی کہ انہیں اپنے لیکچرز آج ہی کی تاریخ میں واپس بھی چاہئیں، سو وہی لوٹانے حاضر ہوا ہوں۔''

اس سے ہاتھ ملانے کے لیے کھڑے ہوتے خضر نے کہا۔وہ خضر کی بات پر مسکراتا خرد کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہماری بیگم ہیں ہی اتنی ذہین، ان کے لیکچرز اور اسائمنٹس کی ڈیمانڈ نہیں ہوگی تو اور کس کی ہوگی۔''اس نے فخریہ نگاہوں سے خرد کو دیکھتے ہوئے کہا۔وہ چہرے پر دلکش سی مسکان لیے بیٹھی تھی۔

''بات تو خیر آپ کی ٹھیک ہے۔ڈپارٹمنٹ میں خاتون اپنی ذہانت کے حوالے سے خاصی پاپولر ہو چکی ہیں۔کچھ خرانٹ قسم کے ٹیچرز جو ہمارے سلام کا جواب بھی محض سر ہلا کر دیتے ہیں، ان کے ساتھ باقاعدہ لمبی چوڑی گفتگو کرتے پائے جاتے ہیں۔''

اپنی تعریفوں پر مسکراتی خرد اس کے لیے چائے بنانے لگی تھی۔اس کی آمد سے قبل وہ لوگ چائے ہی پی رہے تھے۔میز پر چائے اور کچھ ہلکے پھلکے سے اسنیکس موجود تھے۔خرد نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

خضر عالم کے ساتھ ان لوگوں کی براہ راست تو کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ وہ اشعر کی خالہ زرینہ اجمل کی نند یاسمین کا بیٹا تھا اور زرینہ ہی کے حوالے سے اس کی ان لوگوں کے ساتھ بھی اچھی واقفیت اور دوستی تھی۔خضر پاکستان میں اپنی تعلیم کے سبب رہ رہا تھا، ورنہ اس کی پوری فیملی کویت میں سیٹل تھی۔اس کے والد کی وہاں ملازمت تھی۔ایف ایس سی کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے پاکستان آ گیا تھا اور اب گزشتہ دو سالوں سے یہیں رہ رہا تھا۔یہاں اس کی رہائش ایک کرائے کے اپارٹمنٹ میں تھی۔تنہا رہتا تھا تو اپنے ماموں، ممانی یعنی زرینہ اور اجمل کے گھر اس کا بہت زیادہ آنا جانا رہتا تھا اور زرینہ ہی کے حوالے سے وہ ان لوگوں کے گھر بھی آ جایا کرتا تھا۔بائیس تیئس سال کا وہ ایک بہت خوش شکل، ہینڈسم اور زندہ دل قسم کا لڑکا تھا۔

وہ یونیورسٹی میں خرد کا کلاس فیلو تھا۔خرد کو یونیورسٹی جاتے ایک مہینہ ہو رہا تھا اور اس ایک مہینے کے دوران خضر پہلے بھی دو ایک مرتبہ خرد سے کوئی کتاب مانگنے یا اس کے لیکچرز، اسائمنٹس وغیرہ اس سے لینے یا اسے واپس لوٹانے ان کے گھر آ چکا تھا۔خرد کا اپنا تین دوستوں کا گروپ بن گیا تھا۔خرد، سامعہ اور ندرت۔اشعر چونکہ اکثر صبح میں خرد کو یونیورسٹی خود ڈراپ کر دیا کرتا تھا اور چند ایک بار اس کی سہیلیوں کی فون کالز بھی ریسیو کی تھیں، اس لیے اس کی دونوں سہیلیوں سے اس کی واقفیت اور دعا سلام تھی۔خرد کے گروپ کا آن آفیشل ممبر حماد سعید تھا جو سامعہ کا فرسٹ کزن بھی تھا اور ان دونوں کا آپس میں نکاح ہو چکا تھا۔سامعہ کی وجہ سے وہ ان تینوں کے گروپ میں بھی اکثر و بیشتر آ جایا کرتا تھا اور خضر جو حماد ہی کے دوستوں کے گروپ میں تھا، وہ بقول خرد کی دوست سامعہ کے صرف خرد کے لیکچرز اور اسائمنٹس کے لالچ میں ان کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔خرد کے اسائمنٹس اور اس کے کام کی اگر اپنی کلاس میں دھوم تھی تو کچھ غلط تو نہ تھا۔وہ محنت کچھ کم

کرتی تھی، دن میں اشعر کی آفس سے آمد سے قبل تو اسے جتنا پڑھنا ہوتا، وہ پڑھتی ہی تھی اور رات میں بھی سونے سے قبل اس کا ایک گھنٹہ اپنی اسٹڈی کا لازمی ہوا کرتا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے اس وقت پڑھنے کی اجازت لی تھی اور اس نے ایک پیار بھری ڈانٹ اسے پلائی تھی۔ وہ کیا ایسا ظالم شوہر تھا جس سے وہ ڈر ڈر کر اجازتیں طلب کیا کرے گی۔ صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے ہی کی تو بات ہوتی تھی، اس دوران وہ خرد کو ڈسٹرب کرنے کے بجائے اپنے لیے کوئی نہ کوئی مصروفیت تلاش کر لیتا۔ کبھی ٹی وی، کبھی انٹرنیٹ یا کوئی کتاب، وہ ان کے ساتھ مشغول ہو جاتا۔ خرد ایک سوا ایک گھنٹہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر میتھس کے مشکل فارمولوں اور پیچیدہ سوالوں کے ساتھ سر کھپاتی۔ اس دوران اگر اسے جمائیاں لیتے یا نیند بھگانے کی کوشش کرتا دیکھ لیتی تو فوراً ہی اپنی پڑھائی ختم کر کے بیڈ پر آ جاتی۔

☆......☆......☆

وہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تھا۔ صبح سویرے وہ چلا گیا تھا اور واپسی بھی اس کی اسی رات ہی ہو گئی تھی۔ اسے ایئرپورٹ سے گھر پہنچتے پہنچتے ایک بج چکا تھا، لیکن اس کا اس وقت ایٹی کیٹس اور مینرز اور کرٹسی وغیرہ جیسی چیزوں کے مظاہرے کا قطعاً کوئی موڈ نہیں تھا، اس لیے وہ اپنے بیڈ روم میں خاصے ہنگامہ خیز انداز میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے کمرے کا دروازہ ہی اس نے خوب زوردار آواز کے تھا کھولا اور پھر اسے اپنے پیچھے بند بھی خاصے دھماکے کے ساتھ کیا۔ خرد دائیں جانب کروٹ لیے چہرے کے نیچے ہاتھ دبائے بے خبر سو رہی تھی۔ یوں بے خبری کی گہری نیند سوتی وہ مزید حسین لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک پل میں جاگ جائے۔ اس نے بریف کیس سمیت اپنا دیگر سارا سامان خاصے زوردار دھماکے اور خوب شور کے ساتھ میز پر رکھا۔ ان دھماکہ خیز آوازوں نے اسے ایک پل میں جگا دیا تھا۔ نیند سے بوجھل مندی مندی آنکھوں سے وہ اپنے گرد ہوتے شور شرابے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''لڑکی! تمہیں نیند بہت آتی ہے۔'' جوتے اتار کر اس نے لاپروائی سے دائیں بائیں پھینکے۔ کوٹ اور ٹائی سے خود کو آزاد کرتا ان دونوں چیزوں کو صوفے پر اچھالتا وہ لباس تبدیل کرنے کی زحمت کیے بغیر بیڈ پر اس کے برابر گرنے والے انداز میں لیٹ گیا۔ وہ پوری طرح جاگ چکی تھی۔ اس نے ایک نظر گھڑی کو پھر اسے دیکھا۔

''رات کے ایک بجے ہر شریف آدمی کو نیند آتی ہے۔ میں اتنی اچھی نیند سو رہی تھی، مجھے اٹھا دیا۔'' وہ اپنی نیند خراب کیے جانے پر کچھ ناز بھری خفگی سے منہ پھلا کر بولی۔

''شوہر گھر واپس آئے تو نیک بیویوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس کے استقبال کے لیے بالکل چاق و چوبند جاگی رہیں۔'' اس کی خفگی سے متاثر ہوئے بغیر وہ شان بے نیازی سے بولا۔

''شوہر صاحب کی واپسی کا ٹائم بھی تو ذرا معقول ہو۔ ہمیں صبح یونیورسٹی جانا ہے، اس کے لیے ہمیں جلدی اٹھنا ہوگا، اس لیے فی الحال آپ کی ہر طرح کی خدمت سے معذرت چاہتے ہیں۔''

وہ اس کے لہجے میں مکمل ہم آہنگ، بے نیازی بھرے ہی انداز میں بولی۔ لبوں پر مسکراہٹ چھپائے بظاہر بے حد سنجیدگی سے۔

یونیورسٹی کے ماحول، اساتذہ اور کلاس فیلوز کے اس کی ذہانت کے حوالے سے تبصروں نے اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔ اب اگر اس کے سامنے کسی بھی بڑے سے بڑے بیوروکریٹ یا انڈسٹریلسٹ کی مغرور سے مغرور اور ماڈرن سے ماڈرن بیوی، بیٹی، بہن کو بھی لا کر کھڑا کر دیا جاتا تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی شخصیت، اپنے ظاہر، اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کسی بھی چیز کے بارے میں ذرا بھی کونشس ہوئے بغیر بھرپور اطمینان کے ساتھ ان سے باتیں کر لیا کرتی تھی۔ اشعر کے ساتھ بھی اپنے شرمیلے انداز کو ترک کر کے تھوڑی سی بولڈ ہو گئی تھی۔ اگر وہ شرارت میں اسے چھیڑنے کو کچھ کہہ رہا ہوتا تو اس کے پاس سے بھی اکثر بڑا زبردست قسم کا جوابی جملہ سننے کو ملا کرتا تھا۔ وہ اس کی بے تکلفی اور بے ساختہ حاضر جوابی کو بہت انجوائے کرتا تھا۔

''آپ جب کل یونیورسٹی سے دوپہر میں گھر واپس آئیں گی، اس وقت سو جایئے گا۔ فی الحال تو آپ کو کوئی سونے دے گا نہیں۔''

وہ اسی انداز سے بولا، اتنی گفت و شنید کے بعد نیند تو اس کی مکمل طور پر بھاگ چکی تھی، مگر وہ بطور احتجاج ابھی بھی اسے گھور ضرور رہی تھی۔ مگر وہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے کے مصداق گھورے جانے کے اس سلسلے سے قطعاً بے نیاز تھا۔

☆......☆......☆

''خرد! ناشتہ تو ڈھنگ سے کر لو۔'' جلدی جلدی ایک ٹوسٹ اور چائے حلق سے اتارتی خرد کو فریدہ نے ٹوکا۔

''ممی! میری پہلی کلاس ساڑھے آٹھ بجے ہے، لیٹ ہو جاؤں گی۔ آپ فکر مت کریں، بھوک لگے گی تو میں وہاں کچھ لے لوں گی۔'' فریدہ کو خرد کی صحت کی جب سے وہ یونیورسٹی جانے لگی تھی، بہت فکر رہنے لگی تھی۔

''مجھے پتا ہے، لینا دینا کچھ نہیں ہے۔ بس یونہی میری تسلی کے لیے یہ کہا جا رہا ہے۔''

''میں پرامس کر رہی ہوں ممی۔'' اس نے انہیں مطمئن کیا۔

''اشعر! ذرا دیکھو اسے۔ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتی۔ دیکھو، کتنی دبلی ہو رہی ہے۔''

وہ اخبار پر نظریں دوڑاتا خاصی دیر سے اس کے لاڈ اور بہو کے نخرے دیکھ رہا تھا، اب براہ راست مخاطب کیا گیا تو اس نے اخبار سامنے سے ہٹا کر ان دونوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔

''مجھے تو ٹھیک ٹھاک بلکہ تھوڑی موٹی ہی لگ رہی ہے ممی۔'' اس جواب پر انہوں نے ناراضی سے بیٹے کو گھورا۔

''ہاں یہ الٹی سیدھی باتیں اور بول دو تا کہ رہی سہی کسر پوری کر کے یہ مکمل طور پر ڈائٹنگ شروع کر دے۔''

''ممی! آپ سے پرامس کر رہی ہوں ناں، یونیورسٹی میں کچھ ضرور کھا لوں گی۔'' چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے اس نے انہیں پھر اطمینان دلایا۔

''چلیں؟'' خرد نے اس سے پوچھا۔ سر اثبات میں ہلاتا وہ کرسی پیچھے کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔

صبح اس کی پہلی کلاس جلدی ہونا ہوتی تو وہ اشعر کے ساتھ ہی چلی جاتی تھی۔ وہ اسے کیمپس ڈراپ کرتا آفس چلا جاتا اور اگر اس

کی پہلی کلاس دیر سے ہونا ہوتی تب وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی اور واپسی میں تو وہ روز ہی ڈرائیور کے ساتھ آتی تھی۔ آف وائٹ ٹراؤزر، آف وائٹ گھٹنوں سے کچھ اونچی قمیص اور آف وائٹ اور میرون پرنٹڈ ڈوپٹے میں وہ بہت فریش، تروتازہ اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ ایک نیک سی کالج گرل کے تصور پر پوری اترتی ہوئی۔ وہ کسی بھی طرح شادی شدہ نہیں لگتی تھی۔ ایک بھرپور اور گہری نگاہ اپنی حسین بیوی پر ڈالتا وہ مسکرایا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''اپنی زوجہ محترمہ کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ تم خوش ہو ناں خرد! اپنی اسٹڈیز دوبارہ شروع ہونے پر؟''

''ہاں بہت زیادہ۔'' وہ جواباً بھرپور انداز میں مسکرائی۔ ''ایسا لگنے لگا ہے میری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ گھر میں ڈل بیٹھے بیٹھے تو انسان خود کو بالکل worthless سمجھنے لگتا ہے، اب مجھے لگنے لگا ہے کہ ہاں میں بھی کچھ ہوں، میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔'' وہ اسے اپنے دل کی بات بتا رہی تھی۔

''جب میں ایم ایس سی کر لوں گی تو آپ مجھے جاب کرنے دیں گے؟'' اس نے اشعر کی طرف دیکھا۔

''ہاں بالکل، مجھے ویسے بھی ایک حسین سیکریٹری جس کا میتھس بھی بہت اچھا ہو کی اشد ضرورت ہے۔'' شرارتی انداز میں بولا۔

''مذاق نہیں ناں۔ آپ سیریسلی بتائیں؟''

''کر لینا یار جہاں دل چاہے وہاں جاب کر لینا۔ تمہیں کیا میں اتنا دقیانوسی لگتا ہوں کہ تم اگر کوئی کام کرنا چاہو تو میں تمہیں اس سے روکوں گا؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ کہنے کی حد تک تو سب ہوتے ہیں مگر آپ حقیقت میں بہت کھلے ذہن کے انسان ہیں۔ میری شدید خواہش تھی میں اپنی ایجوکیشن پوری کر سکوں۔ میری یہ خواہش صرف آپ کی وجہ سے پوری ہو رہی ہے۔'' اس نے بہت سنجیدگی سے اس کی تعریف کی۔

''صبح صبح ایک حسین لڑکی نے میری اتنی اچھی تعریف کر دی ہے۔ لگتا ہے آج کا سارا دن بہت اچھا گزرے گا۔'' اپنی تعریف پر متبسم نگاہوں سے اسے دیکھتے اس نے گاڑی یونیورسٹی کے گیٹ کے سامنے لا کر روک دی تھی۔

☆......☆......☆

''اللہ Binomial Theorem سے آخر expand کیوں نہیں ہو رہا؟'' خرد نے جھنجلائے لہجے میں خود کلامی کی۔

''اللہ میاں سزا دے رہے ہیں۔ شوہر بے چارہ اکیلا بور ہو رہا ہے اور اسے اگنور کر کے پڑھائیاں کی جائیں تو سزا فوراً ملتی ہے۔'' اس نے کتاب میں کسی سوال کو گھورتی خرد کو چھیڑا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ریاضی کے پیچیدہ پیچیدہ سوالات حل کر رہی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور ناشتے کے بعد اپنے گارڈن کی خبر گیری کے بجائے وہ وہیں بیڈ پر لیٹا مسلسل باتیں کر کر کے اسے تنگ کر رہا تھا۔

''یہ ڈاکٹر ادریس بھی نا۔ آسان آسان کوئسچن کلاس میں خود کروادیے اور اس ایکسرسائز کے ٹیڑھے' میڑھے' خطرناک سوال سارے ہمارے لیے چھوڑ دیے۔''

اس کے تنگ کرنے سے پریشان ہو کر وہ اس سے رخ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی پشت اشعر کی طرف تھی۔ وہ اس کے بالکل پیچھے لیٹا ہوا تھا اور لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے بالوں سے کلپ نکال دیا' اچھے خاصے سمٹے سمٹائے اس کے جوڑے کی طرح بندھے بال کھل گئے' اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو اپنے چہرے پر بکھراتے' ان کی خوشبو کو خوب گہری سانس لے کر اپنے اندر اتارتے ہوئے بولا۔

''خرد! تمہارے شیمپو کی خوشبو لاجواب ہے۔ اتنی سوفٹ اور مدہوش کر دینے والی خوشبو۔ واؤ نشہ سا طاری ہو جاتا ہے اس خوشبو سے۔''

''یہ Minus تو Values میں آگے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ شاید اس کوئسچن ہی گڑ بڑ ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے' یہ کوئسچن ہی شاید غلط ہے۔'' وہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنی ہی الجھن میں گھری بولی۔

سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اشعر نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف خضر تھا۔

''اشعر بھائی! خرد سے بات ہو سکتی ہے؟''

''بھائی میرے' وہ اس وقت مجھ سے بات نہیں کر رہی' تم سے کیا کرے گی۔'' مسکرا کر دل میں سوچتے ہوئے اس نے اسے ''اچھا'' کہا اور ریسیور خرد کو پکڑا دیا جو اس بے وقت کی کال سے کچھ بے زار ہوئی تھی۔

''ہیلو ہیلو' وہ خرد کے بے زاری لیے ہیلو پر مسکرایا۔ اس میں ابھی تک واقعی بچوں جیسی ہی معصومیت تھی۔ اسے لوگوں سے اپنے جذبات چھپانے نہیں آتے تھے۔

''نہیں سوالات ابھی مجھ سے حل نہیں ہوئے۔ ہاں میں کوشش کروں گی کہ اسائنمنٹ کل سب مٹ کرا سکوں۔'' بڑی بے توجہی سے خضر کے کسی سوال کا اس نے جواب دیا تھا۔

''ہاں سب کوئسچن حل کرلوں گی تو آپ کو دے دوں گی۔ اچھا اس وقت میں بہت بزی ہوں۔ اللہ حافظ۔''

وہ اس کی بدلحاظی اور بداخلاقی پر پیچھے لیٹا ہنس رہا تھا۔ اس نے خرد کے ہاتھ سے ریسیور لے کر اسے واپس کریڈل پر رکھ دیا اور اسے ڈسٹرب کرنے' ستانے والے اپنے مشغلے سے تائب ہوتا بیڈ پر سے اٹھ گیا۔ ہنسی مذاق کی بات الگ مگر اسے پڑھائی کے دوران ڈسٹرب کرنا اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

☆......☆......☆

رات وہ کافی دیر سے گھر واپس آیا تھا۔ حریم کو سلاتے سلاتے اس کی خود بھی آنکھ لگ گئی تھی' مگر اپارٹمنٹ کے مین دروازے کا لاک کھلنے ہی کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اشعر اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ وہ حریم کو چادر ٹھیک سے

اوڑھاتی دوبارہ سوگئی تھی۔

اگلے روز وہ تینوں صبح ہی ہسپتال چلے گئے تھے۔ یہ حریم کے ٹیسٹوں کا دوسرا دن تھا۔ وہاں ڈھیر ساری مشینوں' طبی آلات اور اجنبی چہروں کو آس پاس دیکھ کر حریم خائف سی ہوگئی تھی۔ ہسپتال سے باہر نکلنے کے بعد وہ دونوں اپنی باتوں کے ذریعے اس کے خوف کو دور کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہسپتال سے واپس گھر آنے سے قبل' اشعر نے راستے میں گاڑی روک کر حریم کو اس کی پسند کی کئی طرح کی کھانے پینے کی چیزیں اور اس کا فرمائشی ڈرائنگ اور پینٹنگ وغیرہ کا ڈھیر سارا سامان اسے دلا دیا تھا۔ یہ تمام خریداری حریم کو کروانے کے بعد ان دونوں کو اپارٹمنٹ چھوڑ کر وہ خود واپس چلا گیا تھا' غالباً اپنے آفس۔ دن میں دو' تین بار اس نے حریم سے فون پر بات کی تھی۔ شام ساڑھے سات بجے وہ واپس آیا تو خوب لدا پھندا وہ حریم کے لیے بہت ساری شاپنگ کر کے لایا تھا۔ شاپنگ بیگز میں جھانک کر حریم ان میں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ پا کر اخلاقاً ''تھینک یو پاپا'' کہہ کر دوبارہ اپنی ڈول کو پرام میں بٹھا کر سیر کرانے لگی تھی۔

یہ گڑیا حریم کو باقی گڑیوں سے ذرا زیادہ پسند تھی۔

''پرنس! دیکھو تو لو کیسے ڈریسز ہیں۔ پاپا اتنے پیار سے لائے ہیں۔'' وہ اپنی ڈول کی فیڈر اٹھانے مڑی تو اشعر نے اسے گود میں اٹھا کر کہا۔

''پاپا! اینی کو بھوک لگی ہے۔''

مدبرانہ سے انداز میں کہتے اس نے اشعر کو فیڈر دکھا کر سمجھانا چاہا کہ وہ اس وقت بہت بزی ہے۔

''ہاں بھئی اپنی اینی' بیٹی کے آگے آپ پاپا کو کہاں لفٹ کرائیں گی۔'' اسے گود سے اتارتے ہوئے وہ مسکرایا۔

کھانے کے وقت ایک ٹیبل پر ساتھ بیٹھے وہ تینوں ایک مکمل فیملی جیسا ہی تاثر دے رہے تھے۔

حریم اس سب سے بے تحاشا' بے انتہا اور بے حساب خوش تھی۔ اب تک صرف ایک ماں اس بچی کی کل کائنات تھی اور اب ایک باپ اس کی اس کائنات میں شامل ہوا تھا اور وہ اسے خوشیوں کے وہ رنگ دکھا رہا تھا' جن سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔

''ماما! یہاں بیٹھیں مووی دیکھیں۔'' کھانے کے بعد حریم' اشعر کی گود میں چڑھ کر بیٹھی ٹی وی پر کوئی کارٹون مووی دیکھ رہی تھی' کھانے کے بعد کافی دیر وہ میز پر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر جب وہ ٹیبل سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی تب حریم نے اسے پکارا۔

''حریم! تم دیکھو' میرے دل نہیں چاہ رہا۔''

''ماما! آئیں ناں پلیز، پلیز۔'' وہ پھر بھی آگے بڑھنے لگی' تب حریم اسے روکنے کو جلدی سے مزید بولی۔

''ماما! آپ سنڈریلا کی اسٹیپ مدر جیسی تو نہیں ہیں۔'' بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ اشعر کے ساتھ بیٹھ کر سنڈریلا دیکھ رہی تھی۔ حریم سنڈریلا کی مظلومیت پر ایک مکمل طور پر غمگین اور دکھیاری شکل بنا کر بیٹھی تھی۔ اس کا پرتفکر اور اداس سنجیدہ چہرہ دیکھ کر ہنسی بھی آرہی تھی مگر زیادہ دھیان اس کا حریم کی دوا کی طرف تھا۔ اس کی دوا کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے اشعر کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''حریم کی میڈیسن کا۔''

''مجھے یاد ہے۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے قبل اس نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔ بظاہر سادہ سا لہجہ ہونے کے باوجود اس جواب میں ایک پھنکار سی تھی۔

''زینت۔'' اشعر کے آواز دینے پر ملازمہ فوراً وہاں آ گئی۔

''حریم کے روم میں بیڈ سائڈ ٹیبل پر جو میڈیسن رکھی ہیں وہ لے آؤ۔'' وہ سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی اور محض چند ہی لمحوں بعد ایک چھوٹی ٹرے میں تمام دوائیں، پانی کا گلاس اور چمچہ وغیرہ رکھ کر لے آئی۔ ٹرے زینت کے ہاتھ سے لے کر اشعر نے اپنے برابر کی خالی جگہ پر رکھی تب ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر حریم فوراً بولی۔ ''پاپا! حریم میڈیسن نہیں کھائے گی۔'' اشعر کے چہرے پر یک دم بے تحاشا حیرت ابھری تھی۔

''پرنسس! یہ تو اچھی والی میڈیسن ہے۔ یہ تو ڈاکٹر انکل نے دی ہیں ناں اور دیکھنا یہ زیادہ کروی (کڑوی) بھی نہیں ہوں گی اور دیکھو۔ یہ ٹوفی اور یہ چاکلیٹ جو حریم کو میڈیسن کھاتے ہی فوراً ملے گی۔'' اس نے گویا اسے ترغیب اور لالچ دینا چاہا۔

''نہیں پاپا! میڈیسن نہیں۔'' وہ ایسے کسی لالچ میں آنے والی نہ تھی اسے دوا اٹھاتا دیکھ کر وہ نہیں، نہیں کر کے زور زور سے پاؤں چلانے لگی۔

وہ اب مزید لاتعلق نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ ''حریم'' سخت نگاہوں سے اسے گھورتے وہ درمیان کا فاصلہ کچھ کم کر کے اشعر اور حریم کے قریب ہوئی۔ ''اگر دوا نہیں لوگی تو میں پاپا سے کہوں گی اس کے سارے کھلونے دکان پر واپس کر آئیں۔'' دوا کی بوتل اشعر کے ہاتھ سے لے کر اس نے دوا چمچہ میں ڈالنا شروع کی۔ حریم نے ٹھنکنا ضد کرنا اور ہاتھ پاؤں چلانا بھلا کر بے یقینی سے باپ کو دیکھا۔

''سوری پرنسس! پاپا کو سارے کھلونے، ساری ڈولز شاپ میں واپس کر کے آنا پڑیں گی، ورنہ ڈاکٹر انکل پاپا کو ڈانٹیں گے۔ انہوں نے بہت سختی سے کہا ہے کہ اگر حریم میڈیسنز لے تو اسے کھلونے دیے جائیں ورنہ نہیں۔''

وہ ضدی پن سے ہاتھ پاؤں چلانا بھول کر صدمے سے بھری کیفیت میں کبھی اسے اور کبھی اشعر کو دیکھ رہی تھی۔ ''Toys واپس نہیں کریں۔ میڈیسن دے دیں۔'' وہ جلدی سے بولی، مبادا اشعر ابھی اٹھ کر ہی کہیں کھلونے واپس کرنے نہ چلا جائے۔ ان دونوں کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی اور ان دونوں ہی نے اسے چھپا کر چہروں کو سنجیدہ ہی بنائے رکھا تھا۔

بہت برے برے منہ بناتے، آنکھوں میں آنسو بھر کر ''کروی ہے، کروی ہے۔'' اور ''ٹوفی دیں، ٹوفی دیں'' واویلا کرتے مگر بہر حال اس نے دوا ساری لے لی تھی۔

''اوکے پرنسس! گڈ نائٹ سوئٹ ڈریمز۔'' وہ اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد پیار کر کے مڑنے لگا تب حریم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ''پاپا! یہاں سوئیں کہانی سنائیں۔'' کچھ سوچ کر سر اثبات میں ہلاتا وہ کمرے سے چلا گیا۔ تین چار منٹ بعد واپس آیا تو اس کے

ہاتھ میں بچوں کی کئی طرح کی اسٹوری بکس تھیں' خوب صورت اور رنگین تصاویر سے مزین' وہ اس دوران حریم کا لباس تبدیل کروا چکی تھی۔ پنک کلر کا نائٹ ڈریس پہنے وہ اب باتھ روم میں کھڑی اپنے دانت واش کر رہی تھی۔

وہ بیڈ پر ٹانگیں اوپر پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ حریم' باتھ روم سے نکل کر تیزی سے چلتی بیڈ پر آئی اور بڑی بے تکلفی سے اس کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ ''حریم کے Teeth دیکھیں پاپا۔ کتنے شائن کر رہے ہیں۔'' اوپر اور نیچے کے دانتوں کو آپس میں ملا کر اس نے اسے اپنے دانت دکھائے۔

''واہ بھئی' حریم کے Teeth تو واقعی بہت زیادہ Shine کر رہے ہیں۔ اب تو برش کرنے کا صحیح طریقہ مجھے حریم ہی سے پوچھنا پڑے گا۔''

قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اس نے اسے اپنے اوپر سے اٹھا کر اپنے برابر میں لٹا لیا۔ وہ خود بھی تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گیا تھا' اس نے اپنا ہاتھ بڑی محبت سے حریم کے گرد پھیلا رکھا تھا۔

''کہانی شروع کریں پرنس؟''

اسے سر اقرار میں ہلا کر اجازت دینے کے ساتھ حریم خود سے بولی۔ ''ماما! آپ بھی سنیں۔''

''میں سن رہی ہوں جانو!'' مسکرا کر اس نے اسے مطمئن کیا۔ وہ حریم کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی تسلی کے لیے اس کا ایک ہاتھ بھی تھام لیا۔

''ماما! لیٹیں بھی تو۔'' روز رات میں' وہ اس سے لپٹ کر سویا کرتی تھی۔ اس کے بغیر اسے جیسے نیند آ ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر اس وقت لیٹنا اس کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا اس سے پہلے کہ حریم اس سے لپٹنے کے لیے مزید ضد کرتی وہ جلدی سے بولی۔

''اب باتیں بند کرو' خاموشی سے کہانی سنو۔ پاپا تمہیں بہت اچھی کہانی سنانے والے ہیں۔ بھئی آپ کہانی سنانا شروع کریں میں اور حریم ویٹ کر رہے ہیں۔''

بیڈ پر حریم کے دائیں طرف اشعر نیم دراز تھا اور بائیں طرف وہ بیٹھی تھی۔ ایک کمرے میں ایک ہی بیڈ پر اس شخص کے ساتھ اپنی موجودگی سے اسے وحشت ہو رہی تھی' گھٹن ہو رہی تھی۔ اس شخص کی یہاں موجودگی' یہ قربت اسے ذلتوں سے دوچار کر رہی تھی۔ اشعر کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ حریم کے گرد ہاتھ پھیلائے وہ کہانی سنانا شروع کر چکا تھا۔

''جنگل میں سب جانور مل جل کر رہتے تھے۔ شیر' ہاتھی' چیتے' بندر' لومڑی' خرگوش۔'' حریم آنکھوں میں دلچسپی لیے بہت مزے میں کہانی سن رہی تھی۔

''ہاتھی کی برتھ ڈے آنے والی تھی' سارے جانور سوچ رہے تھے کہ ہاتھی کو برتھ ڈے پر کیا گفٹ دیں۔ بی لومڑی بولیں کہ چلو چل کر شیر سے پوچھتے ہیں کہ ہاتھی کو برتھ ڈے پر دینے کے لیے کیا گفٹ۔''

''پاپا!'' حریم نے بے ساختہ اسے پکارا' وہ فوراً رکا اور کتاب پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ہاں پرنسس؟''

''آپ حریم کی برتھ ڈے پر کیوں نہیں آئے؟ گفٹ بھی نہیں دیا۔'' ایک ڈیڑھ ماہ قبل اس کی چوتھی سالگرہ گزری تھی۔ اس کی بیماری سے لڑتے' سخت پریشانی میں مبتلا صرف اور صرف حریم کو خوش کرنے کے لیے' اپنی بیمار بیٹی کو ایک چھوٹی سی' معصوم سی خوشی دینے کے لیے اس نے ایک کمرے والے اپنے اس چھوٹے سے گھر میں ایک برتھ ڈے پارٹی ارینج کی تھی۔

اشعر' حریم کی بات پر بالکل چپ بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ ایک پل بالکل چپ اور گم صم سا بیٹھا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر نرمی سے بولا۔

''سوری پرنسس! پاپا تھوڑی بزی تھے اس لیے آپ کی برتھ ڈے پر آ نہیں سکے تھے پر آپ کا برتھ ڈے گفٹ آپ کو اب دلا دیں گے اور پاپا کا یہ پکا پرامس ہے اپنی پرنسس سے کہ اب سے اس کی ہر برتھ ڈے پر اس کے ساتھ ہوا کریں گے۔'' اس نے جھک کر حریم کے گالوں پر پیار کیا اور پھر سے اسے کہانی سنانے لگا۔ کہانی آدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ نیند کو بہت دیر سے دور بھگاتی حریم آخر کار اس سے ہار گئی۔ وہ حریم کے سوتے ہی فوراً اس سے دور ہٹ گئی تھی۔ وہ پھر بیڈ کے انتہائی دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔ اشعر غالباً حریم کے گہری نیند سو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد پھر وہ بڑی آہستگی سے حریم کے اوپر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر آہستہ آہستہ' بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس کے پاس سے اٹھا اور خرد پر نظر ڈالے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آف کی اور پھر حریم کے برابر آ کر لیٹ گئی۔ اس کی پیشانی چومتے اس کی آنکھوں سے بڑی خاموشی سے دو آنسو گرے۔

''حریم! پتا نہیں تم کبھی یہ جان پاؤ گی یا نہیں کہ تمہاری ماما نے تمہاری محبت میں اپنی کیسی تذلیل کروائی' اپنی عزت نفس' اپنا وقار سب کچھ مٹی میں ملا کر پھر اس شخص کو اپنے سامنے آنے' اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دی جس نے اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔'' وہ حریم کے پاس لیٹ گئی تھی مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اشعر کو لیٹنے کے بعد فوراً نیند نہیں آ پائی تھی۔ حریم کے ایک معصومانہ سے سوال نے اسے پورا کا پورا ہلا دیا تھا۔

''آپ حریم کی برتھ ڈے پر کیوں نہیں آئے؟ گفٹ بھی نہیں دیا۔'' اس کا ایک معصومانہ سوال کیسا اسے پورا کا پورا جھنجوڑ کر رکھ گیا تھا۔ خرد احسان' اس عورت کو کیا کہے۔ اس سفاک عورت کے ظلم کی بدولت آج وہ بیٹی سے دور رہنے کا' غافل رہنے کا مجرم قرار پایا تھا۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا' اسے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ صبح اسے دفتر جلدی پہنچنا تھا۔ لندن کی ایک کمپنی کے ساتھ ان کی ایک اہم ڈیل کل فائنل ہونا تھی۔ ان دنوں حریم کے ساتھ مصروف ہونے کے سبب وہ دفتری کاموں کو مناسب طور پر وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ کل اسے حریم کی تمام رپورٹس امریکہ میں جن ہسپتالوں سے اس نے رابطہ کیا تھا' وہاں فیکس بھی کروانی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کو دنیا کا

بہترین علاج فراہم کرنا چاہتا تھا' اس لیے اس امکان پر بھی غور کر رہا تھا کہ کیا اسے سرجری کے لیے حریم کو امریکہ لے جانا چاہیے یا پھر یہیں پر ہی سرجری کرا لینا درست ہے۔

وہ پوری رات جاگتا رہا تھا۔ وہ پوری رات ایک کسک ایک چبھن محسوس کرتا رہا۔

☆......☆......☆

دفتری کاموں سے اندرون ملک اور بیرون ملک مہینے میں دو' تین بار تو اس کا جانا آنا لگا ہی رہتا تھا۔ سو اپنی اسی روٹین کی دفتری مصروفیات کے تحت وہ ملائیشیا گیا ہوا تھا۔ 12'13 روز بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ ''اور کیا کیا رہا اتنے دنوں میں؟ کوئی نئی تازی بات' کوئی خاص واقعہ؟'' اس نے رات کے کھانے کے دوران فریدہ اور خرد سے مشترکہ طور پر استفسار کیا۔ آج ڈنر میں فریدہ نے بیٹے کی اتنے دنوں بعد موجودگی کے سبب کافی خاص اہتمام کروایا تھا۔ کھانے میں دو ڈشز تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ ایک اشعر کی پسند کی اور ایک خرد کی پسند کی۔

''خضر بے چارے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' لاسٹ فرائی ڈے کو۔''

''ایکسیڈنٹ' کیسے؟ خیریت سے تو ہے وہ؟'' نوالہ ہاتھ میں روک کر اس نے فوراً پوچھا۔

''ہاں اب تو خیر وہ ٹھیک ہے۔ ابھی ہاسپٹل سے ڈسچارج نہیں ہوا' اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا' کسی بس والے نے ٹکر مار دی۔ کافی زیادہ چوٹیں آئی تھیں اسے اور خون بھی بہت ضائع ہو گیا تھا۔ خاصی بری حالت تھی اس کی فوری طور پر اچھا خاصا خون چاہیے تھا۔ بلڈ بینکس اور ادھر ادھر سے زرینہ' اجمل بھائی اور خضر کے دوستوں نے کوششیں کر کے کافی بلڈ حاصل کیا مگر جتنا بلڈ اسے چاہیے تھا' وہ ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ تو پھر خرد کا بلڈ گروپ اس سے میچ کر گیا۔ خرد نے بلڈ دیا۔''

فریدہ نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خرد کو دیکھ کر مسکرایا۔ ''اچھا تو میرے پیچھے یہ خدمت خلق کر کے نیکیاں کمائی جا رہی تھیں۔''

''کیا کریں' ہم او نیگیٹو والے ہوتے ہی اتنے دیالو ہیں' دوسروں کو دینا ہماری سرشت میں شامل ہے۔ یونہی تو نہیں ہمیں Universal Donor کہا جاتا۔ یہاں تو خیر دینا بھی ایک O-Negative والے ہی کو تھا۔

خرد نے ایک ادائے بے نیازی سے ذرا شاہانہ سے انداز میں اسے جواب دیا تھا اور اس کے اس انداز پر اس کے ساتھ ساتھ فریدہ بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

☆......☆......☆

اسے ملائیشیا سے واپس آئے چھ' سات روز ہو چکے تھے جب اس صبح وہ خرد کو یونیورسٹی چھوڑنے آیا تھا۔ یونیورسٹی پہنچ کر خرد گاڑی سے اتر رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے آتی گاڑی میں سر پر پٹی بندھے خضر کو دیکھا۔ اس زخمی حالت میں وہ یونیورسٹی پتا نہیں کیوں چلا آیا

تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا اور اب غالباً اس سے سلام دعا کرنے اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ اشعر بھی اخلاقاً گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''بھائی میرے! ایسے پٹیاں باندھ کر اس زخمی حالت میں یونیورسٹی آنے کی کیا افتاد پڑی تھی۔ ابھی چند دن اور ریسٹ کر لیتے۔''
وہ ایک پیر کو جس طرح گھسیٹ گھسیٹ کر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اسے دیکھ کر اس نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''پہلے ہی بہت چھٹیاں ہوگئیں اشعر بھائی! آپ کی مسز سے تو پڑھائی میں ہم یوں بھی پیچھے ہی رہتے ہیں اب اتنے سارے ناغوں کے بعد تو ان جیسی جینئس سے مزید پیچھے ہوگیا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ خرد خاموشی سے مسکراتی دونوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' اس نے پر اخلاق انداز میں اس کی خیریت پوچھی۔

''اللہ کا شکر ہے' اس کا کرم ہے اور آپ کی بیگم کی مہربانیاں ہیں' بالکل خیریت سے ہوں۔ پہلے صرف ان کے اسائمنٹس کا زیر بار اور ممنون رہا کرتا تھا۔ اب ان کے خون کا بھی قرض دار اور احسان مند ہوگیا ہوں۔ پہلے یہ صرف میری کلاس فیلو تھیں اب میری محسنہ بھی بن گئی ہیں۔'' خضر مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔

پھر خرد پر ایک نظر ڈال کر اپنی بات جاری رکھتے مزید بولا۔ ''خرد بھی میری طرح O-Netagive ہیں یہ مجھے اب اس ایکسڈنٹ کے بعد پتا چلا ہے O-Negative والے جو بڑے انا والے ہوتے ہیں' دیتے سب کو ہیں' پر لیتے صرف اپنوں سے ہیں۔'' خضر نے چھ' سات روز قبل جس روز وہ واپس آیا تھا' اس روز ڈنر کے وقت خرد کی کہی ہوئی بات ذرا مختلف لفظوں میں دہرائی۔

''ہاں بھئی آپ O-Negative والے.... Universal Donors بھی ہیں' انا والے بھی ہیں۔ اب آپ لوگ کھڑے ہو کر اس بات پر خوش ہوتے رہیں' مجھے ہو رہی ہے آفس کو دیر' سو میں تو چلا۔''

گفتگو کو فوراً ہی سمیٹ کر اس نے خضر کو خدا حافظ کہا اور فوراً ہی اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ساتھ ہی میوزک بھی بجنے لگا تھا۔ ابھی گھر سے یونیورسٹی تک آتے ہوئے راستے میں جو گانا وہ اور خرد سنتے ہوئے آتے تھے وہی اس کا فیورٹ گانا گاڑی میں گونجا تھا۔ مگر اپنا وہ فیورٹ نمبر اسے اس وقت اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے فوراً ہی بڑی بےزاری سے میوزک بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے کچھ غیر ملکی کاروباری دوست مختصر دورے پر کراچی آئے ہوئے تھے اور اس روز اس نے انہیں گھر پہ لنچ پر مدعو کر رکھا تھا۔ چونکہ بطور میزبان خرد کی دعوت میں بھرپور انداز میں موجودگی ضروری تھی اس لیے اس نے اس روز یونیورسٹی سے چھٹی کر لی تھی۔ لنچ کا تمام تر اہتمام بھی اس نے اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ ساڑھے تین' چار بجے جب اس کے مہمان رخصت ہوگئے تب وہ واپس آفس چلا گیا تھا۔ آفس سے پھر اس کی روزانہ والے ہی ٹائم پر گھر واپسی ہوئی تھی۔ فریدہ بھی کچھ دیر قبل ہی گھر واپس آئی تھیں۔ خرد سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی اور اب وہ تینوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے پینے کے دوران آج کے لنچ ہی کی بات گفتگو ہو رہی تھی جب ان کے پورچ میں خضر کی گاڑی آ کر رکی۔ اس کے ساتھ زرینہ بھی تھیں۔

''خیریت اتنے مصروف لوگوں نے تمہارے لیے ڈرائیور کی ڈیوٹی کب سے سنبھال لی؟'' وہ لوگ ان لوگوں کے پاس آ کر لان چیئرز پر بیٹھ گئے تب فریدہ' زرینہ سے ہنستے ہوئے بولیں' ان کا اشارہ خضر کی طرف تھا۔ جس کے اپنے ساتھ آنے کے متعلق زرینہ یہ بتا رہی تھیں کہ وہ ان کے ہاں آنے کے لیے اپنے ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھیں۔ جسے اجمل صاحب اپنے کسی کام سے ساتھ لے گئے تھے۔ ان کا ڈرائیور تو اب تک واپس آیا نہیں تھا۔ ہاں خضر غیر متوقع طور پر ضرور ان کے گھر آ گیا تھا اور اس نے ممانی کو ان کے گھر تک پک اینڈ ڈراپ کے لیے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔

''بس آنٹی! بندے کو کبھی کبھی چھوٹی موٹی نیکیاں کرتے رہنا چاہئیں۔'' خضر' فریدہ کی بات کے جواب میں خوش مزاجی اور خوش دلی سے بولا۔ وہ اشعر کے برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ خرد ان دونوں کے سامنے والی کرسی پر۔

''اللہ سلامت رکھے تمہارے نیکی کے اس جذبے کو۔'' فریدہ اس کی برجستگی پر مسکرا کر بولی تھیں۔

ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کے بعد زرینہ جس کام سے فریدہ کے پاس اس وقت آئی تھیں' اس سے متعلق ان سے گفتگو کرنے لگیں۔ خرد اندر ملازمہ سے ان لوگوں کے لیے چائے کا کہنے چلی گئی تھی۔

''آج یونیورسٹی نہیں آئیں آپ؟'' اشعر فریدہ اور زرینہ کے ساتھ محو گفتگو تھا جب اس نے اپنے برابر والی نشست پر بیٹھے خضر کی آواز سنی۔ خرد مہمانوں کو چائے اور اسنیکس سرو کر رہی تھی۔

''آج لنچ پر کچھ مہمانوں کو آنا تھا اس وجہ سے۔'' خرد نے اسے جواب دیا۔

''ہاں میں یہی سوچ رہا تھا کہ اتنی ریگولر اور پنکچوئل خاتون آج غائب کیسے ہو گئیں۔ خیال آیا کہ کہیں طبیعت تو خراب نہیں۔'' خضر چائے پیتے ہوئے خرد سے بولا۔ زرینہ اشعر سے مخاطب تھیں' وہ ان کی طرف دیکھ بھی رہا تھا۔ مگر وہ کیا کہہ رہی تھیں' اس نے بالکل بھی نہیں سنا تھا اس کی سماعتیں کسی اور طرف تھیں۔

''چلو خضر! ورنہ پھر کہو گے کہ نیکی گلے پڑ گئی' میں نے تو صرف پک اینڈ ڈراپ دینے کی بات کی تھی۔ مامی لمبا بیٹھ گئیں۔''

زرینہ کو فریدہ سے جو بھی کام تھا' وہ اسے جلدی جلدی ڈسکس کر کے جانے کے لیے جلد ہی اٹھ گئی تھیں۔

''آنٹی! ڈنر کر کے جائیے گا۔'' خرد نے ان سے کہا۔ خرد اور فریدہ دونوں ان سے کھانے کے لیے رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔

''میں رک جاتی خرد! لیکن آج بہت دنوں بعد سارہ صاحبہ ڈنر گھر پر کرنے والی ہیں۔ مدت بعد تو آج محترمہ کو ماں' باپ کو وقت دینے کا خیال آیا ہے۔ سو ڈنر تو آج لازمی طور پر مجھے گھر پر ہی کرنا ہے۔'' خرد کے اصرار کے جواب میں زرینہ نے اپنے نہ رکنے کی وجہ بتائی۔

''سارہ کیسی ہے؟ بہت دنوں سے کہیں نظر نہیں آئی۔ مسز چوہدری کے ہاں پارٹی میں بھی نہیں آئی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ بس وہی اس کے کام ہیں اور کیا ہونا ہے۔ بس صبح اس سے ملاقات ہو گی اور پھر رات میں اور اس وقت بھی اتنی تھکی ہوئی ہوتی ہے کہ آتے ہی سیدھے اپنے بیڈ روم میں۔ کل ہی میں نے کہا کہ کسی اور کو تو چھوڑو تم کم از کم خود کو تو تھوڑا وقت' تھوڑا آرام دے لیا

کرو تو کہنے لگی' می آج کل اپنی Summer Line کی ایگزیبیشن کی تیاریوں کی وجہ سے اتنی مصروف ہوں' اس کے بعد خوب آرام کروں گی۔ میں نے کہا رہنے دو۔ اس کے بعد کوئی دوسری ایگزیبیشن ہوگی' کوئی اور اہم فیشن شو' کوئی نیا فیشن ایونٹ۔''

زرینہ کے نہ رکنے کی وجہ بتانے کے بعد فریدہ اور خرد نے انہیں مزید نہیں روکا تھا۔ وہ اور خضر بہت جلدی ہی واپس چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

''تم جا کر ریسٹ کرو نور افزا! کچن میں جو کام رہ گیا ہے میں دیکھ لوں گی۔''

خرد ڈائننگ روم کے پاس کھڑی نور افزا سے کہہ رہی تھی۔ کچن کے کاموں کے لیے دیگر دو کل وقتی ملازمائیں اور بھی موجود تھیں مگر۔ وہ ان کے گھر کی سب سے پرانی ملازمہ تھی اور گھر کے ایک ایک فرد کا مزاج اور اس کی پسند ناپسند کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی اسی لیے کھانا پکانے کی بنیادی ذمہ داری اس پر رہا کرتی تھی۔ مگر آج شاید وہ کچھ بیمار تھی۔ اشعر اور فریدہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''بہت نرم دل کی ہے خرد! ہر کسی کی اسے فکر رہتی ہے۔ سب کا خیال رہتا ہے۔'' فریدہ نے بے ساختہ خرد کی تعریف کی۔ ''خود اکثر و بیشتر جمال کو پڑھائی میں مدد بھی دے دیا کرتی ہے۔'' فریدہ اسے بتا رہی تھیں۔ خرد کی یہ خوبیاں اس کے علم میں تھیں مگر ماں کے منہ سے انہیں سننا اور بھی زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی طرح فریدہ بھی خرد کی عاشق تھیں۔

''گھر کے افراد ہوں' نوکر ہوں یا دوست اسے ہر ایک کی اسی طرح فکر رہتی ہے۔'' ابھی خضر کا ایکسیڈنٹ ہوا تو اسی فکر سے خرد تقریباً ہر ایک آدھ دن بعد اس کی عیادت کے لیے ہسپتال جاتی رہی۔ کبھی سوپ بنا کر لے جاتی کبھی دوسری کوئی اور چیز' جبکہ میں تو یہی بات ہے بمشکل دو ہی مرتبہ ہسپتال جا پائی خضر کو دیکھنے' باقی دنوں میں فون پر زرینہ سے یا خرد وہاں سے ہو کر آتی تو اس سے خیریت معلوم کر لیا کرتی تھی۔ تمہارے ڈیڈی جب ہسپتال میں ایڈمٹ تھے تمہیں یاد ہے خرد کی حالت۔ سارا سارا دن ہسپتال میں ان کے پاس رہا کرتی تھی۔ میں کہتی بھی تھی بیٹا کچھ دیر گھر پر آرام کر آؤ' مگر وہ ان کے پاس سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی نیچر ہی اس طرح کی ہے۔ بہت سوفٹ' بہت ہی زیادہ حساس اور نرم دل۔''

نرگسی کوفتے اور جھینگوں کا پلاؤ بنانے کا آغاز تو یقیناً نور افزا نے کیا تھا مگر ان چیزوں کی تیاری کا بقیہ تمام کام خرد نے کیا۔ یوں یہ دونوں ڈشز اس ہی نے تیار کی تھیں۔ وہ تینوں ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ابھی ان لوگوں کا کھانا جاری ہی تھا کہ دلشاد نے آ کر خضر کی آمد کی اطلاع دی۔ ''یہیں بلا لو اسے۔'' فریدہ نے دلشاد سے کہا۔ خضر چند منٹوں بعد ہی دلشاد کے ساتھ وہاں آ گیا تھا۔ سلام دعا کے بعد فریدہ اس سے بولیں۔

''بیٹھو خضر! اگر کھانا کھا کر آئے ہو تب بھی یہ نرگسی کوفتے ضرور چکھو خرد نے بنائے ہیں اور میری بہو کے ہاتھ میں اللہ نے بہت ذائقہ دیا ہے۔''

وہ بلا تکلف مسکراتا ہوا کرسی پر فوراً بیٹھ گیا۔

''چکھوں گا کیوں۔ میں تو پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ خرد کے ہاتھوں کا جب سوپ اتنے مزے کا ہوتا ہے تو باقی چیزیں یقیناً بہت اچھی بناتی ہوں گی۔''

خرد مسکرا رہی تھی۔ وہ اپنے لیے سالن نکالنے لگا تھا۔

''اشعر بھائی بہت چپ ہیں۔ لگتا ہے اس بن بلائے مہمان کی آمد سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' خضر نے فوراً ہی اس کی خاموشی بلکہ رکھائی کو محسوس کیا تھا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خاموشی سے بیٹھ کر کھانا کھانے کو زیادہ انجوائے کرتا ہوں۔'' وہ خود پر جبر کر کے زبردستی مسکرایا کھانے کو انجوائے تو کیا کر رہا تھا۔ وہ تو آج کھانے کی میز پر بغیر بھوک کے آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ دن بھر میں چائے کے سوا اس نے اور کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا پھر بھی اسے بالکل بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ اسے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک شدید قسم کی بےزاری اس پر طاری ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد ابھی سب لوگ میز پر ہی تھے کہ وہ معذرت کرتا میز پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا، خرد صرف پانچ منٹ بعد ہی اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی اور وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ مانیٹر سے نگاہیں ہٹا کر اس نے خرد کو دیکھا، قصداً مسکرایا۔

''ٹھیک ہے۔ کیا ہوا، تم کافی پیے بغیر کیوں آ گئیں؟''

''مجھے آپ کی فکر ہو رہی تھی۔ مجھے لگا، شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ شام سے اتنے چپ چپ لگ رہے ہیں، ابھی کھانا بھی اتنا تھوڑا سا کھایا ہے۔'' اس کی فکرمندی پر اس بار وہ دل سے مسکرایا۔

''طبیعت میری بالکل ٹھیک ہے۔ بس شاید کچھ تھک گیا ہوں، تھوڑا سر میں درد سا ہے۔''

''سر میں درد ہے تو پھر کام کیوں کر رہے ہیں۔ بند کریں اسے، آپ بیڈ پر لیٹیں، میں بس ابھی دو منٹ میں آپ کے لیے زبردست سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ چائے پی کر ڈسپرین لے لیں، ایسا فوراً سر درد بھی دور ہو گا اور تھکاوٹ بھی ختم ہو جائے گی۔''

وہ فوراً ہی مڑنے لگی تھی لیکن اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ''کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ سوؤں گا تو درد اپنے آپ دور ہو جائے گا۔''

''بس تو پھر سونے لیٹیں۔'' اس کے قریب کھڑی وہ خود کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرنے لگی تھی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔ وہ بیڈ کی طرف بڑھا تمام لائٹس آف کر کے وہ خود بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا تھا اور وہ اس کے پاس نیم دراز آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی تھی۔ نازک انگلیوں کی نرماہٹ اور گداز اچھا لگ رہا تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں دل میں

ایک پھانس سی چبھی محسوس ہو رہی تھی۔

''خرد! پتا نہیں کون سی بات ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے' مگر آج میرا دل خوش نہیں۔ خرد! تمہاری قربت ہر روز کی طرح دل کو آج بھی بہت تسکین دے رہی ہے مگر پتا نہیں پھر بھی دل اداس کیوں ہے۔'' وہ بہت دیر تک اس کا سر دباتی رہی تھی اور اس کے نازک ہاتھ، اس کے کومل انگلیوں کی نرماہٹیں محسوس کرتے کرتے وہ نجانے کس وقت سو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس کے پاس لیٹی تھی، اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کی پیشانی ہی پر تھا۔ پتا نہیں، رات وہ کب تک اس کا سر دباتی رہی تھی اور یقیناً دباتے دباتے ہی خود بھی سو گئی تھی۔

اپنی محبوب بیوی کے محبت بھرے اس انداز نے حقیقتاً اس کی ساری بے زاری ساری تھکن مٹا دی تھی۔ اپنی پیشانی پر رکھے اس کے ہاتھ کو اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر والہانہ چوما تھا۔

''خرد! آئی لو یو خرد! ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا، میری زندگی کی ہر صبح یونہی ہو، میں آنکھیں کھولتے ہی سب سے پہلے تمہیں دیکھوں۔''

اس نے خرد کے گرد اپنے بازو پھیلا دیے تھے اور خرد اس کے محبت کے اس پرجوش' انداز پر حیران سی ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆


# جناتی دُنیا

**جناتی دُنیا،** مظہر کلیم کے باصلاحیت قلم سے علی عمران کا ایک اور کارنامہ۔ مثالی دُنیا اور سفلی دُنیا جیسے منفرد موضوعات پر کامیاب ناول لکھنے کے بعد اب حاضر ہے علی عمران بمقابلہ جنات۔ اس ناول میں عمران بدی کی طاقتوں، جن میں انسان اور جن دونوں شامل ہیں، سے برسرپیکار نظر آتا ہے۔ ایک انوکھی طرز کا ناول، جس میں عمران سیکرٹ ایجنٹس سے نہیں بلکہ روحانی بزرگوں اور نوری علم سے مدد طلب کرتا ہے۔ **جناتی دُنیا** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

آنے والے ہفتہ دس دنوں میں حریم کے تمام ٹیسٹ ہو بھی گئے تھے اور ان کی رپورٹس بھی آ گئی تھیں۔ وہ اس روز حریم کی تمام رپورٹس لے کر ڈاکٹر انصاری کے پاس آیا ہوا تھا۔

وہ اسے ''دل کس طرح کام کرتا ہے'' تفصیل سے بتا رہے تھے پھر انہوں نے اسے یہ بتایا کہ حریم کا ایک ہارٹ والو پیدائشی طور پر خراب ہے اس کی وجہ سے اس صاف خون کی کچھ مقدار بجائے دل سے نکل کر جسم کے دیگر حصوں تک پہنچنے کے دل میں back pump ہو جاتی ہے۔ یوں صاف اور گدلا خون آپس میں مل جاتا ہے اور یوں حریم کے دل پر کام کا بوجھ بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے اور اس صورت حال کے مسلسل جاری رہنے کے سبب حریم کے دل کا سائز اس کی عمر کے لحاظ سے جو نارمل سائز ہونا چاہیے۔ اس سے دگنا ہو گیا ہے۔ حریم کی گزشتہ سات آٹھ مہینوں کے دوران کی پچھلی تمام رپورٹس اور اب والی موجودہ تمام رپورٹس کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ حریم کو جو مریض ہے' اس طرح کے کیسز میں وقت سب سے زیادہ اہم ترین چیز ہے۔ سرجری ہونا ہے' یہ طے شدہ بات ہے مگر کب؟ وہ ان لوگوں کو اس لحاظ سے خوش قسمت قرار دے رہے تھے کہ انہوں نے حریم کے علاج کی طرف بالکل درست وقت پر توجہ دی ہے اور ان کے حساب سے یہ حریم کی سرجری کے لیے مناسب ترین وقت ہے۔ ان شاء اللہ ایک ہی سرجری سے نقص دور کر دیا جائے گا اور آگے مزید کسی سرجری کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔

وہ ڈاکٹر انصاری سے پوچھ رہا تھا کہ اگر وہ حریم کو سرجری کے لیے امریکہ لے جائے تو کیا یہ زیادہ مناسب رہے گا یا پاکستان ہی میں سرجری کروانا ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا کہنا تھا Cardiac Paeduatric سرجری ایک مشکل اور نازک کام ہے۔ اس کے لیے اعلا درجے کی پیشہ ورانہ قابلیت مہارت اور جدید ترین ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں اس حوالے سے اب پاکستان میں دل کے امراض اور ان کے علاج کے حوالے سے highly trained کارڈ ئیک سرجنز' کارڈیالوجسٹ اور جدید ترین ٹیکنالوجی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر حریم کی پاکستان میں ہونے والی اوپن ہارٹ سرجری کی کامیابی کے 99% فیصد چانسز اور اس میں ایک فیصد رسک ہے تو وہ اسے امریکہ سمیت دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں لے جائے ایک فیصد رسک وہاں پر بھی ہوگا۔

☆......☆......☆

خرد کے انتظار میں وہ بہت دیر سے نیند بھگا کر بغیر توجہ کے چینلز بدل بدل کر مختلف پروگرامز دیکھ رہا تھا۔ خرد ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھی بڑی سنجیدگی سے پڑھائی کر رہی تھی۔ آج رات کا کھانا بھی اس نے جلدی جلدی الٹا سیدھا کھایا تھا اور پھر کمرے میں آتے کے ساتھ ہی پڑھائی میں جت گئی تھی۔ روز کی طرح گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ مگر آج اسے سر جھکائے انہماک سے کام کرتے ڈھائی تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ اب اس سے مزید جاگا نہیں جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ ٹی وی بند کر کے اٹھا اور اس کے پاس آ گیا۔

''اور کتنی پڑھائی کرنی ہے محترمہ؟'' اس کی گردن کے گرد باز و حمائل کر کے وہ اس کی طرف جھکا۔

''ابھی تو بہت کام رہتا ہے۔'' قلم چلاتے چلاتے رک کر اس نے نگاہیں اٹھا کر ایک پل کو اسے دیکھا۔

''بس کرو یار۔ باقی کام کل کر لینا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے استحقاق بھرے انداز میں اس کے شانوں پر دباؤ ڈالتے اسے کرسی پر سے اٹھانا چاہا۔

''میرا کل بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے، مجھے اس کی تیاری کرنا ہے۔ میں دیر تک جاگوں گی۔ آپ پلیز سو جائیں۔''

''اتنے ذہین لوگوں کو اتنا پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چھوڑو ساری ٹینشن، آرام سے لیٹ کر سوؤ، چلو اب اٹھ بھی چلو۔'' اس نے پھر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

''آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔ مجھے سیریسلی آج رات میں جگ کر پڑھنا ہے۔ میں سو نہیں سکتی۔ آپ سو جائیں۔''

اپنے شانوں پر رکھے اس کے ہاتھوں کو اس نے بتایا تو نہیں تھا مگر اس کے لہجے میں جو جھنجلاہٹ تھی وہ بتا رہی تھی کہ وہ ان ہاتھوں کو بھی اس وقت پسند نہیں کر رہی۔ اس کے حق جتاتے، پرجوش اور محبت بھرے انداز کو یک دم ہی جیسے اس نے اپنے قطعیت بھرے سنجیدہ انداز کا سرد، برفیلا پانی ڈال کر بالکل سرد کر دیا تھا۔ وہ ایک دم ہی پیچھے ہٹا۔ ایک پل میں کمرے کی تمام لائٹس آف کر کے وہ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اس نے یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ اس کی موجودگی میں پڑھائی کر کے وہ اسے چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی مگر نظر انداز کرتی ہے۔ وہ اس کی خوشی میں خوش تھا۔ ہاں وہ اس کے بغیر کبھی سوتا نہیں تھا۔ خرد بھی یہ بات جانتی تھی۔ اس لیے اسے نیند آتی دیکھ کر روز وہ خود سب کچھ بند کر کے سونے کے لیے اٹھ جاتی تھی۔ ایسا آج پہلی بار ہوا تھا۔ جب وہ اس کے بلانے پر بھی اس کے پاس نہیں آئی تھی۔ وہ ہرٹ ہوا تھا، خرد نے اس کے وقار کو چوٹ پہنچائی تھی۔

اس رات سونے سے پہلے جو آخری احساس اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، وہ یہ تھا کہ آج خرد نے اسے، اس کے جذبات اور اس کی محبت کو بہت بری طرح مجروح کیا ہے۔ آج خرد نے اس کی محبت کو سرد مہری اور بے زاری سے ٹھکرایا ہے۔

☆......☆......☆

صبح وہ بالکل خاموشی اور سنجیدگی سے اپنی آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ خرد جھجکی جھجکی، ہچکچائی سی اسے دیکھ رہی تھی، کئی بار لب کھولے تھے مگر بات کرنے کی ہمت غالباً خود میں پیدا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ وارڈروب کے سامنے کھڑا اپنے لیے ٹائی نکال رہا تھا۔

وہ مرون ٹائی پر ہاتھ رکھ ہی رہا تھا کہ وہ بھی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ہاں اس سوٹ کے ساتھ یہ مرون ٹائی بہت اچھی لگے گی۔''

اس نے فوراً ہی دوسرے سرے پر ٹنگی ایک نیلے رنگ کی ٹائی گھسیٹی اور خاموشی سے وارڈروب کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ ٹائی گلے میں لٹکاتا ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے وہیں آ گئی تھی۔ وہ ابھی تک گھر کے ہی لباس میں تھی، اس نے یونیورسٹی جانے کے لیے اپنی کوئی تیاری شروع نہیں کی تھی۔ وہ اسے آئینے میں اپنے برابر کھڑی نظر آ رہی تھی مگر اس نے گردن موڑ کر

براہ راست اسے نہیں دیکھا تھا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

''نہیں۔'' ٹائی کی ناٹ تیز رفتاری سے بناتے اس کا ایک لفظی جواب بالکل بے تاثر تھا۔

''آئم سوری۔ رات کی میری حرکت واقعی بہت زیادہ غلط تھی۔ صرف دو دن پہلے ڈاکٹر افتخار نے آج کے ٹیسٹ کی ڈیٹ اناؤنس کی تھی۔ میری کوئی تیاری نہیں ہوسکی تھی۔ ان دودنوں میں پرسوں لنچ پر ممی کی فرینڈز کو آنا تھا، پرسوں کی پوری دوپہر اور شام اس میں نکل گئی، رات میں بھی پارٹی میں جانا تھا وہاں چلے گئے اور کل دوپہر یونیورسٹی سے آکر لنچ کرنے کے بعد جب میں پڑھنے بیٹھی تو زرینہ آنٹی آگئیں۔ ممی گھر پر نہیں تھیں تو پھر مجھ ہی کو انہیں کمپنی دینے بیٹھنا پڑا۔ میری ساری دوپہر اسی میں ضائع ہوگئی۔ میری ٹیسٹ کی کوئی تیاری نہیں ہوسکی تھی اور میرے ذہن پر ٹیسٹ کا اتنا ہوا سوار تھا کہ میں۔''

وہ روانی سے بولتے لب بھینچ کر ایک پل کے لیے یوں چپ ہوئی جیسے خود اپنے آپ سے بہت خفا ہو۔ وہ اس دوران اس کی باتیں نظر انداز کرتا ٹائی کس چکا تھا۔ قمیص کے اوپر اٹھے کالر کو ٹھیک کرلیا تھا اور اب ہیر برش اٹھا کر انتہائی سرعت سے بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔

''لیکن جیسے ہی آپ سونے کے لیے جا کر لیٹے تھے، مجھے اسی وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، شرمندگی ہوئی تھی، دکھ ہوا تھا۔ مگر جب میں آپ کے پاس آئی، آپ سو چکے تھے۔ میں اسی وقت آپ سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے لیے کوئی ٹیسٹ اور دوسرا کوئی بھی کام آپ سے زیادہ اہم نہیں۔ میرے لیے سب سے زیادہ آپ اہم ہیں۔ میں رات ہی آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی، پلیز مجھے معاف کردیں، مجھ سے ناراض مت ہوں۔''

اس نے آہستگی سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ آنکھوں میں بیک وقت ندامت، دکھ اور آس لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں ناراض نہیں ہوں۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑاتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس نے ہینگر میں سے کوٹ نکال کر ہینگر صوفے پر اچھال دیا۔ وہ اب کوٹ پہن رہا تھا، اپنے بالکل پاس کھڑی خرد کو مکمل نظر انداز کیے۔

''آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، ہم جس سے محبت کرتے ہیں، اسے اس کی غلطیوں پر معاف بھی تو کردیتے ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ کو تھام کر بھرائی آواز میں بولی۔

''مجھ سے ناراض ہو کر سوئے تھے، مجھ سے ناراض ہو کر آفس مت جایئے گا، ورنہ اپنی زندگی کے اس بدترین دن کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے پلکوں کو زور سے جھپکا تھا، اس لڑکی کے آنسو تو ان راتوں میں بھی تکلیف دیتے تھے جب وہ ماں کی جدائی کے غم میں اس کے قریب لیٹی خاموش آنسو بہاتی تھی اور ابھی وہ اس سے محبت کا دعوے دار ہوا بھی نہیں تھا تو پھر اب تو پھر آج......؟ اتنی دیر میں اس نے پہلی مرتبہ اس کی طرف رخ کیا، اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''کہتا تھا نہیں، کہتا ہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، تم میرے لیے سب سے خاص ہو، سب سے اہم ہو۔ اب یہی بات ایک بار تم بھی

میرے لیے بول دو تو ساری ناراضی ابھی کے ابھی ختم ہو جائے گی۔''

''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، جتنی آپ مجھ سے کرتے ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اس لیے کہ آپ کے پاس تو دوسرے بھی بہت سے رشتے ہیں جن سے آپ کا محبت کا تعلق ہے۔ آپ کے پاس ماں ہے، بہنیں ہیں، آپ کی محبت کو تقسیم کرنے کے لیے، بانٹنے کے لیے آپ کے پاس دوسرے کئی رشتے ہیں، میرے پاس تو آپ کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہی نہیں ہے محبت کرنے کے لیے۔ میرے پاس صرف آپ ہیں اور اس محبت کو تقسیم کرنے کے لیے، بانٹنے کے لیے دوسرا کوئی بھی نہیں۔'' وہ اپنے آنسوؤں کو مزید روک نہیں پائی تھی، وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی تھی۔

''اگر مجھے پتا ہوتا میری ناراضی اتنی با اثر ہے، مجھے اتنا خوب صورت اظہارِ محبت سنوا سکتی ہے تو ناراض ہونے والا یہ مبارک کام بہت پہلے انجام دے چکا ہوتا۔'' اپنے شانے پر سے اس کا سر اٹھا کر، اس کے چہرے پر بکھرے اشکوں کو خشک کرتے وہ متبسم لہجے میں بولا۔

''دوبارہ کبھی مجھ سے اس طرح ناراض مت ہوئیے گا۔ ابھی جب مجھ سے ناراض تھے، میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے، مجھ سے بات نہیں کر رہے تھے تو مجھے اتنی وحشت ہو رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا میری زندگی میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا ہے۔''

اشک پیتے جس لہجے میں یہ بات اس نے کہی، اس سے اس کے دل کو کچھ ہوا، بڑی بے ساختگی میں اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

''پاگل ہو تم، اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا جذباتی ہو کر نہیں سوچتے۔ شادی شدہ زندگی میں ناراضیاں، لڑائیاں، جھگڑے سب چلتے رہتے ہیں۔ ان گلے شکوؤں، ناراضیوں اور لڑائیوں ہی میں تو اس رشتے کا حسن ہے۔ اب اس وقت جو اتنا خوب صورت اظہار تم نے مجھ سے کیا ہے، کیا وہ اگلے دس سالوں میں بھی نارمل اور خوش گوار حالات میں مجھے سننے کو مل سکتا تھا؟''

سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں بات شروع کر کے جملے کے اختتام پر وہ شوخ ہوا، اس کی باتوں نے واقعی اسے روتے روتے ہنسا دیا تھا۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی کھل کر ہنس پڑا تھا۔ اپنے کوٹ کو آنسوؤں سے بھگونے اور خراب کرنے پر اسے مصنوعی خفگی سے گھورتا اسے باتیں سنا رہا تھا۔

وہ رات کی ہر بات کو بھلا چکا تھا۔ مگر خرد نے شاید ابھی اس بات کو بھلایا نہیں تھا تب ہی تو کچھ دیر بعد جب وہ اسے یونیورسٹی چھوڑنے جا رہا تھا تب اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی، وہ اسٹیئرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

''کل کی میری بدتمیزی کو بھول جائیں گے نا؟ آئندہ سے میں اپنی ساری پڑھائی آپ کے آفس آنے سے پہلے ختم کر دیا کروں گی۔''

وہ اس کی ناراضی سے خائف ہو کر اپنے معمولات بدل دے، وہ اس سے ڈر کر سانس بھی اس کی منشا کے مطابق لے، ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں چاہ سکتا تھا۔

جس لڑکی سے وہ والہانہ محبت کرتا تھا، وہ اس کی ذرا سی دیر کی ناراضی سے کتنی بجھ سی گئی تھی۔

''تم جس طرح پڑھتی ہو، اسی طرح پڑھو۔ اپنے کسی روٹین کو چینج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا کرو گی تو مجھے اپنا آپ ٹپیکل، ظالم اور جابر شوہروں جیسا لگے گا۔ پھر براڈ مائنڈڈ اور لبرل ہونے کا تمہارا دیا اعزاز میں کس طرح اپنے پاس برقرار رکھ پاؤں گا؟'' اس نے مسکراتی محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''آپ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ ہے۔ میں نے جتنی ندامت اور جیسی شرمندگی کل ساری رات محسوس کی ہے، زندگی میں کبھی نہیں کی۔''

''اسی شرمندگی، شرمندگی میں تمہارے ٹیسٹ کی تیاری کا کیا بنا؟''

''کچھ بھی نہیں، مجھے دلچسپی بھی نہیں۔ میں فیل ہو جاؤں، مجھے ہرگز پروا نہیں۔ ایک بیوی کی حیثیت میں فیل ہو کر پھر مجھے، کسی بھی امتحان میں پاس ہونے کی خواہش نہیں۔''

''تم محض ایک بیوی نہیں ہو، تم میرے لئے کچھ ہو۔ تمہیں پتا ہے ناں یہ بات؟ پھر پاس اور فیل کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔ اپنے ذہن کو سب ٹینشنز سے آزاد کر کے بالکل ریلیکس ہو کر ٹیسٹ دینا۔ تمہیں خود پر بھروسا نہ ہو، مگر مجھے میری خرد پر پورا بھروسا ہے، وہ بغیر تیاری کے بھی ساری کلاس میں سب سے اچھا ٹیسٹ دے کر آئے گی۔'' اس کا لہجہ پریقین بھی تھا اور محبت اور چاہت سے بھرپور بھی۔ وہ اس کے پریقین انداز پر طمانیت سے مسکرا دی تھی۔

پھر اسے یونیورسٹی ڈراپ کر کے جب وہ اپنے آفس جا رہا تھا تب سارے راستے خود کو سرزنش کرتا رہا تھا۔ میتھس میں ایم ایس سی کرنا بچوں کا کھیل نہیں، اتنی مشکل پڑھائی کے لیے اسے وقت تو چاہئے تھا۔ کیا جس وقت وہ اپنا دفتری یا کوئی اور ضروری کام کر رہا ہوتا ہے تب خرد یہ کہتی ہے کہ میں اگنور ہو رہی ہوں؟ کسی زندہ، جیتے جاگتے انسان کو صرف اور صرف اپنے تسلط میں رکھنے کی کوشش کرنا، وہ بھی محبت کے نام پر، محبت کی سراسر توہین ہے۔

☆......☆......☆

تمام تر غور و فکر کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا تھا کہ اگر سرجری ہی حریم کا واحد علاج ہے تو وہ یہ سرجری ڈاکٹر انصاری سے ہی کروانا چاہئے تھا، اسے ڈاکٹر انصاری کی پیشہ ورانہ مہارت، ان کا طریقہ کار سب کچھ بہت زیادہ پسند آیا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ اپنی صبح خیزی کی عادت کے مطابق جلدی جاگ جانے کے باوجود وہ کچھ دیر سستی سے بستر پر پڑا رہا۔ پھر جب وہ اٹھ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسا تو نہانے سے پہلے آئینے میں خود کو دیکھتے اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اتوار کو شیو نہیں کرتا تھا۔

اس کے چہرے پر موجود یہ سخت رواں اس کی نرم و نازک سی بیٹی کو ناگوار گزر سکتا تھا۔ شیو کر لینے، نہا لینے اور بہت اچھا سا آفٹر شیو

اور کولون استعمال کر لینے کے بعد وہ خود اپنے آپ پر ہنس پڑا تھا۔

وہ باتھ روم سے باہر نکلا، عین اسی وقت ایک زوردار دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر حریم اندر آئی۔ اپنے ہلکے گلابی رنگ کے نائٹ ڈریس میں ملبوس نیند سے آنکھیں ملتی ہوئی۔

وہ اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا، اس کے اندر، باہر چہار سو خوشی ہی خوشی بکھر گئی تھی۔

''گڈ مارننگ پرنس۔'' وہ اپنی بانہیں پھیلائے اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی اسے گود میں اٹھالیا، اور والہانہ اس کے گالوں پر پیار کیا۔

''ماما سو رہی ہیں۔ حریم اٹھ گئی۔'' اس سے پیار کرواتے اس نے بتایا۔

''پاپا! برش کرادیں، منہ دھلوادیں۔''

سر اثبات میں ہلاتا وہ اسے باتھ روم میں لے آیا۔ وہ حریم کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اپنے کمرے سے باہر نکلا، آہستگی سے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوا، وہاں بے خبر سوئی خرد پر ایک نگاہ بھی ڈالے بغیر وہاں سے وہی چھوٹی سی کرسی اور باتھ روم سے حریم کا برش اور پیسٹ اٹھا کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا، اس نے واش بیسن کے سامنے وہ کرسی رکھی، حریم کو اس پر کھڑا کر کے وہ بھی وہیں اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حریم واش بیسن کے آگے کرسی پر کھڑی تھی، اس نے اسے نل کھول کر دیا، صابن اٹھا کر پکڑایا، خرد نے اسے کافی کچھ سکھار کھا تھا، اسے صرف اس کے برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر دینا پڑا تھا، باقی دانت برش بھی اس نے خود کیے تھے اور کلی بھی خود کی تھی۔ اس نے آنکھیں کس کر مضبوطی سے بند کر کے منہ پر صابن تو خود ہی بہت اچھی طرح لگا لیا تھا۔

''پاپا! منہ دھلائیں۔'' آنکھیں مضبوطی سے بند کیے کیے اس نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ مسکراتا ہوا وہ اس کے منہ پر پانی کے چھپا کے مارنے لگا۔ اپنے اسٹینڈ سے ٹاول اتار کر اس نے اس کے منہ، ہاتھ خشک کیے، پھر اسے گود میں اٹھا کر واپس کمرے میں لے آیا۔

''ناشتہ کرنا ہے؟'' اسے گود میں اٹھاتے اس نے پوچھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں گردن زور زور سے اقرار میں ہلائی۔

''چلو حریم اور پاپا دونوں ساتھ مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ آج پاپا حریم کو خود ناشتہ بنا کر دیں گے۔'' وہ کمرے سے نکل کر کچن کی طرف آ گیا تھا۔ کچن ٹیبل پر اپنے لیے چائے کا کپ لے کر بیٹھی زینت جو گھر کے مکینوں کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی، ان دونوں کو اندر آتا دیکھ کر ایک دم مستعد ہو کر کھڑی ہوئی۔

''بے بی کے لیے کیا بنانا ہے ناشتے میں اور آپ۔''

''تم رہنے دو زینت! اپنا اور حریم کا ناشتہ میں خود بنا رہا ہوں۔''

زینت اسے خود ناشتہ بنانے کے موڈ میں دیکھ کر سر ہلاتی کچن سے نکل گئی تھی۔ ''ناشتے میں کیا کھاؤ گی پرنس؟''

''ملک اور ٹوسٹ اور ایپل جیم اور کریکر۔'' اس نے بے تکلفانہ اپنی پسند بتائی۔ اس نے حریم کو گود سے اتار کر کاؤنٹر پر بٹھا دیا۔ وہ

ڈبل روٹی، جیم وغیرہ نکال رہا تھا اور وہ دلچسپی سے اسے کام کرتا دیکھ رہی تھی۔

''پرنس! آپ ملک کیسا پینا پسند کریں گی؟'' ڈبل روٹی کے دو سلائسز ٹوسٹر میں ڈالتے اس نے پوچھا۔

''ٹھنڈا، شوگر لیس۔'' ٹانگیں ہلاتے اس نے فوراً جواب دیا۔ وہ فریج کی طرف بڑھ رہا تھا، مگر حریم کے جواب نے اسے چونک کر رک جانے پر مجبور کیا۔

''ملک میں شوگر اچھی نہیں لگتی پاپا۔'' وہ اس کے چونکنے کو شاید اس کی ناپسندیدگی محسوس کر کے مدبرانہ انداز میں بولی، پھر اس مدبرانہ انداز میں بڑی ہی بچکانہ معصومانہ قسم کی سنجیدگی کے ساتھ جھٹ سے مزید بولی۔ ''پاپا! جیم کیک اور کسٹرڈ میں شوگر ہوتی ہے، حریم وہ کھاتی ہے۔'' وہ ایک گہری سی سانس لے کر اپنی بے تحاشا حیرت کے حصار سے باہر نکل کر مسکرایا۔

اپنے بچپن کی ایک عادت جو آج تک قائم تھی، اپنی بیٹی میں دیکھنا ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سامنے خود اس کا اپنا بچپن آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں تنہا تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے بیڈ پر اپنے برابر کی خالی جگہ اور پھر باتھ روم کو دیکھا۔ وہ یک دم ہی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر اسے حریم اور اشعر کے باتیں کرنے کی آواز آئی، تو وہ سیدھی کچن میں چلی آئی۔ کچن کے اندر کا منظر حقیقتاً ایک بہت ہی خوب صورت اور دلچسپ سا منظر تھا۔ حریم اور اشعر کچن ٹیبل پر ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے اتنے خوش، اتنے مگن لگ رہے تھے کہ وہ بے اختیار ٹھٹک کر دروازے ہی پر رک کر انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''اور ٹوسٹ لو گی پرنس؟'' جیم لگاؤں؟'' اشعر کے سوال کا حریم نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

تب ہی اس کی خرد پر نظر پڑی۔ ''ماما آ گئیں۔'' بڑے جوشیلے سے لہجے میں اس نے باپ کو مطلع کیا۔

اشعر نے گردن گھما کر اسے بے تاثر نگاہوں سے دیکھ کر فوراً ہی سر دوبارہ سیدھا کر لیا اور اپنی توجہ ہاتھ میں موجود چائے کے کپ اور سامنے دھرے اخبار پر مرکوز کر دی۔

''ماما! حریم کو بریک فاسٹ پاپا نے دیا۔ ملک بھی پاپا نے دیا۔'' حریم بڑے جوش و خروش سے اطلاع دے رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے حریم کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''ماما کو بریک فاسٹ نہیں کراؤ گی؟'' حریم کی طرف جھک کر اس کے گال پر پیار کرتے اس نے پوچھا۔

اسے سر اثبات میں ہلا کر جواب دیتی وہ اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''پاپا! ماما کو بھی بریک فاسٹ دیں۔'' اس کا انداز ایسا حکمیہ سا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''بہت بہتر پرنس! پر اپنی ماما سے یہ تو پوچھو، وہ کیا لیں گی۔''

''ماما! آپ کیا لیں گی؟'' اشعر کا جملہ اسی کے انداز میں دہراتے اس نے خرد سے پوچھا۔

''جو تم کھلاؤ گی سویٹ ہارٹ۔'' اشعر اس دوران آملیٹ، توسٹ، رول، مکھن تمام چیزیں خرد کی طرف کرنے لگا تھا۔ اس نے کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تب ہی اشعر نے کیتلی اس کی طرف کرنا چاہی۔ اشعر نے اسے کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ خرد کے ہاتھ کے اوپر رکھا گیا تھا۔ اسے جیسے کوئی بہت زور کا جھٹکا، کوئی بہت شدید نوعیت کا کرنٹ لگا تھا، لمحے بھر کا اس شخص کا یہ لمس اسے انتہائی ناقابل برداشت اور قابل نفرت محسوس ہوا تھا۔ مرتے دم تک بھی وہ کبھی یہ تصور نہیں کرسکتی تھی کہ یہ شخص اس کے ہاتھوں کو تھامے، اس کے قریب آئے۔

اچانک اس نے اشعر کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔'' حریم! کیا ہوا بیٹا؟'' بری طرح گھبرا کر اس نے اپنے برابر بیٹھی حریم کو دیکھا جو کھینچ کھینچ کر اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔

''ماما۔'' شدید تکلیف کے عالم میں اس نے اسے پکارا۔ وہ بہت کھینچ کھینچ کر بڑی مشکلوں سے سانس لے رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت پر نیلاہٹ سی ظاہر ہو رہی تھی، وہ پسینہ میں نہا گئی تھی۔

''حریم! بیٹا کیا ہوا؟ کیا سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے؟'' کھینچ کھینچ کر سانس لینے کی کوشش کرتے جو اس نے آنکھیں بند کیں تو اشعر شدید پریشانی کے عالم میں اسے گود میں اٹھا کر اندھا دھند اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف بھاگا۔

''میرا موبائل، گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھا کر لے آؤ۔'' دروازے سے نکلتے اس نے خرد سے کہا۔ وہ اشعر کی تمام چیزیں اٹھا کر بھاگتی اس کے پیچھے ہی لفٹ میں داخل ہوگئی۔

''ڈاکٹر انصاری سے ان کے موبائل پر کانٹیکٹ کرو۔ وہ سنڈے کو صبح میں ہارٹ سینٹر میں بیٹھتے ہیں۔ ان سے پوچھو، وہ اس وقت وہاں ہیں؟ ہم وہاں آرہے ہیں۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے عجلت بھرے انداز میں خرد سے کہا۔ حریم، خرد کی گود میں بے سدھ سی پڑی تھی۔ بہت جلدی وہ لوگ ہسپتال پہنچے تھے۔ وہاں جاتے ہی جو اسے فوری طور پر ٹریٹمنٹ ملا اس سے اس کی طبیعت بہت جلدی ہی سنبھل گئی تھی۔ اسے جو کوئی سکون آور دوا دی گئی تھی، اس کے زیر اثر وہ مکمل طور پر پرسکون نیند میں تھی، اشعر کے ماتھے پر تفکرات کے سبب کئی گہری لکیریں موجود تھیں، مگر وہ کچھ دیر پہلے کے مقابلے میں خود کو قدرے نارمل کر چکا تھا۔ جب کہ وہ ابھی تک بھی خود کو نارمل نہیں کر سکی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک بری طرح لرز رہے تھے۔

ڈاکٹر انصاری نے سرجری کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ دی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا۔ سرجری کے بعد حریم ہر طرح سے نارمل زندگی گزارے گی۔ وہ بڑی ہونے کے بعد شادی کر سکے گی، ماں بن سکے گی۔

پندرہ دن بعد کی تاریخ اس لیے دی گئی ہے جو دوائیں دی گئی ہیں۔ انہیں استعمال کر سکے، ان دواؤں سے اس کی قوت مدافعت بڑھ جائے گی۔

وہ لوگ حریم کو ساتھ لیے گھر واپس آ گئے تھے۔ بہت تھکے ہوئے اور نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی حریم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ حریم ابھی مکمل طور پر غنودگی میں تھی، اشعر نے بڑی احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ اشعر کے چہرے پر تفکرات کا جال بچھا نظر آ رہا تھا۔

اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے بیوی کے پریگنینٹ ہونے کی بات جان لینے کے باوجود بیوی کے لیے تو کیا اپنی اولاد تک کے لیے بھی پلٹ کر اس تک آنے کی زحمت نہیں کی تھی اور جس کے پاس محض چند دن قبل وہ حریم کے اس کی اولاد ہونے کے کئی طرح کے ثبوت لے کر اس کے آفس پہنچی تھی۔ شاید افشین کی بات ٹھیک تھی۔ بیوی کے پریگنینٹ ہونے کو جاننے اور اپنی ایک جیتی جاگتی، پیاری سی بیٹی کو دیکھ لینے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

''کچھ دیر آرام سے بیٹھی رہو پرنسس۔'' پیار سے سمجھاتا وہ اسے بستر سے اٹھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے پاس سے آنے کے بعد سے وہ دونوں مسلسل اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ خرد اس کے ایک طرف اور وہ دوسری طرف۔ اسے یہ فکر تھی ہی نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا، اسے اگر کوئی فکر تھی تو اپنی گڑیا کی، اپنے ڈول ہاؤس کی، اپنے دوسرے کھلونوں کی۔ اس کے پاس سوالات تھے تو اپنی ڈولز کے متعلق، اپنے کھلونوں کے متعلق۔

طبیعت کی اتنی شدت کی خرابی کے بعد ابھی کم از کم چند گھنٹے تو اسے مکمل آرام کرنا چاہئے تھا۔ وہ اس کی ڈولز اور دوسرے کھلونے اٹھا کر یہیں لے آیا۔ اس نے فوراً ہی بڑی فکر سے اپنی گڑیا کے منہ میں فیڈر دی تھی، ٹوئٹی کو اپنی گود میں بٹھایا تھا، باربی کا لباس تبدیل کیا تھا۔

''پاپا Toys کی شاپ پر چلیں؟'' رات دوا لینے کے وقت کا وعدہ، اپنے مطلب کی بات اسے پوری طرح یاد تھی۔

''ہاں بیٹا! چلیں گے، پر آج تو سنڈے ہے، آج تو ساری شاپس بند ہوں گی۔''

''آپ نے پرامس کیا تھا۔'' وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری خفگی بھر کر بولی۔

''سوئیٹ ہارٹ! پاپا کو اپنا پرامس یاد ہے پر آج تو سنڈے ہے۔ کل ہم سب سے پہلا کام یہی کریں گے کہ اپنی پرنسس کو اس کے فیورٹ Toys دلا کر لائیں گے۔'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتا پیار سے بولا۔ اس کے چہرے کی رنگت گو اب نیلاہٹ مائل نہیں تھی مگر اس کے لبوں کے اطراف کی جلد ابھی بھی نیلگوں محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی بیماری سے کتنی انجان اپنے کھلونوں کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں کرب و اذیت لیے اپنی انجان اور بے خبر سی معصوم بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے سامنے حریم کی طبیعت پہلی بار بگڑی تھی وہ چھوٹے چھوٹے معمولی کاموں سے بھی بہت جلدی تھکن محسوس کر سکتی ہے، یہ تو اس نے کئی ڈاکٹرز سے اب تک سن لیا تھا مگر یہ چھوٹے کام اس قدر معمولی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کھانا کھانا اور بیٹھے بیٹھے باتیں کرنا بھی حریم کے لیے کاموں ہی میں شمار ہوتا ہے، ایسے کام جو حریم کو تھکا سکتے ہیں۔ صرف ناشتہ ہی تو کر رہی تھی وہ اور ساتھ

اس سے اور خرد سے باتیں بھی کر رہی تھی، ایک ہی جگہ بیٹھے، بالکل آرام دہ اور پرسکون انداز میں اور اتنے معمولی سے کام سے وہ اس قدر نڈھال ہوگئی تھی کہ اس کے لیے درست طریقے سے سانس لینا بھی ایک مشکل عمل بن گیا تھا۔ وہ اوپر سے ہنس رہا تھا، حریم کے ساتھ خوب باتیں بھی کر رہا تھا مگر اندر سے وہ سخت پریشان تھا۔

صبح جو ناشتہ حریم نے کیا تھا، اس کے بعد سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ اسے بستر پر پابند کر کے کیوں بٹھایا جا رہا ہے، اس بات پر اس کا موڈ آف تھا۔ وہ کہیں باہر گھومنے پھرنے کے لیے چلنے کی اشعر سے ضد کر رہی تھی۔ اسے پارک جانا تھا، جھولے جھولنے تھے، اسے بہت سے کھیل کھیلنے تھے۔

''حریم کو ایک بہت زبردست سا سرپرائز ملے گا، اگر وہ کھانا کھالے گی تو۔'' پہلے اسے سرپرائز کا مطلب سمجھانا پڑا، مطلب سمجھ میں آیا تو کسی اچھے سے تحفے کے بطور انعام ملنے کے لالچ میں وہ آخر کار کھانے کے لیے تیار ہوگئی خرد اب مختلف کھانوں کے نام لے لے کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کیا کھانا ہے۔

''نوڈلز، میکرونی، میٹھی روٹی، دال چاول، کھچڑی۔'' خرد کئی طرح کے کھانوں کے نام لے رہی تھی، یہ تمام چیزیں یقیناً وہ شوق سے کھایا کرتی تھی، بڑی مشکلوں سے آخر وہ کھچڑی کے لیے آمادہ ہوئی تھی۔ اس کے کھچڑی کہنے پر بے اختیار ایک بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی۔ واقعی اس کی مسکراہٹ اس کے لیے جادوئی سا اثر رکھتی تھی، ابھی ایک لمحہ پہلے وہ اداسیوں اور محرومیوں کی گرفت میں تھا اور اب اگلے ہی پل یوں مسکرا رہا ہے جیسے اس کی زندگی میں کہیں کوئی اداسی اور محرومی ہے ہی نہیں۔

خرد کھچڑی پکانے کچن میں چلی گئی۔ زینت کو اس نے حریم کے لیے رکھا تھا، مگر حریم اپنا ہر کام ماں سے کروانا چاہتی تھی، وہ اس سے نہاتی، اس سے کھاتی اور اسی کے ساتھ سوتی تھی۔ وہ ماں سے بہت زیادہ اٹیچڈ تھی۔ وہ اپنی چار سال کی بیٹی کی پسند، ناپسند، اس کی ضرورتوں اور اس کی عادتوں کو آہستہ آہستہ جاننے کے عمل سے گزر رہا تھا اور خرد اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ فی الحال تو اسے اپنی بیٹی کی خاطر دل پر جبر کر کے اس عورت کو ہر قیمت پر برداشت کرنا ہی تھا۔

☆......☆......☆

وہ کچن میں کھچڑی پکانے آئی تو وہاں کھچڑی پکانے کے لیے درکار تمام لوازمات اسے دستیاب تھے۔ زینت کے یہاں ملازمت کے دوسرے ہی دن اشعر نے اسے کافی زیادہ پیسے دے کر کہا تھا کہ وہ ایک لسٹ بنا کر گھر کی کھانے پینے کی ضرورت کی تمام اشیاء قریبی سپر اسٹور سے خرید لائے۔ وہ اس بات سے باخبر اس طرح تھی کہ اس لسٹ کو تیار کر لینے کے بعد زینت اپنی بنائی لسٹ کی منظوری لینے اس نام نہاد مالکن کے پاس چلی آئی تھی۔

جب زینت اس کے پاس وہ لسٹ لے کر آئی تو اس نے اس میں چند ایک وہ چیزیں بھی شامل کر دی تھیں جو حریم شوق سے کھایا اور پیا کرتی تھی۔ کھانا پکانا اور باقی تمام کام زینت ہی کرتی تھی، وہ ان گزرے دنوں میں صرف اسی وقت کچن میں آتی تھی جب حریم نے کھانے

میں نخرے دکھا کر کچھ خاص چیز اس کے ہاتھوں کی بنی کھانی ہوتی تھی۔ جتنی دیر میں اس نے پیاز کاٹی زینت نے اسے دال اور چاول چن کر دے دیے۔ وہ ٹرے میں گرما گرم مونگ کی دال کی کھچڑی کی پلیٹ اور جوس کا گلاس لے کر کمرے میں آئی تو اشعر اور حریم Dough سے کھیلتے نظر آئے۔ اشعر کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا Dough تھا اور حریم کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا۔

''کیا بن رہا ہے؟'' اس نے ٹرے بیڈ پر حریم کے سامنے رکھی۔

''Cat۔'' اس نے Dough کو گول شکل دیتے ہوئے کہا۔ وہ بلی کا بڑا سا گول منہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پرنس! آپ کی کھچڑی آ چکی ہے۔'' اس نے اسی کے انداز میں کہتے بے نیازی سے بلی بناتی حریم کو مخاطب کیا۔ حریم نے نظریں اٹھا کر ٹرے میں رکھی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ بیماری نے اس کی بھوک بھی بہت کم کر دی تھی۔ جس طرح وہ دوا لینے میں تنگ کرتی تھی، ستاتی تھی، یہی حال اس کے کھانے پینے کا بھی تھا۔ جب سے باپ سے ملی تھی، ایکسائیٹمنٹ میں پھر کچھ راضی ہو جایا کرتی تھی، کھانے پینے پر۔ مگر اس وقت وہ کھانا کھانے کے کچھ زیادہ موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ خرد نے خود ہی پہلا نوالہ اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈالا۔ نوالہ اس نے منہ میں لے تو لیا مگر اگلا نوالہ اسے فوراً نہ دیا جا سکے، اس لیے وہ اس نوالہ کو منہ ہی منہ میں بھر کر بیٹھی رہی۔ اسے چبانا بھی شروع نہیں کیا۔

''کتنی زبردست کھچڑی ہے۔ اف! خوشبو کتنی اچھی آ رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے، یہ ساری کھچڑی میں کھا جاؤں۔'' حریم کے انداز کو بغور دیکھتے اشعر نے یک دم ہی چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

''ماما! پاپا کو بھی کھچڑی کھلائیں۔'' وہ اسے سچ سمجھ کر ایک دم ہی اس کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ کھچڑی اس کے پاپا کو بھی کھلائی جائے۔

''اچھا رکو، میں زینت سے کہتی ہوں۔ پاپا کے لیے بھی ایک چمچہ لے آئے۔''

''نہیں حریم کے چمچہ سے کھلائیں۔''

''ہاں بھئی جلدی سے کھلائیں۔ بس آج حریم کی ساری کھچڑی تو میں کھا جاؤں گا۔'' اشعر بے صبری سے بولا، ایسے جیسے واقعی وہ کھچڑی کھانے کے لیے شدید بے تاب ہو۔ ایک پل کے لیے کچھ سوچتے اس نے کھچڑی سے بھرا چمچہ جو حریم کے لیے بھرا گیا تھا، اشعر کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فٹافٹ منہ کھول کر وہ نوالہ منہ میں رکھ لیا اور بڑی رغبت سے چٹخارے لے لے کر اس نوالے کو چبانے لگا۔

''بس اب حریم کو مت دینا۔ یہ ساری کھچڑی مجھے کھانی ہے۔'' وہ حریم کو نظر انداز کر کے اس سے بولا۔ سر اثبات میں ہلا کر اس نے چمچہ میں دوبارہ کھچڑی بھر کر اشعر کی طرف بڑھانی چاہی تو حریم فوراً بولی۔

''ماما! کھچڑی حریم کو کھلائیں۔'' اس نے جلدی سے وہ چمچہ اس کے منہ میں ڈال دیا۔ صرف اور صرف اس خدشے کے پیش نظر کہ اس کے لیے اس کی ماما کے ہاتھوں کی پکائی کھچڑی کہیں پاپا ختم نہ کر دیں۔ اس نے پوری پلیٹ کھچڑی کی کھائی تھی۔

باپ سے اس مقابلہ بازی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ حریم کو کھانا کھلانے میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ جتنا وقت کھانا کھلانے میں لگا تھا اس سے دگنا وقت دوا دینے میں لگا تھا۔ پچھلے تمام دنوں کی طرح مختلف ترغیبات دیتے وہ دونوں بمشکل اسے ساری دوا کھلا دینے میں

کامیاب ہو پائے تھے۔ اس سارے تھکا دینے والے عمل میں کچھ نہیں کچھ نہیں تو ڈیڑھ، دو گھنٹے تو لازمی لگے ہی تھے شدید ترین حیرت اسے اشعر کے رویے پر ہو رہی تھی۔ حریم کے ہزار نخرے دکھانے، ضد کرنے پر بھی اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نہیں آئی تھی۔ وہ بے زاری سے نہیں بلکہ بڑی خوش دلی سے بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

وہ آفس آ تو گیا تھا، تمام دفتری امور سرانجام بھی دے رہا تھا مگر آفس میں اس کا دل بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ حریم سو رہی تھی جب وہ آفس کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ گھڑی میں وقت کا اندازہ لگاتے اس نے اس وقت گھر پر فون کیا جب اس کا خیال تھا کہ حریم جاگ چکی ہوگی۔ فون خرد نے اٹھایا تھا اور اس نے اس سے حریم کی خیریت پوچھی تھی۔ ''ٹھیک ہے، ابھی سو کر اٹھی ہے ناشتہ کر رہی ہے۔'' خرد کے جواب کے ساتھ ہی اسے پیچھے سے حریم کی آواز سنائی دی۔

''پاپا کا فون ہے، حریم بھی بات کرے گی۔'' خرد نے فوراً ہی ریسیور اسے پکڑا دیا۔

''ہیلو پاپا! آپ کو Tazz (ٹیز) اور ڈیفی یاد ہیں نا؟'' حق جتاتے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔

''بالکل یاد ہے پرنسس! یہ تو کوئی بھولنے والی بات ہی نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ اور تو کچھ نہیں چاہئے؟''

''اور......اور......'' وہ سوچتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور نیل پالش۔''

وہ اس انوکھی فرمائش پر پہلے حیران ہوا پھر ہنس پڑا۔ ان چند دنوں میں اب تک اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ اس کی بیٹی سجنے سنورنے کی ازحد شوقین تھی۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ وہ ہیئر بینڈز اور کلپس تک میچنگ کے لگایا کرتی تھی یا ماں سے لگوایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے کئی کپڑوں کے ساتھ ان کی میچنگ کے جوتے تک تھے۔

صبح کی اس فون کال کے بعد بھی دن بھر میں وقتاً فوقتاً اس نے کئی مرتبہ گھر کال کی تھی۔ خرد یا حریم سے ہر مرتبہ بات انتہائی مختصر ہی کی تھی مگر وہ حریم کی خیریت تھوڑی تھوڑی دیر بعد معلوم کرتا رہا تھا۔

آج ایک بزنس ڈنر میں اسے شرکت کرنا تھی۔ اس میں شرکت سے تو اس نے معذرت کر لی تھی، البتہ پاک یو اے ای بزنس کونسل کی جانب سے پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاری کے حصول کی کوششوں اور اس کے درست طریقۂ کار کے حوالے سے مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت سے وہ یوں معذرت نہ کر سکا کہ وہاں وہ سامعین میں شامل ہونے کے لیے نہیں بلکہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اور کافی دن پہلے وہ وہاں جانے کا سیمینار کے منتظمین سے وعدہ کر چکا تھا لیکن وہ وہاں سے معذرت کر کے جلد ہی نکل آیا تھا۔ وہ لفٹ سے باہر نکل کر ہوٹل کی لابی کی طرف جانے کے لیے ایک قدم ہی آگے بڑھا ہوگا جب پیچھے سے ایک خوبصورت نسوانی آواز نے اسے روکا۔

''اشعر؟'' بے ساختہ رک کر وہ ایڑیوں کے بل گھوما تو سامنے سارہ کھڑی نظر آئی۔ اس کی خالہ زرینہ اجمل کی اکلوتی اور بہت

لاڈلی بیٹی سارہ اجمل۔ مرون ٹاپ اور بلیو جینز میں اپنے اسٹریکنگ ہوئے کھلے بالوں اور مناسب قسم کے میک اپ کے ساتھ وہ ہمیشہ ہی کی طرح اسٹائلش، ماڈرن اور بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''ہائے اشعر۔'' خوشگوار سے انداز میں مسکراتے وہ اس کے قریب چلی آئی۔

''ہائے سارہ! کیسی ہو؟'' وہ اخلاقاً مسکرایا جب کہ دل ہی دل میں وہ سخت کوفت کا شکار ہوا تھا۔

''پہلے کی طرح بالکل اکیلی۔'' وہ اس کے سوال کے جواب میں دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

سات سال قبل لندن سے فیشن ڈیزائننگ میں ڈگری لے کر آئی۔ اس کی یہ کزن پچھلے چند سالوں ہی کے اندر پاکستان کی فیشن انڈسٹری میں اپنا ایک نام اور ایک شناخت بنا چکی تھی۔ وہ سارہ کی تخلیقی صلاحیتوں، ذہانتوں کا معترف تھا۔ اپنے کیریئر اور اپنے پروفیشن کے ساتھ اس کی کمٹمنٹ کو بھی وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا مگر اس سے بڑھ کر کسی اور حیثیت میں وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکا تھا جب کہ سارہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بولڈ بھی تھی اور کانفیڈنٹ بھی۔ اشعر کے لیے اپنی پسندیدگی اس نے کبھی اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چھ سال قبل جب وہ خرد احسان کے ساتھ اس نام نہاد شادی کے بندھن میں ابھی بندھا بھی نہیں تھا، تب سارہ نے بڑے واضح انداز میں اس تک اپنی پسندیدگی پہنچائی تھی۔ تب نہ اس کی کہیں کوئی کمٹمنٹ تھی نہ کچھ اور۔ مگر تب بھی اسے سارہ میں کسی بھی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اسے صاف طور پر یہ بتایا تھا کہ وہ ایک بہت اچھی اور غیر معمولی لڑکی ہے مگر اس کے لیے صرف ایک کزن اور دوست ہے وہ اس کا بہت احترام کرتا ہے، اس سے زیادہ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں مگر وہ اتنی ذہین، سمجھ دار، حسین اور کامیاب لڑکی نجانے یہ کیوں نہیں سمجھ پائی تھی کہ وہ اس میں کسی اور انداز سے نہ کبھی دلچسپی رکھتا تھا نہ کبھی رکھے گا۔

اس کے انکار کے باوجود بھی وہ چھ سالوں بعد آج بھی جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے لوگ بے قرار رہا کرتے تھے پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ اس کے ساتھ سر پھوڑ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' وہ سارہ کے جواب کی معنی خیزی کو قصداً نظر انداز کر کے بولا۔

''وہی کام، کام اور بس کام۔ ایک فیشن شو کے لیے اپنے 2007ء کے برائیڈل کلکشن پر کام کر رہی ہوں۔ مایوں، مہندی، شادی کے برائیڈل کلکشن اور برائیڈل ہینڈی کرافٹ وغیرہ کی ڈیزائننگ اور تم؟'' وہ اپنے سلکی بالوں کو نزاکت سے ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ''سیل پر کونٹکٹ کرنا چاہو تو کبھی آف ہوتا ہے اور کبھی میرا نام دیکھ کر کال ہی ریسیو نہیں کرتے۔''

ایک دلکش سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے وہ صاف گوئی سے بولی۔ ایک پل کے لیے وہ کچھ شرمندہ سا ہوا۔

''بس آج کل آفیشل مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ ایک ڈیل کے سلسلے میں بہت بزی ہوں۔''

''ممی بتا رہی تھیں فریدہ آنٹی ارتھ کوئیک افیکٹڈ ایریاز میں کوئی فری میڈیکل کیمپس وغیرہ لگانے گئی ہوئی ہیں۔'' اس نے از خود ہی موضوع تبدیل کر کے سارہ کو مزید شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔

''ہاں ممی کا تو تمہیں پتا ہے، سوشل ورک اور چیریٹی کے ان تمام کاموں کی طرف ان کا کتنا زیادہ جھکاؤ رہتا ہے۔''

''یہاں کس کام سے آئے ہو؟ آئے ہو یا واپس جا رہے ہو؟'' اس کے مینی کیور ہوئے اچھے سے شیڈ کی نیل پالش سے سجے خوبصورت ہاتھ، اونچی ایڑی کی اٹالین سینڈل میں مقید گورے گورے خوب صورت پاؤں، یہاں تک کہ اس کی گردن کا تل بھی۔ سب کچھ کس قدر متناسب اور دلکش تھا اور وہ اپنی اس ساری دلکشی اور خوبصورتی کو کتنی فضول جگہ پر برباد کر رہی تھی۔ کسی دلچسپی کے بغیر وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے ایک بدذوق، بہت بڑا ٹیسٹ رکھنے والا انسان کوئی بہت خوبصورت آرٹ کا شکار دیکھے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائے بغیر سرسری اور سطحی انداز میں۔

''ایک سیمینار میں آیا تھا، واپس جا رہا ہوں۔'' وہ بات سے بات نکال کر گفتگو کو طول دینے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی باڈی لینگویج سے اسے یہ بتانا چاہا کہ وہ بہت زیادہ جلدی میں ہے۔

''خیر کسی بھی بہانے تم سے ملاقات تو ہوئی، ورنہ تم نے تو جیسے نہ ملنے کی قسم ہی کھا رکھی ہے۔ چلو کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔'' اپنے مرون ہی رنگ کے اسٹائلش سے بیگ کو دائیں کندھے سے بائیں کندھے پر منتقل کرتے سارہ نے کہا۔

''آئم سو سوری سارہ! دراصل اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں پھر کسی دن ملتے ہیں نا، کافی کے لیے نہیں بلکہ لنچ یا ڈنر کے لیے۔'' لہجے میں شائستگی برقرار رکھتے ہوئے اس نے فوراً معذرت کی۔

وہ اس کے وعدے پر کھلکھلا کر ہنس پڑی کہ وعدہ کرنے والا بھی جانتا تھا اور جس سے وہ وعدہ کیا جا رہا تھا، وہ بھی کہ وہ ''دن'' سارا اجمل اور اشعر حسین کی زندگی میں کبھی بھی آنے والا نہیں تھا۔ اتفاقاً ملاقات کی بات دوسری تھی۔ قصداً ارادتاً تو اس سے ملنے سے وہ واقعی کتراتا تھا۔

''اوکے سارہ! پھر کسی دن ملتے ہیں۔ بائے۔''

سارہ کی کھلکھلاتی ''میں جانتی ہوں تم مجھ سے بھاگتے ہو۔'' والی ہنسی کو نظر انداز کرتا وہ ایک سیکنڈ میں وہاں سے آگے بڑھا اور پیچھے کھڑی سارہ اجمل آنکھوں میں حسرتیں لیے اس شاندار اور مغرور مرد کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اب اس کے چہرے پر ہنسی نہیں، صرف اور صرف حسرتیں رقم تھیں۔

وہ ہینڈسم تھا، کلچرڈ تھا، اعلا تعلیم یافتہ تھا، دولت مند تھا، کامیاب تھا تو یہ سب خوبیاں تو اس کے سرکل میں موجود اس کے آگے پیچھے پھرتے بے شمار مردوں میں موجود تھیں پھر اس مغرور بندے میں ایسا کیا تھا کہ وہ سارہ اجمل کبھی بھی کسی اور کو دیکھ ہی نہیں پاتی تھی۔ کسی اور کو سوچ ہی نہیں پاتی تھی۔

''ٹھیک ہے اشعر حسین! ہمارے نصیب میں ہی شاید نہیں کہ تمہارے ساتھ ایک کافی ہی پی سکیں۔ چند لمحے ہی تمہارے ساتھ بتا سکیں۔''

کچھ لمحوں بعد وہ واپس لفٹ کی طرف گھومی تو اس کے لبوں پر پھر سے وہی دلکش تبسم بکھرا ہوا تھا جو اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔

☆......☆......☆

حریم کی فرمائشی تمام کھلونے لینے کے بعد وہ ایک اچھی سی کاسمیٹکس کی شاپ میں گھسا۔ شیڈز وریڈز کا تو اسے کچھ پتا نہیں تھا، بس ایک اچھے سے کاسمیٹکس برانڈ کی درجن بھر نیل پالش جلدی جلدی خرید ڈالیں۔ سجنے، سنورنے اور خوب تیار ہونے کی شوقین بیٹی کے لیے کچھ دوسری دکانوں سے کافی سارے کلرفل اور خوب صورت سے ہیر کلپس، ہیر بینڈز اور ہاتھوں اور گلے میں پہننے کی چھوٹی بچیوں کی خوب ساری جیولری جس میں رنگین، دیدہ زیب ہار، کڑے، بریسلیٹ اور چوڑیاں وغیرہ شامل تھے۔ اپنی تمام شاپنگ کے ساتھ وہ گھر پہنچا اور حریم کو گود میں اٹھائے خرد نے دروازہ کھولا۔ ایک بہت حسین، بہت اسٹائلش اور بہت ماڈرن لڑکی سے وہ ابھی مل کر آ رہا تھا اور اب ایک بالکل ہی مختلف لڑکی اس کے سامنے تھی۔ سبز رنگ کا بہت سادہ سا شلوار قمیص، دوپٹہ۔ ان کپڑوں کی قیمت کا اندازہ انہیں دیکھنے ہی سے ہو رہا تھا۔ بالکل سیدھی ہوئی چوٹی اور دھلا ہوا چہرہ۔ اس کا پورا وجود ہر طرح کی آرائش وزیبائش سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے برسوں میں کہاں رہتی رہی اور کیا کرتی رہی، یہ وہ کبھی سوچتا نہیں تھا۔ سوچنا چاہتا نہیں تھا کہ اس بات کا خیال آتے ہی اس کی رگوں میں خون کھولنے لگتا تھا۔ اسے اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگتی تھیں۔ اپنی بے غیرتی کا نئے سرے سے احساس پیدا ہونے لگتا تھا۔ اپنی انا، اپنی غیرت، اپنے وقار کا قتل پھر سے یاد آنے لگتا تھا، مگر اس سب کے باوجود ان چند دنوں میں کسی شعوری کوشش کے بغیر اور کچھ بھی نہ سوچنے کے باوجود اتنا تو اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ گزرے برسوں میں جہاں بھی رہی اور جیسے بھی رہی مگر مالی مشکلات کا شکار ہو کر رہی۔ حریم اس کے ہاتھوں میں موجود بڑے بڑے شاپنگ بیگز کو للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بہت ہی پیارا سا اورنج رنگ کا اسکرٹ اور سبز رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا اور یہ اس کا لایا ہوا لباس نہیں تھا۔ چند دن قبل جب ایک اسپتال کے گارڈن میں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ملا تھا، تب بھی اس نے اسے بہت اچھے لباس اور جوتوں میں دیکھا تھا۔ خرد احسان اس کے پاس آنے سے قبل جب وہ حریم کو اس سے چھپائے کہیں نامعلوم جگہ پر رہتی تھی، تب وہاں وہ کیا کیا کرتی تھی، کہاں رہتی تھی، کیا کام کرتی تھی، اس کے آمدنی کے ذرائع کیا تھے، یہ سب وہ ہرگز نہیں جانتا تھا مگر اتنا بہرحال ان چند دنوں میں اسے نظر آیا تھا کہ اس نے بیٹی کو اچھا لباس، اچھی خوراک، اچھی تعلیم اور اچھی تربیت ضرور مہیا کر رکھی تھی۔ اس نے وہ تمام شاپنگ بیگز فرش پر رکھے اور حریم کو خرد کی گود سے لے لیا۔

''آپ نیل پالش لائے ہیں؟ آپ حریم کے لیے برا (بڑا) سا TAZZ لائے ہیں؟ آپ اورنج کلر کی نیل پالش لائے ہیں۔'' اپنے کمرے کے اندر آتے وہ اس سے مسلسل استفسار کرتی رہی۔ اورنج اسکرٹ تھا تو اورنج نیل پالش بھی ضرور چاہیے تھی۔ حریم کو اپنے لیے آیا سارا سامان دیکھنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کی بے قرار پر مسکراتا وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے کھلونے، اپنے لیے آئی ڈھیر ساری نیل پالش، رنگ برنگی جیولری، وہ تمام چیزوں کو دیکھ کر بے تحاشا خوش تھی۔ خوشی سے ہنستی، کھلکھلاتی وہ کبھی ایک چیز کو اٹھا کر دیکھتی، کبھی دوسری۔ صد شکر کہ نیل پالش کے ان ڈھیر سارے شیڈز میں ایک شیڈ اورنج بھی تھا۔ شاپنگ الٹتے ہی اس نے تمام نیل پالشوں

میں اورنج نیل پالش اس طرح تلاش کی تھی کہ جیسے ان رنگوں میں اگر اورنج کلر نہ ہوا تو اس کی آج کی ساری کی ساری شاپنگ اس کی اپنی نظروں میں بے کار اور بے مصرف ٹھہرے گی۔

''زینت سے کہو کھانا لگا لے۔'' حریم سے اس کی چیزوں پر رواں تبصرے سنتے۔ اس نے خرد سے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔ وہ سر اثبات میں ہلاتی کمرے سے چلی گئی۔

جتنی دیر میں زینت نے میز پر کھانا لگایا، اس نے حریم کے لیے نوڈلز بنا لیے۔ کمرے میں ان دونوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دینے آئی تو باوجود کوشش کے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپا نہیں پائی۔ بہترین قسم کے اٹالین سوٹ، میں کسی کامیاب ایگزیکٹو جیسی لکس والا وہ بندہ سر جھکائے پورے انہماک کے ساتھ اس چار سال کی چھوٹی، شرارتی سی بچی کے ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل پالش لگانے میں مصروف تھا۔

''پاپا! سئی (صحیح) سے لگائیں۔ ماما کی طرح۔'' ایک ناخن پر جو ذرا سا رنگ ناخن سے ہٹ کر ادھر ادھر پھیلا تو حریم نے خفگی سے فوراً کہا۔

''پرنسس! یہ کام میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا۔ لگتا ہے اب تمہاری خاطر مجھے باقاعدہ کوئی کورس کر کے یہ سارے کام بھی سیکھنے پڑیں گے'' ہنس کر حریم سے کہتے اسے ایک دم ہی اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''چلو حریم! کھانا کھالو۔'' وہ حریم کے قریب چلی آئی۔

''حریم نیل پالش لگا رہی ہے ماما!''

''پھر نوڈلز ٹھنڈے ہو جائیں گے تو کہو گی 'ٹھنڈے ہیں، میں نہیں کھا رہی' چلو باقی ناخنوں پر نیل پالش کھانے کے بعد لگوا لینا۔'' اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ کچھ خفگی بھرا منہ بنا کر اس نے جھٹ اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بالکل سیدھ میں کر لیے۔ کہیں اس کی نیل پالش خراب نہ ہو جائے۔ یہی حال اس کے ہاتھوں پر مہندی لگانے کا ہوا کرتا تھا۔ حریم کو اگلے کئی گھنٹوں کے لیے سکون سے ایک ہی جگہ بٹھانا ہے تو اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگا دی جائے۔ دونوں عیدوں کے علاوہ بھی موقع بے موقع وہ اس سے مہندی لگواتی رہا کرتی تھی۔ وہ ماں جتنی سادہ تھی، اس کی بیٹی اتنی ہی شوقین۔

وہ حریم کو لے کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی۔ اشعر بھی ہنستا مسکراتا تین چار منٹ بعد ہی ان دونوں کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''مزے آ رہے ہیں، نوڈلز کھائے جا رہے ہیں اور وہ بھی کیچ اپ ڈال کے۔'' کل کے مقابلے میں آج حریم کی طبیعت بہتر تھی، وہ خود اپنے ہاتھوں سے نوڈلز کھا سکتی تھی مگر اس کی نیل پالش خراب نہ ہو جائے، اس لیے میز پر دونوں ہاتھ بڑی نزاکت سے تمام انگلیاں ایک دوسرے سے دور دور رکھ کر بیٹھی تھی۔ حریم اس کے ہاتھ سے نوڈلز کھا رہی تھی۔

شروع کے دو چار نوالے حریم نے بڑے شوق سے کھائے، مگر پھر اس کے بڑھے نوالے کو کھانے سے منع کرتے ہوئے بولی۔

''ماما! بس اور نہیں۔''

''کیوں جانو؟ ابھی تو اتنے سارے نوڈلز باؤل میں بچے ہیں۔ سب فنش کرو۔'' اشعر بھی کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''پاپا! بس tummy فل ہوگئی۔'' اس کی بھوک، کھانا کھانے کی رغبت سب بیماری سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

کھانے کے بعد وہ دونوں مشترکہ جدوجہد سے اسے دوا دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔

''پاپا! پرامس کریں، حریم سوئے گی تو آپ دوسرے روم میں نہیں جائیں گے۔'' وہ بظاہر اس کی باتوں پر جتنا بھی مسکرایا ہو مگر اندر سے اس کی بے اعتباری نے اسے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ یعنی وہ اتنی ذہین اور سمجھدار تھی جو یہ بات جانتی تھی کہ روز جب وہ سو جاتی ہے، تب وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اندر سے وہ اس کی بے اعتباریوں پر لہولہان ہوگیا تھا۔ وہ چھوٹی سی بچی اس سے کوئی جواب طلبی نہیں کرتی۔ اس سے پچھلے چار سالوں کا کوئی حساب نہیں مانگتی مگر وہ اس پر اعتبار بھی نہیں کرتی۔

''پاپا! کہانی لیٹ کر سنائیں۔'' اشعر نے اسے کہانی سنانی شروع کی تو وہ فوراً بولی۔ ایک پل کچھ سوچتا، وہ جیسے انکار کرتے کرتے رکا پھر اس کے پاس لیٹ گیا۔

''اب خوش ہو پرنس؟'' وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولا۔

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے کہانی شروع کی تو وہ ایک دم ہی دوبارہ بولی۔

''پاپا! آپ یہاں رہیں۔''

''پرنس! میں یہیں تو ہوں تمہارے پاس۔''

''نہیں، یہاں سوئیں۔ حریم کے پاس سوئیں۔'' اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے اپنی بات سمجھانا چاہی۔ کچھ سوچتے ہوئے اشعر نے اقرار میں سر ہلایا تو وہ بے اعتباری سے بولی۔ ''پرامس کریں، حریم سوئے گی تو آپ دوسرے روم میں نہیں جائیں گے۔''

خرد کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے ہی اشعر اس کی بات فوراً مان گیا۔

حریم روز کی طرح کہانی سنتے سنتے سو چکی تھی مگر وہ روز کی طرح وہاں سے اٹھا نہیں۔

حریم اس سے لپٹ کر سو رہی تھی۔ خرد تکیے سے ٹیک لگا کر حریم کے برابر بیٹھی تھی۔ لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلانے کے بعد وہ دوبارہ حریم کے پاس آ کر لیٹ گیا تھا اور اسے محبت سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ آنکھیں کھول کر ایک ہی زاویے سے پوری رات بیٹھی رہی تھی۔ نہ اس نے آنکھیں بند کی تھیں، نہ سونے کی کوشش کی تھی۔ کوشش کرتی تب بھی نیند نہیں آسکتی تھی۔ حریم کو اس کے اوپر ٹانگیں رکھ کر سونے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی وہ ایسے ہی سو رہی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا

مگر جب سے اس کی بیماری سے باخبر ہوئی تھی، اس کی کوئی بھی بات رد کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پہلے اس کی اچھی تربیت کی خاطر اس پر سختی ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک سب کچھ کرلیتی تھی۔ پر اب تو جی چاہتا تھا وہ جو کچھ کہے وہ لمحے بھر میں اس کے سامنے حاضر کردے۔

حریم کے گرد بازو پھیلائے وہ شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے یوں گہری نیند سوتے اس نے پہلے بھی بے شمار بار دیکھا تھا۔ اس کی یادوں میں برسوں پہلے کے وہ منظر محفوظ تھے، جب وہ اس شخص کی محبت میں دیوانی تھی، جب جاگتے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے وہ کترایا کرتی تھی، ہچکچاتی تھی مگر جب وہ گہری نیند سویا ہوتا تب وہ بارہا اس کے خوب صورت نقوش والے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہا کرتی تھی۔ سوتے میں ایک بہت نرم، بہت سچا اور سادہ روشن سا تاثر اس کے چہرے پر ابھرآتا تھا اور اتنے برسوں بعد آج جب وہ اسے اپنے سے تھوڑے سے فاصلے پر سویا دیکھ رہی تھی، تب بھی وہی نرمی، وہی سچائی اور ویسی ہی سادگی اور روشنی اسے اس چہرے پر پھیلی نظر آرہی تھی۔ چہرے تو ہمیشہ دھوکا ہی دیا کرتے ہیں۔ گہری نیند میں سویا یہ شخص جو سوتے میں بہت سیدھا، سچا اور اچھا انسان نظر آرہا ہے، اس کے ظلم اور سفا کی کا اس سے بڑھ کر گواہ اور کون ہوسکتا تھا۔ وہ پوری رات جاگی رہی تھی۔ اس طرح ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بری طرح اکڑ سا گیا تھا مگر اس نے بیڈ پر اپنی ٹانگیں تک سیدھی پھیلائی نہیں تھیں۔ چار بجے وہ بڑی آہستگی، بڑی احتیاط سے حریم کے پاس سے اٹھی......کوئی بھی آواز پیدا کیے بغیر کمرے سے باہر نکل آئی۔ دوسرے کمرے کے باتھ روم سے وضو کر کے لیونگ روم میں آگئی اور کارپٹ پر جائے نماز بچھا کر قبلہ رو کھڑی ہوگئی۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجاتی نظر آئی۔ اتنی گہری، اتنی غفلت کی نیند۔ وہ منہ اندھیرے اٹھنے والے لوگوں میں سے تھا۔ وہ آفس کے لیے لیٹ ہوگیا تھا۔ نو بجے ایک میٹنگ تھی اور ابھی اسے شیو کرنا اور نہانا تھا، تیار ہونا تھا پھر آدھا گھنٹے کی آفس تک ڈرائیو۔ بوکھلا کر وہ ایک دم بستر پر سے اٹھنے لگا مگر اس کے ہاتھ پر رکھے حریم کے سر نے اسے فوراً اٹھنے نہ دیا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

وہ اس کی نیند خراب کیے بغیر بالکل خاموشی سے اس کے پاس سے اٹھ جانا چاہتا تھا مگر اس کی رات کی بے اعتباری اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ اسے جگا کر یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ پوری رات اس کے پاس رہا ہے، اس کے ساتھ سویا ہے، وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں گیا۔

وہ کچھ پل یونہی لیٹا اسے سویا ہوا دیکھتا رہا پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل اٹھا کر اس نے آفس اپنی سیکریٹری کو فون کیا، اسے آج آفس پہنچنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ یہ اطلاع دی، میٹنگ کا وقت تبدیل کروایا اور پھر فون بند کر کے حریم کو پیار سے جگانے لگا۔

''پرنس! اٹھ جاؤ، صبح ہوگئی ہے۔'' مگر وہ اس کے ہلانے جلانے اور آواز دینے پر بھی نیند کو خیر باد کہنے پر آمادہ نہیں تھی۔

''پرنس! آنکھیں کھول کر بس یہ دیکھ لو کہ پاپا رات میں کہیں نہیں گئے، تمہارے پاس ہی سوئے تھے۔'' اس نے اسے گدگدا کر جگانا چاہا۔

''پاپا! سونے دیں۔'' حریم نے آنکھیں کھولے بغیر ناراضی سے کہا اور پھر کروٹ دوسری طرف کرلی۔ وہ جاگ چکی تھی مگر ابھی

آنکھیں کھولنے اور بستر سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کی بیٹی نے آج صبح جاگنے پر اسے اپنے قریب پایا ہے۔ وہ حریم کی بے اعتباریوں کو کچھ تھوڑا بہت اعتبار دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

خرد نے اپنی پڑھائی کے اوقات تبدیل کر لیے تھے، وہ اب اس کی موجودگی میں خصوصاً رات میں بالکل بھی نہیں پڑھتی تھی۔ یونیورسٹی سے دوپہر میں گھر واپس آ کر اسے کوئی دوسری مصروفیت پڑھائی سے نہ روکے، اس غرض سے اب اس نے روزانہ کلاسز ختم ہونے کے بعد مزید اسٹڈی کے لیے کیمپس میں اپنے گروپ کے افراد کے ساتھ چند گھنٹے اور رکنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے اگر یونیورسٹی سے اس کی واپسی دو، ڈھائی بجے تک ہو جایا کرتی تھی تو اب وہ چار، ساڑھے چار بجے وہاں سے واپس آنے لگی تھی۔ وہ روزانہ پونے پانچ بجے کے قریب آفس سے گھر فون کر کے خرد سے اس کی خیریت ضرور پوچھ لیا کرتا تھا۔ ڈرائیور اسے لینے صحیح وقت پر چلا گیا تھا۔ وہ خیریت سے گھر واپس آ گئی، اس نے کھانا کھا لیا، آفس میں کسی انتہائی اہم کام، کسی ضروری میٹنگ کے دوران بھی اسے اس بات کی فکر رہا کرتی تھی۔ اس روز دوپہر میں ڈیڑھ بجے اس نے گھر کال کی تھی مگر خرد سے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ فریدہ سے بات کرنے کے لیے۔

فون نسیمہ نے اٹھایا۔ ''ممی گھر آ گئی ہیں تو انہیں بلاؤ۔''

''وہ تو آج دوپہر میں گھر نہیں آئیں گی۔ صبح کہہ کر گئی تھیں کہ آج شام میں چھ سات بجے تک گھر واپس آئیں گی۔ خرد بی بی کو بلا دوں؟'' فریدہ کی گھر پر غیر موجودگی سے اسے آگاہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''خرد یونیورسٹی سے آ گئی؟'' گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ابھی ابھی آئی ہیں۔ خضر صاحب کے ساتھ۔ لاؤنج میں ہیں۔ انہیں بلاؤں؟'' نسیمہ سے اس نے پوچھا۔

''نہیں، رہنے دو۔ مجھے ممی ہی سے کام تھا۔'' کھوئے کھوئے سے انداز میں یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ ابھی فون بند کیے اسے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے موبائل پر فریدہ کی کال آ گئی۔

''آج رات درانی صاحب اور ان کی فیملی کو میں نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ آسٹریلیا سے چند دنوں کے لیے پاکستان آئے ہیں۔ مجھ سے فون پر دعا سلام کے لیے رابطہ کیا تو میں نے انہیں آج رات کھانے پر انوائٹ کر لیا۔ تمہارے ڈیڈی کے اتنے پرانے دوست ہیں وہ، تو میں چاہتی تھی کہ آج ڈنر پر تم اور خرد بھی گھر پر موجود رہو۔ تم سے یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ رات کا کوئی پروگرام مت رکھنا۔'' انہوں نے اسے کال کرنے کی وجہ سے آگاہ کیا۔

''جی اچھا ممی!'' ان کی بات کا جواب دے کر وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوا پھر آہستگی سے بولا۔

''ممی! نیاز کو کیا آپ نے کہیں کسی کام سے بھیجا ہے؟'' اس نے ان کے گھر کے ڈرائیور کا نام لے کر استفسار کیا۔ یہ سوال پوچھتے ہوئے اسے خود اپنی آواز اپنی نہ لگی۔ اپنا لہجہ اپنا نہ لگا۔

''نیاز کو۔نہیں، تم کیوں یہ بات پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، ایسے ہی۔ مجھے ذرا نیاز سے کچھ کام تھا۔ٹھیک ہے، میں اس سے گھر پر فون کر کے بات کر لیتا ہوں۔'' لہجے کو حتی الامکان حد تک نارمل رکھتے ہوئے اس نے انہیں جواب دیا۔

''اس وقت نیاز کو کسی کام سے مت بھیج دینا۔خرد کو یونیورسٹی سے واپسی پر مشکل ہوگی۔تمہیں ڈرائیور کی ضرورت ہے تو میں اپنے ہاں سے کسی کو بھیج دیتی ہوں۔''

''نہیں، ڈرائیور کی ضرورت نہیں۔ مجھے نیاز سے کچھ اور کام تھا۔'' انہیں جواب دے کر اس نے فوراً ہی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

''خرد نے بلڈ دیا تو اس کی خون کی ضرورت پوری ہوئی۔''

''او نیگیٹو والے جو بڑے انا والے ہوتے ہیں، دیتے سب کو ہیں، پر لیتے صرف اپنوں سے ہیں۔''

''خضر کا ایکسیڈنٹ ہوا تو اس فکر سے خرد تقریباً ہر ایک آدھ دن بعد اس کی عیادت کے لیے اسپتال جاتی رہی۔کبھی سوپ بنا کر لے جاتی، کبھی دوسری کوئی اور چیز۔''

''خرد کے ہاتھوں کا جب صرف سوپ اتنے مزے کا ہوتا ہے تو باقی چیزیں تو یہ یقیناً بہت ہی اچھی بناتی ہوں گی۔''

''آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔ مجھے آج رات میں جاگ کر پڑھنا ہے میں سو نہیں سکتی۔آپ سو جائیں۔''

''خرد بی بی کو بلا دوں؟ ابھی ابھی آئی ہیں خضر صاحب کے ساتھ، لاؤنج میں ہیں۔''

''وہ تو آج دوپہر میں گھر نہیں آئیں گی۔صبح کہہ کر گئی تھیں کہ آج شام میں چھ سات بجے تک گھر واپس آئیں گی۔''

''میں ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھی کہ خضر آ گیا۔کہنے لگا۔چلیں فریدہ آنٹی کے گھر میں آپ کو لے چلتا ہوں۔''

''آج یونیورسٹی نہیں آئیں آپ؟''

وہ اپنے سامنے رکھے کاغذوں کو بے دھیانی سے گھورتا جو کا توں ساکت بیٹھا تھا۔تب ہی موبائل کو اس نے نگاہوں کے سامنے کیا۔خرد فون کر رہی تھی، اسکرین پر اس کا نام جگمگا رہا تھا۔اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو'' وہ روز کی طرح مزید کوئی پرلطف سے بات اس کال کے آغاز میں نہ کہہ سکا۔

''کیا ہوا آج میری یاد نہیں آئی؟ میری خیریت نہیں پوچھی گئی؟'' اس نے بڑے ناز سے، بڑے حق سے پوچھا۔گھڑی پر اس کی نگاہ گئی۔پانچ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔

''ابھی واپس آئی ہو؟'' یہ سوال اس سے پوچھتے اس کی آواز کانپی تھی۔اے سی کی خنکی کے باوجود اس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔اگر اس سوال کے جواب میں خرد نے ''ہاں'' کہہ دیا پھر؟

''نہیں، آئے تو کافی دیر ہوگئی۔ آج کسی کا بھی یونیورسٹی لیٹ رکنے کا موڈ نہیں تھا، اس لیے ڈیڑھ بجے ہی واپس آگئی تھی۔ خضر نے مجھے گھر ڈراپ کر دیا تھا۔ بس پھر کھانا کھایا، تھوڑی بہت اسٹڈی کی اور ساتھ ہی پونے پانچ بجنے کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ میں اتنی دیر سے آپ کی کال کا ویٹ کر رہی تھی، آج مجھے کال کیوں نہیں کی؟''

وہ تو وہی تھی اس کی خرد، بہت سادہ اور بہت سچی اس کی اپنی خرد اور وہ کچھ لمحوں پہلے کتنی چھوٹی بات سوچ رہا تھا۔ کتنی پست، کتنی گھٹیا۔ اسے خود پر شرم آئی۔ ایسی گری ہوئی، گھٹیا اور نیچ بات خرد کے متعلق اس نے سوچی بھی کیسے؟ اسے اس پل اپنا آپ بہت چھوٹا اور بہت نیچ لگا۔ وہ اپنے لہجے میں تازگی اور خوشگوار سا تاثر لا کر دھیمے سروں میں بولا ''میں بس ابھی کال کرنے ہی والا تھا اور یاد کرنے کی بھی آپ نے خوب کہی۔ آپ مجھے کسی وقت بھولیں تو یاد کرنے کی نوبت بھی آئے۔''

''اوہ شاعری۔'' وہ جواباً کھلکھلائی۔

''آپ نے لنچ کر لیا؟'' اگلے پل سنجیدگی اختیار کر کے اس نے فکر سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ خرد روز اس وقت فون پر بات ہونے پر اس کے لنچ کے بارے میں یونہی فکر سے استفسار کرتی تھی۔ اس لیے اس ذکر کو فوراً ہی ختم کرنے کے لیے جلدی سے موضوع بدل کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بیڈ پر لیٹی ہوں۔ آپ سے باتیں کر کے آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ آپ کو کام نہیں کرنے دے رہی اور اگلے پندرہ بیس منٹوں تک میرا مزید یہی کچھ کرنے کا پروگرام ہے۔''

وہ مزے سے بولی اور وہ اس کے انداز پر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کے دل اور اس کی روح پر پڑا کوئی بوجھ جیسے سارا کا سارا اتر گیا تھا۔ آج اس نے خرد کے متعلق کتنی گھٹیا، کتنی تنگ نظری والی بات سوچی تھی۔

مگر بہت کھلے ذہن کے، بہت لبرل، بہت ماڈرن اور نہایت اعلاتعلیم یافتہ اشعر حسین کے لاشعور میں ایک بات تھی جو خود اپنے آپ سے کہنے کی بھی وہ جرأت نہیں رکھتا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ اسے خضر عالم اچھا نہیں لگتا، اسے اس شخص کا کسی بھی انداز میں خرد کے آس پاس موجود رہنا برداشت نہیں ہوتا، اسے اس شخص کی شکل دیکھنے سے تو کیا، صرف اس کا نام سننے ہی سے کوفت ہوتی ہے، غصہ آتا ہے بلکہ شاید وہ اس شخص سے نفرت کرتا ہے۔

☆......☆......☆

وہ ہفتہ وار تعطیل کا دن تھا اور اس سہ پہر موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ٹھنڈا، خوشگوار اور ابر آلود موسم۔ وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھا اپنا کچھ دفتری کام کر رہا تھا اور خرد کھڑکی کھول کر کھڑکی سے باہر جھانکتی بارش کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی ہلکی ہلکی بوندیں پڑنی شروع ہوئیں وہ مزید پرجوش ہوگئی۔

''اللہ کرے خوب تیز بارش ہو، میں بارش میں نہاؤں گی۔'' دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر پھیلا کر بوندوں سے ہتھیلیوں کو بھگوتے اس نے اشعر سے کہا۔

''بارش کے لیے اس طرح ایکسائٹڈ ہم اپنے بچپن میں ہوا کرتے تھے۔'' کی بورڈ پر تیز رفتاری سے انگلیوں کو چلاتے ہوئے وہ ہنسا۔

''ہمارا تو ابھی بھی بچپن ہے، اس لیے ہم ابھی بھی ایکسائٹڈ ہوتے ہیں۔'' اس نے برملا جواب دیا۔ چند ہی منٹوں میں خوب تیز بارش شروع ہوگئی تھی اور اب وہ مصر تھی، نیچے گارڈن میں چلنے کے لیے بارش میں بھیگنے کے لیے۔

''میرا تو کوئی دل نہیں چاہ رہا بارش میں جا کر بھیگوں، اپنا حلیہ بگاڑوں، کپڑے خراب کروں، میں اچھا بھلا بیٹھا کیا برا ہوں۔ نہ بابا، ہم بارش میں بھیگے بغیر بھلے۔''

اس نے صاف انکار کیا، مگر پھر خرد کا موڈ بگڑتا دیکھ کر محض اس کا ساتھ دینے اس کے ساتھ نیچے آتو ضرور گیا مگر گارڈن میں کھلے آسمان تلے نہیں آیا۔ لاؤنج سے باہر سیڑھیوں پر شیڈ کے نیچے ہی کھڑا رہا۔ ہاتھ میں چائے یا کافی کا مگ لے کر بارش کو دور کھڑے ہو کر انجوائے کرنا الگ بات تھی مگر بارش یں بھیگنے اور نہانے کا تصور اس کے نزدیک اچھا خاصا بچکانہ سا تھا۔ وہ دور کھڑا خرد کو بارش کو انجوائے کرتا دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی بہت معصوم، بالکل بچوں جیسی ہی لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا، اتنی جلدی کیوں آگئیں؟ ابھی بارش رکی تو نہیں۔ اتنی جلدی دل بھر گیا اور نہیں نہانا کیا؟'' کچھ ہی دیر بعد وہ شیڈ میں اس کے پاس چلی آئی تو اس نے تعجب سے پوچھا۔

''اکیلے کوئی مزا آتا ہے۔ خود تو میرے ساتھ بارش میں آئے نہیں، یہاں پر کھڑے ہیں۔ آپ بہت بور ہیں۔'' وہ روٹھے لہجے میں منہ پھلا کر بولی۔

''مجبوری ہے، اب تو آپ کو اس بور بندے کے ساتھ گزارا کرنا پڑے گا۔''

''شیڈ میں دور کھڑے جس طرح مجھے دیکھ رہے تھے، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسی میں کوئی احمق ہوں، مسکرا بھی ایسے رہے تھے جیسے بچوں کی حماقت پر بڑے مسکراتے ہیں۔''

''سوئیٹ ہارٹ! کیا بولوں ابھی آپ واقعی بچی ہی ہیں۔ پر آپ کا یہ بچپنا مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔'' اس کے چہرے پر بکھری بالوں کی گیلی لٹوں کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتا وہ مسکرا کر بولا۔ اس کا روٹھا انداز اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے میں واپس آگئے تھے وہ وارڈ روب سے کپڑے نکال رہی تھی۔ ابھی وہ باتھ روم کی طرف جا رہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔

''ہاں ندرت! بولو۔'' چہرے پر بکھرے پانی کے قطروں کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''آؤٹنگ؟ واہ بھئی مزے آرہے ہیں۔'' وہ دوسری طرف سے کہی جانے والی کسی بات کے جواب میں بولی۔

''تمہارے انوائٹ کرنے کا شکریہ یار! مگر میرا موڈ نہیں۔تم لوگ جاؤ۔ میں ان شاء اللہ کل تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔''

چند سیکنڈز دوسری جانب سے ندرت کی کہی جانے والی بات سننے کے بعد اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ندرت کا فون تھا۔سامعہ وغیرہ بہت دنوں سے اس کے پیچھے پڑے تھے کہ اپنی منگنی کی خوشی میں ہمیں ٹریٹ دو۔آج موسم بھی اچھا ہے تو ندرت نے سب دوستوں کو ٹریٹ دینے اور آؤٹنگ کا پروگرام بنالیا ہے۔دیکھیں ایسے ہوتے ہیں زندہ دل لوگ۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے منع کیوں کردیا، چلی جاتیں۔'' وہ دوبارہ کمپیوٹر آن کرنے لگا تھا۔

''بس ویسے ہی۔کل جا تو رہی ہوں اس کی منگنی کے فنکشن میں پھر کیا ضروری ہے روز روز بلاوجہ مارے مارے پھرنے کی اور ویسے بھی ہم چھٹی کے اس دن کو اپنے انتہائی بور قسم کے شوہر صاحب کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔''

وہ کمپیوٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھا اپنی مطلوبہ فائل کھول رہا تھا، جب خرد بات کرتے کرتے ایک دم ہی اس کے پیچھے آئی۔اس کے سنورے بالوں کو اپنے گیلے ہاتھوں سے بگاڑا اور چھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔اسے پکڑنے کے لیے کرسی سے اٹھتا وہ مسکراتا ہوا واپس کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

آج ندرت کی منگنی تھی۔انوائٹڈ تو وہ بھی تھا مگر اس نے اپنے جانے سے معذرت کرتے اسے فنکشن میں خود چھوڑنے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری ضرور لے لی تھی۔خرد کو یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ وہ پہلے اسے چھوڑنے جائے پھر دو تین گھنٹے بعد دوبارہ لینے آئے۔اس نے تیار ہوتے وقت بھی کئی بار اس سے کہا تھا کہ ندرت کے گھر اسے بے شک وہ چھوڑ دے مگر واپسی میں وہ ڈرائیور کے ساتھ آجائے گی لیکن وہ اس کی بات مانا نہیں تھا۔

فیروزی رنگ کا چوڑی دار پاجامہ، انگرکھا اور فیروزی ہی رنگ کے گولڈن کام سے آراستہ بہت لمبے چوڑے دوپٹے کے ساتھ مغلیہ طرز کی لباس سے میچ کرتی جیولری، کانچ کی چوڑیوں اور سنہری پائل کے ساتھ وہ مغلیہ عہد کی کوئی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔سلیقے سے کیے گئے میک اپ اور اس کے کھلے ہوئے لمبے سلکی بال اس کی خوب صورتی کو مزید بڑھا رہے تھے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی، وہ اس کی بے تحاشا تعریفیں کرتا رہا تھا۔اس نے راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر اس کے لیے پھولوں کے کنگن خریدے تھے۔دونوں ہاتھوں میں چوڑیوں سے پہلے اس کی کلائی میں موجود وہ کنگن اس کی تیاریوں کو مزید دلفریب اور مکمل بنارہے تھے۔

ندرت کی منگنی کی تقریب اس کے گھر پر ہی تھی۔تقریب میں آنے والے مہمانوں کی گاڑیوں کی کافی زیادہ تعداد اس کے گھر کے سامنے اور سڑک پر آگے پیچھے کافی دور تک موجود تھی۔گاڑیوں اور لوگوں کے اتنے زیادہ رش کے سبب وہ اپنی گاڑی ندرت کے گیٹ کے بالکل سامنے نہیں روک پایا تھا۔اسی وقت وہاں لڑکے والوں کی بھی آمد ہوگئی تو اس رش اور افراتفری میں مزید اضافہ ہوگیا۔

خرد اسے خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔وہ گاڑی میں بیٹھا خرد کو جاتا دیکھ رہا تھا، جب اسے اپنی گاڑی سے آگے ایک گاڑی

چھوڑ کر کھڑی دوسری گاڑی کے پاس سامعہ، حماد اور خضر کھڑے نظر آئے۔ وہ گاڑی خضر کی تھی، وہ اسے پہچانتا تھا اور اس کے پیچھے والی شاید سامعہ اور حماد کی تھی۔ ان تینوں نے خرد کو ابھی ابھی ہی دیکھا تھا جبکہ پیچھے گاڑی میں موجود اشعر پر کسی کی نگاہ نہیں گئی تھی۔ وہ تینوں اسے نہیں دیکھ سکے تھے، لیکن اسے وہ سب نظر بھی آ رہے تھے اور ان کے زندگی سے بھرپور قہقہے اور باتیں سب سنائی بھی دے رہے تھے۔

وہ تاریکی میں تھا، ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا تھا، جب کہ ان سب کے چہروں پر پڑتی اردگرد سے آتی روشنیاں ان سب کے چہرے اسے بالکل صاف اور واضح دکھا رہی تھیں۔ سیاہ دھاری دار بہترین ڈنر سوٹ میں بہت ہینڈسم، بہت شاندار لگتا خضر اسے بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کی گہری نگاہیں سبج سبج قدم اٹھا کر ان لوگوں کی طرف آتی خرد پر جمی تھیں۔

''اب تو خرد آ گئی ہے۔ اب تو اندر چلو میرے بھائی۔'' اس نے حماد کی آواز سنی جو ہنس کر خضر سے کہہ رہا تھا۔

''خضر نے حماد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس کی نگاہیں مسلسل خرد پر مرکوز تھیں۔ ایک تاریک گوشے میں بیٹھا وہ اس منظر میں شامل ہر شخص کے چہرے اور اس پر موجود تاثر کو باآسانی پڑھ سکتا تھا، وہ پڑھ رہا تھا اور اسے خضر عالم کے چہرے پر موجود تاثر اور اس کی آنکھیں بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ خرد اس اثنا میں ان لوگوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''پچھلے پندرہ منٹوں سے خضر صاحب نے ہمیں تمہارے انتظار میں یہاں باہر روک کر رکھا ہوا ہے۔ فرما رہے تھے۔'' خرد بھی آ جائے پھر سارا گروپ اکٹھا اندر چلے گا۔'' سامعہ نے خرد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ خرد جواباً نجانے کیا بولی، وہ سن نہیں سکا۔ اس کی نگاہیں ابھی بھی خضر ہی کو دیکھ رہی تھیں جو ہنوز خاموش کھڑا خرد ہی کو دیکھ رہا تھا۔ سامعہ اور حماد، خرد سے باتیں کر رہے تھے اور خضر اسے دیکھ رہا تھا، یکلخت ہی وہ شدید ترین غصے اور بے چینی کا شکار ہوا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ خرد کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس گاڑی میں بٹھا لے، اسے اس تقریب میں شرکت سے روک دے، اسے اپنے ساتھ واپس گھر لے جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔

ایک دم ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ بہت تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتا وہ گھر واپس آ گیا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہونے لگا کہ اندر سے آتی آوازوں نے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ لاؤنج سے فریدہ اور زرینہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''خرد گھر پر نہیں ہے، ورنہ میں تمہیں اپنی بہو کے ہاتھ کی مزے دار کافی پلواتی۔'' یہ فریدہ کی آواز تھی جو زرینہ سے مخاطب تھیں۔

''ہاں خضر بتا رہا تھا، ان لوگوں کی کسی فرینڈ کی آج انگیج منٹ ہے۔'' زرینہ جواباً بولیں۔

''شام میں خضر ہمارے ہاں ہی آیا ہوا تھا۔ اچھا خاصا تیز ٹمپریچر ہو رہا تھا اسے۔ میں نے کہا کہ آج ہمارے ہاں ہی رک جاؤ، ریسٹ کر لو۔ کہنے لگا۔ میری فرینڈ کی انگیج منٹ ہے، گروپ کے سب لوگ وہاں آئیں گے، میرا جانا بھی بہت ضروری ہے۔ میں نے سمجھایا بھی کہ جب طبیعت ٹھیک نہیں تو جانا کینسل کر دو۔ اپنی فرینڈ سے ایکسکیوز کر لو مگر نہیں، جب سب دوست جا رہے ہیں تو میرا جانا بھی بہت ضروری ہے۔'' زرینہ شاید کچھ کھاتے ہوئے بولیں۔

''ہنسنے ہنسانے والا زندہ دل لڑکا ہے۔ دوستوں کے ساتھ ایسے ہلے گلے اور ہنگامے کو کیسے مس کر دیتا۔'' جواباً فریدہ ہنس کر بولیں۔

''ہاں، ہنسنے ہنسانے والا ہلے گلے کا شوقین اور زندہ دل تو خیر وہ بہت ہے، اب یہی دیکھو کہ طبیعت شاید دو تین دنوں سے خراب ہے اور مجھے آج بتا رہا تھا کہ کل اسی طبیعت خراب میں اس نے اپنی فرینڈ کے پیچھے لگ کر اس سے اس کی منگنی کی خوشی میں زبردست ٹریٹ لی۔ کہہ رہا تھا۔ دوست آئے تھے، بس صرف خرد نہیں آئی تھی۔ شاید اشعر بھائی نے اسے منع کر دیا ہوگا۔''

''اشعر کیوں منع کرے گا۔ خرد کا خود ہی موڈ نہیں ہوگا۔'' فریدہ جواباً بولیں۔

''ہاں، ہوسکتا ہے ویسے بھی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کی ذمہ داریوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اب خرد ان میرڈ لڑکیوں کی طرح لاپروائی سے منہ اٹھا کر یونہی تو دوستوں کے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔ چاہے جانے کا جتنا بھی دل چاہ رہا ہو اور دل کیوں نہیں چاہے گا۔ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پر جانے کا۔ ابھی اس کی عمر ہے، ان ہلے گلوں اور ہنگاموں کی۔ خضر مجھ سے کہہ رہا تھا اشعر بھائی، خرد سے اتنا بڑے ہیں، ان دونوں کے آپس میں مزاج کیسے ملتے ہوں گے۔ ان دونوں کی سوچ میں مجھے تو بہت فرق محسوس ہوتا ہے۔'' زرینہ نے خضر کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

''نہیں، خیر اتنا زیادہ عمر کا فرق بھی نہیں ہے ان دونوں میں آٹھ سال کا فرق ہے اور میاں بیوی میں اتنا ایج ڈیفرنس تو ہمارے ہاں عام بات ہے۔ ہاں بس یہ ہے کہ اشعر ذرا میچور اور سنجیدہ زیادہ ہے اور خرد میں بچپنا بہت ہے لیکن اللہ کا شکر ہے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں اور ویسے میں تمہیں بتاؤں، خرد میں بچپنا اور نادانی اپنی کم عمری کے سبب چاہے جس قدر بھی موجود ہے، لیکن نیچر کی وہ بہت اچھی ہے۔ خرد کے ہونے سے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دو بیٹیاں میں نے بیاہی تھیں تو ایک بیٹی ان کی کمی پوری کرنے کے لیے مجھے دوبارہ مل گئی ہے۔'' فریدہ نے انہیں جواب دیا۔

''یہ بات تو خیر بالکل ٹھیک ہے، خرد نیچر کی واقعی بہت اچھی ہے۔'' زرینہ نے ان کی بات سے اتفاق کیا پھر غالباً چائے یا کافی کا سپ لیتے ہوئے بولیں۔

''خضر بھی مجھ سے بڑی تعریفیں کرتا ہے خرد کی۔ کہتا ہے، باقی دوست بھی سب اچھے ہیں مگر خرد کی بات الگ ہے۔ وہ سب سے مختلف اور بہت منفرد ہے بلکہ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے مجھ سے مذاق میں کہہ رہا تھا۔ میں لیٹ ہوگیا، اشعر بھائی اتنی اچھی لڑکی کو مجھ سے پہلے لے اڑے۔'' میں نے کہا۔ برخوردار! یہ بات ذرا اشعر کے سامنے کہنا، وہی تمہیں اس بات کا جواب دے گا۔''

زرینہ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔ ان کے پر مزاح انداز پر فریدہ بھی ہنس دیں۔

''اس لڑکے کا سینس آف ہیومر بھی بس اسی کی طرح کا ہے۔ اتنی سنجیدگی سے مذاق کرتا ہے کہ کتنی دیر تو بندہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ مذاق ہوا ہے یا سنجیدگی سے کچھ کہا گیا ہے۔'' فریدہ، زرینہ کے دہرائے خضر کے مذاق کو انجوائے کرتی ابھی بھی ہنس رہی تھیں۔

''آپ بہت بور ہیں۔ ابھی آپ کی جگہ کوئی زندہ دل بندہ ہوتا، اتنا انجوائے کر رہا ہوتا بارش کو۔'' اس کے کان سائیں سائیں کر

رہے تھے۔

''اب تو خرد آ گئی ہے۔اب تو اندر چلو میرے بھائی۔'' وہ لاؤنج کے سامنے سے ہٹا، وہ واپس مڑا۔

''باقی دوست بھی سب اچھے ہیں مگر خرد کی بات الگ ہے۔''

وہ گھر کے اندر داخل ہونے کے دوسرے راستے کی طرف تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا۔

''دیکھیں ایسے ہوتے ہیں زندہ دل لوگ۔'' اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

''پچھلے پندرہ منٹوں سے خضر صاحب نے ہمیں تمہارے انتظار میں یہاں باہر روک کر رکھا ہوا ہے۔''

وہ اندر داخل ہو گیا تھا، کسی بھی طرف دیکھے بغیر وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

''ہمارا تو ابھی بھی بچپن ہے، اس لیے ہم ابھی بھی ایکسائیٹڈ ہوتے ہیں۔'' وہ اپنے کمرے کے اندر آ گیا تھا۔

''اشعر بھائی، خرد سے اتنے بڑے ہیں، ان دونوں کے آپس میں مزاج کیسے ملتے ہوں گے۔''

موبائل، گاڑی کی چابی سب کچھ دور پھینک کر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''اب تو خرد آ گئی ہے، اب تو اندر چلو۔'' خرد سج سج کر قدم اٹھاتی اس طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو زور سے مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔

اس نے رات کے کھانے کے لیے انکار کہلوا دیا تھا۔ وہ کمرے کی تمام بتیاں بجھائے، کمرے میں مکمل اندھیرا کیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹوں بعد خرد واپس آئی تو اس کی بیل کی ٹک ٹک اسے اس کے کمرے میں داخل ہونے سے کافی دیر پہلے ہی سنائی دے گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں یوں بند کر لیں جیسے بہت گہری نیند سو رہا ہو۔ خرد نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ آوازوں سے اسے پتا چلا کہ اس نے وہیں کھڑے ہو کر اپنے دونوں پیروں سے سینڈل اتاری ہیں۔ اس کے بعد وہ بڑی آہستگی سے چلتی اس کے قریب آئی۔ اس کے قریب ہو کر، اس کی طرف جھکی وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی پھر بڑی آہستگی سے اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ یوں رکھا جیسے اسے بخار تو نہیں۔ وہ بالکل ساکت لیٹا سوتا ہوا بنا رہا۔ مسحور کن پرفیوم اور پھولوں کی رومان پرور خوشبوؤں میں بس، مہکتی، سجی سنوری، بہت دلکش بہت حسین اس کی یہ بیوی جو اس کے لیے صرف ایک بیوی سے بھی بہت بڑھ کر اس کی محبت بھی تھی، اس کی محبوبہ بھی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اپنے قرب سے اپنی خوشبو سے اس کے اندر کوئی نرم اور لطیف جذبات نہ جگا پائی، بلکہ اس کا دل چاہا وہ ہاتھ سے دھکا دے کر اسے اپنے پاس سے ہٹا دے، بالکل دور ہٹا دے۔ وہ اس پر جھکی ہوئی تھی اور اس پل اس کی یہ قربت، اپنے اتنے قریب اس کی موجودگی اسے انتہائی ناقابل برداشت لگ رہی تھی، پھر اسے گہری نیند سوتا سمجھ کر وہ اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ دس منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے اور میک اپ و جیولری سے خود کو آزاد کر کے واپس کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے آ کر اس کے برابر کچھ فاصلے پر لیٹ گئی تھی۔ صاف ایک ہاتھ جتنا فاصلہ تھا، وہ چاہتا تو لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس، اپنے قریب کھینچ کر اس فاصلے کو ایک پل میں مٹا سکتا تھا مگر وہ اس فاصلے کو مٹا نہیں سکا تھا، وہ اس پوری رات

جاگتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

خود کو پرسکون اور نارمل کرنے کے لیے صبح وہ جاگنگ اور ایکسر سائز کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ سیاہ نائٹی میں جیولری اور میک اپ کے بغیر بھی وہ اتنی ہی حسین لگ رہی تھی، جتنی کل فیروزی لباس میں لگ رہی تھی۔

وہ واپس آیا تو تب بھی سو رہی تھی۔ صبح کی تازہ ہوا، جاگنگ، ایکسر سائز کسی بھی چیز نے اسے سکون نہیں دیا تھا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تب وہ اٹھ چکی تھی۔ تولیے سے بالوں کو خشک کرتے وہ اس پر نگاہ ڈالے بغیر اپنی وارڈ روب کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے آج پہننے کے لیے سوٹ کا انتخاب کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے، بڑے مصروف ہیں، ہم سے بات ہی نہیں کر رہے۔'' وہ ہنستی مسکراتی ہمیشہ جیسے ہی انداز میں بات کرتی، اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کی ہر کیفیت سے انجان، اس کے اندر اس وقت کیا کچھ ہے، اس سے بالکل بے خبر۔

''کل رات مجھے لینے کیوں نہیں آئے تھے؟ نیاز کو دیکھ کر مجھے اتنی فکر ہوگئی تھی کہ ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ نہیں آئے۔ گھر واپس آ کر آپ کو سوتے دیکھ کر تو میں اور بھی ڈر گئی تھی کہ خدانا خواستہ کہیں طبیعت تو خراب نہیں۔''

''مجھے نیند آ رہی تھی۔'' خود پر جبر کر کے اس نے بمشکل اس کے سوال کا انتہائی مختصر جواب دیا، اس کے مزید نزدیک ہو کر اس نے خوب گہری سانس اپنے اندر کھینچ کر جیسے کوئی خوشبو اپنے اندر اتاری۔

''آپ کے اس آفٹر شیو کی خوشبو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔'' وہ فوراً اس سے کچھ دور ہٹا، اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر اس نے فوراً ہی بغیر کسی توجہ کے ایک ہینگر باہر نکالا اور کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

سیاہ پینٹ اور گرے شرٹ پہنے وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکلا، وہ تب بھی اسی طرح نائٹی میں ملبوس اسی لاپرواسے انداز میں کمرے میں موجود تھی۔ یونیورسٹی میں اس کی کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ وہ فارغ تھی۔ اپنی باقی تیاری تیز رفتاری سے چند منٹوں میں مکمل کرنے کے بعد اب وہ بریف کیس بیڈ پر رکھے اس میں اپنی فائلیں رکھ رہا تھا۔ وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کتنے دنوں سے ہم لوگ ایک ساتھ کہیں باہر نہیں گئے۔ آج لنچ کہیں باہر کریں، کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں۔''

''میں آج بہت بزی ہوں۔'' اس نے فائل کو بریف کیس میں پٹخا۔

''ہاں بھئی، آپ بزی لوگ ہیں۔ فارغ تو بس ہم ہیں۔'' وہ اس کے لہجے میں موجود سرمہری اور تلخی کا برا مانے بغیر بولی۔

''اچھا پھر ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔ کینڈل لائٹ اور پھر بہت سوفٹ سوفٹ میوزک سنتے لانگ ڈرائیو۔ ایک پرفیکٹ رومینٹک ایوننگ۔'' وہ بے تکلفی سے اس کے ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھ کر بولی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے باہر نکالا اور پھر بہت سخت اور بے مہر سے لہجے میں بولا۔

''مجھے آفس جلدی پہنچنا ہے۔ اس وقت ان فضول باتوں کے لیے میرے پاس ہرگز کوئی فرصت نہیں ہے'' مگر وہ ابھی بھی یا تو اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس نہیں کر پائی تھی یا اگر کر لیا تھا تو اسے دانستہ نظر انداز کر رہی تھی، تب ہی تو خود سپردگی کے سے انداز میں اس نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا اور بڑے ناز اور حق سے بولی۔

''میں کچھ نہیں جانتی، مصروف ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے تو بس آج آپ کے ساتھ ڈنر کرنے کہیں باہر جانا ہے پھر میں ایگزامز میں بزی ہو جاؤں گی۔ تب اگر آپ مجھ سے کہیں چلنے کے لیے کہیں گے تو میں بالکل نہیں جاؤں گی۔''

اس نے شدید غصے کے عالم میں ایک جھٹکے سے اس کا سر اپنے شانے پر سے ہٹایا۔ ''یہ چونچلے ہر وقت اچھے نہیں لگتے ہیں خرد! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے، ایک موقع ہوتا ہے۔'' وہ سخت اور سرد لہجے میں بے زاری سے بولا۔

''اشعر!'' وہ حیرت سے آنکھیں وا کیے اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی جس نے کبھی سختی سے بات نہ کی ہو، اس کا یہ انداز۔

وہ اتنی دیر سے خرد پر ضبط قائم رکھ کر خود کو کچھ بھی بولنے سے روکتا رہا تھا مگر خرد ہی نے اپنے بے وقت کے چاؤ چونچلوں سے اسے بولنے پر مجبور کیا تھا۔

''ہر وقت کا یہ بچپنا اور تھرڈ کلاس رومینٹک حرکتیں اچھی نہیں لگتی ہیں خرد! شوہر کا کس وقت کیسا موڈ ہے، بیوی میں اتنا سینس ہونا چاہئے کہ اس کے موڈ کو سمجھ سکے۔'' اس کا انداز ہتک آمیز اور بہت برا تھا اس نے بریف کیس پر زور سے ہاتھ مار کر اسے بند کیا اور جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیڈ پر جس جگہ اس کے پاس آ کر بیٹھی تھی، اسی جگہ، اسی زاویے سے بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھی اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ آفس آ گیا تھا۔ اپنے سخت لفظ، اپنا ہتک آمیز انداز اب اسے بری طرح مضطرب اور پریشان کر رہا تھا۔ وہ اس کے رویے سے ہرٹ ہوئی ہے، وہ روئی بھی ہو گی، وہ جانتا تھا مگر پھر بھی اس نے گھر پر فون نہیں کیا۔ شام میں آفس سے سیدھا گھر آنے کے بجائے وہ ہوٹنگ کے لیے چلا گیا۔ رات کا کھانا اس نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ باہر کھایا۔ اس کی اس ایک سالہ شادی شدہ زندگی کے ابتدائی ایام کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا جب وہ آفس کے بعد گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گھر سے باہر وقت گزار دینا چاہتا تھا۔ وہ رات پونے بارہ بجے گھر واپس آیا تھا۔

پورچ میں لا کر گاڑی روکتے وہ اسے ٹیرس پر کھڑی نظر آئی۔ بالکل اکیلی اور خاموش کھڑی وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر گیا اور پھر ٹیرس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر پورچ سے گزرتا چلا گیا۔ درمیانی تمام راستے عبور کر کے وہ اندر آ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آیا تو وہ بھی کمرے میں آ چکی تھی۔ وہ دروازے ہی پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی، وہ اسے نظر انداز کر کے بریف کیس، گھڑی اور موبائل میز پر رکھنے لگا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے خود بات کرنے کا آغاز کیا۔ شاید پچھلے چند سیکنڈز اس نے اشعر کی گفتگو کی پہل کرنے کی امید میں

گزارے تھے۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے چلتے چلتے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''کھانا لاؤں؟''

''نہیں۔'' وہ باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر نکلا تو وہ بیڈ پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے بجائے سونے کے لیے بیڈ پر آنے کے وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک پل میں وہ کمرے سے باہر تھا۔ سیدھا چلتا وہ کوریڈور کا آخری کمرہ جو اس کی اسٹڈی تھا، وہاں آ گیا۔

وہ وہاں میز پر بظاہر چند فائلیں اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا مگر درحقیقت اس کا دھیان وہاں موجود کسی بھی چیز پر نہیں تھا۔ اسے وہاں بیٹھے آدھا گھنٹہ ہونے والا تھا۔ جب اس نے اسٹڈی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس نے سر گھما کر پیچھے نہیں دیکھا۔ وہ بدستور فائل پر نظریں مرکوز کیے رہا۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چند منٹ وہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔

''آپ کو کیا ہوا ہے؟ مجھ سے کس بات پر ناراض ہیں؟ میں نے کیا کیا ہے، مجھے بتائیں تو سہی؟'' اس نے اس کی بھرائی آواز سنی۔

''کچھ نہیں ہوا ہے، مجھے اپنا کام کرنا ہے۔ کچھ دیر بالکل اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے خشک اور سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔

''کیا بات ہوئی ہے، مجھے بتائیں تو سہی پلیز۔ کل جب میں ندرت کے گھر گئی تو سب کچھ بالکل ٹھیک تھا پھر؟ میں ندرت کے ہاں سے لیٹ واپس آئی تھی۔ کیا اس بات پر ناراض ہیں؟ لیکن میں اتنی لیٹ تو نہیں آئی تھی، صرف ساڑھے بارہ ہی تو بجے تھے۔ شادی بیاہ کے فنکشنز میں عموماً اس سے بھی زیادہ دیر لگ جاتی ہے اور میں آپ کی پرمیشن سے وہاں گئی تھی۔ اگر آپ منع کرتے، میں ندرت کی انگیج منٹ میں کبھی نہیں جاتی۔ آپ مجھے جہاں جانے کو منع کریں گے، میں وہاں زندگی بھر نہیں جاؤں گی۔'' آنسوؤں کو پیتے وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''جب تم سے کہیں پر کچھ غلط ہوا ہی نہیں ہے تو بے کار میں کیوں ایکسکیوز دے رہی ہو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ اور مجھے بھی میرا کام کرنے دو۔ جب مجھے نیند آئے گی، میں کمرے میں آ جاؤں گا اور اب پلیز یہاں کھڑے ہو کر یہ مظلومانہ سے ڈائیلاگز بول کر میرا وقت ضائع مت کرو۔ میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔''

اس کا سرد لہجہ قطعیت بھرا اور دو ٹوک تھا۔ وہ اب یہاں مزید ایک سیکنڈ بھی اس کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا، یہ تاثر لیا ہوا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے پلٹ گئی تھی اور اس کے جانے کے بعد وہ سر دونوں ہاتھوں میں دے کر شدید بے قراری کے عالم میں بیٹھا تھا۔ پوری رات یونہی بیٹھے گزار دینے کے بعد وہ رات کے آخری پہر کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ کمرے کی لائٹس بند تھیں۔ وہ خاموشی سے بیڈ کے دوسرے کونے پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ اس کے مخالف سمت کروٹ لے کر لیٹا ہوا تھا پھر بھی جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ پہلی بار ان آنسوؤں کو صاف کرنے کے لیے اس کے ہاتھ نہیں اٹھ سکے تھے۔ صبح وہ متورم چہرہ اور بے تحاشا سرخ آنکھیں لیے خاموشی سے اسے تیار ہوتا دیکھتی

رہی۔ آج اس نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تیار ہونے کے بعد اسے خدا حافظ کہنا تو کیا اس کی طرف ایک نگاہ تک ڈالے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ فریدہ کی وجہ سے ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ تو گیا تھا مگر ناشتے کی اسے بالکل خواہش نہیں تھی۔

''کیا ہوا خرد نہیں آئی؟'' فریدہ نے خرد کی غیر موجودگی پر فوراً استفسار کیا۔

''وہ سو رہی ہے۔'' اپنے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے اس نے جھوٹ بولا۔

''پڑھتی رہی ہوگی رات میں دیر تک۔ پیپرز کا خوف تو اس نے اپنے اوپر کافی ٹھیک ٹھاک سوار کر رکھا ہے۔'' وہ جوس کا گھونٹ لیتے مسکرا کر بولیں۔ اس نے جواباً محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ انہوں نے اسے بغور دیکھا جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہا ہو۔

''کوئی اور بات تو نہیں ہے؟'' فریدہ نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ قدرے تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''تم دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔ مجھے تم کل سے بہت چپ چپ لگ رہے ہو۔'' ان کے انداز میں فکر اور تشویش تھی۔ وہ ان کی تشویش دور کرنے کو زبردستی مسکرایا۔

''کوئی جھگڑا نہیں ہوا' سب ٹھیک ہے۔ خرد اپنے ایگزیمز کی تیاری میں بزی ہے' اس لیے اس کا سونے' جاگنے کا روٹین معمول سے ہٹ گیا ہے اور میں چپ نہیں بلکہ کچھ آفیشل کاموں میں بہت زیادہ مصروف ہوں۔ اچھا ممی! میں کل دبئی جا رہا ہوں۔'' ان کی بات کا جواب دیتے اس نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر کے انہیں دبئی روانگی سے آگاہ کیا۔ دبئی اس کا معمول کا دفتری کام تھا۔ دبئی اپنے برانچ آفس وہ ہر ایک ڈیڑھ مہینے میں ایک بار تو جایا ہی کرتا تھا۔ وہاں کچھ میٹنگز تھیں' کچھ دوسرے اہم آفیشل کام تھے جن کی انجام دہی کے لیے اس کی وہاں موجودگی ضروری تھی۔

''واپسی کب ہوگی؟'' اس کی موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کامیاب ہو گئی تھی۔

''دیکھیں شاید دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔''

''ہاں' بس اس سے زیادہ وقت مت لگانا۔ تمہاری اور خرد کی شادی کی پہلی سالگرہ آ کر یونہی خاموشی سے گزر گئی۔ میں سوچ رہی ہوں' لیٹ ہو گیا تو کیا ہوا۔ تم لوگوں کی ویڈنگ اینی ورسری کو ایک اچھی شاندار سی پارٹی کر کے ذرا دھوم دھام سے ہم اب سیلی بریٹ کر لیتے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی کے بعد سے گھر میں بالکل سناٹا اور خاموشی ہے۔ خوشی کی کوئی تقریب اتنے دنوں بعد گھر میں ہوگی تو یہ سناٹا بھی ٹوٹے گا۔''

اس نے بے دلی سے بغیر کوئی جوابی تبصرہ کیے ان کی باتوں پر محض سر ہلا دیا تھا۔ جن الجھنوں اور بے قراریوں میں اس وقت وہ گھرا تھا' ایسے میں اسے کوئی بھی بات نہ تو اچھی لگ رہی تھی اور نہ ہی کسی بات پر کچھ کہنے کو جی چاہ رہا تھا۔

آفس میں ایک بہت مصروف دن اس کا منتظر تھا۔ ہر کام اپنے مخصوص پروفیشنل انداز میں نمٹانے کے باوجود وہ اندر سے خود کو بڑا خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بے چین تھا' وہ مضطرب تھا۔ اندر ایک جنگ سی چھڑی تھی۔ دل کا ایک گوشہ صرف اور صرف خرد کو پکار رہا تھا۔

صرف اور صرف اس کا نام لے رہا تھا اور دوسرا اس سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔

وہ آج بھی آفس سے دیر ہی سے کھانا باہر کھا کر گھر واپس آیا تھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ فریدہ اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو خرد دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیڈ پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ بالکل خاموش اور تنہا بیٹھی تھی۔

پرسوں اس کا پہلا پیپر تھا اور وہ بجائے پیپر کی تیاریوں کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں اس نے خرد کے ہاتھ میں کوئی کتاب، کوئی نوٹ بک نہیں دیکھی تھی۔ اسے اپنے گرد بہت سارا پھیلاوا کر کے پڑھنے کی عادت تھی اور رائٹنگ ٹیبل جس طرح سمٹی ہوئی اور بالکل خالی پڑی تھی، اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ آج دن بھر بھی اس نے کچھ نہیں پڑھا ہے۔ وہ خود کو گھر میں بھی بہت اچھی طرح سجا سنوار کر رکھتی تھی مگر اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک لمحے میں یہ دیکھ لیا تھا کہ اس نے آج بھی وہی لباس پہنا ہوا ہے جو کل پہنا ہوا تھا۔ کل سے پہنا وہ کاٹن کا لباس آج بہت زیادہ شکن آلود ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ رویا ہوا، بہت بجھا بجھا اور مرجھا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھی ہوئی تھی مگر وہ اسے خود سے میلوں دور نظر آ رہی تھی۔ اس کی صبح سویرے فلائٹ تھی، اس لیے وہ ابھی سے ہی اپنی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنی جلدی جلدی اور اتنا زیادہ سفر کیا کرتا تھا کہ پاسپورٹ سمیت اس کی تمام چیزیں ہر وقت تیار ہوتی تھیں۔ دبئی تو خاص طور پر آفس کے کاموں سے اس کا زیادہ ہی جانا لگا رہتا تھا۔ وہاں کا برانچ آفس کاروباری لحاظ سے اس کے لیے زیادہ اہم بھی تھا، وہاں ان کی کمپنی کے کئی اہم پروجیکٹس چل رہے تھے۔ اسی کاروباری اہمیت کے پیش نظر بصیرت حسین کے زمانے ہی سے ان کا وہاں اپنا ذاتی ایک اپارٹمنٹ بھی تھا۔

اس نے اپنے بڑے براؤن کلر کے بریف کیس میں اپنی فائلز وغیرہ رکھنی شروع کریں۔ اتنی کثرت سے بزنس ٹریولنگ کے سبب وہ اپنے ساتھ سامان کا بکھیرا ہمیشہ کم سے کم ہی رکھنا پسند کرتا تھا۔ عموماً اس کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ اس کی ساتھ لے جانے کی اشیاء بریف کیس کے ساتھ بہت سے بہت ایک اور چھوٹے بیگ کے اندر سما سکیں۔

وہ اسے سامان رکھتے خاموشی سے دیکھ رہی تھی، اس کے دبئی جانے کا یہ پروگرام اچانک کل ہی بنا تھا اور اس نے خود تو اسے اپنے جانے کا نہیں بتایا تھا اگر فریدہ سے اسے پتا چل گیا ہو تو بات دوسری تھی۔ اس کے موبائل پر اس کے ایک کاروباری دوست حسام نیازی کی کال آئی جو اپنے کسی کام کے سلسلے میں کل اس سے ملنے اس کے آفس آنا چاہ رہا تھا۔

''کل صبح تو میں دبئی جا رہا ہوں۔'' وہ اپنے لیپ ٹاپ کو چیک کر رہا تھا۔ ''وہاں سے واپس آ جاؤں پھر ملتے ہیں۔'' خرد کے چہرے پر آتے تاثر نے اسے بتایا کہ وہ اس کے جانے سے آگاہ نہیں تھی۔

خرد بیڈ پر سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی چند منٹوں بعد باتھ روم کا دروازہ واپس کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر اس طرف نہیں دیکھا، وہ بدستور لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف رہا۔ دروازہ کھلنے کے بعد وہ اندر نہ آئی تو لاشعوری طور پر اس کی نظر اٹھی۔ وہ اسے باتھ روم کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ کسی چیز کو پکڑنا چاہ رہی تھی۔ شاید

دروازے کو شاید دیوار کو۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ وہاں گر پڑے گی۔ وہ خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہیں پایا۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آیا۔ اس کی کمر کے گرد ہاتھ رکھ کر اس نے اسے فوراً سہارا دیا۔

''کیا ہوا......؟''

''کچھ نہیں۔'' سر کو دائیں بائیں زور سے جھٹکتے اس نے کہا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے جواب دیا پھر اپنے گرد پھیلے اس کے ہاتھ کو آہستگی سے خود سے ہٹایا۔ وہ بیڈ کی طرف جانا چاہتی تھی۔ اس کے چلنے' قالین پر پاؤں رکھنے کا انداز بالکل بھی متوازن نہیں تھا۔ سنبھل سنبھل کر وہ اس طرح قدم اٹھا رہی تھی جیسے اسے ابھی بھی چکر آ رہا ہو۔ بہت آہستہ آہستہ' جیسے شدید نقاہت اور کمزوری کے عالم میں اپنی تمام طاقت بروئے کار لا کر چلنے کی کوشش کی۔ وہ باتھ روم کے دروازے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہا وہ اسے سہارا دے کر بیڈ تک پہنچا دے مگر اس نے خود پر سے اس کا ہاتھ جس طرح دور ہٹایا تھا وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس سے خفا تھی۔ وہ کئی منٹ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بیڈ پر جا کر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ پل وہ بیڈ پر یونہی بیٹھی رہی جیسے اپنی سانس بحال کر رہی ہو پھر وہ خاصے تھکے تھکے سے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ لیٹنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے اوپر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لیا' وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر باتھ روم کا کھلا دروازہ اور لائٹ بند کر کے وہ کمرے کے دوسری طرف سوئچ بورڈ کی طرف آ گیا۔ اس نے تمام لائٹس آف کر دیں۔ اب کمرے میں صرف نائٹ بلب روشن تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ بیڈ پر سے ہٹایا۔ اسے میز پر رکھ کر وہ بھی بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

وہ دونوں بیڈ کے بالکل الگ الگ کناروں پر ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر لیٹے ہوئے تھے' دونوں میں سے ایک دوسرے کے مخالف سمت کروٹ کسی نے نہیں لی ہوئی تھی' اگر وہ بغیر کروٹ کے بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا تو وہ بھی بازو آنکھوں پر رکھے بالکل سیدھی لیٹی تھی۔ دونوں جاگ رہے تھے۔ پوری رات ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی کروٹ نہیں لی تھی۔ نہ ایک دوسرے کی طرف نہ ایک دوسرے کی مخالف سمت جیسے آپ کسی کے قریب بھی نہ جانا چاہیں اور اس سے دور بھی نہ ہونا چاہیں۔

وہ کل کی طرح آج اس سے منہ پھیر کر کروٹ بدل کر لیٹ نہیں پایا تھا لیکن اس کی طرف بھی رخ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی چیز مانع تھی جو خود کی طرف بڑھنے' پیش قدمی کرنے سے روک رہی تھی۔ کتنی بار اس کے ہاتھوں نے اسے تھامنے کے لیے' اسے اپنے نزدیک کرنے کے لیے اٹھنا چاہا۔ اور ہر بار اپنے ہاتھوں کو اٹھنے سے پہلے ہی اس نے روک لیا۔ پوری رات دونوں میں سے کوئی بھی ایک پل کے لیے بھی سویا نہیں تھا۔

اسے گھر سے جلدی نکلنا تھا۔ وہ پانچ بجے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیڈ پر آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی تیاری کرتا رہا۔ وہ تیار ہو کر بریف کیس ہاتھ میں لیے کمرے سے نکلنے لگا تب دروازے پر ہاتھ رکھے وہ مڑ کر ایک نظر اسے دیکھنے سے خود

کوروک نہیں پایا۔

''میں جارہا ہوں۔آج ڈاکٹر کو ضرور دکھانا۔'' دروازے کی ناب کو تھامے اس نے اس سے کہا۔اس کے الفاظ اور لہجے میں بہت تکلف بہت فاصلہ تھا۔

جواب میں اس نے بغیر آواز کے صرف لب ہلا کر اسے ''خدا حافظ'' کہا۔وہ فوراً کمرے سے نکل گیا تھا۔

''ممی! خرد کی طبیعت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔رات اسے کافی ویکنس ہورہی تھی' شاید چکر بھی آرہے تھے۔میں نے کہا تو ہے لیکن وہ بہت لاپرواہ ہے' خود سے شاید ہی ڈاکٹر کے پاس جائے۔آپ پلیز آج اسے کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جایئے گا۔''

وہ ماں کو خدا حافظ کہنے آیا تو یہ بات بے ساختگی میں اس کے لبوں سے نکلی۔وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو ایک ہی وقت میں دو حصوں میں بٹ رہا تھا۔اس پر یہ غصہ بھی تھا۔اور اس کی فکر بھی تھی۔

''میں لے جاؤں گی بیٹا' لیکن تم کوئی ٹینشن یا فکر ساتھ لے کر مت جاؤ۔ایگزیمز اور پڑھائی وڑھائی کے چکر میں لگ کر اپنی ڈائٹ کا خیال کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اس لڑکی نے۔کل بھی ناشتے میں' میں نے زبردستی جوس اور آملیٹ لینے پر مجبور کیا تھا ورنہ اس کا وہی مخصوص ایک ٹوسٹ اور ایک کپ چائے والا ناشتہ۔اب ذرا اور سختی کر کے اس کا کھانا پینا ٹھیک کرواؤں گی۔ڈاکٹر سے کچھ ملٹی وٹامنز وغیرہ اس کے لیے لکھوا لوں گی دیکھنا تمہاری واپسی تک ان شاءاللہ اس کی ساری ویکنس وغیرہ دور ہو جائے گی اور خرد تمہیں بالکل فٹ فاٹ ملے گی۔''

فریدہ نے جواباً اسے مطمئن کیا تھا۔باہر ڈرائیور اسے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے گاڑی کے پاس اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔وہ پورچ میں آ گیا۔گاڑی کی طرف قدم اٹھاتے بالکل بے اختیاری میں اس نے نظریں اٹھا کر اوپر ٹیرس کی طرف دیکھا' مگر وہ وہاں نہیں تھی۔وہ گاڑی کے قریب آ گیا۔گاڑی کا دروازہ کھولتے اس نے پھر اوپر دیکھا۔اس کی آس پھر ٹوٹی وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔گاڑی ایئرپورٹ کی طرف جاتے راستے پر رواں دواں تھی اور وہ بہت اداس اور بہت مضطرب اپنے گھر سے دور ہوتا چلا جارہا تھا۔کثرت سے سفر کرنا اس کے کاروباری معاملات کا حصہ تھا مگر اب کے پتا نہیں دل اتنا بے قرار کیوں تھا۔اب کی بار دل کو نجانے کون سا دھڑکا' کون سا خوف لاحق تھا۔

☆......☆......☆

''کیسی ہیں ممی؟ کیا ہورہا ہے؟'' اشعر نے ماں سے پوچھا۔اس کی فون پر فریدہ سے بات ہورہی تھی جو ان دنوں بالاکوٹ میں تھیں۔وہ اس وقت اپنے آفس میں تھا اور وہیں سے اس نے انہیں فون کیا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔ہم نے یہاں ناردرن ایریاز اور آزاد کشمیر کے کئی علاقوں میں فری میڈیکل کیمپس لگائے ہوئے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو مفت علاج کے ساتھ فری میڈیسنز بھی فراہم کررہے ہیں۔دوردراز کے جن علاقوں میں ہم کیمپس نہیں بھی لگا پائے' وہاں سے بھی لوگ ہمارے پاس علاج کے لیے یہاں آرہے ہیں۔جن عورتوں اور بچوں کے ہاتھ' پاؤں زلزلے میں ضائع ہوگئے ان کے لیے ہم کوشش کررہے ہیں مصنوعی اعضاء کی مفت فراہمی کا انتظام بھی کرسکیں۔بس کیا بتاؤں بیٹا' زلزلے کے بعد اب تک بھی یہاں حالات سنبھلے نہیں

ہیں۔ چھوٹے بچوں کی حالت تو خاص طور پر بہت خراب ہے ان بے چاروں کو نہ ڈھنگ کی غذا مل رہی ہے نہ میڈیکل کی سہولت جن کے ماں' باپ مارے گئے ان کو تو چھوڑو جن کے والدین حیات ہیں ان معصوموں کی حالت بھی کچھ خاص اچھی نہیں۔ ظاہر ہے جب ان کے گھر بار تباہ ہوگئے۔ باپوں کے روزگار' کاروبار سب ختم ہوگئے تو بچوں کو سر چھپانے کو چھت اور پیٹ بھرنے کو کھانا کہاں سے ملے گا۔ ابھی بھی کتنی جگہوں پر یہ مجبور لوگ کیمپوں اور عارضی ٹھکانوں پر سر چھپانے پر مجبور ہیں۔ ان کے پاس اپنے گھر نہیں۔ گورنمنٹ بہت کچھ کر رہی ہے اور بہت ساری لوکل اور انٹرنیشنل ریلیف آرگنائزیشن بھی بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ مگر ہم میں سے ہر ایک فرد جب تک اس کام میں خود بھی پوری طرح شریک نہیں ہوگا ان تباہ حال لوگوں کی زندگیاں پہلے جیسی نہیں ہوسکیں گی۔ صرف خوراک اور دوائیں ہی نہیں بلکہ یہاں ملازمت کے مواقع پیدا کرنے ہوں گے تاکہ جن کے کاروبار ختم ہوئے ملازمتیں جاتی رہیں۔ ان کے لیے روزگار کے ذرائع پیدا کیے جاسکیں اسکولز وغیرہ کی ری کنسٹرکشن کرنی ہوگی۔

لیکن سب کچھ نارمل ہونے میں ابھی کئی سال لگیں گے۔ تباہی بھی تو کوئی چھوٹی موٹی نہیں اتنی بڑی آئی تھی۔ خیر تم سناؤ' کیسے ہو؟ میرے پیچھے اور لاپروا ہوگئے ہوگے اپنے کھانے پینے سے؟''

اپنی مصروفیات کا احوال سناتے انہوں نے اس کی خیریت خاصی فکرمندی سے پوچھی تو وہ ان کی فکرمندی پر ہنس پڑا۔ واقعی بچہ کتنا بھی بڑا ہو جائے ماں کے لیے ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے اور اس کی ماں تو وہ تھیں جو بالکل انجان اور پرائے بچوں کے دکھوں پر دکھی ہوتی خدمت خلق کے کام انجام دیتی تھیں اور اس وقت بھی ایسے ہی کار خیر میں مصروف تھیں۔

آٹھ اکتوبر 2005ء کو جب زلزلہ آیا تب وہ اور ان کی این جی او وہاں ادویات' خوراک اور دوسرا امدادی سامان لے جانے والے اولین لوگوں میں شامل تھے۔ وہ یہ سارے کام شہرت' ناموری یا اخبارات میں اپنی تصاویر شائع کروانے کے لیے نہیں بلکہ واقعی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کرتی تھیں۔ وہ واقعی بے حد ہمدرد فطرت کی مالک تھیں۔ وہ ماں کی ہمدرد طبیعت اور دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھنے کی ان کی عادت پر ہمیشہ کی طرح فخر میں مبتلا ہوا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ممی! آپ میری فکر مت کریں۔''

وہ انہیں خوشی کی یہ خبر دینا چاہتا تھا۔ اپنی خوشی ان کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا مگر انہیں گہرا صدمہ پہنچے گا۔ پہلے یہ جان کر کہ ان کی ایک پوتی ہے اور ان کی بہو نے اسے چار سالوں تک ان سے چھپائے رکھا ہے۔ دوسرا مزید گہرا دکھ انہیں اس کی بیماری کے بارے میں جان کر پہنچے گا۔ جب تک حریم کی سرجری نہیں ہو جاتی اس وقت تک اسے کسی نہ کسی طرح ماں سے یہ ساری بات چھپا کر ہی رکھنا تھی۔

☆......☆......☆

''سر! خرد نے اپنی چھٹی بڑھوانے کے لیے اپلیکیشن بھجوائی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی بیٹی کی سرجری کے لیے ڈیٹ دے دی ہے۔ اسے بس اپنی بیٹی کی سرجری ہو جانے تک مزید چھٹی چاہیے۔'' لفافے میں بند خرد کی چھٹی بڑھوانے کی درخواست افشین نے ڈرتے ڈرتے

امجد قریشی کے سامنے رکھی۔ایک چھوٹی سی فرم جس کے مالک ومختار احمد قریشی تھے۔ابھی جن چھٹیوں پر وہ تھی' وہ امجد قریشی نے اسے بڑی مشکلوں سے اور بہت باتیں سنانے کے بعد دی تھیں اور وہ بھی بغیر تنخواہ کے۔اسے اچھا خاصا بے عزت کرنے کے بعد۔

''مسز خاور! آپ مس خرد سے میری طرف سے کہیے کہ وہ دو' چار ہفتوں کے لیے نہیں بلکہ قریشی اینڈ سنز سے ہمیشہ کے لیے چھٹی کر لیں۔'' امجد قریشی نے اپنے سامنے پڑی درخواست ہاتھ سے پرے دھکیلی۔

''سر! خرد کی مجبوری ہے۔اس کی بیٹی سخت بیمار ہے اس کی ہارٹ سرجری ہونی ہے۔''

''مسز خاور! یہ آفس میں نے خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کے لیے نہیں کھولا۔مس خرد کو میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ رعایت دے چکا ہوں۔آپ انہیں میری طرف سے پیغام پہنچا دیجیے کہ ان کی اب اس فرم میں مزید کوئی ضرورت نہیں۔میں ان کی خالی ہوئی پوسٹ کے لیے اس سنڈے کے اخبار میں ایڈ دے رہا ہوں۔''

بے لچک انداز میں انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔اور پھر فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔افشین انتہائی مایوسی اور دکھ کے عالم میں ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اپنے گھر سے دور' ملک سے دور' ایک دوسرے دیس میں شدید اضطراب کے عالم میں تھا۔دبئی کی اس پہلی رات' دن بھر کے تمام معمولات سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے اس نے گھر پر ماں کو فون کیا۔

''ممی! خرد کیسی ہے؟ آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں؟'' سلام دعا کے بعد اس نے فوراً پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔لے گئی تھی آج میں اسے ڈاکٹر شیراز کے پاس۔جو میں تم سے صبح کہہ رہی تھی وہی وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔آپ کی بہو کیا کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے؟ اب میں انہیں کیا بتاتی کہ میری بہو صاحبہ نے ایگزیمز اور پڑھائی کی ٹینشن سر پر بری طرح سوار کر رکھی ہے۔کمزوری ہوگئی ہے اسے' بی پی بھی لو تھا لیکن خدانا خواستہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ڈاکٹر شیراز نے کچھ ملٹی وٹامنز دی ہیں اور میں نے آج سے خرد کے کھانے پینے پر سختی شروع کی ہے' اسے وارننگ دی ہے کہ اگر اپنی صحت کا خیال نہیں رکھو گی تو سب پڑھائی وڑھائی بند۔''

انہوں نے اسے تفصیل سے جواب دیا۔

ان کا جواب سننے کے بعد اس نے طمانیت سے بھری ایک گہری سانس لی۔

''تم خرد کی طرف سے پریشان مت ہونا اشعر! اپنی بہو کا میں بہت اچھی طرح دھیان رکھ لوں گی۔تم بس بے فکر ہو کر اپنے سب کام نمٹاؤ۔'' وہ اس کی پریشانی کو بھانپ رہی تھیں تب ہی دوبارہ اطمینان دلانے والے انداز میں بولیں۔

اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ اتنا مضطرب اور بے چین کیوں ہے۔اس کی طبیعت کے متعلق اطمینان کر لینے کے باوجود دل کی بے اطمینانی ہنوز اپنی جگہ تھی۔اسے خود نہیں پتا تھا لیکن اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے سوتے جاگتے' اسے ہر پل ایک فون کال کا انتظار رہتا تھا۔شعوری

طور پر وہ جانتا تھا وہ اسے کال نہیں کرے گی۔ وہ اس سے ناراض تھی۔ پہلے وہ ملک سے یا شہر سے باہر کہیں جاتا تھا تو ان کی دن میں دو‘ دو‘ تین‘ تین دفعہ آپس میں بات ہوتی تھی اور اس بار اس سے بات کیے بغیر‘ اس کی آواز سنے بغیر اسے کتنے دن ہو گئے تھے اور اپارٹمنٹ آ کر بھی وہ بہت بے چین اور بے قرار تھا۔ وہ واپس آتے ہی جلدی سونے لیٹ گیا تھا مگر دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند آنکھوں میں اتر نہیں رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا تھا اور اس کا ذہن لایعنی سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔

''مجھ سے ناراض ہو کر سوئے تھے‘ مجھ سے ناراض ہو کر آفس مت جایئے گا۔ ورنہ اپنی زندگی کے اس بدترین دن کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

''آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ کے لیے بہت خاص ہوں‘ بہت اہم ہوں۔''

''خرد'' وہ یک دم بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''اشعر! اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بعد خرد کا بہت خیال رکھنا بیٹا! خرد ابھی کم عمر بھی ہے اور بہت سادہ اور معصوم بھی۔ تم سمجھ دار ہو‘ تم میچور ہو‘ اپنے اور خرد کے رشتے کو اچھی طرح نبھانے کے لیے تمہیں میچورٹی کا ثبوت دینا ہو گا۔'' اس کے کانوں میں باپ کی آواز گونجی۔

''دوبارہ کبھی مجھ سے اس طرح ناراض مت ہویئے گا۔ ابھی جب مجھ سے ناراض تھے‘ میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے‘ مجھ سے بات نہیں کر رہے تھے تو مجھے اتنی وحشت ہو رہی تھی‘ ایسا لگ رہا تھا میری زندگی میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا ہے۔'' جس وحشت کی وہ بات کر رہی تھی‘ وہی اندھیرا تو اسے اپنی زندگی میں پھیلتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا۔ اس کی انگلیاں بے تابی سے کال ملا رہی تھیں۔ کال مل گئی تھی‘ بیل جا رہی تھی اور پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''اشعر!'' ہیلو کہنے کے بجائے اس نے اس کا نام لیا۔

''خرد'' وہ بھی جواب میں اس کا نام لینے کے سوا فوراً کچھ نہ کہہ سکا۔

''آپ کیسے ہیں؟'' رات کے اس پہر وہ جاگ رہی تھی۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کوئی گلہ نہیں‘ کوئی شکوہ نہیں‘ کوئی ناراضی‘ کوئی خفگی نہیں۔ اس کے کسی رویے کی کوئی وجہ پوچھے بغیر وہ اس سے اس کی خیریت پوچھ رہی تھی۔ ہاں وہ وہی تو تھی‘ اس کی خرد‘ اس کی بہت اپنی خرد۔

''تم کیسی ہو؟'' اگر وہ سامنے ہوتی تو وہ اسے گلے سے لگا لیتا‘ اپنے سینے میں چھپا لیتا۔ پر اس وقت وہ کیا کہے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کب واپس آئیں گے؟'' اسے ایسا لگا جیسے وہ رو رہی ہے۔

''میں جلدی‘ بہت جلدی واپس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کر رہی ہو؟''

''ہاں‘ بہت بہت زیادہ انتظار کر رہی ہوں۔ بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں‘ پلیز جلدی واپس آ جائیں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔''

''میں بہت جلدی واپس آ ؤں گا۔ مجھے بھی تم بہت یاد آ رہی ہو مجھے بھی تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔''

وہ جس والہانہ پن' جس بے قراری سے اس سے اس وقت بات کر رہا تھا' آج سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

''آپ جب واپس آئیں گے' میں آپ کو ایک بات بتاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کیا؟'' اس نے بے تابی سے فوراً پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ جب واپس آئیں گے تب۔ فون پر نہیں بتاؤں گی۔'' اسے یوں لگا جیسے وہ روتے روتے شاید مسکرائی ہے۔

''خرد! میں نے اس روز تمہیں بہت غلط باتیں بولی تھیں' تم مجھ سے ناراض ہو ناں؟''

''نہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''خرد! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو' تم میرے لیے بہت خاص ہو' یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا خرد۔''

یہ تجدید محبت کر کے اس نے فوراً ہی خدا حافظ'' کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ خرد کی طرح اس کے اپنے لہجے میں بھی ایک نمی سی شامل ہونے لگی تھی۔ جن کاموں کے لیے وہ دبئی آیا تھا' ابھی ان سب کو نمٹانے کے لیے اس کا یہاں مزید ایک ہفتے کا قیام لازمی تھا۔ مگر اب اسے فوراً واپس جانا تھا۔ آنے سے پہلے جو اس کے ساتھ زیادتی کر آیا تھا' اپنی بھرپور محبت سے جلد از جلد ازالہ کرنا تھا۔

☆......☆......☆

''تم توصیف کے رشتے کے بارے میں سوچو تو سہی سارہ! کس چیز کی کمی ہے اس میں؟ اعلا تعلیم یافتہ ہے' کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہے' ہینڈسم ہے' لندن میں اس کا وہ اسٹیٹس اور لیونگ اسٹینڈرڈ ہے جو پاکستان میں بڑے بڑے جاگیرداروں کا نہیں ہوتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ اس کی اپنی خواہش ہے تم سے شادی کرنا۔''

زرینہ' سارہ کے پاس بیٹھی اسے پیار سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ بیڈ پر بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے چہرے پر کھیرے کا ماسک لگا رکھا تھا اور آنکھوں پر بھی کھیرے کے قتلے رکھے ہوئے تھے۔

''تمہارے ڈیڈی بھی توصیف کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے دوست کا بیٹا ہے' سالوں سے اسے جانتے ہیں۔'' سارہ بالکل خاموش لیٹی تھی۔ لیکن سابقہ تجربات کی روشنی میں زرینہ جانتی تھیں کہ وہ لیٹ کر ان کی بات نہیں سن رہی بلکہ اپنے ماسک کے سوکھنے کا انتظار کر رہی ہے۔

''توصیف تمہیں بہت پسند کرتا ہے سارہ! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ جب تم لندن میں پڑھ رہی تھیں اس کا تب سے تمہاری طرف بہت جھکاؤ ہے۔ شادی کا ایک وقت' ایک عمر ہوتی ہے بیٹا! آخر تم اس طرح اپنی زندگی کب تک برباد کرتی رہو گی۔''

آنکھوں پر سے کھیرے ہٹا کر وہ اٹھ بیٹھی' چہرہ بہت ہلکے ہاتھ سے تھپتھپا کر اس نے ماسک کا جائزہ لیا۔ پھر وہ بیڈ پر سے اٹھ گئی۔ وہ اب باتھ روم کی طرف جا رہی تھی۔

''سارہ! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' وہ باتھ روم کے دروازے پر جا کر رکی۔ اس نے ایک نظر مڑ کر ماں کو دیکھا۔

''میرا جواب آپ کو معلوم ہے۔ میرا جواب کل بھی یہی تھا۔ میرا جواب آج بھی یہی ہے۔ میرا جواب زندگی بھر یہی رہے گا۔ آپ یہ مڈل کلاس ماؤں کی طرح مجھے دولت اور اسٹیٹس کا لالچ مت دیا کریں۔ توصیف اخلاق جیسے بیسیوں لوگ مجھے صبح شام پر پوز کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی کسی امیر اور شاندار بندے سے شادی کرنا ہوتی تو یہ کام میں کافی پہلے کر چکی ہوتی۔ یہ بات آپ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ پھر بے کار میں ان فضول لوگوں کا میرے سامنے ذکر کر کے کیوں میرا اور اپنا موڈ خراب کرتی ہیں۔'' جواب دینے کے بعد وہ فوراً باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

زرینہ بے بسی اور لاچاری سے اپنی ضدی بیٹی کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ کیسے سمجھاتیں وہ اسے کہ اشعر کا انتظار بے کار ہے۔ خرد احسان کو اس کی زندگی سے نکلے ساڑھے چار سال ہو گئے ہیں۔ اگر وہ سارہ میں ذرا بھی دلچسپی محسوس کرتا تو ان کے اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ اسے دینے پر آمادگی کا کبھی تو مثبت جواب دیتا۔ زرینہ سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

☆......☆......☆

اور وہ واپس جا رہا تھا اپنے سب کاموں کو ادھورا چھوڑ کر۔ کراچی اپنے آفس میں بھی اس نے اپنی واپسی کی اطلاع اپنی سیکریٹری کو کر دی تھی تاکہ وہ اس کی تمام اپائمنٹس اور میٹنگز ری شیڈول کر سکے۔ گھر پر نہ اس نے اپنی واپسی کا بتایا تھا اور نہ ہی اس کا بتانے کا کوئی ارادہ تھا۔ فریدہ اور خرد یہ سمجھ رہی تھیں کہ ابھی وہ یہاں ایک ہفتہ مزید رہے گا۔

وہ خرد کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسے خرد کے چہرے کی وہ خوشی دیکھنی تھی جو اسے غیر متوقع اپنے سامنے پا کر اس کے چہرے پر بکھرنے والی تھی۔ دبئی میں اس آخری رات آفس میں اپنے کاموں کو بھگتا کر وہ اس کے لیے شاپنگ کرنے چلا آیا تھا۔ کل دوپہر کی اس کی فلائٹ تھی۔ اس نے خرد کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی' ان کی شادی کی سالگرہ گزر چکی تھی۔ فریدہ کا ایک زبردست سی پارٹی کرنے کا ارادہ تھا اور اس نے پروگرام بنایا تھا کہ اس پارٹی کے بعد وہ خرد کو اپنے ساتھ کہیں گھمانے لے جائے گا۔ ان دونوں کی شادی ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ وہ دونوں کہیں ہنی مون پر جا ہی نہ سکے تھے اور پھر سے ڈیڈی کے انتقال کے بعد جب تمام تر کاروباری ذمہ داریاں اس پر آئیں تو اسے اس بات کا نہ وقت مل سکا نہ ہی خیال آیا کہ وہ خرد کو ساتھ لے کر کسی خوبصورت جگہ پر لمبی چھٹیاں گزارنے چلا جائے۔

اب وہ اس چیز کو پلان کر رہا تھا کہ وہ واپس جا کر اپنی تمام مصروفیات کو کم از کم ایک مہینے کے لیے بالکل روک کر خرد کے ساتھ کسی اچھی سی جگہ خوب لمبی چھٹیاں گزارنے چلا آئے گا وہاں بس وہ دونوں ہوں گے اور تیسرا کوئی نہیں۔ وہاں سارا وقت ان کا اپنا ہوگا' کوئی کام نہیں' کوئی دوسری مصروفیت نہیں' صرف وہ دونوں اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور رفاقت۔ اس کے ذہن میں اٹلی' فرانس' اسپین' سوئٹزر لینڈ، نیوزی لینڈ کے بہت سے خوبصورت اور رومینٹک مقامات آ رہے تھے۔ مگر وہ اپنی نہیں خرد کی پسند کی جگہ پر اسے لے جانا چاہتا تھا۔

خرد کے ایگزیمز کا پورا شیڈول اسے رٹا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا شروع کے دو پیپر کے بعد تیسرے پیپر میں پانچ دن کا گیپ ہے۔

آج تو خرد کو گھر پر موجود ہونا ہی تھا۔ وہ ایئرپورٹ سے بہت ایکسائیٹڈ سا گھر پہنچا تو سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی لاؤنج میں فریدہ سے ملاقات ہوگئی۔ پرس کاندھے پر لٹکائے اور موبائل اور گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے وہ کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھیں۔ اشعر کو اتنا اچانک اور غیر متوقع سامنے پا کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔

''بس مجھے گھر کی بہت یاد آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کاموں کا کیا ہے یہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی ان سے خرد کے بارے میں بھی فوراً ہی پوچھا۔

''ممی! میں ذرا خرد سے مل لوں۔ کمرے میں ہی ہے ناں وہ؟'' وہ ماں سے معذرت کرتا اب اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔

''خرد یونیورسٹی گئی ہے بیٹا! صبح ناشتے کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ کہہ رہی تھی ندرت اور سامعہ کے ساتھ مل کر اسٹڈی کرنی ہے۔ پانچ دن کا گیپ ملا تھا ناں انہیں اگلے پیپر میں' تو تینوں فرینڈز ساتھ مل کر پیپر کی تیاری کر رہی ہیں۔ کل بھی خرد صبح ہی سے یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ ویسے اب شاید وہ واپس آنے والی ہوگی۔ کل بھی میرا خیال ہے وہ ساڑھے چار بجے واپس آ گئی تھی۔ صبح نیاز نے ڈراپ کر دیا تھا اسے' اس کے بعد اسے گاڑی سروس کرانے کے لیے لے جانی تھی۔ اپنے ساتھ موبائل لے گیا ہے' کہہ رہا تھا جب خرد بی بی فارغ ہو جائیں تو مجھے فون کر دیں۔ میں انہیں وہیں سے لینے چلا جاؤں گا۔''

اس کی گھر پر غیر موجودگی سے کچھ مایوسی تو ہوئی تھی مگر یہ سرپرائز وہ اچانک یونیورسٹی' اس کے ڈپارٹمنٹ پہنچ کر بھی تو دے سکتا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ایک لمحے ہی میں طے کر لیا تھا۔

''اچھا تم فریش ہو' ریسٹ کرو' خرد بھی میرا خیال ہے تھوڑی دیر میں آنے ہی والی ہوگی۔ میں ذرا آفس جا رہی ہوں۔ صبح بی پی کچھ ہائی تھا تو آج ابھی تک آفس جا ہی نہیں سکی۔'' فریدہ نے اس سے کہا تو اس نے فوراً ہی ماں کی طرف تشویش اور فکرمندی سے دیکھا۔

''اب اللہ کا شکر ہے بالکل نارمل ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کا کام ہے آفس میں' ان شاء اللہ جلدی واپس آ جاؤں گی۔'' انہوں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''آپ جائیں گی کیسے' نیاز تو گھر پر ہے نہیں۔ میں خرد کو یونیورسٹی سے پک کرنے جا رہا ہوں' چلیں پہلے آپ کو آپ کے آفس ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' ان کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے انہیں ڈراپ کرنے کی بات کی۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ وہ خرد کو یونیورسٹی سے پک کرنے کی بات پر ضرور کچھ کہیں گی۔

اس کی بے قراری پر وہ مبہم سا مسکرائیں تو ضرور مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔

''تم خرد کو لینے چلے جاؤ' میں آفس خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی میں آپ کو ڈراپ کر رہا ہوں۔ واپسی میں آپ نیاز کو فون کر کے بلا لیجیے گا۔'' اس کی ضد پہ مسکراتی ہوئی وہ اس کے ساتھ پورچ میں نکل آئیں۔

وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا جب فریدہ کے موبائل پر کال آئی۔

''ہاں زرینہ! بولو۔ تم نے آفس فون کیا تھا؟ اچھا۔ ہاں وہ ذرا طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے۔''

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ ماں کے لیے برابر والی نشست کا دروازہ کھول رہا تھا جب اس نے ان کی فون پر ہونے والی گفتگو سنی۔

''کیا خضر کے اپارٹمنٹ میں۔ ہاں اس کا اپارٹمنٹ ہے تو میرے آفس کے قریب' لیکن...... ہاں' اچھا چلو ٹھیک ہے۔''

''اشعر! میرا خیال ہے تم چلے جاؤ۔ زرینہ نے ایک کام میرے ذمے ڈال دیا ہے بلاوجہ میری وجہ سے تم تھکو گے۔ زرینہ کی ایک جاننے والی کویت سے آئی ہیں۔ یاسمین نے ان کے ہاتھ خضر کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔ زرینہ کہہ رہی ہے پانچ چھ دن سے وہ چیزیں اس کے پاس رکھی ہوئی ہیں اور اس کا خضر کی طرف جانا ہی نہیں ہو رہا۔

تم خرد کو لینے یونیورسٹی جاؤ' میں اپنی گاڑی میں چلی جاتی ہوں۔'' وہ گاڑی سے اترنے لگیں۔

اگرچہ کہ خضر عالم کا نام سنتے ہی اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔ اسے زرینہ آنٹی کا یہ بے وقت کا شوشا سخت ناگوار گزرا تھا۔ پھر بھی تحمل سے بولا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں ممی! میں بالکل لیٹ نہیں ہو رہا۔ آپ کو جہاں جانا ہے چلیں۔''

اگلے دس منٹوں میں وہ ایک بڑا سا پیکٹ زرینہ کے گھر سے وصول کر کے فریدہ کے ساتھ ان کے آفس جا رہا تھا۔ ان کا آفس جس سڑک پر واقع تھا۔ اس سے اندر نکلنے والی ایک سڑک ہی میں وہ بلڈنگ تھی جس میں خضر کا اپارٹمنٹ تھا۔

خرد سے ملنے کی بے قراری میں وہ خضر عالم نام کے اس شخص کو بالکل ہی بھول بیٹھا تھا۔ واپس آتے ہی اس شخص کا نام پھر سامنے آیا تھا اور اس کے اندر موجود اس شخص کے لیے تمام تر نفرتیں نئے سرے سے تازہ ہو گئی تھیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خرد سے کہے گا وہ اس سمسٹر کے پیپرز تو پورے دے لے مگر پھر اگلے تین سمسٹرز ڈراپ کر دے۔ وہ ایک ڈیڑھ سال کے لیے اپنی پڑھائی روک دے۔ ڈیڑھ سال بعد اپنی اسٹڈیز پھر شروع کر دے۔ اور یہ کہ اسے جاب کرنے کا بھی تو بہت شوق ہے۔ وہ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں گھر پر نہ بیٹھے بلکہ اس کا آفس جوائن کر لے وہ خرد کو اس شخص کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتا تھا۔

''تم اوپر چلو گے؟'' فریدہ نے گاڑی کا دروازہ کھولتے اس سے پوچھا۔ اگر وہ نہ بھی پوچھتیں وہ تب بھی ان کے ساتھ اوپر ضرور جاتا۔ ایک تو فریدہ کو خضر کا اپارٹمنٹ ٹھیک سے پتا نہیں تھا' وہ بلاوجہ ادھر ادھر پوچھتیں' پریشان ہوتیں۔ دوسرے وہ اس ملاقات ہی میں اپنے سرد اور سخت انداز سے اس شخص کو یہ باور کرا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے اور وہ آئندہ ان کے گھر آنے یا وہاں فون کرنے کی ہرگز بھی جرات نہ کرے۔ سیکنڈ فلور پر اس کا خوب صورت سا اپارٹمنٹ تھا۔ پہلی بیل کے بعد اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا' ایک سیکنڈ انتظار کر کے فریدہ نے دوسری بیل ذرا لمبی کی' اس بار اندر سے خضر کی آواز آئی۔

''آ رہا ہوں بھئی' تیس منٹ میں پیزا گھر پہنچ جائے گا۔ فون پر یہ کہا گیا تھا۔ آپ لوگوں کی سروس بہت ہی خراب......''

ناگواری سے بولتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ اپنے آرڈر کیے پزا کی ہوم ڈلیوری کرنے والے جس بندے کی وہ توقع کر رہا تھا اس کی جگہ ان لوگوں کو سامنے دیکھ کر اس کا باقی کا جملہ منہ ہی میں رہ گیا۔ ''افسوس تمہارا پزا تو ابھی بھی نہیں پہنچا۔ آئے تو خیر ہم بھی کچھ پہنچانے ہی ہیں مگر وہ چیز پزا بہرحال نہیں۔'' فریدہ مسکرا کر بولیں۔ خضر جواباً بالکل نہیں مسکرایا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' وہ اتنا زیادہ گھبرایا ہوا اور بوکھلاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا کہ اس کے منہ سے ایک لفظ تک ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔

''کیا ہمیں اندر نہیں بلاؤ گے؟'' فریدہ بھی خضر کے انداز پر حیرت کا شکار تھیں۔

''ج..... جی......'' لبوں پر زبان پھیرتے وہ ''جی'' بھی بڑی مشکلوں سے ادا کر پایا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ ابھر آیا تھا۔ خضر کی حالت یوں تھی جیسے کسی نے اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ جیسے موت کا فرشتہ اس کے سامنے آ کھڑا ہو۔

اندر کسی کے چل کر اسی طرف آتے قدموں کی آواز اسے سنائی دی۔

''کون ہے خضر؟ کیا آ گیا......'' ایک بہت جانی پہچانی' بہت مانوس آواز اسے سنائی دی۔ نہیں' نہیں' نہیں' اس کے اندر نہیں' کی گردان ہو رہی تھی اور وہ سامنے سے چلتی اسی طرف آ رہی تھی۔

''خرد' اس کی خرد۔ نہیں یہ خرد نہیں۔ اس کی خرد یہاں نہیں ہو سکتی۔ اس کی خرد کا یہاں پر کیا کام ہے۔''

وہ ان کے قریب آ چکی تھی۔ اشعر! آپ؟ آپ کب آئے؟ ممی آپ۔'' اس نے اس لڑکی کی آواز پھر سنی۔

''خرد تم؟ تم یہاں۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے اپنے برابر میں کھڑی اپنی ماں کی آواز سنی' جو صدمے' دکھ اور شدید قسم کے شاک کے زیر اثر کانپتی ہوئی تھی' بے یقینی لیے ہوئی تھی۔

''خرد! تم یہاں خضر کے ساتھ؟'' اس نے ایک بار پھر اپنی ماں کی کانپتی ہوئی آواز سنی۔ ''تم یہاں اس طرح۔ میرے خدایا! یہ منظر دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی۔'' صدمے سے نڈھال اس کی ماں بری طرح رو پڑی تھی۔

''مم' ممی! آپ یہ کیا؟'' اس نے اس لڑکی کی آواز سنی اور ساتھ ہی اپنی روتی ہوئی ماں کو اس لڑکی کے قریب جاتے دیکھا۔ اس نے اپنی روتی ہوئی ماں کو اس لڑکی کے منہ پر تھپڑ مارتے دیکھا۔

''اتنی بے حیائی؟ اتنی بے غیرتی؟ اشعر کے منہ پر یہ کالک ملتے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی خرد؟ ایسی گھناؤنی حرکت کرتے یہ بھی یاد نہ رہا کہ تم کسی کی بیوی ہو' ایک عزت دار گھرانے کی بہو ہو۔ پڑھائیوں کے بہانے بنا کر ہماری عزت سے نجانے کب سے کھیل رہی ہو۔''

اس نے بری طرح روتی غم و غصے سے کانپتی اپنی ماں کو دیکھا ان کا تھپڑ کھا کر جو لڑکی زمین پر گر پڑی تھی' اسے دیکھا ہاں وہ اسے جانتا تھا۔ پہچانتا شاید نہیں تھا۔ پہچان تو وہ شاید اسے کبھی بھی نہیں سکتا تھا ہاں وہ اسے جانتا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتا تھا۔

''میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ جتنی آپ مجھ سے کرتے ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ۔'' اس کے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی اس کے سر کے اوپر سے آسمان غائب ہو گیا تھا وہ کہیں کسی ایسی فضا میں معلق تھا جہاں نہ زمین تھی نہ آسمان' اس کے کان سائیں

سائیں کر رہے تھے۔ اس کے ماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس میں کچھ کہنے' کچھ کرنے کی تو کیا اپنے وجود کو جنبش دینے تک کی سکت نہیں تھی۔

''کیا نہیں دیا تھا اشعر نے تمہیں خرد؟ محبت' عزت' آزادی' اس کی دی ہوئی آزادی کا ایسا ناجائز استعمال' ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر اتنی گندگی' اتنی غلاظت' اتنی پستی۔'' اس کی ماں نے روتے ہوئے حقارت سے زمین پر تھوکا۔

''ممی! آپ بالکل۔ اشعر۔ ایسا کچھ نہیں۔'' وہ لڑکی روتے ہوئے زمین پر سے اٹھی۔

''بصیرت نے' میں نے' اشعر نے ہم سب نے تمہیں اتنا پیار' اتنی عزت دی اور تم نے۔ تم نے ہماری عزت کو یوں خاک میں ملا دیا؟ کس چیز کی کمی تھی تمہیں جو تم نے ایسی گری ہوئی اور نیچ حرکت کی۔ تم ہمارے اعتماد سے یوں کھیلو گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اچھا ہوا آج بصیرت زندہ نہیں ورنہ جس بھانجی کو اتنی چاہت سے بہو بنا کر لائے تھے۔ اس کی یہ شرمناک حرکت دیکھ کر دکھ اور شرم سے مر ہی جاتے۔ خدایا' کس خطا کی اتنی بڑی سزا مل رہی ہے میرے بے قصور بیٹے کو۔''

زور زور سے بولتی' چلا چلا کر روتی اس کی ماں زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔ جس لڑکی کو وہ اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتی تھیں' اس نے ان کے اعتماد کی یوں دھجیاں اڑائی ہیں' اس نے دیکھا کہ اس کی ماں روتے روتے زمین پر سے اٹھی تھیں' وہ اب ایک طرف بالکل خاموش کھڑے خضر عالم کو جھنجوڑ رہی تھیں' اس کی قمیص کے کئی بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ قمیص پھٹ گئی تھی۔

''تمہاری اور خرد کی دوستی پر میں نے' اشعر نے' ہم نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کیا۔ ہم نے ہمیشہ تمہیں اپنے گھر میں عزت دی اور تم نے ہمارے ہی گھر کی عزت کو؟ یہ میری بہو ہے' میرے بیٹے کی بیوی ہے' کسی دوسرے کی عزت پر بری نگاہ ڈالتے تمہیں کوئی شرم' کوئی غیرت نہیں آئی؟ یہ کیسا گندا' کیسا گھناؤنا کھیل کھیلتے رہے ہو تم اس کے ساتھ مل کر؟ تمہارا نفس' تمہاری جوانی اتنی سرکش تھی جس نے گناہ و ثواب کا احساس ہی مٹا دیا۔ تم دونوں نے مل کر ہمارے منہ پر کالک مل دی' ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل۔''

''ممی! خدا کے لیے۔'' وہ لڑکی روتی ہوئی اس کی ماں کے قریب پہنچی۔

''ایسی غلیظ اور گھناؤنی حرکت کر کے' اتنا بڑا گناہ کر کے' ابھی بھی تم میں اتنی ہمت ہے کہ میری اور اشعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو۔'' اس کی ماں نے غصے سے کانپتے اس لڑکی کو دھکا دے کر اپنے سامنے سے ہٹایا۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گئی۔

''اچھا ہوا آج احسان زندہ نہیں' اچھا ہوا آج میمونہ زندہ نہیں' اچھا ہوا آج بصیرت زندہ نہیں۔ ورنہ تمہارے ماں' باپ اور بہت چاہنے والا ماموں' وہ سب بھی اسی ذلت سے گزرتے جس سے اس وقت میں اور اشعر گزر رہے ہیں۔ وہ بھی یونہی زندہ درگور ہو رہے ہوتے جیسے میں اور اشعر ہو رہے ہیں تم تو نہ بیٹی کہلانے کے لائق ہو نہ بہو نہ بیوی۔ ہر رشتے کی حرمت پامال کر ڈالی ہے خرد تم نے۔''

اس کی ماں چیخ چیخ کر مسلسل رو رہی تھیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس اس صدمے سے جیسے بالکل ہی کھونے لگی تھیں۔

زمین پر گری وہ لڑکی ایک دم اٹھی' وہ اس کی ماں کے پاس نہیں بلکہ دیوار کے ساتھ لگ کر بالکل خاموش کھڑے خضر عالم کے پاس

آ ئی تھی۔

''تم چپ کیوں ہو؟ تم سچ کیوں نہیں بولتے ؟ بتاؤ سچ۔ بولو۔ خدا کے لیے بولو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔''

وہ روتے ہوئے چیخ کر خضر سے بولی۔ وہ پتا نہیں اسے کون سا سچ بولنے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی ماں' خضر عالم اور یہ لڑکی' یہ تینوں جیسے کسی ڈرامے کے کوئی کردار تھے اور وہ دور کھڑا تماش بین۔ اس کا جیسے ڈرامے کے اس منظر سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تماشائی تھا۔ تماش بین تھا اور بہت دور بالکل الگ تھلگ کھڑا اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حسی کی ایک ایسی عجیب سی حالت میں جا پہنچا تھا جہاں غم اور درد کے ناقابل برداشت احساس سے اسے فرار مل رہا تھا۔

''تم چپ کیوں ہو خضر! خدا کے لیے سچ بولو۔'' اس لڑکی نے روتے ہوئے پھر خضر عالم کو جھنجوڑا۔

''میں کیا سچ بولوں خرد؟ میرے سامنے تمہاری اتنی انسلٹ ہو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بس اب بہت ہو گیا ہے۔ مزید جھوٹ اور دھوکے کی زندگی میں نہیں جی سکتا۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔ کسی کو چاہنا کوئی جرم نہیں جو ہم یوں سب سے منہ چھپاتے پھریں۔ اپنی محبت کو چھپانے کے لیے ہزار جھوٹ بولیں۔ ہم کیوں جھوٹ بولیں خرد! ہم نے محبت کی ہے۔ کوئی گناہ نہیں۔ تم ہمیشہ ڈرتی رہیں دنیا سے' لوگوں سے' اپنی محبت سب سے چھپاتی رہیں۔ تمہیں ہمیشہ یہ لگا کہ تمہارا مجھ سے محبت کرنا تمہاری اپنے شوہر سے خیانت ہے کوئی بہت بری بات ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں یہی سمجھایا کہ تمہارا مجھ سے محبت کرنا غلط نہیں بلکہ اس بات کا سب سے چھپانا غلط ہے۔ میں تم سے کہتا تھا سب کو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ توڑ دو ساری بیڑیاں' ختم کر آؤ اس زبردستی بندھے شادی کے رشتے کو جو تمہیں احساس گناہ میں مبتلا کرتا ہے۔ جو تمہیں مجھ سے دور کیے رکھتا ہے پر تم نے میری بات نہیں مانی۔ اور دیکھو آج کیا ہوا ہے۔ کیسے میری آنکھوں کے سامنے تمہیں بے عزت کیا جا رہا ہے۔''

خضر عالم نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے آہستہ آواز مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ اب خوف زدہ یا بوکھلایا ہوا نہیں بلکہ صرف اور صرف اداس اور بہت زیادہ رنج اور دکھ میں مبتلا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے منہ پر یک دم ہی یوں ہاتھ رکھا تھا جیسے اپنی چیخ کو دبا لینا چاہتی ہو۔

''خضر! تم' میرے اللہ۔'' خضر عالم کی طرف دیکھتے اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں نجانے کیا کہنا چاہا۔ نہ جانے کیا کہا۔ یک لخت ہی وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی دور کھڑے اس تماشائی کے پاس چلی آئی اور اسے بھی اس کھیل کا حصہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ...... یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔'' اس نے اس مردے کے بے جان بازو کو روتے ہوئے جکڑا۔

''آپ کو میرا یقین ہے ناں۔ آپ کو پتا ہے ناں میں ایسی نہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں اشعر! خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں ایسی نہیں' میرا یقین کریں۔''

وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی' وہ اس کے پیروں سے لپٹی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا' میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں آپ کی وہی خرد ہوں' وہی خرد جو صرف اور صرف آپ سے محبت کرتی ہے' جو صرف اور صرف آپ کی ہے۔'' اسے جیسے کوئی کرنٹ لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے دور ہٹا۔ پتا نہیں یہ انجان لڑکی کون تھی' پتا نہیں وہ اس سے کیا چاہتی تھی۔ وہ وہ اس سے دور بھاگ رہا تھا۔ وہ اسے پکارتی اس کے پیچھے آ رہی تھی اور وہ وہاں سے اندھا دھند بھاگ رہا تھا یوں جیسے موت اس کے تعاقب میں آ رہی ہو۔

''اشعر! میری بات سنیں۔ پلیز میری بات سنیں۔ مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ خدا کے لیے رک جائیں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔ آپ کی خرد ایسی نہیں ہے اشعر۔ آپ کی خرد ایسی نہیں۔ آپ کی خرد۔'' وہ بھاگتے بھاگتے اس آواز کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھر رہا تھا۔ اسے کہاں جانا ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے' اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ کچھ بھی محسوس کر سکنے کی سرحدوں سے بہت آگے وہ اپنے لیے زندگی میں پہلی بار موت مانگ رہا تھا۔ جو اسے ہر احساس سے پرے' ہر احساس سے دور لے جائے۔ وہ مڑ کر اس دنیا کی طرف کبھی دیکھنا نہیں چاہتا' وہ مڑ کر اس زندگی میں کبھی جانا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

وہ گزشتہ روز حریم کو معمول کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ اتوار کے روز جو اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو اس کے بعد ان چار' پانچ دنوں میں اس کی طبیعت ٹھیک ہی رہی تھی علاوہ دو' چار مرتبہ سانس لینے میں مشکل پیش آنے اور ہارٹ بیٹ کے ایک دم ہی بہت تیز ہونے کے۔ ایک' دو بار کھانا کھاتے ہوئے اس کے ساتھ ایسا ہوا تھا اور ایک بار رات میں سونے کے لیے لیٹنے کے بعد' مگر اس کی شدت وہ نہیں تھی جیسی اس نے اتوار کے روز دیکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ علاوہ سانس لینے میں معمولی دقت اور جلدی تھکاوٹ محسوس کرنے کے اس کی طبیعت مجموعی طور ان تمام دنوں میں ٹھیک ہی رہی مگر وہ اس بات پر خوش اور مطمئن اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ جو بیماری' جو نقص اس کے اندر تھا' وہ تو اپنی جگہ موجود تھا۔ اور اسے اس وقت تک موجود ہی رہنا تھا جب تک کہ اس بیماری' اس نقص کو ٹھیک نہ کر دیا جاتا۔ ڈاکٹر انصاری سے سرجری کی تاریخ لے لینے کے باوجود' یہ سرجری اس کی بیٹی کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے' یہ جان لینے کے باوجود اب گزرتا ہر اگلا دن اسے ایک نئے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کی اتنی چھوٹی' ننھی سی بیٹی کی سرجری۔ اس کی یہ نازک سی گڑیا جو صرف ایک سرنج کو دیکھ کر' سوئی چبھنے کے احساس ہی سے خوف زدہ ہو جاتی تھی' اسے کئی نشتر چبھوئے جائیں۔ اس کے دل کو کھولا جائے۔ اسے صرف یہ سوچ کر ہی اپنی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگتی تھیں۔ اس کی ننھی پری کی یہ کتنی سخت آزمائش تھی' چار سالوں کی جدائی کے بعد جو اپنی بیٹی سے اب جا کر ملا کر تھا اس باپ کا یہ کتنا سنگین امتحان تھا۔

☆......☆......☆

موت کی شدید ترین آرزو کرنے کے باوجود وہ زندہ تھا۔ وہ پورے چوبیس گھنٹوں سے زندہ تھا۔ سانس لے رہا تھا۔ تیسرے

درجے کے ایک ہوسٹل کے تنگ و تاریک کمرے میں وہ بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ گاڑی اندھا دھند سڑکوں پر دوڑاتے وہ کب یہاں آیا' کیسے' کس حال میں آیا۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ ہاں یہ یاد تھا کہ وہ دنیا سے' لوگوں سے چھپ جانا چاہتا تھا۔ کہیں غائب ہو جانا چاہتا تھا۔ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجتے اس کے موبائل نے مسلسل بجنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ اسے چین سے تنہا رہنے کیوں نہیں دیتے۔ اس نے کھینچ کر اپنی جیکٹ سے وہ موبائل نکالا۔ کھڑکی پر آیا اور پوری طاقت سے موبائل کو سامنے ٹریفک سے بھری رواں دواں سڑک پر اچھال دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا آلہ جو بیرونی دنیا کا اس سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ واپس بیڈ پر آ گیا۔ اب دنیا کا کوئی بھی شخص اسے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس کی تلاش ہسپتالوں میں کی جائے گی' فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کی جائے گی۔ ایسی کسی گھٹیا جگہ بھی وہ پایا جا سکتا ہے یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں پائے گا۔

گھڑی کی سوئیاں وقت آگے بڑھا رہی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اس کے احساسات پر جمی برف پگھلتی جا رہی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ بہت گہری' بہت لمبی نیند مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سادہ اور سچا لہجہ اس کے آس پاس گونج رہا تھا۔

''ہاں' بہت' بہت زیادہ انتظار کر رہی ہوں۔ پلیز جلدی واپس آ جائیں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

''میرے لیے سب سے زیادہ آپ اہم ہیں۔''

''اگر آپ منع کرتے میں کبھی نہیں جاتی۔ آپ اب کہیں۔ مجھے جہاں جانے کو منع کریں گے میں وہاں زندگی بھر نہیں جاؤں گی۔''

''میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ جتنی آپ مجھ سے کرتے ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ۔''

''ایک بیوی کی حیثیت میں فیل ہو کر پھر مجھے کسی بھی امتحان میں پاس ہونے کی خواہش نہیں۔''

''بند کرو یہ آوازیں۔ بند کرو میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

وہ تکلیف سے چلا اٹھا۔ وہ اس آواز سے پیچھا چھڑا کر یہاں آیا تھا اور یہ اس کے تعاقب میں یہاں بھی چلی آئی تھی۔

''خضر کا ایکسیڈنٹ ہوا تو خرد تقریباً ہر ایک آدھ دن بعد اس کی عیادت کے لیے اسپتال جاتی رہی۔''

''وہ صبح کہہ کر گئی تھیں کہ آج شام میں چھ' سات بجے تک گھر واپس آ ئیں گی۔''

''خرد بی بی کو بلاؤں!۔جی ابھی آئی ہوں خضر صاحب کے ساتھ۔''

''اب خرد ان میرڈ لڑکیوں کی طرح لاپروائی سے منہ اٹھا کر یونہی تو دوستوں کے ساتھ نہیں جا سکتی چاہے جانے کا جتنا بھی دل چاہ رہا ہو اور دل کیوں نہیں چاہے گا اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پر جانے کا۔ ابھی اس کی عمر ہے ایسے ہلے گلوں اور ہنگاموں کی۔''

''خضر مجھ سے کہہ رہا تھا اشعر بھائی خرد سے اتنے بڑے ہیں' ان دونوں کے آپس میں مزاج کیسے ملتے ہوں گے۔ ان دونوں کی سوچ میں مجھے تو بہت فرق محسوس ہوتا ہے۔''

''آپ بہت بور ہیں۔ ابھی آپ کی جگہ کوئی زندہ دل بندہ ہوتا اتنا انجوائے کر رہا ہوتا بارش کو۔''

''خضر کہتا ہے باقی دوست بھی اچھے ہیں مگر خرد کی بات الگ ہے۔''

''میں لیٹ ہوگیا' اشعر بھائی اتنی اچھی لڑکی کو مجھ سے پہلے لے اڑے۔''

''آپ بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔ کہنے کی حد تک تو سب ہوتے ہیں۔ آپ حقیقت میں بہت کھلے ذہن کے انسان ہیں۔''

''براڈ مائنڈڈ' لبرل' اس براڈ مائنڈڈ اور لبرل انسان کے منہ پر کسی نے بہت کس کر طمانچہ مارا تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں' اس کے مقابل ایک دوسرے مرد کے پہلو میں کھڑی تھی' اس کے گھر پر تنہا موجود تھی۔ وہ صرف بیوی تو نہ تھی' وہ تو اس کی محبت بھی تھی' وہ تو اس کی زندگی بھی تھی' پھر کیوں' آخر کیوں؟

''میں نے دوپہر میں آپ سے جھوٹ بولا تھا آپ نرسری گئے ہوئے تھے تب وہ سارے گملے میں نے دھوپ میں رکھے تھے۔'' جسے ایک معمولی سا جھوٹ بول کر رات میں نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے کب اور کیسے جھوٹ' دھوکے اور فریب کو اپنا لیا؟ کب' کب ایسا ہوا اور وہ اتنا لاعلم رہا۔ اس تبدیلی کو جان تک نہیں سکا؟

''خرد یونیورسٹی گئی ہے۔ کہہ رہی تھی ندرت اور سامعہ کے ساتھ مل کر اسٹڈی کرتی ہے۔''

''آ رہا ہوں بھئی۔ 30 منٹ میں پیزا گھر پر پہنچ جائے گا فون پر یہ کہا گیا تھا۔ آپ لوگوں کی سروس بہت ہی خراب۔''

''کون ہے خضر؟ کیا آ گیا۔''

وہ بیڈ پر اوندھے منہ پڑا رو رہا تھا۔ ہاں...... وہ اشعر حسین جو زندگی میں کبھی رویا نہیں تھا' باپ کی موت تک پر جس نے اپنے آنسوؤں کو دل ہی دل میں چھپا کر بظاہر بہادری کا ثبوت دیا تھا آج محبت کی موت کے پورے 24 گھنٹوں بعد اس کی مرگ پر سسک سسک کر رو رہا تھا۔

اسے بھوکے پیاسے اس کمرے میں بند پڑے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ بیرونی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کیے پورے دو دن ہو گئے تھے۔ ان دو دنوں میں کچھ کھانا تو دور اس نے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا' ایک لمحے' ایک پل کے لیے بھی وہ سویا نہیں تھا۔ اسے ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اس کی سادگی' اس کی معصومیت' اس کی سچائی' اس کی محبت' اس کا دھوکا' اس کا فریب' اس کا جھوٹ' اس کی بے وفائی۔

''آپ کب واپس آئیں گے' پلیز جلدی واپس آ جائیں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

''آپ جب واپس آئیں گے' میں آپ کو ایک بات بتاؤں گی۔''

اور اس رات اس کی وہ روتی ہوئی آواز سن کر اسے لگا تھا کہ وہ اسے یاد کر کے' اس کی محبت کی جدائی میں رو رہی ہے۔ لیکن وہ تو ندامت کے آنسو تھے۔ وہ اس رات روتے ہوئے جو بات اسے بتانا چاہتی تھی اور بتا نہیں پا رہی تھی۔ وہ شاید یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں۔

شادی ان دونوں کی ان کی مرضی کے خلاف کچھ دوسرے لوگوں نے زبردستی کروائی تھی۔ مگر پھر دھیرے دھیرے گزرتے وقت

کے ساتھ ان دونوں نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا' ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ مگر اشعر حسین نے ایک پوری دنیا کو دیکھنے کے بعد خرد احسان کو قبول کیا تھا۔ اس سے محبت کی تھی اور خرد احسان نے دنیا کو دیکھنے سے بہت پہلے مگر جب وہ اشعر حسین کے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلی تو اسے پتا چلا۔ دنیا اشعر حسین سے آگے' اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے۔ وہ الجھ گئی۔ اسے انتخاب کا موقع' انتخاب کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ اگر دیا جاتا تو اس کا انتخاب اپنے سے عمر میں 8 سال بڑا اتنا سوبر اور سنجیدہ مرد نہیں بلکہ اپنا ہم عمر کوئی شوخ اور زندہ دل لڑکا ہوتا۔ کاش وہ اسے دھوکا دینے کے بجائے اس سے صاف صاف یہ سب کچھ کہہ دیتی۔ وہ انتہائی باوقار طریقے سے اسے خود سے الگ کر دیتا۔ باعزت طریقے سے اسے طلاق دے کر اپنا اور اس کا رشتہ اس کے حسب منشا ختم کر دیتا۔ دلوں کے رشتے جبر اور زور زبردستی کی بنیاد پر تو قائم نہیں رکھے جاسکتے۔ محبت جبر کے ذریعے تو کسی کے دل میں پیدا نہیں کی جاسکتی۔ دکھ تب بھی بہت ہوتا۔ اس کے جذبات' اس کی انا' اس کا وقار' اس کی محبت' سب کو تب بھی چوٹ پہنچتی مگر تب' اب جیسی ذلت' اپنی نگاہوں میں اپنے بے آبروئی' تحقیر اور رسوائی' دھوکا اور بے وفائی سہہ کر بھی زندہ رہنے کا بے غیرتی بھرا احساس تو اس کے حصے میں نہ آتا۔ وہ کم از کم خود اپنا سامنا تو کر پاتا۔

☆......☆......☆

پورے 72 گھنٹے مردوں کی طرح اس کمرے میں بند گزارنے کے بعد وہ آخر کار ہمت کر کے اٹھا تھا۔ وہ باتھ روم میں آ کر منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ تب اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ آئینے میں نظر آتا یہ عکس اشعر حسین کا نہیں بلکہ ایک ہارے ہوئے' شکست خوردہ اور ناکام انسان کا عکس تھا۔ بڑھی ہوئی شیو اور صدیوں کا بیمار نظر آتا ویران' اجڑا چہرہ' کئی روز سے پہنا شکن آلود لباس وہ یہاں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا کسی ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو۔ لیکن کیا سب رشتے ناتے چھوڑ جانا اتنا آسان ہے؟ اس کی ایک ماں بھی ہے جس کا وہ واحد سہارا ہے۔ اور...... اور وہ لڑکی...... وہ لڑکی جس کے لیے اس کے باپ نے مرنے سے پہلے اسے کچھ نصیحتیں کی تھیں۔ باپ کی وہ کمزور اور نحیف آواز کانوں میں ابھی اتنی تازہ تھی جیسے وہ ابھی ابھی اس سے یہ سب کہہ کر گئے ہوں۔ ''اشعر! اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بعد خرد کا بہت خیال رکھنا بیٹا۔''

اور باپ کی آواز' اس سے کیا اپنا وہ وعدہ اسے پورے تین دنوں بعد پھر وہیں لے جا رہا تھا جہاں وہ اب مر کر بھی دوبارہ کبھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خرد احسان پر کوئی فرد جرم عائد کرنے نہیں جا رہا تھا۔ وہ صرف اس کے لبوں سے وہ سچ سننے جا رہا تھا جو نظر آ رہا تھا مگر اس کی زبان سے ادا ہونا باقی تھا۔ خرد احسان نے اس کی عزت اور ناموس کی پروا نہیں کی مگر وہ اسے باعزت طریقے سے' اس کے تمام شرعی حقوق ادا کرتے ہوئے اسے خود سے الگ کرے گا۔ لیکن اگر اس نے کہا جو اشعر نے دیکھا' جو سنا وہ سب جھوٹ تھا' اس کی نظروں کا دھوکا تھا' اس کی سماعتوں کا فریب تھا' اس نے اس کی امانت میں کوئی خیانت نہیں کی' وہ بے گناہ ہے' تو؟ تو کیا کرے گا وہ؟

اور اس کے دل سے ایک بہت ہی عجیب بہت ہی ناقابل یقین جواب اسے موصول ہو رہا تھا۔ وہ جواب جو دنیا کے اچھے سے اچھے اور اعلا ظرف سے اعلا ظرف شوہر تک کے دل میں بھی کبھی نہیں آسکتا۔ وہ پھر اس کا یقین کر لے گا؟ دل کا جواب ناقابل یقین

تھا۔''ہاں'' مرجانے والی اس انمول محبت کے کچھ نقوش شاید اب بھی اس کے دل پر باقی تھے اور وہ دل کو کسی اور ہی طرح سوچنے پر مجبور کررہے تھے۔

وہ واپس اپنے گھر آرہا تھا' ہر سچائی کا سامنا کرنے کے لیے، کچھ انتہائی اہم اور سنجیدہ فیصلے کرنے کے لیے۔گاڑی اپنے گھر میں لاکر اس نے روکی تو اسے یاد آیا' صرف دس روز قبل اس گھر سے اس صبح ایئرپورٹ جاتے اس کا وجدان اس سے کیا کہہ رہا تھا۔واقعی جب وہ واپس آیا تب زندگی ویسی نہیں رہی تھی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔جو بھی فیصلہ ہو۔پر ایک بات تو طے ہے۔اس کی' اشعر حسین کی زندگی اب کبھی پہلے جیسے نہیں ہوسکے گی۔زندگی میں سب کچھ ہوگا بس وہ اشعر حسین سانسیں لینے کے باوجود بھی مرچکا ہوگا۔

☆......☆......☆

یہ ہفتے کی شام تھی اور وہ سوچ کر بہت خوش خوش اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تھا کہ کل اتوار ہے اور کل کا پورا دن بغیر آفس اور دیگر کسی بھی طرح کی مصروفیات اور رکاوٹوں کے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ گزار سکے گا۔

دروازہ زینت نے کھولا تھا۔وہ اندر پہنچا تو حریم،خرد کے ساتھ لیونگ روم میں نظر آئی۔حریم کارپٹ پر اپنی ڈرائنگ بک لیے بیٹھی تھی۔اس کے گرد ڈھیر سارے Crayons رنگین پنسلیں اور مارکرز وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔سر جھکائے ڈرائنگ بک کو دیکھتی وہ پنسل منہ میں دبائے کچھ سوچنے میں مصروف تھی۔وہ اس کے اس انداز کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا اٹھا۔

وہ کتنی ساری عادتیں اس کی چرالائی تھی۔وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔وہ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔خرد نے البتہ خاموش نظریں اٹھا کر اسے ایک پل کو دیکھا تھا۔

''کیا بن رہا ہے پرنسس؟''

''ہاؤس۔''

''یہ تو بہت خوب صورت ہاؤس ہے۔کس کا ہے یہ ہاؤس؟'' حریم کے بتانے پر سمجھ میں آیا تھا کہ یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں دراصل ایک گھر ہیں۔باقی ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور الٹی سیدھی اشکال کس چیز کو ظاہر کررہی تھیں یہ جاننا ابھی باقی تھا۔

''حریم کا، ماما کا، پاپا کا۔'' اس نے سنجیدگی سے اسے گھر کے مالکان کے نام بتائے۔

''ڈور کو کون سا کلر کروں پاپا؟''

''ریڈ کردو۔''

''پاپا! ڈور ریڈ کلر کا نئیں ہوتا۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں اسے مطلع کیا۔اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتا وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''پاپا بھی بالکل ڈفر ہیں ناپرنسس ڈور کس کلر کا ہوتا ہے یہ بھی نہیں پتا نہیں۔'' اس نے اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

''پاپا! حریم کی ڈرائنگ۔''اس نے اس کی گود سے اترنا چاہا۔

''پاپا کو پیار تو دے دو سوئٹ ہارٹ پھر کر لینا اپنی ڈرائنگ۔''اس نے اس کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔

''یہ چوڑیاں تو دیکھنے دو پاپا کو۔''

اس کی بائیں کلائی اس نے اپنے ہاتھ میں لی۔ اسی کا لایا پرپل کلر کا ٹراؤزر، قمیص اور نیٹ کا دوپٹہ اس نے بڑے اہتمام سے پہن رکھا تھا۔ ساتھ اس تیاری کو مکمل کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں میں میچنگ کی چوڑیاں تھیں اور بالوں میں بھی لباس اور چوڑیاں ہم رنگ ہیئر بینڈ لگا تھا۔ نہانے اور لباس تبدیل کرنے سے قبل اپنے کپڑے وہ خود منتخب کیا کرتی تھی۔ وہ بیٹی کی تیاریوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ویسٹرن طرز کے ملبوسات کے بعد آج پاکستانی لباس میں بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ڈرائنگ میں مصروفیت کے باوجود مجال تھی جو اس کے شانے پر بڑے انداز سے پڑا دوپٹہ ادھر سے ادھر ہو جائے۔

اس کے حریم کے پاس بیٹھنے کے بعد خرد وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ اسے اب کھٹر پٹر کی آواز کچن سے آ رہی تھی۔ وہ کچن میں کچھ کام کرتی، زینت سے بھی باتیں کر رہی تھی۔ حریم کو وہ دونوں اکیلا نہیں چھوڑا کرتے تھے اور یہ گویا ایک ان کہا معاہدہ تھا، ان کے بیچ کہ دونوں میں سے ایک اگر اس کے پاس سے ہٹ رہا ہے تو اتنی دیر دوسرے کو اس کے پاس موجود رہنا ہوگا۔

''پرنس! پاپا بور ہو رہے ہیں۔ ڈرائنگ بس کرو۔'' کافی دیر اسے خاموشی سے ٹیڑھی میڑھی لکیریں بناتے، دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

ڈرائنگ بک سے نظریں اٹھا کر اس نے اسے دیکھا پھر کچھ سوچ کر بڑی معصومیت سے بولی۔

''ٹی پارٹی کریں پاپا؟'' اپنی طرف سے بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے اس نے جیسے اس کی بوریت دور کرنے کا ایک معقول حل بتایا تھا۔ اپنی بے ساختہ امنڈتی مسکراہٹ کو دباتے اس نے سنجیدگی سے سر اقرار میں ہلا دیا۔

وہ ڈرائنگ بک بند کر کے فوراً اٹھی۔

حریم وہ ٹرانسپرینٹ بیگ اٹھا لائی۔ جس میں سرخ رنگ کا ٹی سیٹ رکھا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر وہ بیگ کی زپ کھول کر سارے برتن باہر نکال رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں دلچسپی اور والہانہ محبت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب رکھے فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہی ریسیور اٹھایا۔

''کون ہو سکتا ہے۔'' سوچتے ہوئے اس نے ''ہیلو'' کہا۔ جواب میں اس نے کسی عمر رسیدہ عورت کی آواز سنی۔

''ہیلو۔ آپ اشعر بات کر رہے ہیں بیٹا؟'' وہ اپنا نام ایک اجنبی آواز کے اس مشفقانہ انداز میں لیے جانے پر چونکا۔

''جی میں اشعر بات کر رہا ہوں۔ آپ؟''

''میں بتول بانو بول رہی ہوں بیٹا! شاید آپ کو یاد ہو، میمونہ اور خرد، نواب شاہ میں میرے برابر والے گھر میں رہتی تھیں۔ آپ

اور آپ کے والد جب میمونہ اور خرد کو اپنے ساتھ کراچی لے جانے آئے تھے تب میری آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔'' ان کے بات کرنے کا انداز بے حد سادہ اور اپنائیت بھرا تھا۔

''بتول بانو۔'' اس نے زیرلب یہ نام دہرایا۔ ''بتول خالہ؟'' اسے شکل یاد نہیں آسکی، مگر یہ یاد آ گیا کہ پھوپھو کی بیماری کی خبر پانے کے بعد جب وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ پھپھو اور خرد کو لینے ان کے گھر نواب شاہ پہنچا تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے اپنے گھر سے کھانا پکا کر لائی تھیں۔ دسترخوان...... بچھا کر انہوں نے ان لوگوں کے لیے کھانا لگایا تھا اور اصرار کر کر کے اسے اور اس کے ڈیڈی کو یوں کھانا کھلا رہی تھیں جیسے کہ وہ ان ہی کے مہمان ہوں۔ آلو کی بھجیا، بھنا ہوا قیمہ اور چپاتیاں، وہ اپنی زندگی کے اس سادہ ترین لنچ کو محض مروتاً کھاتے یہ سوچتا رہا تھا کہ کیا پڑوسی بھی پڑوسیوں کے گھروں میں اتنی بے تکلفی سے جایا آیا کرتے ہیں۔ اس کے گھر میں تو ماں، باپ اور بھائی، بہن تک بھی ایک دوسرے کے کمرے میں ایسے داخل نہیں ہوتے تھے جیسے وہ پڑوسن، بے تکلف پھوپھو کے گھر میں پھر رہی تھیں۔ پھر ان کی شادی کے بعد بھی شاید ایک، دو بار اس کی موجودگی میں خرد کے پاس ان خاتون کا فون آیا تھا اور خرد نے بڑی گرم جوشی اور والہانہ پن سے بتول خالہ، بتول خالہ کر کے ان سے باتیں کی تھیں۔ اور ان سے بات کرنے کے بعد اسے بتایا تھا کہ ان کا خاندان اور اس کے بابا کا خاندان انڈیا میں ایک ہی محلے میں آباد تھا۔ تقسیم کے وقت انہوں نے وہاں سے ساتھ ہجرت کی تھی اور پھر بعد میں نواب شاہ میں بھی ایک ساتھ ہی آباد ہوئے تھے گویا یہ کئی نسلوں پر پھیلے بہت قدیم تعلقات تھے۔ رشتے داری کوئی نہیں تھی مگر تعلق بہت گہرا اور بہت مضبوط تھا۔ مگر اب وہ حیران سا یہ سوچ رہا تھا کہ خرد کے اس پرانے شہر اور پرانے گھر کی وہ پڑوسن، ان سے اب خرد کا کیا واسطہ تھا؟ جو وہ یہاں فون کر رہی تھیں؟

''حریم کی طبیعت کیسی ہے بیٹا؟'' ان کے اس سوال نے اسے مزید حیرت میں مبتلا کیا۔

''جی۔ اللہ کا شکر ہے۔''

''آپریشن کی تاریخ دی ڈاکٹر نے؟'' ان کی گفتگو میں خلوص اور اپنائیت کے رنگ بہت واضح محسوس کیے جا سکتے تھے۔

''جی ہاں دے دی ہے۔'' وہ ان کے سوالات کے جواب دے تو رہا تھا مگر حیرت زدہ سا۔

''کیا میں خرد سے بات کر سکتی ہوں؟''

''آپ ہولڈ کیجیے، میں بلاتا ہوں۔'' ریسیور سائڈ میں رکھ کر وہ کچن میں آیا۔

''آپ کا فون ہے۔'' اس نے خرد سے کہا جو غالباً پھلوں کا کچھ بنا رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور الماری سے جینز اور ٹی شرٹ نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔

اس نے آ کر ریسیور اٹھایا تو بتول بانو کی آواز سن کر خوشی سے سرشار ہی ہو گئی۔

''میں ٹھیک ہوں بتول خالہ! حریم کے لیے آپ دعا کریں۔''

''میں ہر نماز میں پابندی سے دعا کر رہی ہوں بیٹا! تم فکر مت کرو! ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو گا۔ آپریشن کی تاریخ اور وقت مجھے فون

کر کے ضرور بتا دینا بیٹا! جس وقت حریم کا آپریشن ہو رہا ہو گا میں اس وقت ان شاء اللہ دعا کرتی رہوں گی۔ دعاؤں میں بہت برکت ہوتی ہے بیٹا!'' مارے خوشی اور تشکر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بہت شکریہ بتول خالہ! حریم کو اس وقت دعاؤں سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ دعا کیجئے گا۔ اللہ میری بیٹی کو صحت اور تندرستی دے دے۔''

حریم کارپٹ پر سے اٹھ رہی تھی، اسے اٹھتا دیکھ کر اس نے عجلت میں ریسیور رکھا۔

''کہاں جا رہی ہو حریم؟''

''پاپا کے پاس۔ پاپا کہاں ہیں؟ حریم اور پاپا کو پارٹی کرنی ہے۔'' وہ بھاگ کر کمرے سے نکلنا چاہتی تھی۔

اسے بھاگ کر باہر جانے سے روکنے کے لیے وہ فوراً بولی۔

''تم یہیں بیٹھو۔ جلدی سے چائے تیار کرو، پاپا تمہارے گیسٹ ہیں۔ ان کے لیے چائے کے ساتھ کچھ اور بھی رکھو۔ پاپا کو میں بھیج رہی ہوں، تمہارے پاس۔''

کہیں حریم بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے نہ آ جائے۔ اسی سوچ میں مبتلا وہ بغیر دستک دیے اشعر کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ تولیے سے سر رگڑتا اسی وقت شاید باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز پہن رکھی تھی اور اس کی ٹی شرٹ سامنے بیڈ پر پڑی تھی۔ تولیے سے بال خشک کرتے اس کے ہاتھ بھی اپنی جگہ رک گئے تھے۔ وہ بھی اس کے غیر متوقع انداز میں اندر آنے پر ٹھٹک گیا تھا۔

''آئم سوری۔'' وہ فوراً ہی واپس گھومی۔

''کیا ہوا؟ حریم ٹھیک ہے؟'' اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی اسے پتا تھا کہ وہ بلا وجہ اس کے کمرے میں نہیں آ سکتی۔

''وہ ٹی پارٹی کے لیے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' دروازے کی ناب تھامے اس نے اشعر کی طرف دیکھے بغیر کہا اور کمرے سے نکل آئی۔

اسے بری طرح غصہ آ رہا تھا، شدید کوفت ہو رہی تھی۔ کچن میں اپنا ادھورا کام مکمل کرتے اس نے زینت سے کھانا لگانے کے لیے کہا اور جب کھانا لگ چکا تب اسی سے اشعر اور حریم کو بلانے کے لیے کہا تھا۔

''اشعر، حریم کو گود میں لیے ڈائننگ روم میں آیا تب وہ ڈائننگ ٹیبل پر پہلے سے بیٹھی تھی۔ اتنی دیر میں وہ خود کو بالکل نارمل کر چکی تھی۔

آج اس نے حریم کے لیے فروٹ سلاد بنائی تھی۔

''ماما! ایپل کے Seed (بیج) کہاں ہیں؟'' فروٹ سلاد میں سیب کا ٹکڑا جو حریم کے منہ میں آیا تو اس کا ذائقہ پہچانتے اس نے خود سے پوچھا۔ وہ تو اس سوال کا پسِ منظر بخوبی سمجھتی تھی مگر اشعر یقیناً نہیں سمجھ پایا تھا تب ہی حیرت سے پوچھنے لگا۔

’’Apple کے Seeds کا کیا کرنا ہے پرنس؟‘‘

’’Apple لگانا ہے پاپا! Seed ڈالیں گے تو Plant نکلے گا۔‘‘

’’یہاں تو ایسی کوئی چیز میسر نہیں تھی مگر وہاں اپنے اس چھوٹے سے گھر میں حریم کو ایک کیاری ضرور میسر تھی۔ وہ ہر پھل کھانے کے بعد اس کا بیج، گٹھلی کیاری میں بڑے شوق سے دبانے بھاگتی تھی۔ اور پھر اسی وقت سے اس کے پیچھے پڑ جاتی۔‘‘ ماما Plant کب نکلے گا؟‘‘ وہ روز اس جگہ پانی ڈالتی اور پھر اگر کبھی اس کے بیج بوئی جگہ پر کوئی جنگلی پودا، جھاڑی، کوئی کونپل پھوٹ پڑتی تو وہ خوشی سے دیوانی سی ہو جاتی۔ حریم نے وراثت میں باپ سے باغبانی کا شوق لے لیا تھا۔

اس نے حریم کو یہ تسلی دی کہ کسی بھی فروٹ کے Seed اس نے پھینکے نہیں ہیں۔ حریم یہ سن کر خوش ہوئی مگر پھر یک دم ہی اسے یاد آیا کہ ان کے اس گھر میں تو کوئی کیاری ہی نہیں ہے۔ آخر وہ Seed ڈالے گی کہاں؟ وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔

’’پاپا! حریم Seed کہاں ڈالے گی؟ حریم کو Apple لگانا ہے۔‘‘ وہ دیکھتی تھی کہ اشعر، حریم کے ذخیرہ الفاظ اور اس کے بولنے کے انداز کو بہت زیادہ انجوائے کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بہت کھل کر مسکراتا اس کے طرزِ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

’’حریم Plant کہاں لگائے؟ Seed کہاں ڈالے؟ یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے اب تو رات ہو گئی ہے چلو کل صبح ہم اس کا کچھ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟‘‘ حریم نے فوراً ہی سر اثبات میں ہلا کر اس کی بات مان لی۔ بغیر کسی ضد کے، اسے یقین تھا کہ پاپا اس کی ہر بات مانتے ہیں۔

حریم کو دوا دینے کے بعد وہ کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ کیونکہ اسے ابھی عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔ اشعر کمرے میں حریم کے پاس موجود تھا۔ اشعر کے کمرے سے جانے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ حریم کے کہنے پر جو اس رات وہ اس کمرے میں سویا تو اس کے بعد گزری تمام راتوں میں حریم کے کہے بغیر ہی وہیں سویا تھا۔ اور وہ بیڈ پر حریم کے دوسری طرف جاگی ہوئی بیٹھی رہتی۔

نماز پڑھ کر وہ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ سر میں درد ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک کپ چائے کا پی کر، سر درد کی گولی لے کر سکون سے گہری نیند سو جائے۔ اشعر کی کمرے میں موجودگی کی وجہ سے وہ پچھلی کئی راتوں سے ایک پل کو بھی سو نہیں سکی تھی۔ دن میں کسی وقت تھوڑی سی دیر کو اتفاقاً اس کی آنکھ لگتی بھی تو حریم کی فکر اسے فوراً جگا دیتی تھی۔

کچن میں زینت بچا ہوا کھانا فریج میں پہنچانے اور دھلے ہوئے برتن سکھانے میں مصروف تھی۔ اس نے چولہے پر پانی رکھا اور کیبنٹ کھول کر چینی اور پتی نکالنے لگی تب ہی اشعر کچن میں داخل ہوا۔

’’زینت! مجھے ایک کپ چائے بنا دو، ذرا اسٹرونگ سی۔‘‘ خود پر اس کی نظر بعد میں پڑی تھی۔

زینت کے سامنے وہ یہ نہیں کر سکتی تھی کہ اپنے لیے چائے بنا لے اور اس کے لیے نہ بنائے۔ اس لیے بمشکل تمام ایک جبری سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر اس سے بولی۔

''میں چائے بنارہی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں۔'' غالباً ملازمہ کے سامنے کوئی تماشا بنانا وہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ''اچھا'' کہہ کر سر ہلاتا فوراً کچن سے چلا گیا۔

اس نے کیتلی میں مزید ایک کپ پانی کا اضافہ کیا۔ اسٹرونگ سی چائے کو خوب اچھی طرح دم دے کر اس نے اسے دو پیالیوں میں نکالا۔ ایک میں شکر ملائی، ایک میں نہیں۔ اتنے برسوں میں وہ اس شخص کی کوئی بات، کوئی عادت بھی تو نہیں بھول پائی تھی۔ اس لیے کہ اس شخص کی ایک ایسی زندہ، جیتی جاگتی نشانی اس کے پاس تھی جو اسے اس شخص کو کبھی بھولنے نہیں دیتی تھی۔ اس کی بیٹی میں اس سے زیادہ باپ کی شباہت تھی۔ اس کی عادتیں اس سے زیادہ باپ سے ملتی تھیں۔

وہ چائے کے دونوں کپ لے کر کمرے میں آ گئی۔ حریم ابھی جاگی ہوئی تھی۔ کہانی سننے کے بجائے آج وہ اشعر کے ساتھ ٹی وی پر کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ اشعر کا کپ اس نے بغیر کچھ کہے بالکل خاموشی اور لاتعلقی سے اس کے پاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود اپنا کپ لے کر بیڈ کے دوسرے کونے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''ماما! سنو وائٹ دیکھیں۔'' اشعر کے ساتھ لگ کر بیٹھی حریم نے اس سے کہا۔ چائے کے گھونٹ لیتی وہ بھی مووی دیکھنے لگی۔ اس نے اپنا چائے کا کپ کب کا خالی کر دیا تھا۔ اور اشعر کا کپ جوں کا توں ان چھوا رکھا تھا۔ حریم کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، مگر اسے یہ فکر لاحق تھی کہ سنو وہائٹ زہریلا سیب کھانے سے کہیں مر تو نہیں جائے گی۔ اشعر کئی بار اس سے سونے کے لیے کہہ چکا تھا۔ مگر وہ آنکھیں زبردستی کھولے سونے سے انکار کر رہی تھی۔

''بس پرنسس! اب باقی مووی کل دیکھیں گے اس وقت پرنسس کو بھی نیند آ رہی ہے اور پاپا کو بھی۔''

ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے اشعر نے آخر فیصلہ صادر کر ہی دیا۔ اور پھر فوراً ہی اٹھ کر ٹی وی اور لائٹ سب آف کر دیا۔ حریم نے روز کی طرح اپنا سر اشعر کے ہاتھ پر اور پاؤں اس کے اوپر رکھ دیے۔ اشعر، حریم کے دائیں جانب لیٹا تھا اور وہ بائیں جانب بیٹھی تھی۔ حریم لیٹتے ہی سونے کی دعا پڑھتے پڑھتے ہی سو گئی تھی۔ ایسی ساری مسنون دعائیں اسے خرد نے یاد کروائی تھیں۔

حریم کے سو جانے کے بعد اشعر بھی فوراً ہی سو گیا تھا۔ اس کی بے خبری اس کی گہری نیند کا پتا دے رہی تھی۔ وہ پچھلی کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی پھر کس وقت اس کی آنکھ لگی اسے پتا نہیں چلا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ نیند سے پوری طرح بے دار ہونے اور آنکھیں کھولنے سے بھی پہلے اسے ایک عجیب مانوس سا احساس ہوا۔

آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا تو اسے حریم کے برابر بالکل بے خبر، گہری نیند سوئی خرد نظر آئی۔ اس نے ...... بے اختیار اپنے چہرے کو اس سے کچھ دور ہٹایا۔ تب اس کی نظر حریم کے سینے پر رکھی اپنی ہتھیلی اور اس پر رکھے خرد کے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کے اوپر خرد کا

ہاتھ اتنی مضبوطی سے رکھا ہوا تھا کہ فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نہیں نکال سکا۔ وہ اپنے ہاتھ کے اوپر رکھے اس کے ہاتھ کو بغور دیکھتا رہا۔ گہری نیند سوتے میں کسمسا کر وہ حریم کے اور قریب ہوئی تو اس کا پیر اشعر کے پیر سے ٹکرایا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق دایاں پیر بائیں پیر کے اوپر رکھ کر لیٹا تھا۔ گو ایک پل کو ٹکرانے کے بعد اس کا پیر فوراً ہی اس کے پیر سے دور ہو گیا تھا، مگر یہ ایک پل اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی، ایک ناقابل فہم سا احساس دوڑا گیا تھا۔ گہری نیند سوئی یہ لڑکی اتنی بچی اور معصوم سی لگ رہی تھی کہ وہ حیرت میں گھرا سوچ رہا تھا کہ کیا گناہ گاروں کے چہرے اتنے روشن بھی ہوا کرتے ہیں؟ یک دم ہی اسے یہ یاد آیا کہ اس کے ہاتھ پر رکھے اس ہاتھ نے کئی برس پہلے اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اس کے ساتھ بدترین خیانت کی تھی۔ اس کی عزت، اس کے وقار کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا ایک جھٹکے سے اس نے کھینچ کر اس کے ہاتھ کے نیچے دبا اپنا ہاتھ وہاں سے اٹھایا، خود کو جس حد تک حریم سے دور کر سکتا تھا کر لیا۔ اسے اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یا وہ خود مر جائے یا اس عورت کو مار ڈالے، وہ ایک مرتبہ پھر اسی جنون اور وحشت بھری سوچ کا شکار ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی گھر کے اندر سے فریدہ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے باہر آ گئی تھیں۔ ان کی حالت انتہائی خراب تھی۔ وہ اسے چومتی اسے والہانہ پیار کرتی۔ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں کہ تین دن کہاں تھا؟ تین دنوں تک لاپتا رہ کر، روپوش رہ کر اس نے ماں کو کتنا پریشان کیا ہے کیسے کیسے وسوسے اور خوف ان کے دل میں اس دوران آتے رہے ہوں گے، وہ سمجھ سکتا تھا لیکن وہ پہلے حریم سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''ممی! میں آپ سے ابھی ٹھہر کر بات کرتا ہوں۔'' وہ اپنے گرد لپٹے ماں کے ہاتھوں کو آہستگی اور بہت نرمی سے ہٹاتا، اندر آ گیا۔

''اشعر! کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھ جاؤ بیٹا! اتنی پریشان رہی ہوں تمہارے لیے، کچھ دیر تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ آؤ میرے کمرے میں چلو۔''

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ بہت محبت سے بولیں۔ اس نے انہیں بغور دیکھا، اپنے آنسو ضبط کرتی، وہ اسے کچھ چھپاتی محسوس ہوئیں۔

''آؤ بیٹا! کچھ دیر ستا لو۔ میں تمہارے لیے چائے بنواتی ہوں۔'' وہ اسے اس کے کمرے میں جانے سے روکنا چاہتی تھیں۔

اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹایا اور آندھی طوفان کی طرح اپنے کمرے کی طرف بڑھا...... کمرہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن وہاں پر وہ موجود نہیں تھی۔ اس نے گھوم کر ماں کی طرف دیکھا، جو اسے کمرے میں آنے سے روکنے پر ناکام ہونے کے بعد خود بھی اس کے پیچھے اندر آ گئی تھیں۔ بہت نڈھال اور آنسوؤں کو ضبط کرتی ہوئی۔

''خرد کہاں ہے؟'' سوائے سنجیدگی کے دوسرا کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہ تھا۔

''بیٹا! میں تم سے کہہ رہی ہوں نا۔ تم کچھ دیر ستا لو۔ دیکھو حالت کیا بنالی ہے تم نے اپنی۔ آؤ چلو کچھ کھا پی لو۔ میں نور افزا سے۔''

''ممی! خرد کہاں ہے؟'' اس کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

''میں......وہ......خرد...... بیٹا تم پہلے کچھ دیر آرام کرلو۔ آؤ چلو میرے کمرے......'' وہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔

''ممی! خرد کہاں ہے؟'' ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ان کا رخ اپنی طرف کیا۔ اور ان کی آنکھوں میں جو جواب اسے نظر آیا، وہ اسے پورا کا پورا ہلا گیا۔

''وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی اشعر!'' اس سے نظریں چراتے، وہ بہت آہستہ سرگوشی نما آواز میں بولیں۔ ان کے شانوں پر سے اس نے یک دم ہی اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ دونوں ہاتھ بالکل نیچے لٹکائے وہ بے یقینی سے ان سے ایک دم دور ہٹا۔

''وہ اسی روز یہاں سے چلی گئی تھی۔ جب تم خضر کے اپارٹمنٹ سے گئے، میں روتی اور بھاگتی ہوئی تمہارے پیچھے گئی۔ مگر جب تمہیں روک نہ پائی تو صدمے سے چور گھر لوٹ آئی۔ وہ مجھ سے پہلے گھر پر موجود تھی۔ وہ اپنا سارا سامان جلدی جلدی پیک کر رہی تھی۔ وہ گھر سے جا رہی تھی۔ گھر سے باہر گاڑی میں......'' وہ روتے ہوئے بول رہی تھیں، جو اس کی سماعتوں سے ٹکرا تو ضرور رہا تھا مگر شاید اس پر اپنے معنی واضح نہیں کر پا رہا تھا۔

''خضر کے گھر پر اسے دیکھ کر جس ذلت اور بے آبروئی سے ہم دوچار ہوئے تھے ابھی وہ ہی داغ نہیں سہا جا رہا تھا کہ خرد نے کبھی نہ ختم ہونے والا ذلت کا یہ طوق ہماری گردن میں ڈال دیا۔''

اور وہ ان کی بات سنتا ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اپنی بات پوری کر کے انہوں نے آنسوؤں سے بھری نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جو پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا تھا۔

وہ اس سے لپٹ کر زار و قطار روتی رہیں اور وہ بالکل ساکت دونوں ہاتھ لٹکائے کھڑا رہا۔ کافی دیر تک روتے رہنے کے بعد اس کے بے حس اور بے جان جسم کو محسوس کرتی وہ ایک دم اس سے الگ ہوئیں۔

''اشعر!'' وہ خوف و ہراس میں مبتلا اسے زور زور سے ہلانے لگیں۔ ''اشعر! تم ٹھیک ہو نا بیٹے؟ میں اسی لیے تمہیں آتے ہی یہ بات نہیں بتانا چاہتی تھی۔ خدا کے لیے خود کو سنبھالو بیٹا! خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔''

اس کی پیہم بے حسی دیکھ کر انہوں نے روتے ہوئے اسے پورے کا پورا جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے ان کے ہاتھ خود پر سے ہٹا دیے۔

''ممی! آپ یہاں سے جائیں۔'' اس کی آواز، اس کی آواز نہ تھی۔ اس کا لہجہ اس کا لہجہ نہ تھا۔ بے تاثر لہجے میں مشینی انداز میں اس نے ان کی سمت دیکھے بغیر یہ بات کہی تھی۔

''میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ تم...... تم لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے پاس۔''

''ممی! آپ یہاں سے جائیں۔'' وہ زندگی میں پہلی بار ماں پر بلند آواز میں چلایا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نہ گئیں تو وہ خود یہاں سے کہیں چلا جائے گا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی اس طرح کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں ان کے باہر نکلتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیوں آیا مزا؟ بہت اعلاظرف بن کر لوٹے تھے، کہو کیسی رہی؟''

آئینے میں نظر آتا اس کا عکس اس پر بھرپور طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''چہ چہ، بے چارہ اشعر حسین۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر گھر سے کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اخبار کے اندرونی صفحات پر ایک کالمی خبر لگتی ہے ناں، شادی شدہ عورت آشنا کے ساتھ فرار۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔'' وہ ہنسی قہقہوں میں بدل رہی تھی۔ ان قہقہوں میں اس کے اپنے عکس کے ساتھ اب آہستہ آہستہ دوسرے بہت سارے لوگ بھی شامل ہونے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ پوری دنیا، پوری کائنات ان قہقہوں میں شامل ہوگئی تھی۔ اس نے گلدان اٹھا کر پوری قوت سے آئینے پر دے مارا اس کے سر میں شدید قسم کے دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ فرش پر گر پڑا تھا۔ وہاں بکھرے کئی کانچ اس کے جسم میں چبھے تھے۔ شیشے کے وہ سب ٹکڑے اب بھی اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ بے بسی سے انہیں خود پر ہنستا دھندلی دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ پورے پندرہ دن ہسپتال میں رہا تھا اور ان پندرہ دنوں میں سوائے ماں کے دوسرا کوئی فرد اس کے قریب نہیں تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ وہ مرتے مرتے بچا ہے۔ ہسپتال کے ان پندرہ دنوں میں وہ بالکل چپ، کسی بت کی مانند ساکت اور خاموش رہا تھا۔ فریدہ ہزار اس سے بولتیں، اسے بولنے پر مجبور کرتیں، وہ اپنے اندر کا سارا دکھ سارا کرب سب کچھ ان کے اپنی ماں کے سامنے بول کر، رو کر باہر نکال دے۔ وہ روتے ہوئے بے بسی سے اس کی منت تک کرتیں اور ان کی ہر بات کے جواب میں اس کی ایک چپ ہوتی۔ وہ ہسپتال میں پہلی بار کچھ بولا بھی تو تب جب اس کی پیہم چپ، زندگی سے...... بےزاری اور نفرت سے خائف ہوتی، سہمتی اس کی ماں نے اس کے سامنے روتے ہوئے وہ نام لیا۔

''اشعر! خود کو سنبھال لو۔ کیا اس بدکردار، نیچ لڑکی کے کرتوتوں کی سزا تم خود کو دو گے؟ وہ بے غیرت، بدکردار۔''

''ممی! لائٹ بند کر دیں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' اس کے سخت، دوٹوک لہجے میں یہ تنبیہہ واضح طور پر موجود تھی کہ وہ یہ نام، یہ ذکر دنیا کے کسی بھی فرد سے چاہے وہ اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو سننا نہیں چاہتا۔

پندرہ دن ہسپتال میں رہ کر جب وہ اپنے گھر واپس آیا تب وہ ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ گوشت پوست سے بنا، بظاہر ایک زندہ انسان جو سوچتا، سمجھتا سب کچھ ہے پر محسوس کچھ نہیں کرتا۔ وہ اپنی محسوس کرنے کی تمام حسیات گنوا کر زندگی میں واپس آیا تھا۔ وہ دفتر جانے لگا تھا، وہ انسانوں کی اس دنیا میں لوٹ آیا تھا، جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ مگر وہ اس دنیا میں اب رہتا یوں تھا جیسے دنیا سے، زندگی سے، لوگوں سے، رشتوں سے بے نیاز اور نالاں کوئی شخص رہا کرتا ہے۔ اسے زندگی سے، لوگوں سے، رشتے ناتوں سے ہر ایک چیز سے نفرت تھی، شدید نفرت۔

دنیا کے سامنے اس کا اور اپنا بھرم قائم رکھنے کو، اس کی عزت برقرار رکھنے کو اس کی ماں نے بڑے اچھے اچھے بڑے مضبوط جھوٹ

بولے تھے۔ ایسے مضبوط اور سچے لگتے جھوٹ جن کے جھوٹ ہونے کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی بہو، ان کے بیٹے سے کچھ گھریلو اختلافات کے سبب روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ ایک روٹین کی سی بات، ہر گھر میں ہونے والی روایتی میاں بیوی کی باہمی چپقلش۔

وہ اپنی ذات کا اعتماد، مان، فخر، غرور، سب گنوا کر اس دنیا میں واپس آیا تھا۔ اپنی نظروں میں گر جانے کے بعد اب اسے دنیا کے کسی بھی فرد کی نظروں میں اپنی عزت قائم رہنے یا نہ رہنے سے کوئی مطلب، کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس کے لیے اب ہر جذبہ، ہر احساس بے معنی تھا۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں رہتا تھا وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں تھا۔

خرد احسان......اس نام کی لڑکی کو اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ ہاں فقط اتنی دعا ضرور کی تھی کہ وہ زندگی بھر دوبارہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔ خرد احسان کا اس کے سامنے نہ آنا خود اس کے اپنے حق میں بہت بہتر تھا۔ کہ اگر وہ کبھی اس کے سامنے آئی تو اس کے ہاتھوں اس کا وہ حشر ہوگا جو اسے رہتی دنیا تک کے لیے عبرت کا نشانہ بنا دے گا۔ اللہ نے اسے بہت طاقت بہت اثر و رسوخ، بہت دولت دی تھی۔ اس کی پہنچ اس کی رسائی بہت دور تک تھی۔ اگر چاہتا تو چاہے وہ پاتال ہی میں کیوں نہیں، وہ اسے زمین کی تہہ سے، دنیا کے کسی بھی گوشے سے ڈھونڈ کر اپنے سامنے لے آتا۔ اس کی زندگی، اس کی موت ہر چیز کو عبرت کی مثال بنا دیتا۔ مگر ایسا کچھ اس نے کیا نہیں تھا۔ انتقام لینے کے لیے۔ نشان عبرت بنانے کے لیے بھی وہ اس چہرے کو کبھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عمر بھر یہ نام دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

رات جن ذلتوں کو اس نے پھر سے خود پر گزرتے محسوس کیا تھا، اس کے بعد لگا تھا، اب وہ کبھی بھی ان سب باتوں کو بھلا کر مسکرا نہیں سکے گا۔ شاید حریم بھی اسے خوشی نہیں دے سکے گی اور محض چند ہی گھنٹوں بعد اس نئی صبح میں دن کی روشنی میں وہ اپنی بیٹی کے ساتھ مسکرا رہا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ اس کی معصوم سی باتوں پر دل کھول کر ہنس رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔

اس کی بیٹی جیسے اس پر ایک جادوئی اثر رکھتی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی زندگی کو مرتا دیکھنے لگتا، اسے یقین ہونے لگتا کہ اب وہ مر رہا ہے، وہ اسی وقت اس کے پاس آ کر اس کے دل کو خوشگوار انداز میں دھڑکنے پر آمادہ کر دیتی۔

جب تک وہ جاگی نہیں تھی، وہ بے زاری سے بغیر ناشتہ کیے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا اور اس کے جاگتے ہی جیسے اس کی مردہ زندگی بھی جاگ گئی۔ وہ طویل نیند لے کر خوب دیر سے اٹھی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے ان باپ بیٹی نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا تھا اور پھر وہ اس کے پیچھے لگ گئی تھی، وہ اسے اس کا رات کا وعدہ یاد دلا رہی تھی۔

وہ حریم کو ساتھ لے کر ان کے اپارٹمنٹ سے قریب ہی ایک بڑی سی نرسری میں لے آیا۔ کچھ خالی گملوں کے علاوہ وہ مختلف پھولوں اور پودوں سے سجے گملے بھی خریدنے لگا۔ حریم کو صرف پھولوں اور پھلوں والے پودوں میں دلچسپی تھی۔ حریم نرسری آ کر وہاں مختلف پودوں اور گملے خریدے جاتے دیکھ کر بہت زیادہ خوش تھی۔ بیٹی کا یہ شوق اس کے علم میں اب آیا تھا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کا یہ شوق، یہ دلچسپی

اسے پہلے کیوں نہیں پتا تھی۔ اگر پتا ہوتی تو اس کے لیے سجائے اپنے اس اپارٹمنٹ کو وہ ڈھیر سارے ان ڈور اور آؤٹ ڈور پلانٹس سے سجا ڈالتا۔ اس کے اپنے گھر کا گارڈن کس قدر وسیع و عریض تھا، وہاں خود اس کے اپنے ہاتھوں کے لگے کتنے سارے پھلوں کے درخت تھے۔ اس کا دل چاہا وہ حریم کو وہاں لے جائے اور اس سے کہے، اسے جو بھی پلانٹس لگانے ہیں، فروٹس لگانے ہیں، سب یہاں لگا لے۔ اگر گارڈننگ میں حریم کے اس شوق کی اسے پہلے خبر ہوتی تو بجائے کرائے کا کوئی اپارٹمنٹ لینے کے وہ کرائے کا کوئی مکان تلاش کرتا، ایسا مکان جس میں بہت بڑا سا لان بھی ہوتا۔ فی الوقت تو حریم کا پھلوں کا شوق وہ گملے میں لگے لیموں کے پودے ہی سے پورا کر سکتا تھا۔ باقی اس نے سارے مختلف پھولوں والے گملے لے لیے۔ وہ اتنے ڈھیر سارے گملے تھے کہ پہلے چکر میں وہ لفٹ میں حریم کے ساتھ آدھے گملے رکھ کر لا پایا اور باقی کے حریم کو اپارٹمنٹ چھوڑ دینے کے بعد اگلے دو چکروں میں۔ جتنی دیر اس نے تمام گملے بالکونی میں ترتیب سے رکھے، حریم کو اتنی دیر وہیں اپنے قریب کرسی ڈال کر اس پر بٹھائے رکھا، ان کی بالکونی کافی کشادہ اور بہت بڑی تھی، مگر ان ڈھیر سارے گملوں نے اس پوری خالی جگہ کو بھر دیا تھا۔

جب گملے ترتیب سے لگانے کا کام ختم ہوا، تب اس نے حریم کو اپنے پاس بٹھالیا، وہ اس کے ہاتھ سے پنیریاں لگوا رہا تھا، اس کے ہاتھ سے بیج ڈلوا رہا تھا۔ جس پودے میں پانی ڈالتا، اس میں پانی بھی اس کے ہاتھ سے ڈلوا رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے ایک پھول کا بیج ڈلوانے لگا تو وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر قدرے خفگی سے بولی۔

''پاپا! حریم سیڈ خود ڈالے گی۔ حریم کو سیڈ ڈالنا آتا ہے۔''

وہ حیرت سے آنکھیں واکیے بیٹی کا باغبانی کا شوق دیکھ رہا تھا۔

اس کے لگائے ایک پودے کو اس کے ساتھ بیٹھی حریم پلاسٹک کے چھوٹے شاور سے پانی دے رہی تھی اور اس کی چشم تصور اسے اٹھارہ انیس برس بعد کا ایک خوش گوار منظر دکھا رہی تھی۔ اس کے گھر کا وسیع و عریض گارڈن تھا۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے، اس کی آنکھوں، ماتھے اور ہونٹوں کے گرد کئی گہری لکیروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ وہاں کسی کیاری میں ایک پودا لگا رہا تھا اور اس کے قد کے برابر آتی اس کی بہت حسین نوجوان بیٹی اس کے ساتھ کھڑی تھی، جیسے آج وہ اسے بتا رہا تھا کہ بیج ایسے نہیں، ایسے ڈالتے ہیں اور پودوں کو پانی ایسے نہیں، ایسے دیتے ہیں۔ ایسے ہی وہ ہنستے ہوئے شوخ لہجے میں اسے بتا رہی تھی۔

''پاپا! آپ واقعی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ یہ پودا یہاں نہیں، ادھر والی کیاری میں لگانا چاہئے تھا۔ وہاں دھوپ زیادہ آتی ہے۔ لگتا ہے پاپا! آپ بڑھاپے میں گارڈننگ بھولتے جا رہے ہیں۔'' وہ خود کو بوڑھا کہے جانے پر اسے مصنوعی خفگی سے گھور رہا تھا، وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس نے بے اختیار اللہ سے دعا کی کہ وہ اسے یہ منظر دیکھنا نصیب کرے۔ وہ اپنی پیاری بیٹی کو لمبی عمر، صحت اور خوشیاں پاتا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اس نے محبت بھری نظروں سے حریم کو دیکھا۔ اس نے صرف زمین پر ہی جا بجا مٹی کا ڈھیر نہیں بکھیرا تھا، ساتھ اپنے چہرے، ہاتھ، پاؤں اور کپڑوں پر بھی خوب مٹی لگائی تھی۔ اس کے گالوں، ناک اور ماتھے پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ پوری طرح مٹی میں سنے

ہوئے تھے اور کپڑوں کا تو خوب ہی شاندار حال کیا تھا، وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستا رہا۔

پورے دو گھنٹے گملوں کے ساتھ، پودوں کے ساتھ مصروف رہ کر وہ دونوں اندر آئے تھے۔ وہ اسے گود میں اٹھائے اندر آیا تو ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی خرد، حریم کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر ایک باؤل رکھا تھا اور وہ اس میں پتا نہیں کیا مکس کر رہی تھی۔

''یہ آپ کیا حلیہ بنا کر آئی ہیں؟'' جو کام وہ کر رہی تھی، اسے ویسا ہی چھوڑ کر اس نے آگے بڑھ کر حریم کو اس کی گود سے لیا۔

''ماما! حریم نے سیڈ ڈالے ہیں۔''

وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''پاپا! پلانٹ کب نکلے گا؟'' گویا کوئی جادو تھا، ادھر بیج بوئے جائیں گے، ادھر پودا نکل آئے گا۔

''تھوڑے دن لگیں گے پرنس!

''باقی باتیں بعد میں، اب پہلے چل کر نہالو۔ میں ڈونٹس بنا رہی ہوں، ان کی ڈیکوریشن کرنی ہے۔'' حریم سے باتیں کرتی خرد اسے وہاں سے لے گئی۔ اپنی ٹی شرٹ، جینز اور ہاتھوں پر اوپر تک جا بجا گیلی مٹی کے نشان اور داغ دھبے دیکھ کر مسکراتا وہ بھی دوبارہ نہانے اور لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں آ گیا۔

حریم کو نہلا دھلا کر لباس تبدیل کروانے کے بعد وہ اسے لیونگ روم میں لے آئی کہ اشعر بھی وہیں صوفے پر بیٹھا سنڈے کے اخبار کا کوئی پزل حل کر رہا تھا۔ حریم بھاگتی ہوئی اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اس سے کوئی بات کرنے لگا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ اشعر اور حریم کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں اسے کچن میں سنائی دے رہی تھیں۔

حریم نے کل اس سے ڈونٹس کی فرمائش کی تھی۔ حریم کو ڈونٹس کھانے سے زیادہ ان کی سجاوٹ کرنے میں مزا آتا تھا۔ وہ جب بھی ڈونٹس بناتی، تو ان کو تیار کر لینے کے بعد ان کے اوپر سجانے کا سارا سامان لے کر حریم کو اپنے ساتھ کھڑا کر لیا کرتی۔ کھانے کی مختلف کلرفل اشیاء کے ذریعے ڈونٹس کی سجاوٹ کا یہ کام حریم کے لیے بے حد ایڈونچرس اور انجوائے منٹ والا ہوا کرتا تھا۔ ڈونٹس کی سجاوٹ کا مرحلہ آ گیا تو اس نے میز پر لا کر سارے فرائی اور بیک ہوئے ڈونٹس رکھے، آئسنگ شوگر، چاکلیٹ سیرپ اسٹرابری سیرپ، ایپل جیلی، اسٹرابری، almond paste چھوٹے چھوٹے ملک چاکلیٹ کے ٹکڑے، چاکلیٹ کے کلرفل بینز (Beans)، اور ڈونٹس کی سجاوٹ کا دیگر سامان لا کر میز پر رکھا پھر حریم کو بلانے لیونگ روم...... میں آ گئی۔ وہاں آئی تو پتا چلا، اسکول، اسکول، کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا دوپٹہ اوڑھے حریم ٹیچر بنی رائٹنگ بورڈ پر نیلے رنگ کے مارکر سے کچھ لکھ رہی تھی۔ اور سامنے کرسی پر اشعر اس کا اسٹوڈنٹ بن کر بیٹھا تھا۔ حریم کی پلاسٹک کی دونوں کرسیاں بھی اشعر نے وہیں، غالباً اس کی فرمائش کے تحت لا کر اپنی کرسی کے برابر رکھی تھیں۔ اور ان دونوں پلاسٹک کی کرسیوں پر اس نے اپنی ڈولز کو بٹھا رکھا تھا۔ وہ یونہی اپنی گڑیاؤں کو اپنی اسٹوڈنٹس بنا کر کلاس روم سجایا کرتی تھی۔

''الف سے انار، ب سے؟''

''ٹیچر! میں بتاؤں؟''اشعر نے اپنی مسکراہٹ دبائے ہاتھ اٹھایا۔حریم نے کسی ٹیچر ہی کے انداز میں ''یس'' کہا۔

''بندر۔''

''ب سے بلی۔''حریم نے خفگی سے اپنے نالائق شاگرد کو گھورا۔ چونکہ اس کی بک میں، ب سے بلی ہی لکھا ہوا تھا۔ وہ اب اپنے نالائق شاگرد کو شدید کوئی ڈانٹ پلانے والی تھی جب وہ مسکراتی ہوئی ان دونوں کے پاس چلی آئی۔

''چلیے ٹیچر صاحبہ! آپ کے فیورٹ ڈونٹس تیار ہوگئے ہیں۔اب انہیں اچھا اچھا سا ڈیکوریٹ کر دیجئے۔''اس نے خوشی سے سر ہلایا۔

''چلیں پاپا! ڈونٹس ڈیکوریٹ کریں گے''اس نے ہاتھ پکڑ کر اشعر کو اٹھانا چاہا جو فوراً ہی کھڑا ہو گیا تھا اور اسے بھی گود میں اٹھا لیا تھا۔وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ڈائننگ ٹیبل تک آ گئے۔

حریم کو اشعر نے کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔وہاں ڈونٹس اور ان کی سجاوٹ کا سارا سامان دیکھ کر اشعر سمجھ چکا تھا کہ حریم کو کیا کرنا ہے سو مسکراتے ہوئے اس سے بولا۔

''پرنسس! مقابلہ کرتے ہیں۔دیکھتے ہیں کس کے ڈونٹس زیادہ اچھے ڈیکوریٹ ہوں گے۔میں اور حریم ایک ٹیم میں اور ماما دوسری ٹیم میں اور جج بنے گی زینت۔''حریم نے تالی بجا کر خوشی کا اظہار کرتے فوراً ہامی بھری۔

''ہاں پاپا! بہت مزا آئے گا۔''

وہ ان دونوں کی بحث سے لطف اندوز ہوتی خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

''پاپا! ماما کی ڈیکوریشن اچھی ہے۔''اس کے تیار کر کے رکھے ڈونٹس کو بغور دیکھتے حریم کو احساس ہوا کہ ماما ڈونٹس کو پاپا سے زیادہ اچھا سجا رہی ہیں۔اس نے پاکستانی سیاستدانوں کو مات کرتے یک دم ہی اپنی پارٹی اور اپنی وفاداری تبدیل کر لی۔''حریم! ماما کی ٹیم میں ہے۔''

اشعر نے اس کی توتا چشمی اور بے وفائی پر اسے مصنوعی خفگی سے گھورا جبکہ وہ بیٹی کی چالاکی پر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

''آ جائیے زینت صاحبہ! جج کے فرائض سرانجام دینے۔ذرا دیکھ کر بتائیے کس نے ڈونٹس زیادہ اچھے ڈیکوریٹ کیے ہیں۔''اشعر نے کچن میں کام کرتی زینت کو یہیں کھڑے کھڑے زور سے آواز دی۔زینت ایپرن سے گیلے ہاتھوں کو خشک کرتی ڈائننگ روم میں آ گئی۔

وہ خرد اور اشعر کے ہنسی ضبط کرتے چہروں کو دیکھ کر اس کھیل کا سارا پس منظر سمجھ چکی تھی تب ہی فوراً ہاتھوں سے حریم کے ڈونٹس والی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

''حریم جیت گئی۔حریم جیت گئی۔''زور زور سے تالیاں پیٹ کر حریم نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

اشعر چھٹی کے اس پورے دن گھر پر رہا تھا۔اس کی کاروباری اور سوشل مصروفیات کس طرح کی ہوتی تھیں وہ جانتی تھی۔شاید ان

دنوں اس نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر رکھی تھیں۔

شام میں وہ حریم کو قریبی پارک لے گیا تھا۔ حریم وہاں سے واپس آئی تو اشعر کو گود میں چڑھی لدی پھندی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں خوب بڑے سائز کے دو غبارے تھے' غباروں کا باقی ڈھیر اشعر کے ہاتھوں میں تھا۔ کئی رنگوں اور کئی طرح کے لگتا تھا گویا کسی غبارے والے کے پاس موجود سارے کے سارے غبارے ہی وہ دونوں خرید کر لے آئے ہوں۔ ساتھ ہی اشعر کے ہاتھوں میں کھانے پینے کی کئی طرح کی اشیاء سے بھرے شاپرز بھی تھے۔ اتنی تفریح اور بھرپور شاپنگ کر کے آئی تھی پھر بھی حریم کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''یہ گھر آتے ہی منہ کس خوشی میں پھلایا ہے پرنس آپ نے؟'' اشعر نے تعجب سے اس کے پھولے منہ کو دیکھا۔ باپ کی بات نظر انداز کر کے اس نے اپنی بانہیں اس کی طرف پھیلائیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے گود میں لیا تو اس کی گود میں آتے ہی وہ منہ پھلا کر روٹھے لہجے میں بولی۔

''پاپا نے حریم کو سی سا پر نہیں بٹھایا۔'' اشعر اسے گھورتا جھٹ اس کے قریب آیا۔

''پرنس! تم تو بڑی چیز ہو۔ پارک میں کیا کہا تھا اگر سارے بیلونز اور اپنی پسند کی کھانے کی ساری چیزیں ملیں گی تو دوستی ہو جائے گی۔''

اشعر نے اسے جھولوں پر زیادہ دیر بیٹھنے سے روکا ہوگا اور اس چیز سے وہ خفا تھی۔

''اب بابا' ماما اور حریم بیلونز سے کھیلیں گے۔ پارک میں یہی پرامس ہوا تھا نا؟'' اشعر نے کہا جواباً اس نے پھولے منہ ہی سے اثبات میں سر ہلایا۔ کھیل میں لگ کر حریم کا آف موڈ خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔

رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا' زینت ان لوگوں سے کھانے کا آ کر پوچھ چکی تھی۔ حریم کھیل ختم کرنے کے لیے ابھی آمادہ نہیں تھی۔ حالانکہ اب وہ تھکنے لگی تھی۔

''تب ہی اچانک اشعر کا موبائل بجنے لگا اشعر نے اسکرین دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم ممی!'' اس نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ اس کا لہجہ بھرپور محبت کی واضح عکاسی کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھی اور غبارے کے پیچھے جاتی حریم کو گود میں اٹھا کر لیونگ روم سے باہر نکل آئی۔ حریم کے احتجاج کی پروا کیے بغیر جتنی دیر میں اشعر کو اس کے سلام کا دوسری جانب سے جواب موصول ہوا ہوگا اتنی دیر میں وہ وہاں سے باہر آ گئی تھی۔ باہر آ جانے کے بعد اسے اشعر کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ممی! آپ کیسی......'' وہ حریم کو لے کر اپنے اور حریم کے مشترکہ کمرے میں آ گئی تھی۔

اشعر نے خرد کو باہر جاتے تعجب سے دیکھا۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی وہ جس طرح ایک دم سے اٹھ کر حریم کو وہاں سے لے گئی تھی وہ بہت عجیب سا انداز تھا۔ ماں سے ایک اتنی بڑی بات اب تک چھپائے رکھنے پر وہ ان سے بہت شرمندہ تھا۔ جب وہ سب کچھ جان

جائیں گی تب...... اتنی بڑی اور اہم بات سے بے خبر رکھے جانے پر یقیناً اس سے ناراض ہوں گی۔ مگر وہ ان سے معافی مانگ کر' اپنے ایسا کرنے کی وجہ سے آگاہ کر کے انہیں منا لے گا۔ انہیں دکھ' پریشانی اور ٹینشن دینے سے بدر جہا بہتر تھا کہ وہ ان کی تھوڑی سی ناراضی سہہ لے۔ حالانکہ دل ماں کے لیے شدید دکھ میں مبتلا ہوا تھا۔ اس کی ماں جو اسے دوسری شادی کے لیے آمادہ کرتے اکثر بڑی حسرت سے کہا کرتی ہیں کہ ''کیا ان کی تقدیر میں پوتے پوتی کی خوشی دیکھنا نہیں لکھا۔'' جانتی ہی نہیں کہ ان کی ایک پوتی ہے۔ ان کی وہ پوتی جسے ان کی بہو نے پچھلے چار سالوں سے ان سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کے دل اور دماغ میں اس وقت کون سی سوچیں' کون سے خیال آرہے تھے۔ ان سب کو نظر انداز کر کے وہ بظاہر معمول ہی کے انداز میں ہنستا مسکراتا ماں سے باتیں کرتا رہا۔

''تم سے بات کرنا ہو تو بندہ یا تو تمہارے موبائل پر کال کرے یا آفس میں کہ میرا بہت مصروف بیٹا میری موجودگی میں گھر رات گئے واپس آتا تھا تو آج کل تو میرا خیال ہے ساری رات ہی آفس میں گزاری جاتی ہو گی۔ آج سنڈے ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ کام کے معاملے میں میرا جنونی بیٹا اس وقت بھی آفس ہی میں پایا جاتا ہو گا۔'' وہ ہنس کر بولیں اور وہ بھی جواباً ہنس پڑا۔

''اتنا کام کرنے والا بھی نہیں ہوں۔ فی الحال تو ایک بہت اچھی سی جگہ پر چھٹی کے اس دن کو انجوائے کر رہا ہوں۔ آپ ہیں نہیں تو بندہ گھر پر کس کے لیے رکے۔''

''بہت خوش لگ رہے ہو؟''، وہ ماں تھیں اور اتنی دور بیٹھے صرف اس کے لہجے سے اس کی خوشی کو پہچان گئی تھیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ زندگی کے اور خوشیوں کے جو رنگ ان دنوں وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ اس نے آج تک کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ زندگی میں بعض بظاہر اتنی چھوٹی چھوٹی بچکانہ سی باتیں بھی کسی کو اس قدر خوشی دے سکتی ہیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ آج اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ گارڈننگ کی ہے، پارک میں جھولے جھولے ہیں، اور غبارے سے کھیلا ہے۔ وہ یہ سن کر حیران ہوتیں یا ہنستیں۔ وہ ان کا اتنا سوبر، اتنا میچور بیٹا ایسی کوئی باتیں کہتا تو پتا نہیں ان کا پہلا ردعمل کیا ہوتا۔

☆......☆......☆

وہ اور رضا زیدی ساتھ لنچ کر رہے تھے۔ کام کو جنون کی طرح سر پر سوار رکھتے اس اچھے سے ریسٹورنٹ میں اچھا سا لنچ انجوائے کرتے بھی رضا زیدی کے سر پر بزنس ہی سوار تھا۔ وہ لندن کی ایک کمپنی کے ساتھ ہونے والی ان کی ڈیل اور اس ڈیل کے فائنل ہونے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے۔ ان کے ایک Competitor ہی کا ''ذکر خیر'' کرنے میں مصروف تھا۔ روزانہ آفس سب سے پہلے آنا، وہاں سب سے آخر میں اٹھنا اور اتوار کا دن بھی آخر و بیشتر آفس ہی میں گزارنا اس کا معمول تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کافی کے سپ لیتے رضا زیدی نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی اشعر ہی کی طرح چین اسموکر تھا۔

''نو تھینکس زیدی!'' نفی میں سر ہلاتے اس نے سگریٹ لینے سے انکار کیا۔

''تم سگریٹ کے لیے منع کر رہے ہو؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی سانس لینے سے انکار کر دے۔'' رضا ہنستے ہوئے بولا۔

''سب خیریت تو ہے نا میرے بھائی؟'' اس نے پیکٹ سے اپنے لیے ایک سگریٹ نکالی۔

I,m trying to quit'' سگریٹ منہ میں دباتا رضا زیدی بہت زور سے کھانسا۔

'trying to quit'' یقین نہ کرنے اور مذاق اڑانے والے انداز میں اس نے اشعر کے الفاظ دہرائے۔

''خیر تو ہے ناں اشعر حسین صاحب! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔''

''یہ میرے لیے آسان نہیں ہے مگر اس عادت کو چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس کی سنجیدگی کے جواب میں رضا زیدی کی معنی خیز مسکراہٹ اور زبردستی کی کھانسی تھی جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''ایک بندہ اپنی کوئی بری عادت چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی حوصلہ افزائی ہی کر دو۔''

''بری عادت؟'' وہ معنی خیزی سے پھر کھانسا۔ ''اسموکنگ کرنا بری عادت ہے۔ گندی بات ہے، اس اچھے نیک اور فرماں بردار بچے کو یہ بات کس ہستی نے سمجھائی ہے؟'' رضا کے مذاق اڑاتے انداز کے جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ سارہ کا نام دیکھ کر وہ کال ریسیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں کر لی۔

''ہاں سارہ! کیسی ہو؟''

''اپنی خوش قسمتی پہ ناز کر رہی ہوں۔ جناب اشعر حسین نے میری کال ریسیو کر لی۔ مجھے اتنی عزت بخش دی۔'' وہ جواباً کھلکھلائی۔ وہ جواب میں بالکل خاموش رہا۔

''سوری، تم شاید مائنڈ کر گئے۔'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

''تم بزی تو نہیں تھے؟ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' سامنے بیٹھے رضا کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہے وہاں میں بزی بھی ہوں اور ڈسٹرب بھی بہت ہو رہا ہوں۔

سارہ اپنے مختلف فیشن ایونٹس کی اسپانسر شپ کے لیے دو تین بار اس کے آفس آ چکی تھی اور رضا اس سے مل چکا تھا۔ رضا ہی کیا کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی سمجھ جاتا کہ وہ اسے کس طرح دیکھتی، کس طرح ملتی اور کس طرح بات کرتی ہے۔ وہ آنکھوں میں محبت، عقیدت اور خود سپردگی سموئے، اپنا پورا وجود اس پر دان کرنے کو تیار، اپنی پوری حیات اس پر نچھاور کرنے کو بے قرار ایک لڑکی اپنی زندگی کے قیمتی ماہ وسال اس کے پیچھے برباد کر رہی ہے۔ سارہ کے لیے یہ تمام افسوس، ہماری سب اپنی جگہ مگر وہ اس کے ایسے ہر انداز اور ہر بات سے بے نیاز ہوتا تھا۔ چڑتا تھا تب ہی تو اس سے کتراتا تھا۔

''بزی تو ہوں۔ خیر تم کہو کیسے فون کیا؟'' وہ قدرے بے مروتی سے بولا۔

''میں نے تم سے اس روز ذکر کیا تھا ناں اپنے فیشن شو کا۔ 2007ء کے لیے میرا برائیڈل کلکشن۔ سنڈے کو فیشن شو ہے اور اس میں تمہیں بھی آنا ہے نو ایکسکیوز، نو بہانہ ایک انٹرنیشنل میڈیا کمپنی شو کو اسپانسر کر رہی ہے اور انہوں نے ڈیزائنر کے طور پر مجھے سلیکٹ کیا

ہے Solo presentation ہے میرے کام کی۔ بہت بڑا ایونٹ ہے میرے لیے۔صرف پاکستان سے ہی نہیں بلکہ انڈیا، لندن اور پیرس سے بھی کئی سلیبر یٹیز اور فیشن اور ٹیکسٹائل انڈسٹری سے وابستہ لوگ آ رہے ہیں۔تم آؤ گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''سوری سارہ! سٹرڈے کو تو میں یہاں ہوں گا ہی نہیں۔فرائی ڈے کو سنگا پور جا رہا ہوں کچھ آفیشل کام ہیں۔وہاں سے جلدی سے جلدی بھی آیا تو اگلے منڈے تک میری واپسی ہوگی۔اینی ویز انوائیٹ کرنے کا بہت شکریہ اور میں ہوں یا نہیں میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔تمہارا فیشن شو ان شاء اللہ بہت کامیاب رہے گا۔اچھا ٹھیک ہے پھر اللہ حافظ۔''

''سارہ اجمل؟'' رضا نے معنی خیزی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔اس نے بے زاری سے سر اقرار میں ہلا دیا۔

''اچھا تو آپ سنگا پور جا رہے ہیں اور وہ بھی کافی سارے دنوں کے لیے؟'' رضا نے اسے اس کے جھوٹ پر جیسے ملامت کی۔

''اتنی خوب صورت لڑکی سے جھوٹ بولتے، اسے نظر انداز کرتے تمہارا دل نہیں دکھتا؟ سچ کہتا ہوں تم جیسا بدذوق میں نے آج تک نہیں دیکھا۔'' رضا کی باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

''ایسی حسین لڑکی مجھے آدھی رات کو نیند سے اٹھا کر بھی کسی جگہ بلائے گی تو میں سر کے بل چل کر جاؤں گا۔''

''یونہی تو نہیں عطیہ بھابھی تم سے مشکوک رہتیں۔آفس دیر تک رکو تو فون کر کے مجھ سے تصدیق ضرور کرتی ہیں کہ ان کے شوہر صاحب آفس ہی میں ہیں یا آفس کا کام لے کر کہیں اور پہنچے ہوئے ہیں۔'' ویٹر کو فارغ کرتے اس نے رضا پر جوابی چوٹ کی۔

وہ دونوں ساتھ چلتے ریسٹورنٹ کے دروازے سے باہر نکلنے لگے تھے جب رضا کو پیچھے سے کسی نے آواز دی۔وہ رضا کے دوست تھے۔رضا گرم جوشی سے اپنے دوستوں کی طرف بڑھا جب کہ وہ اسے اس کے دوستوں کے ساتھ مصروف چھوڑ کر باہر اپنی گاڑی کے پاس آ گیا۔وہ گاڑی کا دروازہ کھول ہی رہا تھا جب ایک بار پھر اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔اتنی جلدی دوبارہ کال؟ ابھی گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ قبل لنچ کے لیے اٹھنے سے پہلے تو اس کی گھر پر خرد اور حریم سے بات ہو چکی تھی۔گھبراہٹ میں اس نے فوراً کال ریسیو کی۔دوسری طرف سے آنے والی آواز حریم کی تھی۔اس کی آواز سنتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔

''پاپا۔''

''ہاں پاپا کی جان! پاپا کی پرنسس کیسی ہے؟'' کچھ روٹھے روٹھے سے لہجے میں کہے گئے اس کے ''پاپا'' کے جواب میں وہ وارفتگی سے بولا۔

''پاپا! حریم کو zoo جانا ہے۔lion دیکھنا ہے۔ماما نہیں لے جا رہیں۔'' اس کا انداز شکایتی اور ماں سے بھرپور خفگی کا اظہار کرتا ہوا تھا۔

''اس بات پر موڈ آف ہے ہماری پرنسس کا؟ ہم خود لے کر جائیں گے اپنے بیٹے کو Zoo۔بس تم تیار رہنا۔'' اس کے حساب سے اس کے فوراً کیے گئے اس وعدے پر اسے خوش ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ خوش ہوئے بغیر اسی خفا اور ضدی انداز میں بولی۔

''شام میں نہیں۔حریم کو Zoo ابھی جانا ہے۔ پاپا! حریم کو ابھی جانا ہے۔'' اس کی ضدی آواز میں آنسوؤں کو محسوس کر کے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ آفس میں ابھی کون کون سے کام اس کے منتظر ہیں۔ اسے سب کچھ بھولنے لگا۔

''اچھا پاپا ابھی آ رہے ہیں۔ٹھیک ہے؟ تھوڑی سی دیر میں۔ اب جلدی سے آنسو صاف کرو۔'' اسے تسلی دے کر اس نے فون بند کیا تو رضا ریسٹورنٹ سے نکل کر اپنی طرف آتا نظر آیا۔ وہ اسے فون پر بات کرتا دور سے دیکھ چکا تھا، چنانچہ اس کے قریب آنے پر جیسے ہی اس نے یہ کہا کہ وہ ابھی آفس واپس نہیں جا رہا اسے کوئی ضروری کام ہے تو رضا معنی خیزی سے بولا۔

''جہاں سے فون تھا وہیں جانا ہے؟ اس نے سنجیدگی سے سر اثبار میں ہلایا۔

''کوئی لڑکی تھی نا۔؟ دیکھو جھوٹ مت بولنا۔ بات کرتے وقت جو تمہارے چہرے کی اتنی زبردست اور بھرپور مسکراہٹ میں نے ابھی دور سے دیکھی ہے وہ آج تک کبھی نہیں دیکھی اور ایسی شاندار مسکراہٹ صرف کسی حسین لڑکی سے بات کرتے وقت ہی چہرے پر آ سکتی ہے۔''

وہ جواباً کھل کر ہنسا۔''لگاتے رہو اندازے۔''

''اندازے نہیں مجھے یقین ہے بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ کہیں یہی تو وہ ہستی نہیں جس کی وجہ سے آپ جیسا چین اسموکر، اسموکنگ سے تائب ہونے کی باتیں کر رہا ہے۔'' وہ کچھ کہے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا ہاں اندر ہی اندر وہ رضا کی قیافہ شناسی پر محظوظ ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ اپارٹمنٹ پہنچ چکا تھا۔ اپنی بانہیں والہانہ پن سے باپ کی طرف پھیلاتے وہ اگلے پل اس کی گود میں تھی۔

''ٹھیک ہے، اب خوش ہو؟ دیکھ لو پاپا فوراً گھر آ گئے ہیں۔'' وہ اسے لے کر اندر آ گیا۔ خرد کچن میں کھڑی کچھ کر رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر اسے اور پھر حریم کو دیکھا۔ حریم کی طرف اس نے جن خفگی بھری نظروں سے دیکھا تھا انہیں دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حریم سے کسی بات پر ناراض ہے۔

''پاپا! ماما، حریم سے کٹی ہیں۔'' وہ اسے لے کر لیونگ روم کی طرف آ گیا تب حریم نے خود ہی اسے بتایا۔

''کس بات پر؟ آپ نے کوئی شرارت کی تھی؟ ماما کو تنگ کیا تھا؟'' اس نے بغور بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

''حریم نے آپ کو فون کیا تھا، ماما کٹی ہو گئیں۔'' فون کرنے پر بیٹی سے ناراض ہے اس بات پر وہ خاصا حیران ہوا۔ نمبروں کو چاہے وہ پہچانتی بھی تھی تب بھی فون پر کوئی نمبر ملانا ابھی وہ جانتی نہیں تھی۔ اس نے حریم سے پوچھا تو کچھ فخریہ لہجے میں وہ بولی۔

''حریم نے خود کیا تھا؟''

''خود؟ کیسے؟'' وہ اسے ساتھ لے کر صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور حریم اس کے چہرے پر موجود تجسس اور دلچسپی کو محسوس کر کے پاس رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''اس سے۔'' اس نے redial کے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اکیسویں صدی سے تعلق رکھتی اپنی بیٹی کی ذہانت پر عش عش کر

اٹھا۔

''ماما نہار ہی تھیں، حریم نے آپ کو فون کر دیا۔ ماما آ کر کٹی ہو گئیں۔ پاپا کو فون کیوں کیا، حریم تم گندی بچی ہو۔ حریم تم ضدی ہو۔''

''پاپا!'' وہ اس کے کندھوں کے گرد ہاتھ پھیلا کر بولی۔

''ہاں پرنسس۔''

''پاپا! ماما، حریم سے کٹی ہیں۔'' اس کی پریشانی کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

''ماما اس بات پر ناراض ہیں ناں کہ حریم نے خود پاپا کو فون کیوں کیا تھا؟ ہم ماما سے جھوٹ موٹ کہہ دیتے ہیں کہ حریم نے فون نہیں کیا تھا، فون تو پاپا نے کیا تھا۔ ماما تو نہار ہی تھیں انہیں تھوڑی پتا چلے گا کیسا؟'' مگر حریم نے یک دم ہی نفی میں سر ہلایا۔

''پاپا! جھوٹ بولنا گندی بات ہے۔'' وہ جہاں کا تہاں حیرت سے آنکھیں وا کیے اپنے چار سال کی بیٹی کو اپنی ایک غلطی کی اصلاح کرتے دیکھ رہا تھا۔ ایک، دو پل اپنی حیرت اور خوشی پر قابو پانے کی کوشش کرنے کے بعد اس نے بیٹی کو فخر سے دیکھا۔ اس کے لبوں سے ایک اتنی اچھی بات سن کر اس کا دل فخر اور خوشی سے بھر سا گیا تھا۔

''بالکل ٹھیک بات کہی حریم نے۔ حریم کو اتنی اچھی باتیں کس نے بتائیں؟''

''حریم کی ٹیچر نے؟''

''ماما نے۔'' حریم نے ٹیچر کے لفظ پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ماما بولتی ہیں جھوٹ بولنا گندی بات ہے۔ جھوٹ بولنے سے اللہ میاں نراض (ناراض) ہوتے ہیں۔'' جس کی اپنی پوری زندگی جھوٹ، دھوکے اور فریب سے عبارت تھی وہ بیٹی کو سچ بولنے کی نصیحت کیا کرتی تھی؟ جھوٹ، اور فریب کو سرتاپا اختیار کرنے والی بیٹی کو اچھائیوں اور سچائیوں کی ترغیب دیتی تھی؟ وہ حیرت زدہ حریم کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

یک دم ہی اسے خیال آیا کہ وہ عورت بیوی چاہے جتنی بھی بری ثابت ہوئی ہو مگر ماں اچھی تھی۔ وہ بیٹی سے محبت کرتی تھی۔ اس نے بیٹی کو بہت اچھی تربیت دی تھی۔

وہ بہت آف موڈ کے ساتھ حریم کو zoo جانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ حریم کا بات بات پر چڑچڑا ہونا اور ضدی پن دکھانا، اس کی طویل بیماری کے سبب ہے اسے جو گھر میں ہزار طرح کی پابندیوں کے ساتھ ایک محدود زندگی جینا پڑ رہی ہے اس کے سبب ہے مگر پھر بھی وہ اس کے حد سے بڑھتے ضدی پن سے کوفت میں مبتلا تھی وہ اتنی ضدی ہو گئی تھی کہ ایک بار جو بات اس کی زبان پر آ جاتی اسے وہ جب تک پورا نہ کرا لیتی سکون سے بیٹھتی نہیں تھی۔

''ماما! آپ تیار ہوں۔'' حریم اس کے خفا خفا چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آئی۔ سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے بالکونی میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اشعر کو حریم کو گود میں اٹھائے بالکونی میں آتے دیکھا۔

''بھئی آپ ہماری پرنسس سے کیوں ناراض ہیں؟'' حریم کی طرف دیکھتے اشعر نے اسے مخاطب کیا۔ گویا سفارشی بنا کر باپ کو لایا گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بیٹی کی چالاکی اور ذہانت پر مسکرائی مگر بظاہر خفگی ہی سے بولی۔

''اس لیے کہ یہ گندی بچی بن گئی ہے کہنا نہیں مانتی ہے۔''

''اچھا آپ ابھی دوستی کرلیں۔ ہماری پرنسس آپ سے پرامس کررہی ہے آئندہ آپ کی ہر بات مانے گی۔''

باپ کی گود میں چڑھی وہ امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، اتنی مضبوط سفارش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔

''اگر آئندہ سے یہ کہنا مانا کرے گی تو پھر میں دوستی ہوں۔''

''بالکل کہنا مانے گی۔ اب آپ جلدی سے ہماری پرنسس کو Kiss کریں اور پھر ہمارے ساتھ zoo چلیں۔'' اس نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر حریم کو اشعر کی گود سے لے کر پیار کیا تھا۔

دو گھنٹے zoo میں گزار کر وہ لوگ اپنے اپارٹمنٹ واپس آئے تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ اپنی بلڈنگ کے اندر آکر وہ لوگ لفٹ کے انتظار میں آکر کھڑے ہوگئے۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر آکر رکی تو اس میں سے ایک فیملی باہر نکلی۔ خوش شکل اور خوش لباس ایک مرد، ایک عورت اور ان کے ساتھ دو پیارے سے بچے خوش باش اور پرفیکٹ قسم کا کپل۔ اور پھر وہ حیرت سے بری طرح چونکی جب اس نے اشعر کو اس آدمی کے سامنے ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔ اشعر تو صرف ٹھٹک کر رکا تھا مگر وہ بندہ۔

''ابے سالے! تو یہاں۔'' کہہ کر ایک ہی پل میں اس سے بغل گیر ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

نعمان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوا تھا اور کسی حد تک پریشان بھی۔ اس کے اور خرد کے بیچ جو بھی کچھ تھا وہ تو ان کی بالکل نجی بات تھی۔ وہ جو کچھ بھی سچائیاں تھیں مگر فی الحال سب سے بڑی سچائی یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ کھڑا تھا مگر جو بات ابھی ماں کو نہیں بتائی تھی چاہتا نہیں تھا کہ ماں سے پہلے اس سے کوئی اور واقف ہوسکے مگر اب اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوسکتا۔ نعمان اس کا یونیورسٹی کے دنوں کا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ اسے امریکہ میں ملا تھا۔ ان دونوں نے ایم آئی ٹی سے ایک ساتھ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھی تھی اور ان کی آپس میں گہری دوستی تھی۔

تعلیم مکمل کرکے اشعر امریکہ سے پاکستان واپس آگیا تب بھی اس کا اور نعمان کا آپس میں ہمیشہ رابطہ رہا۔ پاکستان آنے پر اس کے انوائٹ کرنے پر وہ ان کے گھر ڈنر پر بھی آیا تھا۔ اس موقع پر اس کی خرد سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد جو اس کی زندگی طوفان کی زد میں آئی تو وہ ساری دوستیاں اور سارے تعلقات بھول گیا۔ نعمان بے چارہ بہت عرصہ تک اس سے یک طرفہ دوستی نبھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کبھی فون کالز اور کبھی e-mails کے ذریعے مگر اس نے پلٹ کر کبھی دوست کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اب تو تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال سے اس کا نعمان سے سرے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ شاید وہ بے چارہ اس دوستی کو یک طرفہ طور پر نبھانے کی اپنی

کوشش سے تھک گیا تھا یا شاید اس سے ناراض ہوگیا تھا، تب ہی اس کی کالز اور mails آنی بند ہوگئی تھیں۔ نعمان سے وہ آخری بار واشنگٹن میں اس کے گھر میں ملا تھا تب نعمان کی بیٹی شاید چند ماہ کی تھی اس ملاقات کے چند مہینوں بعد ہی اس کی زندگی طوفانوں کی زد میں آگئی تھی اور اس کے بعد سے پھر اس کی نعمان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

''دوستی کا تعلق توڑ لیا، کیا شکل پہچاننا بھی چھوڑ دی۔'' اب اس کے گلے لگا وہ شکوہ کناں انداز میں بولا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ اور یہ زنانہ طعنے دینے کے بجائے یہ بتاؤ کہ کب سے آئے ہوئے ہو اور اب تک مجھ سے ملے کیوں نہیں۔'' نعمان کے شکوے پر دل میں شرمندہ ہوتے اس نے اس کا ہاتھ گرم جوشی سے تھام کر پوچھا۔

''آئے ہوئے چند دن ہوگئے ہیں اور آپ سے ملنے کا جہاں تک سوال ہے تو بندہ یہ جاننے کے باوجود کہ آپ مزید اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے پھر بھی ڈھیٹ اور بے غیرت بن کر تین روز قبل آپ کے گھر فون کر چکا ہے، وہاں سے اطلاع ملی تھی کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں، آپ کے فون نمبر آپ کا موبائل نمبر ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ آپ کے ملازم سے بھی یہ نمبرز لینے کی کوشش نہیں کی چونکہ میرا خیال تھا کہ پرانے تعلقات کا لحاظ کرتے اپنے ملازم سے میری کال کا سن کر ایک جوابی کال کرنے جتنی کرٹسی آپ شو کر ہی دیں گے۔ اسی امید پر وہاں اپنا کراچی میں اپنے گھر کا فون نمبرز وغیرہ سب کچھ چھوڑا تھا مگر دوست، دوست نہ رہا، پیار پیار نہ رہا۔'' پچھلے تین دنوں سے وہ واقعی گھر گیا ہی نہیں تھا۔ اس لیے دوست کا فون آنے کا پیغام نہ پہنچائے جانے پر کسی ملازم سے باز پرس کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''السلام علیکم بھابھی! کیسی ہیں آپ؟'' اسے دل بھر کر شرمندہ ہونے کے لیے چھوڑتے ہوئے نعمان، خرد کی طرف متوجہ ہوا جو پتا نہیں اسے پہچانتی تھی کہ نہیں۔ خرد نے کسی قدر حیرت بھرے انداز میں جواب دیا۔

''اور یہ گڑیا؟'' اس نے اشعر کی گود میں موجود حریم کو بغور دیکھا۔

''اس کا تو خون سفید ہوگیا۔ کم از کم آپ ہی مجھے میری بھتیجی کے ہونے کی اطلاع دے دیتیں۔'' وہ پھر بے تکلفانہ انداز میں خرد سے مخاطب تھا۔ وہ شکوے شکایات کرتے دوست کو کیا بتاتا کہ اس کی اس بھتیجی سے تو وہ خود چند دن پہلے ملا ہے کسی اور کو اس کی اطلاعات کیا پہنچاتا۔ مگر یہ سب ایک الگ قصہ تھا۔ اس وقت اپنے اس بے تکلف اور مخلص دوست کے سامنے اس ساری صورت حال کو وہ کس طرح ہینڈل کرے وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ شدید ترین مجبوری تھی کہ اپنی بلڈنگ میں اپنے اپارٹمنٹ کے اتنے پاس کھڑے دوست کو اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دینا ہی تھی۔ مگر دل میں وہ یہ دعا کر رہا تھا کہ کاش وہ اس وقت بہت جلدی میں ہو۔ وہ خود ہی اس کے گھر آنے سے معذرت کر لے۔ دل میں سوچتے الجھتے کب سے خاموش کھڑی نعمان کی بیوی سے سلام دعا کی وہ بینش سے دو، تین بار ملا ہوا تھا اور نعمان کی بیٹی علینا کو بھی دیکھا ہوا تھا ہاں دوسرے بچے کو آج وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

''بھابھی! اس کا طعنوں سے اتنی جلدی دل نہیں بھرے گا...... آپ اوپر چلیے۔'' اس نے بینش سے کہا۔

''طعنے؟ میرا دل چاہ رہا ہے تم سے ٹھیک ٹھاک قسم کا جھگڑا کروں۔ شادی ہم نے بھی کی، فیملی ہماری بھی ہے مگر تمہاری طرح

دوستوں کو بھلا کر اپنی زندگی میں ہم یوں مگن نہیں ہو گئے۔'' اسے ناراضی سے دیکھتے نعمان نے خود لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ یعنی وہ ان کے ساتھ ان کے گھر چل رہا تھا۔ وہ سب لفٹ میں داخل ہو گئے۔ اندر ہی اندر اس ساری صورت حال سے گھبراتے اور نعمان کے ممکنہ سوالات کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرتے وہ اوپر سے خود کو پرسکون ظاہر کرتا اس کے دونوں بچوں سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی بیٹی علینا، حریم سے تقریباً سال ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ اور بیٹا غالباً دو ڈھائی سال کا تھا۔ خرد ابھی تک بالکل خاموش تھی۔

فیملی کی کسی قریبی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ پاکستان آئے ہوئے تھے اور یہاں ان کی بلڈنگ میں بینش کے کوئی رشتہ دار رہتے تھے جن کے گھر وہ لوگ لنچ پر مدعو تھے اور اس وقت وہیں واپس جا رہے تھے کہ ان لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔

زینت نے گھر میں آنے والے ان پہلے مہمانوں کا حیرت سے استقبال کیا۔ اشعر، نعمان اور اس کی فیملی کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔ خرد بھی ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آ ئی تھی۔

''پرنس! فرینڈ شپ کرو، ہمارے گھر اتنے پیارے پیارے بچے آئے ہیں ان سے شیک ہینڈ کرو۔ انہیں اپنے toys دکھاؤ۔''

اس کے کہنے پر حریم نے علینا اور صفی سے ہاتھ ملایا۔ پھر خرد نے زینت کو آواز دے کر بلایا۔

''بچوں کو لیونگ روم میں لے جاؤ، کھیلیں گے۔'' زینت نے حریم کو گود میں اٹھایا اور پھر ان تینوں بچوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔

بینش کے چہرے پر حریم کو گود میں اٹھا کر لے جاتے دیکھ کر حیرت پھیلی۔ اس سے پہلے لفٹ کے سامنے کھڑے ہونے سے لے کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے تک حریم کو مسلسل اشعر کی گود میں دیکھ کر وہ سمجھی تھی کہ شاید لاڈ پیار میں اشعر نے بیٹی کو گود میں لے رکھا ہے مگر چار سال کی بچی جو خود آرام سے چل پھر سکتی تھی اسے جب ملازمہ نے بھی گود ہی میں لیا تب وہ کچھ حیران سی ہوئی۔

خرد، بینش سے بات کرنے لگی تھی۔ خرد اور بینش کی یہ پہلی ملاقات تھی اس لیے ابھی ابتدائی گفتگو کی جا رہی تھی۔ پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ صوفے پر سے اٹھنے لگی تو اسے اٹھتا دیکھ کر نعمان فوراً بولا۔

''بھابھی! آپ کو ابھی کوئی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کسی جلدی میں نہیں ان شاء اللہ آپ کے ہاتھ کا بنا ڈنر کھا کر جائیں گے۔ جو بھی چیز آپ اچھی بناتی ہیں بنالیں، تکلف کوئی نہیں، اور جلدی بھی کوئی نہیں۔ ہم نے لنچ کافی دیر سے کیا تھا۔ ڈنر بھی لیٹ ہی کریں گے۔'' دل بھر کے بے تکلفی کا مظاہرہ کر لینے کے بعد اس کے ''تکلف کوئی نہیں'' کہنے پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا جب کہ بینش نے شوہر کو گھورا تھا۔ وہ نعمان سے غیر متوقع ملاقات پر پریشان ہوا تھا، مگر اب اپنے ایک سچے اور مخلص دوست کی بے تکلفی کو انجوائے کر رہا تھا۔ خرد مسکراتی ہوئی واپس بیٹھ گئی تھی۔ نعمان نے خرد کے اٹھنے کا جو بھی مطلب سمجھا ہو مگر وہ جانتا تھا کہ خرد اور کسی بھی کام کے لیے اٹھی تھی مگر مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے ہرگز نہیں۔ ایک پل تو اس نے حیران پریشان نظروں سے نعمان کی بے تکلفانہ بات سنی اور پھر اس کا مطلب سمجھ کر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

پھر نعمان کے استفسار پر اس نے اسے حریم کی بیماری اور اس کی عنقریب ہونے والی ہارٹ سرجری کے متعلق بتایا تھا۔ نعمان اپنی

ساری چونچالی اور غیر سنجیدگی بھول کر یک دم ہی بے تحاشا سنجیدہ ہو گیا۔

''میں بھی اتنی دیر سے بغیر سوچے سمجھے گلے شکوے کیئے چلا جا رہا ہوں۔''

دونوں بڑی فکرمندی اور توجہ سے حریم کی بیماری سے متعلق اس کی ساری بات سن رہے تھے۔ خرد اس دوران خاموش رہی تھی۔

''پریشان مت ہو اشعر! ان شاءاللہ آپریشن کامیاب ہو گا۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نعمان نے اسے تسلی دی۔

خرد، حریم کو دیکھنے کے لیے اٹھ گئی، کہیں اپنے ہم عمر بچے دیکھ کر اس نے بھاگنا دوڑنا نہ شروع کر دیا ہو۔ بینش بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں یار! تمہیں وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ آخر شادی شدہ زندگی کا سات سالہ تجربہ رکھتا ہوں تم سے سینئر ہوں اور بہت پہلے سے جانتا ہوں کہ ساس اور بہو کا اختلاف جو بنیادی طور پر حق ملکیت کا اختلاف ہوا کرتا ہے، ان میں ٹھیک ٹھاک قسم کی شامت بے چارے بیٹے اور بے چارے شوہر ہی کی آتی ہے کس کو صحیح سمجھے، کس کا ساتھ دے؟ ماں کی سنو تو وہ اپنی جگہ بالکل حق پر لگتی ہے اور بیوی کی سنو تو وہ۔ سمجھ دار سے سمجھ دار مرد بھی ایسے موقع پر بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔ دونوں جانب اس سے حمایت کی امید کی جا رہی ہوتی ہے اور وہ دونوں میں سے جس کی بھی طرف سے بولے اگلا فریق لازماً اس سے ناراض اور برہم ہو جاتا ہے۔''

وہ الگ گھر میں رہنے کا کوئی جواز نعمان کو پیش کرنے والا تھا، مگر ابھی اس نے اپنی بات شروع کی ہی تھی کہ اس کی وضاحت کا مقصد سمجھتے نعمان نے اس کی بات کاٹتے بڑے ہمدردانہ اور تسلی آمیز لہجے میں اس سے کہا تھا۔ کم از کم دوست کے آگے وہ مزید کسی شرمندگی سے تو بچ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بیوی اور ماں کے بیچ اختلافات کے سبب اس نے اپنی فیملی کو لے کر علیحدہ رہائش اختیار کر لی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کیا وہ، خرد احسان اور حریم ایک ایسی مکمل اور خوش باش فیملی کا تاثر پیش کر رہے تھے جو اس کے دوست کو کوئی شک ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں اپنی فیملی کو لے کر علیحدہ رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ساتھ رہ کر صبح، شام کی تلخیوں سے بہتر ہے بیوی کو الگ رہائش فراہم کر دی جائے۔ باقی والدین کے جو حقوق ہیں وہ آپ الگ جگہ رک کر بھی پورے کر سکتے ہیں۔ اس طرح نہ بیوی کی حق تلفی ہوتی ہے نہ والدین ناراض ہوتے ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو امی، ابا واشنگٹن ہی میں ہیں مگر میں الگ رہ رہا ہوں۔ ہاں ان سے ملنے ہر دوسرے دن پابندی سے جاتا ہوں۔'' نعمان کے آگے اپنا بھرم قائم رہ جانے نے اسے جیسے ایک بہت بڑی مشکل سے بالکل نکال لیا۔

اور دوسری طرف خرد سوچ رہی تھی کہ اشعر نے اپنے دوستوں سے اتنی بڑی بات چھپائی ہوئی ہے، اسے حیرت ہوئی تھی۔ دوسروں کے دامن کو داغ دار کرنے اور اس پر کیچڑ اچھالنے والے کو اپنی عزت اتنی پیاری تھی کہ دوستوں تک کو اتنی بڑی، اتنی اہم بات سے لاعلم رکھا ہوا تھا جب اس کا تماشا لگایا ہی تھا تو پھر دوستوں کو بھی تو یہ بتا دینا چاہئے کہ اس کی بیوی ایک بدکردار عورت تھی اس لیے اس نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس میں چونکہ اپنی عزت کا بھی سوال تھا تو دوستوں سے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔

وہ پہلی نظر میں نعمان کو پہچان نہیں سکی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد اسے وہ یاد آ گیا۔ اس رات نعمان ڈنر کے بعد بھی کافی دیر ان کے گھر میں

رہا تھا اور اس نے اس کی بے تکلفانہ اور پُر لطف باتوں کو بہت انجوائے بھی کیا تھا۔ نعمان کے رخصت ہو جانے کے بعد اشعر نے اس رات اسے اپنی اور نعمان کی یونیورسٹی کے دنوں کی بہت سی باتیں بہت سے واقعات سنائے تھے اس نے اپنی طالب علمی کے دنوں کی بے شمار یادیں اس کے ساتھ شیئر کی تھیں اور ان باتوں اور یادوں کے نتیجے میں وہ نعمان اظفر کو کافی زیادہ جان گئی تھی۔

وہ زینت کو ساتھ لگائے ایک اچھے سے ڈنر کی تیاری کر رہی تھی۔ کچھ دیر اشعر اور نعمان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بینش بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔

''یہ نعمان بھی ناں بس۔ بیٹھے بٹھائے آپ کو پریشان کر دیا۔ مجھے سخت شرمندگی ہو رہی ہے، ہماری وجہ سے آپ کو اتنی زحمت کرنی پڑ رہی ہے۔'' خرد اسے کچن میں داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھنے کے لیے کرسی آفر کی تو بیٹھتے ہوئے بینش نے کہا۔

'کوئی زحمت نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اور اب آپ یہ پر تکلف جملے مزید بول کر مجھے شرمندہ ہرگز مت کریں۔''

''لائیں میں آپ کی کچھ ہیلپ کراؤں۔'' پہلے اس نے منع کرنا چاہا مگر پھر اسے بضد دیکھ کر سلاد بنانے کے لیے تمام سبزیاں اور چھری اس کے حوالے کر دی۔ بینش میز پر تمام سبزیاں رکھ کر کرسی پر بیٹھی سلاد کے لیے سبزیاں بھی کاٹتی جا رہی تھی اور اس سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

''سرجری کی کیا ڈیٹ دی ہے ڈاکٹر نے؟'' بینش نے پوچھا..... وہ اسے اچھی امید دلانے اور تسلی دینے کے لیے اپنی بھتیجی کے بارے میں بتانے لگی جس کی اوپن ہارٹ سرجری جب وہ ڈھائی، تین سال کی تھی تب ہوئی تھی۔

''اور اب وہ ماشاءاللہ 16 سال کی ہے اولیول کر چکی ہے اور پڑھائی اور ایکسٹرا ایکٹوٹیز میں بھرپور حصہ لیتی ہے۔'' اسے اس کا امید دلاتا انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ڈائننگ ٹیبل پر ایک اچھی دعوت کا تمام اہتمام موجود تھا۔ چانپوں کا پلاؤ، چکن کڑاہی، فرائیڈ فش، سلاد، رائتہ، بچوں کے لئے اسپیگیٹیز اور میٹھے میں پڈنگ اور موسم کے پھل۔ بغیر کسی پیشگی تیاری کے آناً فاناً کیے جانے والے ترتیب و اہتمام کے لحاظ سے تو یہ ایک بہترین ڈنر تھا۔ بہت طویل عرصے بعد وہ خرد احسان کے ہاتھوں کا پکا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی تھی اور ایک وقت تھا جب وہ اس کے ہاتھوں کا بنا کھانا بہت شوق سے کھایا کرتا تھا۔ تینوں بچے اسپیگیٹیز بہت شوق سے کھا رہے تھے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ علینا جو حریم سے سال ڈیڑھ سال بڑی تھی، وہ بھی اتنے پرفیکٹ ڈائننگ ایٹی کیٹس کے ساتھ کھانا نہیں کھا رہی تھی جس طرح حریم کھا رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

مہمانوں کو کھانا بہت مزے کا لگا تھا۔ کھانے کے بعد سب لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ بڑوں کے لیے جیسمن ٹی خرد نے خود بنائی تھی اور بچوں کے لیے کولڈ ڈرنک سرو کی تھی۔ حریم کی علینا اور صفی سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ رات بارہ بجے جب وہ لوگ جانے کے لیے اٹھے تو حریم کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ لوگ جائیں۔

''انکل! علینا کو یہاں رہنے دیں۔''

''بیٹا! آج ہمیں علینا کو لے جانے دو، ہم پھر کسی اور دن اسے آپ سے ملانے لائیں گے اور اب آپ بھی اپنے پاپا سے خوب ضد کرنا کہ وہ اسکول کی چھٹیوں میں آپ کو ہمارے گھر امریکہ لے کر آئیں۔ وہاں ہم آپ کو خوب سیر کرائیں گے پھر وہاں پر آپ اچھی طرح دل بھر کر علینا کے ساتھ کھیلنا۔'' حریم کو جھک کر پیار کرتے نعمان نے اس کی بات کا محبت وشفقت سے جواب دیا۔

وہ دوست اور اس کی فیملی کو چھوڑنے نیچے تک چلا گیا تھا جب کہ خرد نے انہیں وہیں سے ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ اتنی دور سے آئے اس کے دوست کی اچھی خاطر تواضع ہوگئی اور وہ اس کی چھوٹی خوش باش فیملی اور عارضی قیام گاہ کے متعلق اچھی رائے لے گیا ہے۔ اس چیز سے وہ خاصا مطمئن تھا۔

آج حریم کو اس کے بجائے خرد سے کہانی سننی تھی، اس لیے وہ چپ چاپ اس کے ساتھ لیٹا تھا۔ خرد کتاب سے کہانی پڑھنے کے بجائے اپنے حافظے میں محفوظ شہزادوں اور پریوں کی ایک مشہور دیو مالائی کہانی اسے سنا رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے حریم کو پتا نہیں کیا بات یاد آئی تھی جو خرد کو ایک سیکنڈ رکنے کا اشارہ کر کے وہ اس سے بولی۔

''پاپا!''

''ہاں میرا بیٹا!'' اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے اس نے پوچھا۔

''پاپا! حریم کے پاس بھائی کیوں نہیں؟'' ہونق نگاہوں سے اس نے بیٹی کو دیکھا۔ ایک معصومانہ سوال کر کے وہ اس کے چودہ طبق روشن کر گئی تھی۔ اس نے ضدی پن سے اپنا سوال دہرایا۔

''حریم کو بھائی چاہئے۔ علینا کے پاس بھائی ہے، حریم کو بھی بھائی چاہئے۔'' خرد بظاہر اس گفتگو سے لاتعلقی ظاہر کر رہی تھی، اپنے ناخنوں کو گھورتے اس نے جیسے حریم کی بات سنی ہی نہیں تھی مگر ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالتے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت جیسی گھبراہٹ اسے ہو رہی ہے اور جتنا اکورڈ وہ فیل کر رہا ہے، اتنا ہی وہ بھی فیل کر رہی ہے۔

''ماما! حریم کو بھائی چاہئے، علینا کی طرح۔''

''حریم! فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں کہانی سننی ہے تو خاموشی سے سنو۔ اب اگر بیچ میں تم کچھ بولیں تو پھر میں کہانی ہرگز نہیں سناؤں گی۔'' اس نے بیٹی کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ بچوں کو ڈانٹ کر اپنے بڑے ہونے کا رعب دکھا کر ہم ان کے سوالوں کے جواب دینے سے انکار کر سکتے ہیں مگر انہیں یہ معصومانہ سوال کرنے سے روک کس طرح سکتے ہیں؟ حریم منہ بسور کر اشعر سے لپٹ گئی تھی اور پھر ماں سے اظہار ناراضی کے طور پر ہاتھ سے کٹی ہونے کا اشارہ بھی اسے دکھا دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ڈاکٹر انصاری کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حریم کا تفصیلی چیک اپ کر چکے تھے۔ حریم کی ECG اور کچھ دوسرے

ٹیسٹ جوانہوں نے اس کے دوبارہ کروانے چاہے تھے، وہ سب بھی ہو چکے تھے۔حریم کی فزیکلی کنڈیشن اوراس کی تازہ ترین ٹیسٹ رپورٹس کی روشنی میں انہوں نے حریم کی سرجری پانچ روز بعد کئے جانے کوApprove کر دیا تھا۔وہ یہاں سرجری کی تاریخ طے کرنے ہی آئے تھے اوراب جب انہیں بتایا جارہا تھا کہ پانچ روز بعداس کی اوپن ہارٹ سرجری کی جائے گی،تب ان دونوں ہی کے چہروں پرفکراور پریشانی پھیل گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری ایک ایک بات انہیں تفصیل سے بتا رہے تھےاورایک مرتبہ پھر یہ اطمینان بھی دلا رہے تھے کہ ان شاءاللہ یہ آپریشن بالکل کامیاب رہے گا۔اس آپریشن میں کوئی خطرے کی بات نہیں اور آپریشن کے بعدریکوری بھی جلد ہوگی۔حریم کی حالت میں بہتری تو بہت جلدآنی شروع ہو ہی جائے گی اوراندازاً تین سے چار ماہ کے اندرحریم ایک مکمل اور بھرپورقسم کی نارمل لائف شروع کر سکے گی۔

وہ دونوں باہر نکلے تو ویٹنگ روم میں صوفے پرحریم اپنی ڈول کو گود میں بٹھائے اس سے باتیں کررہی تھی۔

''بھوک لگی ہے؟اچھا ابھی ماما، پاپا آئیں گے پھر ہم لنچ کرنے ہوٹل جائیں گے۔تم کیا کھاؤ گی؟ فرنچ فرائز اور کیچ اپ؟ فرنچ فرائز حریم کو بھی اچھے لگتے ہیں۔ ماما نہیں کھانے دیتیں۔ہم پاپا سے کہیں گے حریم کواورانجلینا کوفرنچ فرائز کھانے ہیں۔''

بالکل بے خبراور معصوم اس کی یہ جیتی جاگتی گڑیا جانتی ہی نہیں تھی کہ اس کی زندگی کس آزمائش سے گزررہی تھی۔اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کرمسل ڈالا تھا۔اس نے اپنے ساتھ کھڑی خرد کودیکھا تو وہ جلدی سے آنکھوں سے آنسو۔صاف کرتی نظرآئی۔جتنی دیر میں اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کر کے خود کو نارمل کیا،اتنی دیر میں وہ حریم کو صوفے پر سے گود میں اٹھا چکا تھا۔

''تو جناب حریم کواورانجلینا کو ہوٹل چلنا ہےاورفرنچ فرائز کھانے ہیں۔''اس نے خوشی سے زورزور سے سراقرار میں ہلایا۔دل و دماغ اس وقت کسی تفریح کے لیے آمادہ نہیں تھے مگر بیٹی کی خوشی کے لیے اسے ایسا کرنا ہی تھا۔

وہ تینوں گاڑی میں آ بیٹھے۔گاڑی ڈرائیو کرتے کئی بار یونہی اس کی اچٹتی سی نظراپنے برابر بیٹھی خرد پر پڑی تھی۔وہ کھڑکی کی طرف منہ کئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرے سے آنسوؤں کو صاف کررہی تھی۔حریم اسے روتا دیکھ سکتی تھی اور پھراس کے سوالات کا ایک نہ ختم ہونے والاسلسلہ شروع ہوسکتا تھا،اس لیے اس نے خرد کو بہت دبی آواز میں آہستگی سے کہا۔

''خرد پر کنٹرول رکھو۔حریم ڈسٹرب ہوگی۔''حریم کا دھیان ماں پر نہ جائے،اسی لیے اس نے گاڑی میں اس کی پسند کا فاسٹ میوزک لگا دیا تھااور مسلسل اس سے باتیں بھی کئے جارہا تھا۔

ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں وہ تینوں آ کر بیٹھ گئے تھے جو پابندیاں اس پر عائد تھیں،وہ سب اسی کی بہتری کے لئے تھیں پھر بھی اس وقت اس کا بیٹی کی ایک معصوم سی خواہش پوری کرنے کا دل چاہا تھا۔حریم نے جو جو ڈشز منگوائی تھیں،وہ دونوں اس کا دل خوش کرنے کو اسی میں سے ایک دو نوالے لے رہے تھے۔اس کی پوری توجہ اپنی بیٹی پرتھی۔تب ہی تو اسے سامنے کی میز سے کسی کے اٹھنے اوراپنی طرف آنے کی ذرا بھی خبرنہیں ہو پائی تھی۔یہ خبراسے اس وقت ہوئی جب کوئی اس کی میز پراس کے بالکل سرپرآ کرکھڑا ہوگیا۔

حریم سے کچھ بات کرتے اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تو اپنے سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر وہ حقیقتاً بوکھلا گیا۔ اسے خرد اور حریم کے ساتھ اس کا کوئی بھی دوست یا جان پہچان والا دیکھ لیتا مگر سارہ اجمل کم از کم نہ دیکھتی۔

''ہائے اشعر! تم تو سنگاپور گئے ہوئے تھے نا؟ کب واپسی ہوئی؟'' طنزیہ نگاہوں سے سارہ نے اسے دیکھا۔

''میں جا نہیں سکا، یہاں کچھ ضروری کام پڑ گیا تھا۔'' خود کو پرسکون اور نارمل ظاہر کرنے کے لیے اس نے قصداً کانٹے کی مدد سے مشروم کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا، بڑی لاپروائی اور بے نیازی سے۔

''اچھا جا نہیں سکے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید تمہارا سنگاپور کراچی ہی میں ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر اس نے طنزیہ نگاہوں سے خرد کو دیکھا۔

''خرد احسان! لوٹ آئیں آپ؟ کب آئیں...... اور کیسی ہیں آپ؟ آپ لوگوں کی ری یونین کب ہوئی؟ فریدہ آنٹی نے یہ بریکنگ نیوز مجھے نہیں دی۔'' اس کا انداز حقارت آمیز تھا۔ پھر قدرے جھک کر اس نے حریم کو بغور دیکھا جو فرنچ فرائز منہ میں رکھتی ان خوبصورت آنٹی کو دلچسپی سے بغور دیکھ رہی تھی۔

''یہ غالباً آپ کی بیٹی ہے؟'' اس نے خرد کی طرف نگاہ کی۔

''اور شاید تمہاری بھی۔'' اس بار مخاطب وہ تھا اس کی بوکھلاہٹ ایک پل میں شدید قسم کے غصے میں تبدیل ہوئی تھی۔ اس کی پرسنل لائف میں اس طرح آ کر مداخلت کرنے والی وہ تھی کون؟

''سارہ تم......'' تنبیہی لہجے میں اس کا نام لے کر اس نے لب بھینچ کر کسی سخت لفظ کی ادائیگی سے خود کو بمشکل روکا۔

''بہت لکی ہو اشعر! چار، پانچ سال بعد بیگم واپس ملیں تو ملیں ساتھ تمہارے لیے ایک بیٹی بھی بطور تحفہ لے آئیں۔ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایک عدد پلی پلائی بیٹی بھی مل گئی۔'' اشعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمسخرانہ سی ہنسی ہنستے اس نے اسے مزید غصہ دلانا چاہا۔

''سارہ!'' کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے شدید طیش کے عالم میں کہا۔ اس بار اس کی آواز پہلے سے بلند تھی، غصے میں وہ یہ بھولنے لگا تھا کہ وہ کسی پبلک پلیس پر موجود ہے اور یہ بھی کہ سارہ جان بوجھ کر اس کے غصے کو ہوا دینا چاہتی ہے، اس کے غصے سے لال انگارہ چہرے سے وہ نہ خائف ہوئی اور نہ ہی چپ ہوئی بلکہ اس نے جیسے اس صورتِ حال سے مزید حظ اٹھانا چاہا۔

''ڈونٹ وری۔ میں یہاں زیادہ دیر رکنے نہیں آئی۔ میں تو صرف اس Reunite ہوئی فیملی سے ہائے ہیلو کرنے چلی آئی تھی۔''

''تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ جتنا برداشت میں کر سکتا تھا کر لیا، آگے اگر تم نے مزید ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا بالکل بھی لحاظ نہیں کروں گا۔''

''کہا تو ہے بابا! جا رہی ہوں۔'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ اشعر کے غصے سے لطف لیتے اس نے استہزائیہ اور تمسخرانہ نگاہوں سے پہلے خرد اور اس کے بعد حریم کو دیکھا۔

''او کے بیٹا! بائے۔''

''بائے آنٹی!۔'' حریم نے بڑی تہذیب سے ان اسٹائلش سی آنٹی کو بائے کہا۔ سارہ اجمل ایک پل میں وہاں سے چلی گئی تھی۔

وہ شدید غصے میں تھا، اور چلے جانا چاہتا تھا مگر حریم ابھی اپنے لنچ کو انجوائے کر رہی تھی۔

''پاپا! حریم کو لنچ کرنے دیں۔'' اس نے حریم سے واپس چلنے کے لیے کہا تو اس نے فوراً جواب دیا تھا۔ ہر بات سے بے خبر، بے نیاز وہ جوس کے سپ لے رہی تھی۔ اس نے سارہ کے آنے اور چلے جانے کے بہت دیر بعد...... پہلی بار خرد کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں میز پر مرکوز کیے بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی دیر بعد کہیں جا کر حریم گھر جانے کے لیے آمادہ ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو گھر چھوڑ کر فوراً واپس بھی نہیں جا سکا تھا۔ حریم اس کے لیے راضی نہیں تھی۔ اس کے ہزار عذر تراشنے کے باوجود وہ اسے کافی دیر تک گھر پر روکے رہی تھی۔

☆......☆......☆


# جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالبؔ ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ''انسان'' درحقیقت وہی ہے جس کا ''شر'' اس کے ''خیر'' کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ''خیر'' کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزر گئے** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

طوفانی رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر کے وہ گھر پہنچی تھی۔ راستے میں اتنی جگہ اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا کہ اس کی زندہ سلامت گھر واپسی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ زوردار دھماکے سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو فون پر کسی سے بات کرتی زرینہ نے اسے بے وقت گھر واپس آتے تعجب سے دیکھا۔

''نرگس حیات کے بارے میں تمہاری رائے بالکل ٹھیک تھی۔ مسز نثار کے ہاں ڈنر پر دیکھا تھا اسے؟'' گوسپس میں مصروف انہوں نے بیٹی کو مسکرا کر دیکھا، اسے اشارے سے سامنے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

جس رفتار سے وہ اندر داخل ہوئی تھی اسی رفتار سے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اوپر اپنے کمرے کا دروازہ اس نے ایک زوردار دھماکے سے بند کیا تھا اور اس کی آواز انہوں نے نیچے تک سنی تھی۔ پریشانی میں جلدی سے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر کے وہ اس کے پیچھے اوپر بھاگیں۔

بے طرح پریشان ہوتے انہوں نے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کیا اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ انہوں نے دوبارہ ناک کیا، ساتھ اسے آواز بھی دی۔

''سارہ! سوئیٹ ہارٹ، میں ہوں ممی، دروازہ کھولو بیٹا!'' اندر سے پھر کوئی جواب نہیں آیا۔ انہوں نے دروازہ خود کھول کر اندر داخل ہونا چاہا تو وہ اندر سے لاکڈ تھا۔

''سارہ! کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ پلیز دروازہ کھولو میری جان۔'' عام طور پر اپنے غصے اور ناراضی کا اظہار وہ اس طرح کیا نہیں کرتی تھی۔ اور اگر کر رہی تھی تو یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوئی تھی۔ بری طرح پریشان ہوتے وہ اس کے کمرے کا دروازہ پیٹے چلی جا رہی تھی۔

تب اندر سے سارہ کی غصے، جھنجھلاہٹ اور بے زاری سے بھری آواز انہیں سنائی دی۔

''ٹھیک ہوں۔ میں خودکشی کی ہے، نہ کرنے والی ہوں۔ کچھ دیر بالکل اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز سن کر زرینہ کی جان میں جان آئی۔ کم از کم اندر وہ خیریت سے تو تھی، لیکن ایسا کیا ہوا تھا جوان کی بیٹی اتنے شدید غصے میں تھی، اس طرح کا ردعمل ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی اس طرح کی کیفیت انہوں نے زندگی میں اب سے پہلے صرف ایک ہی بار اور دیکھی تھی۔

☆......☆......☆

سارہ کی بدتمیزی کو نہ اس نے معاف کیا تھا نہ معاف کرنے کا اس کا کوئی ارادہ تھا۔ وہ اس کی اس بدتمیزی پر اسے پہلی اور آخری بار انتہائی سخت لفظوں میں یہ وارننگ دینا چاہتا تھا کہ وہ آئندہ اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت کی جرأت نہ کرے، ورنہ نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔ وہ اس کے پاس جا کر اس کی طبیعت صاف بھی کر آیا ہوتا اگر اسے فوری طور پر حریم کی سرجری کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا۔ کسی دوسرے مسئلے میں الجھنے کی اس کے پاس نہ فرصت تھی نہ مہلت۔ سارہ گھٹیا پن کا ثبوت دیتی خرد اور حریم کے متعلق نجانے کیا کیا بات، کس کس انداز میں فریدہ

تک پہنچا سکتی تھی، مگر اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ حریم اس کی بیٹی ہے اور وہ حریم کا باپ ہونے پر خدانخواستہ کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں جو اس بات پر خوف محسوس کرے کہ کہیں کوئی اس کی بیٹی کے وجود سے آگاہ نہ ہو جائے۔ حریم کو ماں سے چھپانے کی اس کی وجوہات قطعاً دوسری نوعیت کی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کو پورے دل کے ساتھ، اپنے دل کے تمام سچے جذبوں کے ساتھ Own کرتا تھا۔ اس کی بیٹی اس کا سامانِ فخر اور اس کی پوری حیات کا سرمایہ تھی۔

اس وقت اسے اپنی ممی کی نہیں حریم کی فکر تھی۔ تین روز بعد حریم کو ہسپتال میں ایڈمنٹ ہو جانا تھا اور اسے اس وقت سوائے اپنی بیٹی کی صحت اور زندگی کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

آفس میں اپنے چند ضروری کاموں کو الٹا سیدھا نمٹا کر وہ سرِشام ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ سارہ سے دوپہر میں ہوئی ملاقات اگر ذہن سے اب تک مکمل طور پر محو نہیں ہوئی تھی تو حریم کو دیکھتے ہی بالکل بھول گئی۔

''کیا کھیلا جا رہا ہے پرنس؟''

''ڈاکٹر، ڈاکٹر۔'' اس نے اپنے کھلونے کا اسٹیتھو اسکوپ کان سے لگاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے سامنے صوفے پر اس کی گڑیا لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کھیل اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے تھے، اس لیے حیران ہونے کے بجائے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ خرد بھی وہیں بیٹھی تھی۔ وہ اپنے کھیل میں پوری طرح مگن اور مصروف تھی۔

''پرنس! پاپا کو بھی کھلاؤ۔'' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، کچھ سوچا، پھر سر اقرار میں ہلا کر بولی۔

''اچھا۔ حریم ڈاکٹر ہے۔ ماما نرس ہیں اور آپ۔''

''اور میں یقیناً آپ کی arrie کی طرح ایک پیشنٹ ہوں گا، جس کا کہ آپ علاج کریں گی۔ سوئیٹ گرل! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ ہر کھیل میں لیڈنگ رول آپ ہی کا کیوں ہوتا ہے؟ Play کی رائٹر، ڈائریکٹر بھی خود اور ہیروئن بھی خود۔'' اس کی ناک ہولے سے کھینچتے ہوئے اس نے اسے چھیڑا۔ خرد خاموشی سے بیٹھی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی اسے اتنی ہی پریشان محسوس ہو رہی تھی، جتنی دوپہر ڈاکٹر انصاری کے پاس سے اٹھتے وقت تھی۔

''پاپا! گیم شروع کریں نا!'' حریم نے اس سے کہا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے بالکل سامنے مریض بن کر بیٹھ گیا۔ پہلے تھرمامیٹر اس کے منہ میں ڈال کر اس کا ٹمپریچر دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اسٹیتھو اسکوپ اٹھایا گیا تھا۔

''لمبے لمبے سانس لی جے (لیجیے)'' وہ اسٹیتھو اسکوپ اس کے سینے پر رکھ کر بولی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اب میز پر رکھے رائٹنگ پیڈ پر پین سے الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر دراصل اس کی دواؤں کا نسخہ لکھ رہی تھی۔

''آپ کا ہارٹ بہت ویک ہے۔ آپ کو بھاگنا بھی نہیں ہے۔ کھیلنا بھی نہیں ہے۔ بس ریسٹ کرنا ہے۔''

وہ انتہائی معصومیت اور سادگی و روانی سے کسی ڈاکٹر کے اپنے متعلق کہے گئے جملے دہرا رہی تھی۔ اس کی اس معصومیت نے اس کے

دل کو لہولہو کر ڈالا، خود پر ضبط کر کے مسکراتے رہنا، اس پل اس کے لیے بڑا کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ خرد ایک دم ہی ان دونوں کے پاس سے اٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا نہیں تھا مگر جانتا تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پائی ہے، وہ اندر کسی کمرے میں جا کر رونا چاہتی ہے۔

''آپ کو انجکشن لگے گا۔ تھوڑی سی تکلیف ہوگی۔ رونا نہیں ہے۔'' اس کی معصومیت نے اس کے ماں باپ کے دل کو کیسا ہلا کر رکھ دیا ہے، وہ بے خبر اور انجان بچی کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے اس سے انجکشن لگوانے لگا۔

کھانے کے لیے جب اس نے زینت سے کہہ کر خرد کو بلوایا تو اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہ لگا کہ وہ کمرے میں سارا وقت روتی رہی ہے۔ کھانے کے لیے حریم کے برابر بیٹھ کر، اس کے منہ میں اپنے ہاتھ سے نوالہ ڈالتے وہ خود کو کمپوز کر چکی تھی۔ روز کی طرح دونوں نے مل کر ہی اسے دوا کھلائی تھی۔ حریم کو آج بھی ماما سے کہانی سننا تھی اس لیے وہ خاموشی سے حریم کے پاس لیٹ گیا اور خرد اس کے برابر بیٹھ کر، اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی ایک مشہور دیومالائی کہانی سنانے لگی۔

حریم کے اتنے زیادہ نزدیک آ جانے سے وہ اس کے کتنے قریب آ گئی ہے، شاید وہ محسوس کر ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی موجودگی سے مکمل طور پر بے نیاز تھی۔ حریم سو چکی تھی اور وہ دونوں جاگے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہرے حریم کی طرف تھے، دونوں کی نگاہیں حریم پر مرکوز تھیں۔ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرنے والے رات کے اس پہر ایک ہی بات سوچ رہے تھے، ایک ہی چہرے کو دیکھ رہے تھے، ایک ہی فکر میں الجھے تھے، ایک ہی کرب میں مبتلا تھے، ایک ہی دعا مانگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں چلتے ان دو لوگوں کی زندگیاں اس وقت ایک ہی مقام اور ایک ہی جگہ پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔ کیسی عجیب سی بات تھی۔ ایک دوسرے سے شدید نفرت تھی اور حیات کا مقصد ایک ہی تھا، جینے کی وجہ ایک ہی تھی، زندگی کا محور ایک ہی تھا۔ حریم حسین، حریم حسین اور صرف حریم حسین۔

حریم کے سینے پر ہاتھ رکھے، اس کی دھڑکنوں کو محسوس کرتی وہ شاید یہ اطمینان پاتی رہنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کا دل بالکل صحیح رفتار سے دھڑک رہا ہے اور وہ اشعر حسین بیٹی کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ کیے، اپنے چہرے پر اس کی سانسوں کو محسوس کرتا شاید اس کی سانسوں کے ہموار ہونے کے یقین حاصل کیے رکھنا چاہتا تھا۔ یوں ہی حریم کی دھڑکنوں اور سانسوں سے اطمینان پاتے وہ دونوں کب سو گئے انہیں خود معلوم نہیں تھا۔

☆......☆......☆

وہ کچن میں تھی جب اس نے اپنے موبائل کی رنگ ٹون سنی۔ وہ تیزی سے کمرے میں آئی اور سائڈ ٹیبل پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا۔ افشین کا نام دیکھتے ہی اس نے فوراً کال ریسیو کر لی۔ اسے تو پریشانیوں میں گھرے پچھلے تمام دنوں میں اپنی اس دوست کا خیال آیا ہی نہیں تھا مگر افشین نے بھی اس تمام عرصے میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی چھٹی بڑھوانے کے لیے جو درخواست اسے بھجوائی تھی، اس کے بعد سے افشین کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ اپنی جاب کے حوالے سے اسے کوئی خوشگوار امیدیں وابستہ نہیں تھیں۔ پہلے جو چھٹی اسے بغیر تنخواہ

کے بہت ساری باتیں سنائے جانے بلکہ اچھا خاصا بے عزت کرنے کے بعد دی گئی تھی اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہر بڑی سے بڑی بات وہ خود سوچ سکتی تھی۔

''تم ٹھیک ہو؟ خاور بھائی، بچے سب ٹھیک ہیں؟'' سب سے پہلے اس نے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

''آفس میں سب ٹھیک ہے؟''

''ہاں، بس تمہاری بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔''

''میں جاب پر ہوں یا نکال دی گئی ہوں۔'' اس کے سنجیدگی سے پوچھے سوالوں کا افشین روانی سے جواب دیتے دیتے اس سوال پر ٹھیک کر چپ ہوئی۔

''خرد تم......''

''افشین! جو بھی بری خبر ہے۔ مجھے بتا دو کیونکہ بات کچھ کچھ تو میں سمجھ ہی گئی ہوں۔'' افشین کے کچھ کہنے سے قبل اس نے متانت سے کہا۔

''خرد! وہ امجد صاحب نے تمہیں......'' وہ ہچکچا کر چپ ہوگئی۔ شاید ایک بری خبر دوست کو سنانے کی اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

''انہوں نے مجھے جاب سے نکال دیا۔'' اس نے خود اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ افشین جواب میں بالکل چپ رہی اور اس کی یہ چپ اپنے اندر ہر سوال کا واضح جواب تھی۔ ایک دو سیکنڈز کی خاموشی کے بعد افشین اپنے اندر کچھ جرأت پیدا کر کے اسے ساری بات بتانے لگی۔ جب خود جان ہی گئی تھی تو اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ورنہ افشین واقعی اتنے دنوں سے اسے اسی لیے فون نہیں کر رہی تھی۔ وہ جاب سے نکالی جا چکی ہے، اس کی جگہ پر کی جا چکی ہے، وہ خرد کو یہ سب بتا کر اس کی مشکلات میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

''امجد صاحب نے تمہاری جگہ ایک لڑکی کو اپائنٹ کر لیا ہے، اب تو اسے جوائن کیے بھی کئی دن ہو چکے ہیں۔ میں نے تمہیں یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔''

وہ ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کر جواباً بالکل خاموش رہی۔ تو افشین نے تشویش زدہ سی آواز میں اسے پکارا۔

''خرد کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو نا؟''

''ٹھیک ہوں افشین! مجھے کیا ہونا ہے۔ خاصی سخت جان اور ڈھیٹ ہوں۔ جاب لیس ہو جانا تو اتنی بڑی بات بھی نہیں، اس سے بڑی بڑی باتیں سہہ کر بھی بالکل ہٹی کٹی رہی ہوں۔'' استہزائیہ انداز میں وہ کسی اور پر نہیں، خود اپنے آپ پر ہنسی۔

''تم پریشان مت ہو خرد! جابز کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دس دروازے کھولتا ہے۔''

''تم میری فکر مت کرو افشین! فی الحال تو حریم کے آگے مجھے دوسری کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی۔ حریم کا آپریشن ہو جائے وہ

ٹھیک ہوجائے تب سوچوں گی آئندہ زندگی کے بارے میں۔ ابھی تو یوں لگ رہا ہے جیسے میری زندگی ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ حریم ٹھیک ہوجائے گی، تب ہی زندگی آگے بڑھے گی۔''

''کب ایڈمٹ ہورہی ہے حریم ہسپتال میں؟''

''کل۔''

''سرجری کب ہے؟''

''پرسوں۔'' یہ لفظ منہ سے نکلتے ہی وہ خوف سے کانپ سی گئی تھی۔ اب ہفتوں کی نہیں، اب تو دنوں بلکہ گھنٹوں کی بات شروع ہوچکی تھی۔

''تم میرے لیے دعا کرو افشین! اللہ میری بیٹی کو صحت دے دے، زندگی دے دے اور اگر اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے میری بیٹی کی قسمت میں ٹھیک ہونا نہیں، اگر اس کا آپریشن کامیاب نہیں ہوتا، اگر اللہ نہ کرے اسے کچھ......'' وہ آنسو پیتے وہ بڑے لفظ ادا نہ کر سکی۔

''ان شاء اللہ حریم بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ دیکھ لینا آپریشن کے بعد کیسی فٹ فاٹ اور تندرست ہوجائے گی وہ۔ اچھا اب چھوڑو یہ ٹینشن بھری باتیں، یہ بتاؤ حریم کہاں ہے، کیا کر رہی ہے؟'' افشین نے ماحول کی افسردگی اور بوجھل پن کو کسی خوش گوار سی بات سے تبدیل کرنا چاہا۔

''اشعر کے ساتھ ہے بالکونی میں۔ ان دونوں نے مل کر وہاں گملوں میں بہت سارے پودے لگائے ہیں۔ اس وقت بھی دونوں باغبانی ہی میں مصروف ہیں۔'' چہرے پر سے آنسو صاف کرتے اس نے بھی لہجے کو خوشگوار ہی بنا کر اسے جواب دیا۔

''حریم، اشعر سے بہت جلدی مانوس ہوگئی، ہے نا؟''

''ہاں، وہ اس سے اتنی مانوس اور اتنی بے تکلف ہوگئی ہے جیسے اسے شروع سے جانتی ہے، جیسے اس کے ساتھ ہمیشہ سے رہتی آئی ہے۔'' اس نے افشین کے سوال کا سچائی اور دیانت داری سے جواب دیا۔

''آخر خون کا رشتہ ہے۔ بیٹی، باپ سے کیوں مانوس نہیں ہوگی۔''

''ہاں، خون کا رشتہ تو بے شک ہے مگر حریم جو اشعر سے اتنی جلدی اتنی زیادہ مانوس ہوگئی ہے، اس کے ساتھ اتنی زیادہ بے تکلف ہوگئی ہے تو اس میں سارا کمال اشعر کی محبت اور چاہت بھرے رویوں کا ہے۔ وہ اسے ٹوٹ کر والہانہ اور بے ساختہ پیار کرتا ہے۔ حریم سے اس کے پیار میں کہیں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا۔'' وہ سچائی سے بولی۔ اس شخص سے اسے جو نفرت تھی، وہ اپنی جگہ تھی مگر اس نفرت کا شکار ہو کر وہ یہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی کہ اشعر، حریم کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہو رہا۔

''تم سے ذکر سن کر اشعر کا میں نے جو خاکہ بنایا تھا، وہ کسی انڈین کمرشل مووی کے ظالم اور خطرناک ولن جیسا تھا مگر اب حریم کے ساتھ اس کے برتاؤ کو سن کر مجھے لگ رہا ہے کہ وہ اتنا برا بھی نہیں۔ کم از کم ولن تو ہرگز نہیں۔'' افشین خوش دلی سے ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں افشین! وہ میرے ساتھ جیسا بھی تھا جو بھی کیا، کم از کم حریم کے حق میں وہ واقعی بہت اچھا ثابت ہو رہا ہے۔''

''اللہ کرے اب وہ اچھا ہی رہے۔ حریم کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ اگر وہ اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو کر تم سے معافی مانگے، تمہارے ساتھ زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہے تو اس کا ہاتھ تھامنے میں دیر مت کرنا، اس لیے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں اگر وہ تمہارے اور حریم کے ساتھ ہے تو پھر میرا دل کہہ رہا ہے، اسے ایک اور موقع دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ غلطیاں انسانوں ہی سے ہوتی ہیں اور انہیں معاف بھی ہم انسان ہی کیا کرتے ہیں۔''

اس کے لبوں پر اس کی نصیحتوں نے ایک تلخ سی ہنسی بکھیر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اشک تھے اور ہونٹوں پر ایک خاموش اور تلخ مسکراہٹ۔ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا یا کیا کہ اچانک ہی اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرے کے کھلے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ اسے اشعر کھڑا نظر آیا۔ وہ پتا نہیں یہاں کب سے کھڑا تھا اور پتا نہیں کیا کچھ سن چکا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے تو وہ بالکل خاموش ہو گئی، اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے پھر اس نے اشعر کو واپس پلٹتے دیکھا، وہ ایک لمحے کے اندر وہاں سے واپس جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

چار دنوں تک ساری دنیا سے ناراض اپنے کمرے میں بند ہو کر گزارنے کے بعد آخر اس نے پانچویں دن انہیں اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دی تھی۔ ان چار دنوں میں وہ نہ کسی سے ملی تھی، نہ کوئی کال ریسیو کی تھی۔ اس کے کولیگز کی اس کے کلائنٹس، اس کے دوستوں کی، اس کے کاروباری ساتھیوں کی، نجانے کس کس کی کتنی بے شمار کالز اس کے موبائل اور آفس میں رابطے میں ناکامی پر ان کے گھر کے فون نمبرز پر آ رہی تھیں۔ زرینہ ہر ایک سے ''سارہ کی طبیعت خراب ہے، وہ بات نہیں کر سکے گی۔'' کہہ کر بات کرانے سے معذرت کر رہی تھیں۔ سارہ نے جب انہیں اپنے کمرے میں آنے سے صاف منع کر دیا تھا تو کسی اور سے ملنے یا بات کرنے کے لیے کیسے آمادہ ہو سکتی تھی؟ بس اتنی اس نے ان کے بہت منت سماجت کرنے پر اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کے لیے کسی ملازم کے ہاتھ ناشتہ اور کھانا کمرے میں بھجوا دیں۔ کھانے کی جوٹرے اس کے لیے جاتی تھی وہ جوں کی توں ویسی کی ویسی ہی واپس بھی آ جاتی تھی۔ اس میں سے کچھ بھی وہ کھاتی پیتی نہیں تھی، مگر انہیں ملازم کے آنے سے اتنی تسلی تو مل جاتی تھی کہ وہ اندر ٹھیک ہے۔ بس صرف اوندھے منہ بستر پر لیٹی ہے۔ اور آج پورے چار دنوں بعد جب وہ دروازے کے باہر ہی سے اس سے منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ اگر خود کمرے سے باہر نہیں نکل رہی تھی تو کم سے کم انہیں تو اندر آنے کی اجازت دے دے۔ تب اس نے انہیں اندر آنے کی اجازت محض ایک ''ہوں'' کے ذریعے دی تھی۔ نہ مزید کچھ کہا نہ اٹھ کر ماں کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ بے تابی سے دروازہ کھول کر خود اندر داخل ہوئیں تو وہ بیڈ پر بیٹھی نظر آئی۔ انہوں نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ کمرے کا پورا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ تکیے، کشنز، کارپیٹ پر ادھر ادھر پھینکے ہوئے قیمتی ڈیکوریشن پیسز دیواروں پر مار کر توڑ پھوڑ دیے گئے تھے۔ غصے میں اس نے کمرے کی کوئی چیز ہی سلامت نہیں چھوڑی تھی۔

اپنا بڑا نفاست اور خوبصورتی سے سجایا قیمتی اشیاء سے آراستہ کمرہ اس نے خود پورے کا پورا اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ تیزی سے چلتی وہ

اس کے پاس آگئیں، اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا ہے سارہ! خدا کے لیے مجھے کچھ تو بتاؤ۔ دیکھو تو ذرا تم نے اپنی حالت کیا بنالی ہے۔'' اپنی حسین بیٹی کا یہ اجڑا روپ انہیں دکھ اور شدید غصے میں بیک وقت مبتلا کر گیا۔ کس کی وجہ سے تھی ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی یہ حالت۔

''خرد واپس آگئی ہے۔''

''کیا؟'' انہوں نے ناسمجھ آنے والے انداز میں بیٹی کو دیکھا۔

''خرد احسان، اشعر حسین کی زندگی میں واپس آگئی ہے۔ یہی کہا ہے میں نے۔'' وہ غصے سے چلائی۔

''تم سے کس نے کہا؟''

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ساتھ میں اس کی بیٹی بھی تھی۔ کیا ایک کمپلیٹ فیملی کا تاثر پیش کر رہے تھے وہ تینوں مل کر۔ بڑی محبت سے ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا جا رہا تھا'' اس کے لہجے میں غصہ اور حقارت دونوں شامل رہی تھیں۔ ''ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟'''' وہ بے چاری چھوٹے شہر کی مسکین سی لڑکی، وہ آپ کی اس بیٹی سے کہیں زیادہ باکمال، زیادہ ٹیلنٹڈ ہے۔ کم از کم اپنی بھولی بھالی شکل کا سہارا لے کر اسے اس شخص کا دل جیتنا تو آتا ہی ہے۔ اس نے لندن فیشن اسکول کی شکل نہیں دیکھی۔ فیشن ڈیزائنر کے مقام تک اگلی دس زندگیوں میں بھی نہیں پہنچ سکتی، مگر اس کی رُسائی وہاں تک ہے، جہاں آپ کی بیٹی اگلی سو زندگیوں میں بھی نہیں پہنچ سکتی۔'' اس نے غصے سے سائیڈ ٹیبل پر سلامت پڑی واحد چیز ٹائم پیس بھی اٹھا کر زور سے دیوار پر مارا۔ زرینہ خاموشی سے بیٹی کا غصے سے لال انگارہ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''وہ دو ٹکے کی لڑکی، جسے میں کبھی اپنے ساتھ بٹھانا تک پسند نہ کروں، وہ اس شخص کے پہلو میں اس کی بیوی کی حیثیت سے پھر جا بیٹھی ہے جس نے مجھے کبھی اپنے برابر بٹھانا گوارا نہیں کیا، اس دو ٹکے کی معمولی لڑکی سے میں سارہ اجمل اپنا موازنہ نہ کر رہی ہوں، مقابلہ کر رہی ہوں اور اس مقابلے میں وہ سارا اجمل کو مات دیتی وہاں کھڑی ہے جہاں سارہ اجمل کی رسائی نہ ہوتی ہے، نہ کبھی ہو سکے گی۔'' وہ نفرت اور حقارت سے چلا رہی تھی، زور زور سے بول رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے تھے۔

''جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اتنی شدید نفرت کے بعد اشعر ایسا کس طرح کر سکتا ہے؟'' زرینہ نے جیسے خود کلامی کی،

'' ایسا ہو چکا ہے، اشعر حسین سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسی شہر میں ڈنکے کی چوٹ پر اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر گھوم رہا ہے، وہ نہ صرف اپنی حیثیت اشعر سے دوبارہ منوا چکی ہے بلکہ اپنی بیٹی کی حیثیت بھی اس سے منوا چکی ہے معصوم اور بھولا بھالا بن کر مردوں کو کس طرح قابو کیا جاتا ہے، اب شاید یہ ٹریننگ مجھے اس تھرڈ کلاس' معمولی لڑکی سے ہی لینا پڑے گی۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز سے چلائی تھی' وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

اشعر نے اس فون پر ہونے والی کتنی باتیں سن لی ہیں‘ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے لگا کہ شاید وہ کافی دیر سے وہاں کھڑا تھا پھر لگا کہ شاید وہ اسی وقت وہاں آ کر کھڑا ہوا تھا جو کچھ کہے بغیر صرف خاموشی سے افشین کی نصیحت سن رہی تھی۔ اس نے دعا کی کہ وہ اسی وقت وہاں آیا ہو۔ اتنے دنوں بعد ایک ہمدرد‘ غم گسار دوست کی آواز سنی تھی۔ اتنے دنوں بعد کوئی دل کی بات سننے والا ملا تھا تو وہ خود پر قابو رکھ ہی نہیں پائی تھی۔ پتا نہیں بے سوچے سمجھے اپنے دل کی کون کون سی باتیں وہ افشین سے کہہ گئی تھی۔ دل کو یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ اس کے دل کی باتیں‘ اس کی کمزوری‘ اس کی سوچیں اشعر حسین جان جائے مگر اس کے تاثرات سے ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اس نے کچھ سنا ہے۔ گو وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس شخص کو اپنے چہرے کے تاثرات چھپا کر رکھنے میں کمال درجہ مہارت حاصل ہے پھر بھی یہ دعا کر رہی تھی کہ جو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے‘ سچ بھی یہی ہو۔ اشعر نے حقیقتاً اس کی فون پر ہونے والی کوئی بھی بات نہ سنی ہو۔ رات ہو چکی تھی اور وہ دونوں مل جل کر حریم کو روز ہی کی طرح کھانا کھلا چکے تھے۔ حریم بیڈ پر بیٹھ کر اپنی کلرنگ بک میں اپنے کسی پسندیدہ کارٹون کریکٹر کی تصویر میں رنگ بھر رہی تھی اور وہ سامنے صوفے پر بیٹھی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

کل صبح آٹھ بجے تک انہیں ہسپتال پہنچ جانا تھا اور آٹھ بجے پہنچنے کے لیے صبح تیار بھی جلدی ہونا تھا‘ اسی لیے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ہسپتال کے جانے کے لیے حریم کا سارا ضروری سامان ابھی پیک کر لینا چاہیے۔ اشعر کمرے میں آیا تو بجائے حریم کے پاس جا کر بیٹھنے کے صوفے پر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔

”تم نے حریم کو کل ہسپتال جانے کا بتایا؟“ بہت آہستہ آواز میں اشعر نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اشعر کی طرف دیکھے بغیر اس نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔ وہ کبھی بھی حریم سے اس کی بیماری کے متعلق کچھ نہیں کہتی تھی۔ علاوہ اسے بھاگنے دوڑنے اور خود کو تھکانے سے منع کرنے کے وہ اسے ایسا کچھ بھی نہیں کہتی تھی جس میں اس کی بیماری کا کوئی ذکر شامل ہو۔

اگر ابھی وہ دونوں اسے اعتماد میں لے کر پیار سے سمجھا دیں کہ آئندہ کافی سارے دنوں تک اسے گھر پر نہیں بلکہ ایک ہسپتال میں رہنا ہوگا تو اس کا والدین پر اعتبار قائم رہے گا۔

اشعر اس کے پاس سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ سرخ پینسل کا کونا منہ میں دبائے اپنے مخصوص انداز میں کچھ سوچنے میں مصروف تھی۔

”پاپا! انجیلا کیسی لگ رہی ہے؟“

”اچھی ہے مگر پاپا کی پرنسس جتنی اچھی نہیں لگ رہی۔ میری پرنسس تو سب سے اچھی ہے۔“ اس نے اسے اپنی گود میں اٹھا کر بٹھا لیا اور والہانہ اس کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔ اس کے گرد محبت سے اپنے دونوں ہاتھ لپیٹ دیے۔

”پاپا! حریم کو کلر کرنا۔“ اس نے اس کی گود سے اترنے کی کوشش کی۔

”کلرنگ ابھی کر لینا سوئیٹ ہارٹ! پہلے پاپا کی ایک بات سن لو۔“ اس نے حریم کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''پرنس! آپ کو ڈاکٹر انکل کیسے لگتے ہیں؟''

''اچھے۔''اس نے معصومانہ سنجیدگی سے ایک لفظی جواب دیا۔

''تو آپ کے اچھے والے ڈاکٹر انکل نے کہا ہے کہ حریم کو میرے پاس ہسپتال میں ایڈمٹ کروادو میں اس کا اتنا اچھا علاج کروں گا' اسے اتنی اچھی اچھی میڈیسنز دوں گا کہ حریم فوراً ٹھیک ہو جائے گی پھر حریم کو کوئی بھاگنے سے بھی منع نہیں کرے گا اور ماما' حریم کو اسکول بھی جانے دیں گی۔ فرنچ فرائز اور آئس کریم بھی خوب ڈھیر ساری جتنی حریم کا دل چاہے گا' اتنی کھانے دیں گی۔'' حریم کی طرف بغور دیکھتے وہ ٹھہر ٹھہر کر آسان لفظوں میں بات اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''حریم کو اسکول جانا ہے؟ سی سا پر بیٹھنا ہے؟''اس کے سوالیہ انداز کا حریم نے سر کو زور زور سے اقرار میں ہلا کر جواب دیا۔

''تو پھر آپ کو ڈاکٹر انکل کی بات مان کر کل ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونا ہوگا۔''

''ایڈمٹ کیا ہوتا ہے؟''ٹکر ٹکر اسے دیکھتے اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا یہ ہوتا ہے کہ اب آپ کو تھوڑے دنوں تک جب تک ڈاکٹر انکل کہیں گے' اس وقت تک ہسپتال میں ہی رہنا ہوگا۔ رات میں بھی وہیں رہنا ہوگا' وہیں سونا ہوگا۔ اکیلے نہیں' وہاں حریم کے پاس ماما بھی ہوں گی' پاپا بھی ہوں گے۔'' خرد بھی صوفے سے اٹھ کر حریم اور اشعر کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''تھوڑے دنوں تک ہمیں صرف وہیں پر رہنا ہوگا مگر حریم وہاں اپنے تھوڑے سے Toys لے جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر انکل نے پرمیشن دی ہے حریم وہاں Annie کو بھی ساتھ لاسکتی ہے۔ حریم کا دل چاہے گا تو وہ وہاں اپنے Toys سے بھی کھیل لے گی۔ ڈرائنگ بھی کرلے گی اور حریم کے روم میں ٹی وی بھی ہوگا اگر حریم کا دل چاہے گا تو حریم اپنا کوئی فیورٹ کارٹون بھی دیکھ سکے گی۔''اس نے حریم کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے رسانیت سے اسے سمجھایا۔ حریم ابھی بھی اشعر کی گود میں تھی اور اس کے قریب آ کر بیٹھنے سے وہ اشعر کے کتنے قریب آگئی ہے۔ اسے اس وقت یہ احساس تھا ہی نہیں۔ ان دنوں اس کے محسوسات' اس کی تمام حسیات صرف حریم پر مرتکز تھیں۔ حریم' اشعر کی گود میں بیٹھی ہے' یہ اسے نظر آ رہا تھا مگر اشعر کے ہونے کا کوئی احساس اس تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس تک پہنچنے والا ہر احساس' محبت کی ہر آنچ صرف حریم سے وابستہ تھی۔

اس نے جھک کر حریم کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا' اسے پیار کیا۔

''ہسپتال میں اچھے بچوں کی طرح رہوگی نا۔'' آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اس کی آواز کچھ بھاری سی ہوگئی تھی۔ مسکرا کر بیٹی کو دیکھتے وہ اس کے سامنے بالکل بھی نہیں رونا چاہتی تھی۔

''پرنس! آپ کی ماما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بس آپ نے گڈ گرل بن کر ہسپتال میں رہنا ہے۔ ڈاکٹر انکل کی ساری باتیں ماننی ہیں۔ گندے بچوں کی طرح رونا اور ضد بھی نہیں کرنا ہے۔ ڈاکٹر انکل کو بھی تو پتا چلے کہ پاپا کی پرنس کتنی بہادر' کتنی اسٹرونگ ہے۔''اشعر نے

حریم کے گرد پھیلے اپنے ہاتھوں کو مزید مضبوطی سے جکڑ کر اسے اپنے اور قریب کر لیا۔

''ہم......گھر کب آئیں گے پاپا'' اس کے چہرے پر ابھی بھی کچھ الجھن سی تھی۔

''بہت جلدی، ان شاء اللہ بہت جلدی اور وہاں سے میری پرنسس بالکل ٹھیک ہو کر آئے گی پھر کوئی منع کر کے تو دیکھے میری بیٹی کو بھاگنے اور کھیلنے سے، پارک جانے سے، اسکول جانے سے، آئس کریم کھانے سے پھر میری پرنسس کو کوئی کسی بھی بات سے منع نہیں کرے گا۔'' اشعر کے یقین دلانے پر بات سمجھ لینے والے انداز میں اس نے سر بڑی سمجھداری سے اثبات میں ہلا دیا۔

☆......☆......☆

حریم کے چہرے کو کبھی فکر، کبھی محبت سے تکتے نجانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی، کمرے میں کوئی شور شرابا نہیں ہوا تھا، پھر پتا نہیں کس چیز نے اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا، آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے ہاتھ پر سر رکھ کر سوئی ہوئی حریم کو دیکھا، وہ بالکل بے فکری والی گہری نیند سوئی نظر آئی، اس کی سانسیں، اس کے دل کی دھڑکنیں سب کچھ بالکل نارمل تھا' پچھلے کئی دنوں سے وہ رات میں یونہی گہری نیند سے بیدار ہو ہو کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکنوں کو محسوس کیا کرتا تھا۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم کو دیکھا کرتا تھا، حریم کو پُرسکون سویا دیکھ کر اس نے اس کے برابر والی جگہ کو دیکھا۔ وہ جگہ خالی تھی، خرد وہاں نہیں تھی' گردن گھما کر اس نے واش روم کی طرف دیکھا۔ اس کی لائٹ آف تھی شاید وہ پانی پینے کچن میں گئی ہو گی۔ گھڑی پر نظر ڈالتے اس نے سوچا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے دس بارہ منٹ گزر گئے اور وہ کمرے میں واپس نہیں آئی، تب حریم کا سر بڑی آہستگی سے اپنے بازو پر سے ہٹاتا وہ بیڈ سے کھڑا ہوا۔

کمرے سے دبے پاؤں بغیر کوئی آواز اور آہٹ پیدا کیے وہ باہر نکلا۔ پورے اپارٹمنٹ میں اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی روشنی نہیں تھی۔ کوریڈور میں ذرا آگے بڑھنے پر اسے کسی کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ کوئی گھٹ گھٹ کر رو رہا ہے۔ یہ آواز لیونگ روم سے آ رہی ہے وہ آہستگی سے چلتا ہوا لیونگ روم کے کھلے دروازے پر آ کر رک گیا۔ ایک بڑی سی سفید چادر لپیٹے جائے نماز بچھائے خرد سجدے میں تھی، وہ رو رہی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز بہت مدہم، بہت ہلکی تھی مگر رات کی اس گہری خاموشی میں اسے کوریڈور تک سنائی دے گئی تھی۔ وہ سسک سسک کر روتے کچھ دعائیں بھی پڑھتی جا رہی تھی' وہ بہت دیر کھڑا ٹکٹکی باندھے بالکل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اللہ سے رابطہ جوڑے' سجدہ ریز ہوئے خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا اسے اس کی آمد کی کوئی خبر ہوئی ہی نہیں تھی۔ بہت دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ جس خاموشی سے وہاں آ کر کھڑا ہوا تھا اسی خاموشی سے پلٹ بھی گیا۔ کمرے میں آ کر حریم کے برابر لیٹتے وہ بالکل گم صم تھا۔ جاگا ہوا لیٹا وہ حریم کو دیکھ رہا تھا اور سوچ پتا نہیں کیا رہا تھا۔ کچھ سوچ بھی رہا تھا کہ نہیں، اسے خود معلوم نہیں تھا۔

☆......☆......☆

حریم کے ہسپتال جا کر کچھ بلڈ ٹیسٹ اور یورین ٹیسٹ وغیرہ ہونے تھے جن کے لیے اسے وہاں نہار منہ پہنچنا تھا۔ ان ٹیسٹوں کے

بعد ہی اسے ناشتہ کرنا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بیٹی کو اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا اس کی پسند کا ناشتہ کرائے، اس کی من پسند اشیاء پر مشتمل بہت اچھا سا ناشتہ بنا کر سلیقے سے پیک کرلیا، ان تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے حریم کو جگایا۔

اس کا منہ دُھلا کر اس کو تیار کیا، Annie کی پریم اور دوسرا بہت ساز و سامان تھا، اس لیے حریم اس کے سمجھانے پر انجلینا کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگئی تھی، اپنا کلرنگ اور ڈرائنگ بکس کلر پینسلیں بھی اس نے اس سے بیگ میں رکھوائی تھیں۔ ابھی تو وہ اتنی خوش تھی جیسے کسی پکنک پر اسے لے جایا جا رہا ہو، اس کے لیے تیار ہو کر اپنا ساز و سامان لے کر ہاسپٹل جانا بھی جیسے ایک تفریح ہی تھا۔

ڈاکٹر انصاری نے انہیں بتایا تھا کہ سرجری کے بعد دس سے بارہ دنوں تک اسپتال میں رہنا پڑے گا اور پھر گھر آنے کے بعد اس کا بیڈ ریسٹ اور مکمل احتیاط برتے جانے کا عرصہ کم سے کم بھی دو ڈھائی ماہ پر مشتمل ہوگا۔

''چلیں؟'' اشعر نے اس سے پوچھا۔ وہ دل میں چند قرآنی سورتوں کا ورد کر رہی تھی۔ جھک کر اس نے حریم کے اوپر دم کیا اور پھر اشعر کے سوال کے جواب میں سر اثبات میں ہلایا۔ اشعر نے حریم کو گود میں اٹھالیا۔ وہ تینوں گھر سے باہر نکلنے لگے' تب اس نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور سچائیوں سے اللہ کو پکارا۔

''بہت بیمار ہے' اس حالت میں میری بیٹی یہاں سے جا رہی ہے۔ میرے اللہ! تو ایسا کرم کردے کہ ہر بیماری سے آزاد ہو کر مکمل طور پر صحت مند اور تندرست ہو کر میری بیٹی اس گھر میں واپس لوٹے۔ میری آنکھوں کو یہ منظر دکھا دینا میرے اللہ۔''

☆......☆......☆

وہ بیسمنٹ میں موجود پارکنگ میں اپنی گاڑی کے پاس پہنچے بھی نہیں تھے کہ حریم نے اپنے فیورٹ چاکلیٹ کوکیز خریدنے کی فرمائش کردی۔

اس سے کوئی بھی حجت کیے بغیر وہ اسے گود میں اٹھائے اپنے ساتھ بیسمنٹ سے باہر لے گیا۔ وہ حریم کو اس کی پسند کے کوکیز دلا کر واپس آیا تو خرد اسے اپنی گاڑی کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ خرد کے ساتھ ہی کھڑے تین منچلے اور لا ابالی قسم کے نوعمر لڑکے بھی نظر آئے تھے جو بیسمنٹ میں بالکل تنہا کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس پر بے ہودہ کمنٹس پاس کر رہے تھے۔ وہ تینوں خرد کے سامنے ایک گاڑی پر چڑھ کر بیٹھے تھے اور وہ انہیں اگنور کر کے دوسری سمت دیکھ رہی تھی۔

اپنے قدموں کی رفتار اس نے یک دم ہی بڑھائی اور بجائے اپنی گاڑی کی طرف آنے کے تیزی سے چلتا ان تینوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے تاثرات میں یقیناً ایسی کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی جو وہ تینوں گڑبڑا کر ایک دم ہی خاموش ہو گئے۔

''اسی بلڈنگ میں رہتے ہو تم تینوں؟'' ان تینوں میں سے ایک لڑکے کو وہ پہچانتا تھا، اسے بوکھلاتا دیکھ کر اس کے دونوں دوست بھی گھبرا گئے تھے۔ وہ تینوں یک دم ہی گاڑی کے اوپر سے اتر کر بالکل سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کرتا ہوں میں تم لوگوں کا کچھ انتظام۔'' چند سیکنڈز تک انہیں غیض و غضب کی مشتعل نگاہوں سے دیکھنے کے بعد وہ دھمکاتی

نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہوا ان تینوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اسے انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا' تینوں لڑکوں کو بدستور مشتعل نگاہوں سے دیکھتے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسی لمحے اس کی اپنی برابر والی نشست پر بیٹھی خرد پر نظر پڑی خرد بالکل خاموش اور ہمیشہ کی طرح بالکل سنجیدہ تھی مگر اس کے چہرے پر ایک اچٹتی سرسری نگاہ جو اس پر پڑی اسے اس کی آنکھوں میں بڑا عجیب سا تاثر نظر آیا۔ کیا تھا اس کی آنکھوں میں اس وقت۔ طنز' تمسخر' استہزاء؟

☆......☆......☆

گاڑی اسپتال کے احاطے میں آ کر رک چکی تھی۔ شہر کے ایک مہنگے علاقے میں کارڈیو ویسکولر ڈیزیز کے علاج کے لیے قائم اس اسپتال کی عمارت کا exterior اور Interior دونوں نہایت شاندار تھے۔

یہ Pre-operative day تھا اور آج حریم کے دوبارہ کئی ٹیسٹ ہونے تھے۔ چنانچہ اسپتال پہنچنے کے بعد سب سے پہلے وہ لوگ اسی مرحلے سے گزرے۔

حریم فی الحال ان میں سے کسی چیز سے بے زار نہیں ہوئی تھی۔ اسپتال کے اس کشادہ' آرام دہ اور تمام سہولیات سے آراستہ روم میں وہ بیڈ پر مزے سے تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔

سوا ایک بجے کے قریب ڈاکٹر انصاری' حریم کے روم میں آئے۔ حریم کے ساتھ چند پرلطف سی باتیں کرتے ڈاکٹر انصاری نے اس کا معائنہ کیا۔ اپنے ساتھ موجود نرس اور ڈاکٹر کو آج تمام دن بھر حریم کی observation کے حوالے سے چند ہدایات دیں اور اشعر کو یہ بھی بتایا کہ ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر سفیان رضی جو حریم کی سرجری کے دوران anesthesia ٹیم کو لیڈ کریں گے۔

ڈاکٹر سفیان رضی' ان کے جانے کے آدھے پون گھنٹے بعد حریم کے روم میں آئے۔

فزیکل ایگزامنیشن کے بعد انہوں نے اشعر اور خرد سے حریم کی گزشتہ اور موجودہ صحت کے متعلق کچھ سوالات کیے تھے۔

ڈاکٹر انصاری سے تو وہ پہلے ہی خوب واقف تھی اور انہیں پسند بھی کرتی تھی' یہ پسندیدگی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کل صبح حریم کی سرجری تھی اور ڈاکٹر رضی نے حریم کے روم سے نکلنے سے پہلے ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ اس چیز کی تاکید کی تھی کہ حریم کو آج رات ٹھوس غذا دینی کب سے بند کر دینی ہے اور پھر اس کے بعد سوپ' جوس اور پانی وغیرہ بھی کس وقت کے بعد سے نہیں دینا ہے۔

☆......☆......☆

حریم ہر بات سے بے خبر اپنی ایک کلرنگ بک میں رنگ بھرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اپنے روزانہ کے معمول کے برخلاف آج صبح بہت جلد اٹھ گئی تھی اس لیے کلرنگ کرتے کرتے ہی اسے نیند آنے لگی تھی۔ خرد نے اسے تکیے پر لٹا دیا، اس سے باتیں کرتے کرتے وہ چند منٹوں ہی میں سو گئی تھی۔

ڈاکٹر رضی کے جانے کے کچھ دیر بعد اشعر کمرے سے باہر چلا گیا تھا' اس سے کچھ کہے بغیر گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔

اشعر کی وہاں واپسی آدھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ کمرے میں آ کر اشعر نے سوئی ہوئی حریم کو ایک نظر بغور دیکھا پھر خاموشی سے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ حریم کے پاس سے آہستگی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کی ڈاکٹر انصاری سے بات ہوئی؟ انہوں نے کہا تھا حریم کی سرجری میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس میں ایک فیصد سے بھی کم رسک ہے۔ کیا اب بھی وہ یہی کہہ رہے ہیں اور یہ آپریشن کتنے گھنٹوں تک ہوگا؟ اور آپریشن کے بعد جب حریم کو ہوش آئے گا تو کیا اسے بہت زیادہ تکلیف ہوگی؟'' اسے یہ سب کہتے ہوئے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ خوف و ہراس چہرے پر لیے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔ پریشانی اور ٹینشن تو اس کے چہرے پر بھی پھیلی تھی وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

''ہاں' ڈاکٹر انصاری سے بھی ہوئی ہے میری بات۔ وہ آپریشن کی کامیابی کے بارے میں بہت زیادہ پرامید ہیں۔ ہمیں ڈرنے اور فکر کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ ان شاءاللہ آپریشن پوری طرح کامیاب ہوگا۔ اسے درد ہوگا مگر ایسا نہیں جو برداشت سے باہر ہوگا۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت غنودگی میں رکھا جائے گا'' وہ حریم کو دیکھتے ہوئے اس سے بات کر رہا تھا۔

چند سیکنڈز وہ دونوں ہی خاموشی سے اپنی بے خبر سوئی بیٹی کو دیکھتے رہے۔

''ہمیں حریم کو تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ سمجھانا چاہیے۔ آپریشن کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا کمپلیکیشن ہیں۔ یہ سب وہ ابھی بالکل نہیں سمجھ سکتی۔''

''مگر جب وہ ہوش میں آئے گی تب تو اسے محسوس ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ ہر طرح کی میڈیسنز دیے جانے کے باوجود بہر حال اسے درد' تکلیف اور بے چینی بھی محسوس ہوگی۔ ہمیں اسے اس سچویشن کے لیے ابھی سے ذہنی طور پر تیار کرنے کی ضرورت ہے۔'' وہ اب اس کی طرف دیکھ کر بول رہا تھا۔ حریم کی اب تک کی مختصر سی زندگی کے اس سب سے خطرناک دور اہے پر وہ ایک مرتبہ پھر اپنے اچھے باپ ہونے کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔

سر اثبات میں ہلا کر اس نے اشعر کی بات سے اتفاق کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس کے اور اپنے درمیان صوفے پر ایک ٹرے رکھی تھی۔

''کھانا کھا لو۔'' سنجیدہ انداز میں اس نے اس سے کہا۔ اسے کھانے پینے' کسی چیز کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

''مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔'' ٹرے کی طرف کسی خاص توجہ سے دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔ اس سے کھانے کے لیے کچھ مزید کہے بغیر اشعر نے کھانے کے چند لقمے لیے تھے۔ تھوڑی دیر میں حریم سو کر اٹھ گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر حریم کے لیے ایک گلاس میں ایپل جوس نکالا اور اسے جوس پیتا ہوا دیکھتے دل میں سوچنے لگی کہ اسے آسان لفظوں میں کس طرح ساری بات سمجھائے۔

''حریم! ڈاکٹر انکل نے کہا ہے کہ حریم بالکل ٹھیک ہو جائے' اسے گندی گندی کڑوی میڈیسنز بھی گھر واپس جا کر نہ کھانی پڑیں اس کے لیے ہمیں حریم کا تھوڑا سا علاج کرنا پڑے گا۔'' حریم کے بالوں کو پیار سے سنوارتے اس نے کہا۔

''اس علاج کے لیے حریم کو ایک اسپیشل روم میں رہنا پڑے گا۔ وہاں ڈاکٹر انکل ہوں گے' نرس ہوگی' ماما اور پاپا بھی وہاں حریم کے پاس ہی ہوں گے مگر ڈاکٹر انکل نے کہا ہے ماما' پاپا اس روم میں حریم کے ساتھ سارا وقت نہیں رہ سکتے۔''

حریم جو مزے سے خوش ذائقہ جوس کے سپ لے رہی تھی۔ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی معصومیت سے بولی۔

''حریم رات کو اکیلی سوئے گی؟'' اس نے مدد کے لیے اشعر کی طرف دیکھا۔

''اکیلی نہیں' وہاں بہت اچھی' بہت سویٹ سی نرس آنٹی ہوں گی جو حریم کا بہت زیادہ خیال رکھیں گی۔ بہت اچھے والے ڈاکٹر انکل ہوں گے وہ بھی حریم کا خوب خیال رکھیں گے اور ماما' پاپا بھی اس روم کے باہر حریم کے بالکل پاس ہی ہوں گے۔ حریم کا جس وقت دل چاہے گا کہ ماما' پاپا اس کے پاس آ جائیں بس فٹ سے نرس سے کہہ کر ہمیں بلا لے گی۔ ہماری پرنسس تو بہت بہادر ہے' وہ تو ماما' پاپا کے بغیر بھی رہ سکتی ہے۔ رہ سکتی ہے کہ نہیں؟'' اشعر نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا تھا۔ حریم کے چہرے پر الجھن اور کچھ پریشانی سی تھی۔ پاپا کا مسئلہ نہیں تھا' ان کے بغیر وہ رات میں رہ سکتی تھی مگر ماما کے بغیر رات میں اکیلے؟ وہ بیٹی کے تاثرات کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی بتائی اس نئی بات سے ہرگز خوش نہیں تھی مگر مجبوری تھی پاپا نے بہادر ہونے کی بات کہہ دی تھی اور وہ خود کو ہر حال میں بہادر کہلوانا چاہتی تھی اس لیے مجبوری کے سے عالم میں گردن اقرار میں ہلا دی تھی۔

☆......☆......☆

شام کے چھ بج رہے تھے اور یہ وزیٹنگ آورز تھے۔ خرد باتھ روم میں تھی اور وہ حریم کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ جب ان کے دروازے پر ہلکے سے دستک دے کر ایک خاتون اندر آئیں۔ پہلی نظر میں وہ انہیں بالکل بھی نہیں پہچان سکا تھا البتہ حریم نے بڑی گرم جوشی سے انہیں سلام کیا اور ساتھ ہی کسی فضہ باجی کا پوچھا۔

''فضہ باجی نہیں آئیں؟''

''فضہ باجی گھر پر پڑھائی کر رہی ہیں ان کے ایگزام ہو رہے ہیں اس لیے۔'' حریم کے قریب آ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اسے یاد آیا یہ وہی خاتون ہیں جن کے پاس حریم اور خرد اس کے ساتھ آنے سے پہلے رہ رہی تھیں۔

وہ ان سے انتہائی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملا۔

''آپ بیٹھیے۔ خرد باتھ روم میں ہے۔''

تب ہی خرد باتھ روم سے نماز کے لیے دوپٹہ لپیٹتی نکلی تو انہیں سامنے بیٹھا دیکھ کر والہانہ ان کی سمت بڑھی۔

''آپ کو اتنی زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی! آنٹی فون کر کے حریم کی خیریت پوچھ لیتیں۔'' وہ ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''افشین میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے لیے۔ خبردار جو یہ زحمت وحمت جیسے لفظ میرے ساتھ بولے۔''

''نہیں بولوں گی۔ میں تو بس آپ کے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔'' وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ خرد سے ہلکی

ہلکی مگر تسلی آمیز گفتگو کر رہی تھیں۔ وہ واقعی مہذب خاتون تھیں۔ حریم کے پاس صرف پندرہ بیس منٹ رک کر ہی وہ جانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ خرد نے صوفے پر سے اٹھ کر انہیں وہیں سے خدا حافظ کہہ دیا تھا، جب کہ وہ انہیں خدا حافظ کہنے دروازے کے باہر لفٹ تک ان کے ساتھ آیا تھا اور حریم کی عیادت کے لیے آنے پر اس نے ان کا بہت شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

کارڈیالوجسٹ نے آ کر حریم کا تفصیلی چیک اپ کیا تھا۔ اس نے نرس کو حریم کی کوئی میڈیسن دینے کو کہا تھا۔ وہ اور اشعر دونوں حریم کے بالکل پاس کھڑے تھے کیا ہونے والا ہے حریم کو کچھ پتا نہیں تھا وہ مسکرا رہی تھی اور وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر آنسوؤں کو پیتی حریم سے روز مرہ جیسی ہی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ حریم کی پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے اس دوا کا اس پر اثر ہوتا تھا ویسے ویسے اس کی بھولی بھولی اور انجان بیٹی کو غنودگی میں چلے جانا تھا۔ جیسے ہی حریم غنودگی میں چلی جاتی اسے آپریشن تھیٹر لے جایا جانا تھا۔ حریم اپنی گھنی، لمبی پلکوں کو زبردستی اٹھا اٹھا کر اپنی گہری سیاہ آنکھوں کو بند ہونے سے روک رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ماما کی بات پوری سننا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس نے جھک کر بیٹی کی پیشانی کو چوما تھا۔ اسے آپریشن تھیٹر لے جائے جانے کی تیاری ہونے لگی تو اس کا دل چاہا۔ وہ بیٹی کے دل کو چیر پھاڑ کرنے سے ان ڈاکٹروں کو روک دے یہ آپریشن اس کی بیٹی کی زندگی کے لیے جتنا بھی ناگزیر سہی پر وہ کیسے سہے اس تکلیف کو کہ اس کے دل کو کھولا جائے اس کا خون بہے اسے نوکیلے اوزار چبھیں اس کے دل کو کام کرنے سے روک کر اسے کسی مشین پر زندہ رکھا جائے اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے وہ پوری کی پوری کانپتی بری طرح رو رہی تھی۔ اسی پل کسی نے اس کے کانپتے ہوئے سرد ہاتھ کو اپنے مضبوط اور گرم ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، کا پیغام دیتا نرم سا تاثر پھیلا ہوا تھا، اس پل اس تسلی اس سہارے سے بڑھ کر اس کے لیے اور کوئی بھی چیز نہیں ہو سکتی تھی، اس نے اپنا کانپتا ہوا دوسرا سرد ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں کے اوپر رکھ دیا تھا اور اس نے اسے بھی اسی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

☆......☆......☆

حریم کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا چکا تھا اور وہ دونوں کوریڈور میں کھڑے تھے۔

اشعر نے اسے کندھے سے پکڑ کر بینچ پر بٹھا لیا تھا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا وہ اپنے دل اپنے دماغ اور اپنی سوچوں کو اس وقت صرف اور صرف تسبیحات، وظائف اور دعاؤں میں لگائے رکھنا چاہتی تھی مگر پھر بھی ہزار نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے رہ رہ کر یہی خیال آئے جا رہا تھا کہ اندر اس وقت حریم کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری نے سرجری کا جو تمام تر پروسیجر انہیں تفصیلی طور پر سمجھایا تھا۔ وہ خوف اور اذیت سے کانپ رہی تھی وہ اپنا سارا دھیان صرف دعاؤں پر رکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ذہن میں آپریشن روم کے اندر کا تصوراتی منظر مسلسل آئے چلا جا رہا تھا۔

''حریم ٹھیک ہو جائے گی؟'' آپریٹنگ روم کے خوفناک منظر سے پیچھا چھڑا کر اس نے اشعر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے

آنسو اس تیزی سے گر رہے تھے کہ وہ اسے بہت دھندلا دھندلا سا نظر آیا۔

''ان شاء اللہ ہماری بیٹی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ اپنے ہاتھ سے اس کے چہرے پر بکھرے آنسوؤں کو صاف کرتا آہستگی سے بولا۔ وہ یک دم ہی اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

''اگر حریم کو کچھ ہوا، میں کیسے زندہ رہوں گی؟ ابھی تو اتنی چھوٹی ہے میری بیٹی، ابھی تو اس نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس کی ٹیچر اس کی ذہانت کی مجھ سے اتنی تعریفیں کرتی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بہت ذہین بہت قابل باپ کی بیٹی ہے۔ اس کے پاپا امریکہ سے پڑھ کر آئے تھے۔'' وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔

''ہماری بیٹی ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اور دنیا کی جس بہترین یونیورسٹی میں وہ پڑھنا چاہے گی میں اسے وہاں بھیجوں گا۔ آئی پرامس یو۔'' اشعر کی بھرائی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس کے کندھے پر سے سر اٹھا کر اس نے اسے دیکھا، اس نے بڑے ضبط سے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔

''حریم نے پھولوں کے جو بیج گملے میں ڈالے تھے، ابھی اس میں پودا نہیں، نکلا نا؟'' اس کی ذہنی رو بھٹک کر کسی اور سمت گئی تھی۔

''نہیں ابھی تھوڑے دن لگیں گے۔'' اس نے رسانیت سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''جب اس میں پھول کھلیں گے تب حریم ہوگی نا وہاں ان پھولوں کو دیکھنے کے لیے۔''

''ہاں جب پھول کھلیں گے تب حریم ہمارے ساتھ ضرور ہوگی۔ ان شاء اللہ۔'' اس کے یہ سوالات شاید اسے حیران نہیں کر رہے تھے، شاید وہ خود بھی ایسی ہی کچھ ادھوری رہ جانے والی باتوں کو سوچ رہا تھا، جنہیں حریم نے ان کی زندگیوں میں واپس آ کر پورا کرنا تھا۔

آپریشن شروع ہونے کے بعد تین، چار گھنٹوں تک تو وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے رہی تھی مگر اب گزرتا ہر اگلا لمحہ اسی کڑے عذاب سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحات حریم حسین کی نہیں خرد احسان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والے سخت ترین لمحات تھے۔ بغیر آواز کے تسبیحات کرتی، قرآنی آیات کا ورد کرتی وہ پھر بے قراری سے رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

پورے پانچ گھنٹے اور اٹھارہ منٹ بعد انہیں یہ خوش خبری ملی تھی کہ حریم کے والو کا نقص ٹھیک کر دیا گیا ہے۔ بائی پاس مشین ہٹا دی گئی اور اب حریم کا دل کسی مشین کے بغیر خود مکمل کام کر رہا ہے۔

یہ آدھی خوش خبری تھی مگر یہ آدھی خوش خبری ہی اس کے لیے اتنی بڑی تھی کہ مارے خوشی اور تشکر کے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اشعر نے پوچھا۔

''روئی بہت ہوں، اللہ سے شکوے بہت کیے ہیں۔ اب ذرا اس کا شکر بھی تو ادا کر آؤں۔'' روتے ہوئے اس نے اشعر سے کہا۔

خرد کا شکرانہ پندرہ بیس منٹ پر مشتمل رہا تھا اور ابھی وہ واپس نہیں آئی تھی کہ اس نے ڈاکٹر انصاری کو آپریشن تھیٹر والے کوریڈور سے چل کر آتے دائیں ہاتھ والے دوسرے کوریڈور کی طرف مڑتے دیکھا۔ یقیناً وہ آپریشن تھیٹر ہی سے آ رہے تھے وہ کسی اور طرف جا رہے تھے مگر اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے رک گئے۔

''خوش خبری تو یقیناً آپ کو مل گئی ہوگی۔ بیٹی کی نئی زندگی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔''

خرد بھی اسی وقت اس کے پاس آ کر کھڑی ہوئی تھی اور اس نے ڈاکٹر انصاری کے اختتامی جملے سنے تھے ایک کامیاب آپریشن کے بعد مریض کے متعلقین کے خوشی سے سرشار چہروں کو دیکھ کر خود بھی خوشی اور سرشاری اپنے دل میں پیدا ہوتی محسوس کرتے ڈاکٹر انصاری وہاں سے واپس مڑ گئے۔ اس نے خرد کی طرف دیکھا۔

''حریم پھول کھلتے دیکھے گی خرد!'' اشعر کی آنکھوں میں خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔

''ہاں حریم پھول کھلتے دیکھے گی اور جو کہانی کل رات میں نے اسے آدھی سنائی تھی وہ اسے بھی پورا سن پائے گی۔ مجھے کل رات کہانی پوری کرتے وہم آیا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے آدھی کہانی سنائی تھی۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

☆......☆......☆

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد انہیں اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ انہیں حریم نظر تو آئی مگر سوئی ہوئی، ڈھیر ساری مشینوں، تاروں اور آلات میں جکڑی ہوئی۔

''حریم!'' اس کے پاس کھڑے ہو کر اسے چھوئے بنا اس نے آہستگی سے اسے آواز دی۔

وہ بے آواز اشک بہاتے غنودگی کی حالت میں پڑی اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ حریم کے پاس سے ہٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھی مگر اشعر اسے ہاتھ پکڑ کر ICU سے باہر لے آیا تھا۔ اس کی آئی سی یو میں ڈیوٹی پر موجود کارڈیالوجسٹ سے تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔

خرد کی بے چینی اور بے قراری دیکھ کر وہ اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آئی سی یو میں جانے دے رہا تھا اس شرط پر کہ وہ حریم کو دیکھ کر فوراً باہر آ جائے گی۔

رات کے نو بج رہے تھے اور ڈاکٹروں کے مطابق حریم کی حالت تسلی بخش تھی۔ پرسوں رات اپنے گھر پر ان دونوں نے حریم کے ساتھ جو ڈنر کیا تھا، خرد نے تب ہی جتنا تھوڑا بہت کھایا تھا، کھایا تھا اس کے بعد سے وہ مسلسل بھوکی پیاسی تھی۔ وہ کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ وہ بھی دو راتوں سے بالکل نہیں سویا تھا مگر مرد اور عورت کی جسمانی طاقت میں بہت فرق ہوتا ہے اور اسے اب یہ ڈر لگ رہا تھا کہ بے انتہا ٹینشن کے ساتھ مسلسل بھوکے پیاسے رہ کر کہیں وہ خود اپنی طبیعت نہ خراب کر لے۔ اسے ہسپتال سے گھر لے جانے کی کوشش کرنا بالکل بے سود تھا، وہ حریم سے دور جانے کے لیے کسی بھی قیمت پر راضی نہ ہوتی۔

رات سوا نو بجے جب وہ دونوں حریم کو دیکھ کر دو منٹ بعد وہاں سے باہر نکلے تب وہ خرد کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوریڈور کے دوسرے حصے

کی طرف لے جانے لگا۔ وہ اسے بینچ کی جگہ کسی اور جگہ جاتے دیکھ کر ٹھٹکی۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں۔''

''لیکن حریم؟ وہ یہاں اکیلی۔'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ''حریم اکیلی نہیں ہے۔ اس کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے لئے انتہائی قابل ڈاکٹرز اور نرسیں موجود ہیں۔'' اس نے پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ''لیکن وہ حریم'' کہنا چاہا مگر اس کے کسی احتجاجی انداز کو خاطر میں نہ لاتا وہ اسے طویل کوریڈور کے اختتامی حصے میں بنے لاؤنج کی طرف لے آیا۔

وہ اسے لے کر لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ پورا کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ اشعر نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور پھر خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''حریم کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے لیے، اس کا دھیان رکھنے کے لیے، اس کی تیمارداری کے لیے تمہارا خود کا صحت منداور فٹ رہنا انتہائی ضروری ہے۔ اگر تم خود بیمار پڑ گئیں تو حریم کا خیال کون رکھے گا؟'' اس نے رسانیت سے اسے سمجھایا۔ ''مجھے کیا ہوا ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''اس طرح مسلسل بھوکے رہ کر، نہ سو کر، تم ٹھیک کس طرح رہ سکو گی خرد؟ تمہارے لیے کچھ کھانا اور تھوڑا سا سونا بہت ضروری ہے۔''

وہ اس کے پاس سے اٹھا اور صوفے کے پاس رکھی چھوٹی میز پر موجود لیمپ آن کر دیا۔ ٹیوب لائٹ اس نے قصداً نہیں جلائی تھی۔ وہ نیند بھگا بھگا کر خود کو زبردستی جگا رہی تھی۔ اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکلا ہاسپٹل کے اندر موجود کیفے ٹیریا رات نو بجے بند ہو جاتا تھا، وہ بیس پچیس منٹ لیٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب اسے کہیں باہر سے کچھ لے کر آنا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں آ کر وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا جب اس کے موبائل پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ اس نمبر کو بالکل بھی نہ پہچانتے اس نے کال ریسیو کی۔

''اشعر صاحب بات کر رہے ہیں؟'' کسی نوجوان خاتون کی آواز تھی۔

''جی۔'' اس نے آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے قدرے حیرت سے کہا۔

''میں خرد کی دوست افشین خاور بات کر رہی ہوں نواب شاہ سے آپ کو اس بے وقت زحمت دینے کی معذرت چاہتی ہوں، لیکن خرد کے موبائل پر دوپہر سے ٹرائی کر کر کے میں تھک گئی تو پھر میں نے آپ کے اپارٹمنٹ فون کر کے آپ کی ملازمہ سے آپ کا سیل نمبر لیا۔ دراصل میں حریم کی خیریت پوچھنا چاہ رہی تھی حریم کیسی ہے؟ اس کا آپریشن؟''

''اللہ کا شکر ہے آپریشن بالکل کامیاب رہا ہے، ابھی حریم آئی سی یو میں ہے اور خرد نے اپنا موبائل شاید آف کیا ہوا ہے۔ ابھی میں ہسپتال سے باہر ہوں ورنہ آپ کی اس سے بات کرا دیتا۔ میں آدھے گھنٹے تک واپس وہاں پہنچتا ہوں تو آپ کی خرد سے بات کرا دوں گا۔'' اس نے شائستگی اور خوش اخلاقی سے اسے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے بس حریم کی خیریت معلوم کرنا تھی، وہ

آپ سے معلوم ہوگئی۔ آپ بس خرد کو میرے فون کا بتا دیجئے گا اور یہ بھی کہ ہم سب مسلسل حریم کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ بتول خالہ نے آج اپنے گھر پر آیت کریمہ کا ختم رکھا تھا، وہاں بھی سب نے حریم کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔ میں ان شاء اللہ کل صبح خرد کو فون کروں گی۔''

کہاں کہاں، کون کون لوگ تھے جن سے وہ واقف نہیں تھا اور جو اس کی بیٹی کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھے وہ خرد کے ان مخلص جاننے والوں کو سوچتا گاڑی سڑک پر لے آیا۔ وہ ہسپتال کے بالکل قریب واقع ایک غیر ملکی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں آ گیا تھا۔ اس نے برگر پیک کروایا اور فوراً ہی واپس ہسپتال آ گیا۔ خرد کو وہ جس طرح بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی، بس صرف اس نے اپنے سر کو ہاتھ سے ذرا زور ڈال کر پکڑا ہوا تھا شاید اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر اس کے پاس بیٹھا اور برگر کا ایک ڈبا کھولتے ہوئے اس سے بولا۔

''تمہیں بھوک نہیں لگ رہی، تمہارا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا، پھر بھی صرف حریم کی وجہ سے کھانا کھا لو۔ میرے لیے نہیں، اپنے لیے نہیں صرف حریم کے لیے۔'' اس کے کسی انکار سے پہلے اس نے کہا۔

''یہ برگر کھاؤ، چائے پیو، سر درد کی ایک گولی لو اور تھوڑی دیر سو جاؤ تا کہ جب پھر سو کر اٹھو تو پوری طرح فٹ اور فریش ہو۔''

''لیکن حریم وہاں اکیلی۔''

''حریم کے پاس میں جا رہا ہوں۔ جتنی جلدی تم اسے کھا کر سونے کے لیے لیٹ جاؤ گی۔ میں اتنی جلدی وہاں چلا جاؤں گا۔'' اس کا زبردستی منہ میں ٹھونسا نوالہ اس نے ایک دم ہی جلدی جلدی چبانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بغیر کسی اختلاف، بحث یا احتجاج کے اس کے ہاتھ سے برگر کھا رہی تھی۔ وہ پورا برگر کھا چکی تب ڈسپوزیبل کپ میں جو وہ چائے لایا تھا، اس میں سے ایک کپ میں اس چینی کا ساشے کھول کر شکر ملا کر چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے چائے کے گھونٹ لینے شروع کر دیے تھے۔ مگر اسی طرح جیسے ذائقہ، رنگ، خوشبو، مزا اسے کسی بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اسے چائے پیتا دیکھ کر اس نے دوسرا برگر نکالا اور اسے خود کھانے لگا۔ وہ برگر کھانے کے ساتھ ساتھ ہی اپنی چائے کے سپ بھی لے رہا تھا۔

''ابھی تمہاری دوست افشین کا فون آیا تھا میرے موبائل پر، حریم کی خیریت پوچھ رہی تھی۔ شاید کل صبح کسی وقت تمہیں فون کرے گی۔'' اس نے اسے اطلاع دی۔

جواباً کچھ کہے بغیر اس نے یونہی بے توجہی سے سر ہلا دیا۔

''یہ لو۔'' وہ کمرے سے اٹھ کر گیا تھا اور باہر ڈیوٹی پر موجود ایک نرس سے سر درد کی گولی لے کر آیا تھا۔ اس وقت وہ پانی کا گلاس اور گولی اس کے سامنے لیے کھڑا تھا۔ اس نے پانی سے گولی نگلی۔ وہ ایک بار پھر صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ حریم کے پاس جائیں، میں سو رہی ہوں۔'' اشعر کو اس کے ارادے میں قطعی دیکھ کر وہ یہاں رکنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔

''پہلے تم سو جاؤ پھر جاؤں گا۔'' جیسے اسے حریم کے پاس جلدی سے بھیجنے کے لیے اس نے کھانا فٹافٹ کھایا تھا۔ایسے ہی وہ چاہتا تھا اسے وہاں فوراً بھیجنے کے لیے وہ نیند کو مزید بھگا کر خود کو زبردستی جاگے رہنے پر مجبور نہ کرے وہ کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ موجود ریک پر سے ایک چادر اٹھا کر لے آیا۔اس پر چادر ڈالتے وہ پھر اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

''صوفے پر ہی ٹانگیں سیدھی کر کے لیٹ جاؤ۔زیادہ نہیں بس دو ڈھائی گھنٹے سو جاؤ۔''

وہ اس کے پاس سے اٹھ جانا چاہتا تھا، وہ صوفے پر پوری طرح لیٹ جائے، مگر بجائے اس کے پاس سے اٹھنے کے اس نے بڑی آہستگی سے اس کے گرد ہاتھ پھیلا کر اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا تھا۔اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلاتے وہ جیسے اسے ایک بہت پرسکون نیند سلا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ اسے بہت کمزور، بہت نڈھال اور بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔اس کے بال جو کل صبح ہسپتال آنے کے بعد سے دوبارہ برش نہیں کئے گئے تھے، ان کی الجھی کئی لٹیں اس کے چہرے کے گرد بکھری ہوئی تھیں۔رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں، اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اس نے وہی کاٹن کا سبز لباس پہن رکھا تھا جو وہ اسے پہلے بھی نجانے کتنی بار پہنے دیکھا کا تھا۔اس کے پاس موجود ان فقط سات آٹھ جوڑوں میں سے ہر لباس کا رنگ اور ڈیزائن اسے بغیر کسی توجہ اور دھیان کے بھی ازبر ہو چکا تھا۔بہت سادہ اور عام سے وہ معمولی قیمت کے کپڑے اس کی مالی حیثیت کے آئینہ دار تھے۔

پتا نہیں کیوں مگر ایک عجیب سی سوچ اس کے دل میں پہلی بار ابھر رہی تھی، وہ اس سے پہلے کہاں تھی، وہ زندگی کو کس طور گزار رہی تھی، وہ اس کے پاس حریم کی سرجری کے لیے پیسے مانگنے آئی تھی۔حریم کی گزشتہ رپورٹس دیکھ کر وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس آنے سے کافی عرصہ پہلے سے وہ حریم کا مختلف کارڈیالوجسٹس سے علاج کروا رہی تھی اور پتا نہیں کیوں مگر اس وقت اس کی یہ الجھی بکھری حالت دیکھ کر یک بارگی اس کے دل میں خیال ابھرا تھا کہ ابھی تو وہ اس کے ساتھ ہے، مشکل کی ان گھڑیوں میں وہ تنہا نہیں، تب اس کا یہ عالم ہے۔بیماری کا پتا چلا ہوگا، تب اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اس کا دل چاہا تھا، وہ غصے یا نفرت سے نہیں، دکھ اور کرب سے اس سے صرف اتنا پوچھے۔

''خرد! کیا تم اس وقت تنہا تھیں؟ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہیں پکارا تھا؟ تم اب میرے ہوتے ہوئے اتنی کمزور پڑ رہی ہو تو اس وقت؟ وہ وقت تم نے کیسے سہا تھا؟''

عجیب و غریب سے ناقابل فہم سے احساسات میں گھرا اپنے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں موندے نیند کی آغوش میں جاتی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر وہی معصومیت اور وہی سادگی پھیلی تھی۔جس نے برسوں پہلے اسے اپنے حصار میں قید کر لیا تھا۔وہ کئی شب پہلے کا گزرا واقعہ تھا جب سوتے سے آنکھ کھلنے پر اس نے اسے اپنے ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھے پایا تھا۔وہ بہت دیر تک ساکت لیٹا رہا تھا۔وہ اپنے ہاتھ پر رکھے اس کے ہاتھوں کو ہٹا نہیں پایا تھا اور بہت دیر بعد جب وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹا کر بالکونی میں جا کر کھڑا ہوا تو اسے خود پر اپنی اس کمزوری پر شدید طیش آیا تھا مگر آج رات اسپتال کے اس کمرے میں جب بیٹی کی بیماری اور اس کی صحتیابی کے سوا اس کے ذہن پر کچھ نہ تھا، کسی کمزور لمحے کی زد میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اگر ایسا ہوتا تو یہاں خرد احسان کی جگہ کوئی دوسری عورت اس کے ساتھ تنہا ہوتی تو وہ اس کے لیے بھی اسی طرح محسوس کر رہا ہوتا، اسے بھی تحفظ فراہم کرنے کی خواہش، دنیا کے تمام دکھوں سے بچالینے کی آرزو یونہی دل میں ابھر رہی ہوتی، مگر ایسا نہیں تھا جس سے اسے شدید نفرت تھی، اس کا دل اس سے نفرت نہیں کر رہا تھا۔ اگر اسے حریم کے پاس واپس نہ جانا ہوتا تو وہ ساری رات یونہی اسی طرح گزار دیتا۔ اس نے خرد کا سر شانے ہٹایا۔ اسے صوفے پر پوری طرح لٹا کر چادر بھی اوڑھا دی۔ وہ بہت گہری نیند میں جا چکی تھی۔ چادر اس کے شانوں تک اچھی طرح پھیلاتے اس کے ہاتھ ایک پل کے لیے رکے، ایک بے اختیاری سی کیفیت میں وہ اس کی طرف جھکا، بڑی آہستگی سے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے۔

''میں آج بھی نہیں جانتا کہ تم نے جو کیا، وہ کیوں کیا مگر خرد! تمہیں ایک بات بالکل سچ بتاؤں۔ تم سے نفرت کرنے میں، میں ہار گیا ہوں۔''

☆......☆......☆

آئی سی یو میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے بات کر کے حریم کی کنڈیشن، اس کی ریکوری کی رفتار سے متعلق اطمینان پا کر وہ دوبارہ بنچ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے اندر آوازیں ہی آوازیں تھیں، شور ہی شور تھا، بے سکونی ہی بے سکونی تھی۔ اس کے سامنے اس کی اپنی، خرد کی اور حریم کی زندگی ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑی تھیں۔ ان کی زندگیوں میں جو کچھ ہوا آخر وہ ہوا کیوں؟

جس محبت کی موت کا وہ ساڑھے چار سال قبل سوگ منا چکا تھا، اس کا دل اسے بتا رہا تھا کہ وہ مری نہیں، وہ آج بھی زندہ ہے اور محبت کبھی مرتی نہیں ہے شکلیں بدلتی ہیں۔ کبھی وہ جوگ بنتی ہے کبھی روگ۔ کبھی خوشی، کبھی ہنسی۔ کبھی درد، کبھی آنسو۔ کبھی خود سپردگی، کبھی بے اعتنائی۔ کبھی الفت، کبھی نفرت۔ اس کا دل اسے دلیلیں دے رہا تھا۔

وہ ساڑھے چار سال پہلے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کس طرح چھوڑ کر گئی تھی یاد ہے؟ تمہارے غصے، تمہارے اندر بھڑکتی آگ، تمہاری کسی انتقامی کارروائی کو ذہن میں رکھتے وہ زندگی بھر کبھی تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں کر پائی۔ ایک مہینہ پہلے وہ تمہارے آفس میں آئی تھی تو کیا اس کے چہرے پر شرمندگی تھی، ندامت تھی، پچھتاوا تھا؟ وہ تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت سے کیا کہہ رہی تھی۔

''یہ میری چار سال کی بیٹی حریم حسین کی تصویر ہے۔ بدقسمتی سے میری اس بیٹی کے بائیولوجیکل فادر آپ ہیں۔ آپ مجھے جیسا اور جس کردار کا حامل سمجھتے ہیں، شوق سے سمجھتے رہیے۔ میرے یہاں آنے کا محض اتنا مقصد ہے کہ میں اپنی بیٹی کو اس کے امیر کبیر باپ سے وہ پیسہ دلوا سکوں جو اس کے علاج کے لیے درکار ہے اور جو اپنے باپ سے لینا اس کا حق ہے۔''

وہ صرف اور صرف نفرت، حقارت اور طنز میں ڈوبے لہجے میں تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

''اگر آپ کو کچھ شبہ ہو تو آپ اپنے طور پر خود بھی تصدیق کروا سکتے ہیں کہ میری بیٹی جو تاریخ میں کہہ رہی ہوں، اسی کو پیدا ہوئی تھی یا نہیں۔ یہ بات میں کیوں کہہ رہی ہوں، آپ یقیناً سمجھ ہی رہے ہوں گے۔ جس کا کردار آپ کے ساتھ رہتے مشکوک تھا تو کہیں دور جا کر اس پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے شک میں حق بجانب ہیں۔'' وہ حقارت سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔

''میری بیٹی کا بلڈ گروپ B+ ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ B+ میرا بلڈ گروپ B+ نہیں، B+ خضر عالم کا بلڈ گروپ بھی نہیں تھا۔ ہاں یہ آپ کا بلڈ گروپ ضرور ہے۔'' تم سے نہیں ڈری، تمہاری طاقت، تمہارے غصے سے نہیں ڈری۔ ایک تنہا اور لاچار عورت میں یہ جرأت کب پیدا ہوتی ہے۔ صرف اور صرف اس وقت جب وہ خود کو حق پر اور درست سمجھ رہی ہوتی ہے، جب اس کے اندر کا سچ اسے بالکل نڈر اور بے خوف بنا دیتا ہے۔ وہ ساڑھے چار سالوں میں کبھی پلٹ کر تمہارے پاس نہیں آئی۔ مالی مشکلات کے باوجود وہ کبھی تم سے بیٹی کی پرورش کے لیے پیسہ مانگنے نہیں آئی، وہ کسی بھی انداز میں کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئی اور اب جب آئی تو صرف اس وقت جب بیٹی کی جان پر بن آئی تھی۔

ایک بہت چاہنے والے امیر ترین شوہر کو چھوڑ کر کسمپرسی اور مفلسی کی مشکل زندگی کا انتخاب کر کے اس نے ایک سنگین غلطی کی ہے۔ کیا کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے پر ایسا کوئی پچھتاوا، کوئی ملال دیکھا ہے؟ سوائے نفرت اور غصے کے کوئی اور رنگ نظر نہیں آیا۔

''تم اس سے نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے، تم سے زیادہ نفرت کرتی ہے تم اسے غلط سمجھتے ہو اور وہ تمہیں، تم سے زیادہ غلط سمجھتی ہے۔ ایک وقت دو لوگ تو صحیح نہیں ہو سکتے، دونوں تو قابلِ نفرت نہیں ہو سکتے، دونوں تو ظالم نہیں ہو سکتے۔ یقیناً دونوں میں سے ایک صحیح ہے، ایک غلط۔ ایک ظالم ہے، ایک مظلوم۔ لیکن کون؟''

وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا اور اس کے کان اپنے قریب ایک مانوس آواز سن رہے تھے۔

''میں بیس سال کی ہو چکی ہوں۔''

''میرا میتھس بہت اچھا ہے۔ میرے بابا مجھے میتھس پڑھاتے تھے۔''

''میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی، لیکن اس وقت آپ اتنے غصے میں تھے، مجھے یہ بتاتے ڈر لگا تھا کہ یہ گملے کسی ملازم نے نہیں بلکہ میں نے یہاں رکھے ہیں۔''

''جو باتیں میں آپ سے اس دوستانہ ماحول میں کر رہی ہوں، کورٹ کے ذریعے بھی کر سکتی تھی۔ میرا کردار چاہے جتنا بھی مشکوک ہو، پر میرے دعوے کے جواب میں عدالت ایک DNA Paternity test کروانے کا حکم آپ کو دیتی اور پھر فوراً ہی ساری سچائی کھل کر سامنے آ جاتی مگر آپ ایک عزت دار انسان ہیں۔ یقیناً کورٹ کچہری میں آپ کی جگ ہنسائی ہوتی، اسی لیے میں نے یہاں آنا مناسب سمجھا۔''

سادہ، سادہ سی باتیں کرنے والی اس معصوم لڑکی کو یہ کڑوی باتیں کرنا کس نے سکھائی تھیں؟

''خاصی سخت جان اور ڈھیٹ ہوں۔ جاب لیس ہو جانا تو اتنی بڑی بات بھی نہیں، اس سے بڑی بڑی باتیں سہہ کر بھی بالکل ہٹی کٹی رہی ہوں۔''

اپنی دوست سے یہ جملے بولتے اس کے لہجے میں کیا تھا، بے بسی سے بھری ایک تلخی۔

اپنی نظروں میں وہ مجرم نہیں، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ وہ زندگی بھر کے اپنے کیے کسی ایک بھی فعل پر نادم و شرمسار نہیں۔ یہ بات ہر طرح سے واضح ہے۔

''پاپا! جھوٹ بولنا گندی بات ہے۔''

''میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔ جھوٹ تو جھوٹ ہے چاہے بڑی بات پر بولا جائے، چاہے چھوٹی بات پر۔''

''ماما بولتی ہیں جھوٹ بولنا گندی بات ہے۔ جھوٹ بولنے سے اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔''

''بابا کہتے تھے جھوٹ بولنا صرف پہلی بار آسان لگتا ہے، اس کے بعد ہمیشہ مشکل ہوتی ہے اور سچ بولنا صرف ایک بار مشکل لگتا ہے، اس کے بعد آسانی ہی آسانی ہوتی ہے۔''

وہ اس کی بیٹی کی کتنی اچھی ماں ہے کیا وہ یہ بات اس ایک مہینے میں نہیں دیکھ چکا؟ اگر وہ ہر رشتے میں بری تھی تو اسے ماں کے رشتے میں بھی برا اور خود غرض ہی ہونا چاہیے تھا۔

اپنے کم وسائل میں بھی اس نے بیٹی کو کتنے ناز و نعم میں پالا تھا۔ جو لباس خود پہنتی تھی اور جو حریم کو پہناتی تھی اس کے معیار میں موجود زمین آسمان کا فرق یہ صاف ظاہر کرتے تھے کہ اپنی ضروریات کو محدود سے محدود کر کے اس نے بیٹی کو ہر ممکن حد تک اچھی زندگی دینے کی کوشش کی تھی۔

فجر کا وقت ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی جب اس نے خرد کو کافی دور سے آتے دیکھا۔ وہ کوریڈور کے آخری سرے سے چلتی اسی سمت آ رہی تھی وہ بغور اسے آتا دیکھ رہا تھا، وہ اس کے پاس آ کر رکی۔ ''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ سر کا درد ٹھیک ہوا؟''

''ٹھیک ہے۔ حریم کیسی ہے؟ میں اسے دیکھ آؤں؟'' وہ اس پر سرسری نظر ڈال کر سادہ سے لہجے میں بولی۔

فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے وہ مسجد چلا گیا تھا اور وہاں سے واپسی پہ وہ کیفے ٹیریا سے اپنے اور خرد کے لیے ناشتہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ بھی نماز پڑھ کر واپس وہیں بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹہ نماز کے سے انداز میں لپیٹا ہوا تھا اور تسبیح ہاتھ میں لیے وہ کچھ ورد کر رہی تھی۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرے اس نے اپنی گود ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بوائل انڈے، رول، مکھن، جیم اور چائے موجود تھی۔

''ناشتہ کر لو خرد!'' سر ہلا کر اس نے تسبیح پڑھنا روکی اور پھر اس سے دور ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت نہیں ممنونیت اور اظہار تشکر جھلکتا تھا۔ جیسے کوئی غیر شخص اس کی بیٹی کا علاج کروا رہا ہے، وہ سادہ رول چائے کے ساتھ کھانے لگی۔

''بس کھا چکیں؟ یہ بوائل ایگ تو لے لو۔'' اس نے آہستگی اور نرمی سے اصرار کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے پاس آنے، اپنائیت اور محبت سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں دیتی، اس کی احسان مند نگاہوں میں بھی یہ تاثر موجود تھا۔

وہ دونوں ناشتہ کر چکے تب وہ آہستہ آواز میں انتہائی سنجیدگی سے اس سے بولی۔

''آپ پوری رات جاگتے رہے ہیں۔ اب کچھ دیر گھر جا کر آرام کر آیئے۔ حریم کے پاس میں ہوں۔''

سادہ سے اس جملے میں محبت اور اپنائیت کا ہلکا سا بھی رنگ شامل نہیں تھا۔ یہ صرف انسانیت اور اخلاقیات کے تحت کہی جانے والی ایک بات تھی پھر بھی اسے یہ جملہ اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ دو تین گھنٹوں میں آؤں گا۔ تمہارے لیے کچھ لاؤں گھر سے؟ تمہیں کچھ منگوانا ہے؟''

اسے سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتے خرد نے نفی میں سر ہلا دیا تھا وہ اپنے سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو درحقیقت اسے خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑی نظر آ رہی تھی، وہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ اس سے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ وہ پرسوں سے ان ہی کپڑوں میں تھی اور اس سے یہ تک نہیں کہہ رہی تھی کہ آتے ہوئے وہ اس کے لیے اس کا ایک جوڑا ہی لیتا آئے۔ وہ اس سے پورے حق کے ساتھ ہر چیز لیا کرتی تھی۔ وہ اسے شاپنگ کرانے لے جاتا تو وہ جی بھر کر شاپنگ کرتی۔ اسے جب کبھی پیسوں کی مزید ضرورت پڑتی وہ بے دھڑک مطلوبہ رقم کا چیک کاٹ کر وہ چیک اسی کے حوالے کرتی کہ اسے یہ پیسے کیش کروا دیے جائیں۔ مگر وہ اب اس کی کسی بھی چیز پر اپنا کوئی حق نہیں سمجھتی تھی۔ یہ اس انا، اس کی خودداری، اس کی غیرت کا سوال ہے کہ وہ اپنی ذات پر اشعر حسین کا کوئی احسان نہ لے، ہاں حریم کے ساتھ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ اسے قبول کرتی ہے، وہ اس پر اس کی احسان مند اس کی بے انتہا شکر گزار بھی ہے۔

بوتیک سے چند جوڑے اس کے لیے خرید لے، ان میں سے ایک لے جا کر اسے ہسپتال میں تبدیل کرنے کے لیے دے دے مگر اسے پتا تھا وہ اس کے دیے ان کپڑوں کو کبھی بھی قبول نہیں کرے گی۔ گاڑی اپنے اپارٹمنٹ کے قریب واقع ایک اسٹور کے پاس روک کر اس نے کچھ اشیاء وہاں سے خریدی تھیں اور انہیں لے کر وہ اپنے اپارٹمنٹ آ گیا تھا۔ ''اسپیکیٹیز بنا دو اور فش فرائی کر دو میں ہسپتال اپنا اور خرد کا لنچ لے کر جاؤں گا۔'' خرید کر لائی ہوئی اشیاء کو زینت کے سپرد کرتے ہوئے اشعر نے کہا۔ اس عارضی قیام گاہ میں آنے کے بعد یہ اس کی پہلی خریداری تھی جو اس نے حریم کے علاوہ کسی اور کے لیے کی تھی وگرنہ اپنے اور خرد کے روزمرہ کھانے پینے کی اشیاء اور دیگر کچن آئٹمز کی خریداری کے لیے اس نے زینت کو اکٹھے پیسے دے رکھے تھے۔

شیو بنا کر نہا کر، خود کو تازہ دم کر لینے کے بعد کچھ دیر لیٹنا چاہتا تھا مگر لیٹنے سے پہلے کچھ خیال آنے پر وہ کمرے میں موجود الماری کی طرف آیا۔ الماری پوری کی پوری حریم کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر خرد نے آخر اپنے کپڑے اور ضروری اشیاء رکھی کہاں تھیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نگاہ الماری کے سب سے نچلے خانے میں رکھے ان دو بیگز پر پڑی جو اس اپارٹمنٹ میں آتے ہوئے وہ اپنے

ساتھ لائی تھی۔ ان میں سے ایک پورا خالی تھا اور دوسرا بھرا ہوا تھا۔ اس نے اس بڑے سے بیگ کی زپ کھولی تو اس کے اندر تہہ ہوئے خرد کے کپڑے اور اس کی ذاتی استعمال کی دوسری اشیاء نظر آئیں۔ اس نے اپنے کپڑوں کو الماری میں نہیں بیگ ہی میں رکھا ہوا تھا۔ عجیب سی کیفیت میں گھرے اس نے اس میں سے ایک جوڑا نکال کر استری کرنے کے لیے زینت کے حوالے کیا، وہ ہاسپٹل لے جانے کے لیے یہ کپڑے اور لنچ سب کچھ اچھی طرح سلیقے سے پیک کر دے، اسے یہ ہدایت دے کر وہ کمرے میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، چھت کو گھورتا رہا تھا

''کچھ چیزیں آپ کے حالات اور واقعات دکھا رہے ہوتے ہیں اور کچھ آپ کا دل آپ سے کہہ رہا ہوتا ہے۔ اور اسے تو حالات و واقعات اور اس کا دل سب مل کر نجانے کب سے کہے جا رہے تھے کہ ان کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ غلط تھا۔ بہت غلط تھا۔ اس غلط کو ڈھونڈنے کے لیے کھوجنے کے لیے اسے ساڑھے چار سال پیچھے جانا ہوگا۔ جن واقعات کو اپنے لیے ذلت کا باعث سمجھ کر کبھی خود سے بھی دہرانا پسند نہیں کرتا انہیں نئے سرے سے دہرانا ہوگا۔

''آپ جب واپس آئیں گے، میں آپ کو ایک بات بتاؤں گی۔'' ساڑھے چار سال پہلے اس رات اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ جب واپس آئیں گے تب۔ فون پر نہیں بتاؤں گی۔'' وہ روتے روتے کسی بات پر ہنسی تھی۔

''جب میں آپ کے گھر سے گئی تو تقریباً پانچ، چھ ویکس کی پریگنینٹ تھی۔ میرے اس دعوے کا ثبوت آپ چاہیں تو آپ کو ڈاکٹر طیبہ نادر کے کلینک سے مل سکتا ہے۔ آپ کے گھر سے جانے سے کافی روز قبل میں نے اپنا پریگننسی ٹیسٹ وہیں سے کروایا تھا۔''

''کیا جو بات وہ اسے اس رات بتانا چاہتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟ کیا وہ بات یہ تھی؟ لیکن وہ تو ڈاکٹر کے پاس ممی کے ساتھ گئی تھی۔''

''لے گئی تھی آج میں اسے ڈاکٹر شیراز کے پاس، جو میں تم سے کہہ رہی تھی وہی وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔

''آپ کی بہو کیا کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے؟ کمزوری ہوگئی ہے اسے، بی پی بھی لو تھا لیکن خدانخواستہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ڈاکٹر شیراز نے کچھ ملٹی وٹامنز وغیرہ دی ہیں اور میں نے آج سے خرد کے کھانے پینے پر سختی کی ہے۔''

اسے ماں کی ساڑھے چار سال قبل کی فون پر کہی بات یاد آئی۔ اس نے الجھے ہوئے انداز میں اپنے سر کو زور سے پکڑا۔ ڈاکٹر طیبہ نادر؟ ڈاکٹر شیراز؟ ڈاکٹر شیراز قادران کے فیملی ڈاکٹر تھے اور طیبہ نادر، یہ پتا نہیں کون ڈاکٹر تھیں۔ ہوسکتا ہے خرد، ممی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی ہی نہ ہو، پڑھائی کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کر دیا ہو۔ اس رات اور اس صبح جب وہ دبئی جا رہا تھا تب وہ لگ بھی تو کتنی ناراض رہی تھی۔ اس کے سہارا دیتے ہاتھ تک کو اس نے قبول نہ کیا تھا۔ شاید۔

ممی نے فون پر صرف اس کی تسلی کے لیے، تاکہ وہ ملک سے باہر خرد کی صحت کی طرف سے پریشان نہ ہو، اس سے یہ جھوٹ بولا ہو

کہ وہ اسے ڈاکٹر کے لے گئی تھیں۔ شاید انہیں ملک سے باہر دور بیٹھے بیٹے کو یہ بتانا مناسب نہیں لگا ہوگا کہ اس کی بیوی نے اس کی بات رد کرتے ان کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ فون پر یہ بات سن کر اسے لازمی طور پر غصہ آتا اور انہوں نے ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر وہی مدبرانہ کام کیا تھا جو سمجھدار بڑے اپنے سے چھوٹوں کے بیچ کے جھگڑے اور اختلافات ختم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ خرد بعد میں ممی کو لاعلم رکھتے اکیلے ان کے پاس گئی ہوگی، اس نے اپنے پریگنینٹ ہونے کی بات ممی سے بھی چھپائی تھی۔ لیکن کیوں؟ شاید خوشی کی یہ خبر وہ سب سے پہلے اسے سنانا چاہتی ہوگی، اس لیے۔

وہ خود ہی سوال اور خود ہی جواب والی عجیب الجھن میں گھر الیتا تھا۔ وہ خود کو ساڑھے چار سال پیچھے اس ماضی میں لے تو گیا تھا مگر زندگی کی الجھی ڈور کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

خرد کے ردعمل اور اس کے منہ سے اسے دیکھ کر سب سے پہلے کیا لفظ نکلا تھا اشعر نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

وہ نہ بوکھلائی ہوئی تھی نہ گھبرائی ہوئی وہ تو بس صرف حیران نظر آ رہی تھی۔ جب کہ اصولاً تو اسے خضر عالم سے بھی زیادہ ڈر جانا چاہئے تھا۔ وہ جہاں تھی اسے وہیں رک جانا چاہئے تھا۔

بغیر کسی پریشانی سے صرف اور صرف حیرانی سے پہلے اس سے پھر ممی سے پوچھا تھا۔

''اشعر! آپ؟ آپ کب آئے؟ ممی آپ؟''

اس کا یہ ادھورا جملہ مکمل نہیں ہو پایا تھا، ممی نے بات کاٹ دی تھی۔

''خرد! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ ممی کی اس بات کو سننے کے بعد پریشان اور خوف زدہ ہوئی تھی۔

اس نے انسانی فطرت کے اتنے برخلاف کیوں react کیا؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ علاوہ اس کے کہ وہ بے قصور تھی۔ وہ وہاں کیوں تھی کس وجہ سے تھی مگر جو اس نے اور ممی نے اس کی وہاں موجودگی سے مطلب اخذ کیا وہ شاید خرد کے وہم و گمان اس کی سوچوں سے بھی آگے کی بات تھی۔

وہ روتے، گڑگڑاتے، ممی کی چیخوں کے بیچ وہ ادھورے ادھورے لفظوں میں کیا کہنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ لفظ ممی کی چیخوں، ان کی روتی ہوئی بلند آواز میں دب گئے تھے، اسے ممی کی آواز، ان کا رونا، ان کا بین یاد تھا مگر خرد کے وہ ادھورے ادھورے لفظ ذہن میں تازہ ہو ہی نہیں پا رہے تھے۔

تب وہ اس کے پاس آئی تھی۔ ''یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔''

اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، وہ کمرے میں نہیں تھی، مگر وہ اس کے بازو کو جکڑ کر بری طرح رو رہی تھی۔

''آپ کو میرا یقین ہے نا۔ آپ کو پتا ہے نا میں ایسی نہیں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں ایسی نہیں۔ میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں آپ کی وہی خرد ہوں جو صرف اور صرف آپ سے محبت کرتی ہے۔''

وہ اس کے گھٹنوں سے اس کے پیروں سے لپٹی زاروقطار رو رہی تھی۔

''خرد''

اسے بلند آواز سے پکارتا وہ یک دم بیڈ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم ایسی نہیں ہو، میں جانتا ہوں۔ میری خرد ایسی نہیں ہے میں جانتا ہوں۔ مگر جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا، میں یہ نہیں جانتا۔ جتنا سوچ رہا ہوں میری الجھن اتنی ہی بڑھتی چلی جارہی ہے۔''

وہ اپنے گھٹنوں میں چہرہ رکھ کر یوں سسک اٹھا جیسے وہ ابھی بھی اس کے پیروں سے لپٹ کر رو رہی ہو۔

''کیا خضر عالم؟ کیا خضر عالم کی کوئی خباثت کارفرما تھی اس سب کے پیچھے؟ اس کی اور خرد کی محبت بھری زندگی میں آگ لگانے والا کیا وہ ذلیل انسان تھا؟ وہ سوچ رہا تھا اور اسے یاد آرہا تھا جب خرد نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تب اچانک ہی خضر نے ان کے گھر زیادہ آنا جانا شروع کر دیا تھا، شروع شروع میں وہ صرف گھر پر آیا مہمان سمجھ کر اخلاقاً اس کے اور ممی کے ساتھ خضر کے سامنے آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی میں زبردستی خرد کے گروپ میں گھسا تھا، خرد نے اس سے دوستی نہیں کی تھی وہ لیکچرز اور اسائمنٹس کے بہانے اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ خرد معصوم تھی۔ سادہ تھی وہ اس کی خباثتوں کو سمجھ نہیں سکی، کیا اس روز وہ ذلیل انسان خرد کو کسی بہانے سے اپنے کسی ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے اپنے اپارٹمنٹ لے گیا تھا۔ کچھ جھوٹ بول کر، کوئی غلط بیان کر کے۔ اسے یاد آرہا تھا خرد بیل کی آواز پر جب کسی طرف سے نکل کر دروازے کے سامنے آئی تھی تو کیا بول رہی تھی۔

''کون ہے خضر؟ کیا آگئی.....'' وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ آگے کیا بولنا چاہتی تھی؟ اور جس بھی بارے میں بول رہی تھی کم از کم یہ ذکر پزا کی ہوم ڈلیوری کا نہیں تھا۔ خضر عالم وہ خبیث انسان خرد سے کوئی جھوٹ بول کر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ خرد آگے کیا کہنا چاہتی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر یہ ضرور سمجھ میں آرہا تھا خرد جس بھی جاندار یا بے جان چیز کے آنے کی ادھوری بات بول پائی تھی، وہ وہی جھوٹ تھا جس کے ذریعے خضر عالم، مکاری اور عیاری سے اسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے کر گیا تھا۔

اس کی رگوں میں دوران خون کھولنے لگا تھا۔

اگر اس سب کے پیچھے واقعی خضر عالم کا ہاتھ تھا تو وہ اس شخص کو اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک موت دے گا۔ مگر اس صحیح بات کا پتا کس طرح چلے گا۔

''مگر کیا وہ خرد سے یہ بات پوچھ پائے گا؟''

خرد کے دل میں اس کے لیے بدگمانی مزید بڑھ جائے گی۔ اس کے سامنے اس کی، خرد کی اور حریم کی تین زندگیاں ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی تھیں۔

وہ ساڑھے چار سال پہلے کی اس روز کے بعد ہوئی تمام باتیں ترتیب سے پھر دہرانے لگا تھا۔

خرد نے اس کی واپسی کا انتظار کیوں نہیں کیا تھا؟ کیا وہ اس وجہ سے گھر چھوڑ کر، گھر سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی کہ خضر عالم کے گھر جب وہ اس کے پاؤں پکڑ کر روتی اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی۔ تب اس نے اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ اس کے گھر کے علاوہ اس کا دوسرا ٹھکانہ کون سا تھا؟

نہیں یہ بات نہیں۔ یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اور وہ یہ بھی تو یاد رکھے کہ اگر وہ اس سے ناراض ہو گئی تھی تو جو ایک خط وہ اس کے نام چھوڑ کر گئی تھی۔ اس سے اپنی ناراضی اور لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے اس کے بعد دوسرا کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟

اس کے ذہن میں خرد کے گھر چھوڑ جانے کے بعد کی باتیں ترتیب سے آنے لگی تھیں۔ وہ پندرہ دن ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ اور گھر آنے کے بعد جب بظاہر خود کو نارمل سا ظاہر کر کے وہ اگلی صبح آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تب نور افزا اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر اس کی آمد کی وجہ دریافت کی تو اس نے اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک لفافہ پکڑا دیا تھا۔

''کیا ہے؟ یہ؟''

''خرد بی بی یہ خط آپ کے لیے دے کر گئی تھیں۔''

تب یہ نام سنتے ہی اس کی رگیں تن گئی تھیں، اس کا فشار خون بلند ہونے لگا تھا۔ نور افزا اسے خط پکڑاتے ہی فوراً ایک پل سے بھی کم دیر میں کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جیسے اس کے ہاتھ میں کسی نے ایک زہریلا سانپ رکھ دیا ہو اس نے اس خط کو فوراً اچھال کر پوری قوت پوری طاقت سے دور پھینکا تھا۔ اس خط میں کیا ہوگا؟ اپنے گھر چھوڑ جانے کی وجوہات، اس کے ساتھ اس شادی شدہ زندگی میں ناخوشی کی داستان یوں چلے جانے پر افسوس، معذرت مگر وہ اس کے ساتھ بالکل خوش نہیں تھی۔ یہ واضح اعلان، طلاق کا مطالبہ، اور شاید حق مہر کی ڈیمانڈ۔ اس بات کو ابھی ہفتہ دس دن ہی ہوئے ہوں گے۔ جب اس کے آفس میں اس کے ذاتی فون نمبر پر جس پر آنے والی کالز وہ خود ریسیو کیا کرتا تھا کہ یہ نمبر صرف اس کے بہت خاص اور قریبی جاننے والوں ہی تک محدود تھا، اس پر ایک کال آئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تھی۔ تب اگر جانتا ہوتا کہ یہ کال کس کی ہے تو اسے ہرگز ریسیو نہ کرتا۔

''ہیلو اشعر! میں خرد بات کر رہی ہوں۔'' اپنے ہیلو کے جواب میں اس نے جو آواز سنی اسے وہ زندگی بھر کبھی بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔

''سوری، میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتا۔''

اس نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی لائن کاٹ دی تھی۔

خرد احسان کی یہ ہمت، یہ جرأت کہ اسے فون کرے، اس سے مخاطب ہو، کیا اسے اپنی زندگی پیاری نہیں تھی جو اس کے اندر بھڑکتی آگ کو باہر نکالنے اور اسے کسی انتہائی شدید ردِعمل پر مجبور کرنے کے لیے اکسا رہی تھی۔

ابھی وہ اس فون کال کو ہی نہیں بھولا تھا۔ اس کی آواز سن کر جو غصہ جو اشتعال پہلے سے بھی زیادہ بڑھا تھا ابھی وہ اس سب پر قابو

پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس فون کال کے شاید ایک یا ڈیڑھ مہینے بعد اس نے اپنے آفس میں، اپنے آفس کے پتے پر، اپنی آفیشل ڈاک کے ساتھ وہ مخصوص ہینڈ رائٹنگ لفافے پر دیکھی، جس پر اس کا نام، اس کے آفس کا پتا اور لفافے کو کونے پر ''پرائیویٹ اینڈ کانفیڈنشل'' لکھا تھا۔ بھیجنے والے کے نام، پتے کے بغیر بھی وہ اس لکھائی کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے یہ خطوط، یہ فون کالز کس لیے کی جا رہی تھیں۔ طلاق اور حق مہر مانگنے کے لیے؟ یا اسے چھوڑ کر جانے کے دو، تین مہینے بعد ہی عقل ٹھکانے آ گئی تھی، ساری دنیا میں اشعر حسین کے گھر کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہیں، یہ یاد آ گیا تھا۔ اب اس کے گھر اور اس کی زندگی میں واپسی کے لیے معافی تلافی کی کوششوں کی غرض سے یہ رابطے کئے جا رہے تھے؟

وجہ چاہے جو بھی تھی، وہ اس نام سے نفرت کرتا تھا۔ شدید ترین نفرت۔ اس نے اس لفافے کو کھولے بغیر جوں کا توں بند ہوئی حالت ہی میں پرزے پرزے کر کے وہیں اپنے آفس میں اپنی میز کے سامنے کھڑے ہو کر ہی لائٹر سے آگ لگا کر جلا ڈالا تھا۔ خرد احسان نام کی کسی عورت سے وہ کبھی واقف تھا وہ یہ بات بھول جانا چاہتا تھا۔ اس سے یہ رابطے چاہے جس بھی وجہ سے قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر وہ اب مزید کچھ بھی سہنے کے لیے تیار نہیں تھا، وہ اب وہ کسی بھی قیمت پر آواز سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اپنے پرسنل فون نمبر پر اس نے کالز ریسیو کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اس نے اپنی سیکریٹری کو بلا کر اس سے انتہائی مختصر، دوٹوک اور حکمیہ لہجے میں یہ کہا کہ اس کے لیے خرد احسان کی کال جب بھی آئے چاہے کچھ بھی ہو، وہ کال اسے منتقل نہ کی جائے۔

اور اس بات کے بعد ہی اسے یہ پتا چلا تھا کہ دنیا ہمیشہ آپ کی زندگی کے چھپے گوشوں، جن کا آپ اعلان نہ کرتے ہوں، جن پر آپ بات نہ کرتے ہوں۔ جنہیں آپ چھپانے کی سعی کرتے ہوں۔ ان کے پیچھے پڑی رہا کرتی ہے۔

آپ خود اس موضوع پر ببانگ دہل بغیر کسی شرمندگی اور ہچکچاہٹ کے بات کریں تو لوگوں کا اس موضوع میں سارا انٹرسٹ ہی ختم ہو جائے گا۔

تب شدید غصے اور طیش کے عالم میں سوچا نہیں تھا پر اب سوچ رہا تھا خرد نے اسے فون کالز کہاں سے کی تھیں؟ وہ خط کہاں سے لکھا تھا؟ کیا نواب شاہ سے؟

کیا خرد اس کا گھر چھوڑنے کے بعد نواب شاہ اپنے پرانے محلے میں چلی گئی تھی؟ مگر کیوں؟ اس نے تو اسے گھر سے جانے کے لیے نہیں کہا تھا، آخر وہ گھر سے گئی کیوں تھی؟ مگر کیوں؟ وہ اس طرح مجرموں کی طرح کیوں چلی گئی تھی؟ منہ چھپا کر تو مجرم بھاگا کرتے ہیں۔

پر اب یہ سب وہ کس سے پوچھے؟ اسے وہ ساری سچائی کون بتائے گا۔ خرد؟ ہرگز نہیں اس کا انداز بتاتا ہے وہ اس بات کی رتی برابر بھی پروا نہیں کرتی کہ وہ اسے کس کردار کا اور کیسا سمجھتا ہے اس کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے، ''میری بلا سے تم مجھے جتنا بدکردار سمجھے ہو، چاہو تو اس سے بڑھ کر سمجھ لو، میں تم پر اور تمہاری سمجھ پر تھوکتی ہوں۔''

وہ دوسرا خط اس نے پھاڑ کر جلایا تھا مگر وہ پہلا خط۔ وہ اس نے صرف غصے سے بہت دور پھینکا تھا ساڑھے چار سال پرانی بات

تھی۔ ساڑھے چار دن نہیں، جو وہ کمرے میں جائے اور جا کر اس خط کو ڈھونڈ نکالے۔

وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بے بسی سے بیٹھ گیا۔ وہ خط ہی وہ واحد ذریعہ تھا جو اسے وہ ساری سچائی بتا سکتا تھا جو خرد شاید کبھی بھی اور کسی بھی قیمت پر نہ بتاتی۔ طلاق کا مطالبہ اور حق مہر کا دعوا، وہ خوددار اور غیرت مند لڑکی اس خط میں یہ نہیں بلکہ وہ سچائی لکھ کر گئی ہوگی۔ جو اس کے گھر سے جانے کی وجہ بنی تھی۔

سوال بے شمار تھے اور جواب اس کے پاس ایک بھی سوال کا نہیں تھا۔ ان ہی سوالوں کے درمیان گھرے کسی ایک کا بھی جواب نہ پاتے وہ خرد کے کپڑے اور اپنا اور اس کا لنچ لے کر ہاسپٹل واپس آ گیا تھا۔ چہرے پر حیرت یا ناگواری کچھ بھی لائے بغیر خرد نے اس سے کپڑے لے بھی لیے تھے اور انہیں تبدیل بھی کر لیا تھا۔ جب تک حریم کو روم میں شفٹ نہ کر دیا جاتا وہ تھوڑی سی دیر کے لیے بھی گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ فوراً لنچ نہیں کر پائے تھے۔ حریم کو درد محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے وجود کے ساتھ منسلک تاروں اور طبی آلات سے بھی وہ گھبرائی ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر اسے ماما کو اپنے پاس روکنا تھا۔ ماما کے بغیر اکیلے لیٹنے کے لیے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ جو اس کے لیے ہرگز بھی مناسب نہیں تھا۔ نرس خرد کو آ کر اندر بلا کر لے گئی تھی۔ خرد اس کے ہاتھ کو بہت آہستہ سے تھامے کافی دیر اس کے پاس رہی تھی، اشعر بھی اندر اس کے پاس آ گیا تھا اور تکلیف سے بے چین ہوتے، اس نے پاپا سے بھی وہی کہا تھا جو ماما سے کہے جا رہی تھی کہ اسے یہاں سے لے جائیں۔ تمام تر آلات سمیت ہر چیز کو یا تو خود پھینک دینا چاہتی تھی یا چاہتی تھی ماما پاپا نکال کر پھینک دیں۔ وہ اس سے یہی کہتی رہی تھی۔ وہ اس پر جھک کر اسے پیار کر کے محبت سے بولا تھا۔

''ماما، پاپا تمہارے پاس ہیں پرنس اور یہ روم حریم کو اچھا نہیں لگ رہا تو بس کل ہی ہم حریم کو اس کے پہلے والے روم میں لے چلیں گے وہاں پرنس کے ساتھ ماما بھی لیٹیں گی۔''

خرد، حریم کو بے چین اور تکلیف میں دیکھ کر خود بھی بہت بے چین سی ہو گئی تھی۔ حریم کی طرف جھک کر اس سے بات کرتے، اسے پیار سے بہلاتے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ خرد کے شانے پر تسلی دینے والے انداز میں رکھا ہوا تھا۔ اسے درد سے آرام کے لیے میڈیسن فوراً ہی دے دی گئی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ دوبارہ غنودگی میں چلی گئی تھی۔

وہ دونوں آئی سی یو سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ خرد کو ساتھ لے کر لنچ کرنے کے لیے آ کر بیٹھا تو وہ اپنی بے چینی پر پریشانی کچھ بھی اس کے ساتھ شیئر نہ کرتی خاموشی سے لقمے لینے لگی تھی۔ کھانے میں اس کی پسند کی اشیاء موجود تھیں۔ مگر شاید اس کی پسند بدل چکی تھی۔ اس کے دو، تین بار کے اصرار کے باوجود اس نے کھانا تھوڑا سا ہی کھایا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے شیشی کھولی، پانی کا گلاس اس ہاتھ میں لیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں موجود ان دونوں چیزوں کو صرف ایک سیکنڈ ہی اس نے بغور دیکھا۔ لمحہ بھر سے زیادہ نہیں لگا تھا اسے ان گولیوں کو اپنے حلق سے اتارنے میں، پتا نہیں ان گولیوں کا اس پر اثر ہونے میں کتنی دیر لگنا

تھی۔ وہ گلاس اور شیشی میز پر رکھ کر اپنے بیڈ پر بالکل سیدھی لیٹ گئی۔ وہ انتظار کرنے لگی اس کا جس سے ہر زندہ انسان خائف رہا کرتا ہے۔ مگر وہ ذرا بھی خائف نہیں تھی، وہ تو اسے خود اپنے پاس بلا رہی تھی۔ موت بھی بھلا کوئی ڈرنے والی چیز ہوا کرتی ہے؟

☆......☆......☆

حریم کو آئی سی یو سے پرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ شفٹ کیے جانے کے بعد حریم کے چیک اپ کرنے کے لیے آئے ڈاکٹر اور نرس نے ان دونوں کو پوسٹ آپریشن کیئر سے متعلق کافی کچھ بتایا تھا۔ سرجری کے دوران حریم کے دل تک پہنچنے کے لیے سینے پر جو شگاف کیا گیا تھا، وہ ابھی بہت درد کر رہا تھا۔ حریم کو بہت بے چین اور پریشان کر رہا تھا۔

حریم ابھی ان میڈیسنز کے زیر اثر تھی جو اسے درد میں کمی اور سکون پہنچانے کے لیے دی جا رہی تھیں اسی لیے وہ اپنا زیادہ وقت سوتے ہوئے گزار رہی تھی۔ نرس اسے انجکشن دے کر چلی گئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد حریم سو گئی تھی۔ تب ان لوگوں نے لنچ کیا۔ لنچ کا دھیان بھی اشعر ہی کو آیا تھا۔ وہ صبح کچھ دیر کے لیے گھر گیا تھا۔ زینت نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ جتنی دیر میں وہ نہایا، کپڑے بدلے، زینت نے کھانا اچھی طرح سے پیک بھی کر دیا تھا۔

گھڑی میں تین بجتے دیکھ کر اسے کھانے کا دھیان آیا تو وہ فوراً ہی کرسی سے کھڑا ہوا۔

''آ جاؤ خرد کھانا کھا لو۔'' اس نے سامنے رکھی ایک چھوٹی میز صوفے کے آگے رکھ لی اور اس پر کھانے کے برتن کھول کر رکھنے لگا۔

خرد اٹھ کر ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر صوفے پر آ کر بیٹھی تو اسی طرح اس سے ذرا دور ہٹ کے، اپنے اور اس کے بیچ کچھ فاصلہ قائم رکھتے۔

اس نے ایک پلیٹ میز پر خرد کے آگے رکھی اور دوسری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اپنی پلیٹ میں کھانا نکال کر کھانا شروع کرتے وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا، جو ہمیشہ کی طرح کھانے کو بے رغبتی سے اور بہت کم کھا رہی تھی۔ پہلے بھی جب وہ ہنسی خوشی، محبتوں بھری زندگی ساتھ مل کر گزار رہے تھے تب بھی وہ کوئی بہت خوش خوراک نہیں تھی۔ مگر اپنی پسند کی ڈشز وہ بھرپور طرح انجوائے کر کے خوب رغبت سے کھایا کرتی تھی اور اب کھانا کھانا جیسے ایک کام تھا، زندگی کے لیے، زندہ رہنے کے لیے ناگزیر، سانس لینے کی طرح ضروری، جسے انجوائے کرنا ضروری نہیں تھا۔

''ٹھیک سے کھاؤ۔ یہ فش تو تمہیں پسند ہے نا، یہ کیوں نہیں لی؟''

گرلڈ فش جو وہ زینت سے خاص طور پر کہہ کر بنوا کر لایا تھا۔ اس نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ روانی میں یہ جملہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ بولتے وقت اسے خود احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس بات کو سن کر خرد نے جن اجنبی اور خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا، وہ اپنی کہی بات پر بری طرح شرمندہ ہو گیا۔ اجنبی نظر اسے اپنی بات پر خود ہی شرمسار کروا گئی تھی۔

وہ ہر پل اس کی ممنون، اس کی احسان مند نظر آتی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ صرف ایک پل کے لیے بھی اسے یہ حق نہیں دیتی تھی

کہ وہ اس سے اس کے کھانے، پینے، اس کی کسی ذاتی ضرورت، کسی ذاتی چیز کے متعلق کچھ کہہ سکے۔

اب اسے حریم کے ساتھ ساتھ خرد کی بھی فکر تھی۔

اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھو تو بالکل سفید نظر آتی تھیں، اس کے ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کی کمی ہے۔

وہ ایک ہاسپٹل میں ہی موجود تھے، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خرد کو یہاں کسی ڈاکٹر کو دکھا دے۔ مگر دل میں ہزار چاہنے کے باوجود بھی اس کی ممنونیت کا بظاہر بالکل خاموش آنکھوں کا وہ چھپا ہوا سرد تاثر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑا دیتا تھا۔ مگر اس وقت اسے بہت قریب سے دیکھتا وہ اندر سے بہت بے چین ہو رہا تھا۔

''حریم کی پیدائش نارمل ہوئی تھی؟'' وہ اسے ایسا کوئی حق دینے کو آمادہ نہیں، پھر بھی وہ یہ سوال پوچھنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکا تھا۔

''نہیں۔'' پلیٹ پر نظریں مرکوز رکھتے اس نے یک لفظ جواب بے تاثر لہجے میں دیا۔ مگر اس کے اس بے تاثر انداز سے اس نے ہار نہیں مانی، جن لمحوں کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ آج ہر حال میں جاننا چاہتا تھا۔

''سیزیرین؟'' اس کے بے تاثر چہرے کو بغور دیکھتے اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیوں، کیا کوئی کومپلیکشن......''

''مجھے گھر جانا ہے۔'' خرد نے اسے اس کی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ پلیٹ میز پر رکھتے بظاہر اس نے سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی اس کی پلیٹ میں ابھی کھانا بچا ہوا تھا مگر وہ کھانا چھوڑ کر ایک دم صوفے پر سے اٹھ گئی تھی۔

''تین، چار گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گی۔'' بظاہر اس کے چہرے پر نہ غصہ تھا نہ نفرت، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خرد کے دل میں اس کے لیے جو غصہ جو نفرت ہے وہ اتنا زیادہ شدید ہے کہ وہ اس غصے، اس نفرت کا اظہار تک کرنا گوارا نہیں کرتی۔

اس نے بھی اپنی پلیٹ ویسی ہی واپس میز پر رکھ دی تھی۔ جو گرلڈ فش وہ صرف اس کے لیے بنوا کر لایا تھا وہ بھی ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی تھی۔ خرد اپنا ہینڈ بیگ، موبائل وغیرہ اٹھا کر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''اچھا میں جا رہی ہوں، اللہ حافظ۔'' وہ سوئی ہوئی حریم کو آہستہ سے پیار کر کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس سے بولی۔

''رکو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ صوفے پر سے کھڑا ہوا۔

''میں چلی جاؤں گی، شکریہ۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر وہاں رکی نہیں تھی، وہ بھی اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا، سنجیدگی سے چلتے خرد نے اسے دیکھا، پھر لفٹ کے پاس آ کر رکتے ہوئے متانت سے بولی۔

''آپ حریم کے پاس رکیے۔ ہم دونوں اس کے پاس ہٹ جائیں، یہ مناسب نہیں۔'' اس کا سنجیدہ، شائستہ اور مہذب انداز اسے ایسا لگا جیسے وہ اس کے منہ پر کھینچ کر ایک طمانچہ مار گئی ہو۔

''میں اکیلے زندگی گزارنے، میں اکیلے اپنے سب کام کرنے کی عادی ہوں۔ میں پچھلے ساڑھے چار سالوں سے تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔ تم اپنی یہ مہربانیاں اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔'' اس نے نہ طنز سے اسے دیکھا تھا نہ حقارت سے، پھر بھی اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے خرد اس کی فکرمندی، خود چھوڑ کر آنے والی بات پر اندر ہی اندر استہزائیہ انداز میں قہقہے لگا کر ہنس رہی ہو۔

اس نے ایک ٹیکسی والے کو ہاتھ دے کر پاس بلایا۔ کہاں جانا ہے اس نے ٹیکسی والے کو یہ بتایا اور پھر اپنے والٹ سے پیسے نکالتے اس سے یہ کہا کہ جتنی دیر وہ اپارٹمنٹ میں رہے گی اسے نیچے ہی اس کا انتظار کرنا ہوگا، دو، تین گھنٹوں بعد وہ اسی جگہ واپس آئے گی اور تب تک ٹیکسی ڈرائیور وہاں رکے تاکہ اسے یہاں واپس پہنچا سکے۔ خرد کو اپارٹمنٹ تک چھوڑنے اور پھر وہاں سے ہسپتال واپس لانے کے پیسوں کے ساتھ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس کے دو، تین گھنٹوں کے انتظار کے بھی منہ مانگے پیسے دیے۔ وہ والٹ جیب میں واپس رکھ رہا تھا جب خرد گیٹ سے باہر نکلی تھی اس کی خود سے نفرت دیکھ کر لگتا تھا، شاید وہ اس کی روکی ٹیکسی میں بھی نہیں بیٹھے گی۔ مگر ان ساڑھے چار سالوں میں اتنی بدل گئی تھی، اتنی زیادہ میچور ہوگئی تھی کہ ایسے کسی بھی بچکانہ انداز میں اپنی ناراضی ظاہر کیے بغیر وہ بڑی خاموشی سے اس کی روکی اس ٹیکسی میں آکر بیٹھ گئی۔ جس کا دروازہ وہ اس کے لیے کھول کر کھڑا تھا۔

وہ بیٹھ چکی تو کھڑکی کی طرف جھک کر اس سے بولا۔

''اسی ٹیکسی میں واپس آنا، خان صاحب اپارٹمنٹ کے نیچے تمہارا انتظار کریں گے۔''

چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھی اور وہ مڑ کر واپس ہسپتال کے گیٹ میں گھسا تب زیرِلب بہت آہستگی سے اسے مخاطب کر کے بولا۔

''ان دنوں میں اپنی انا، وقار، غیرت سب کو فراموش کر کے ایک بار پھر ماضی کی کھوج میں نکلا ہوا ہوں اور اتنا یقین رکھنا خرد کہ ساڑھے چار سال پہلے جو کچھ ہوا اگر اس میں میری کہیں کوئی غلطی ہے تو چاہے تم مجھے معاف کر بھی دو، میں خود اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

وہ ہسپتال کے اندر واپس آ گیا تھا، وہ اپنی سوئی ہوئی بیٹی کے پاس واپس آ گیا تھا۔ اس کی نظریں حریم پر تھیں مگر اس کا ذہن اس خط کو سوچ رہا تھا۔ آخر وہ خط کہاں گیا تھا۔ آج تو مہلت نہیں تھی، لیکن وہ کل اپنے گھر اسے لفافے کو تلاش کرنے لازمی جانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

گھر میں نہا کر، کپڑے بدل کر، اپنے کچھ دیگر کام نمٹا کر وہ واپس ہسپتال جانے کے لیے اپنی بلڈنگ سے باہر نکلی تو اپنے لیے انتظار میں کھڑی ٹیکسی کو دیکھ کر طنز اور استہزائیہ اس کے لبوں پر آکر بکھر گیا۔ وہ ٹیکسی میں آکر بیٹھی تو فکرمندی اور اپنائیت لیے چند اور فقرے اس کے

کانوں میں گونجے۔

''رکو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

''ٹھیک سے کھاؤ، یہ فش تو تمہیں پسند ہے نا۔ یہ کیوں نہیں لی؟''اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی۔

''سوری، میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتا۔''مسکراتے مسکراتے ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''حریم کی پیدائش نارمل، ہوئی تھی؟

''ماں اور بچے دونوں کی جان کو خطرہ ہے، ہمیں یہ آپریشن فوراً کرنا پڑے گا۔''

ایک ظالم شخص کے ہمدردانہ اور اپنائیت لیے جملوں نے سب زخموں کو پھر سے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے آنسوؤں پر اسے اس پل کوئی اختیار نہیں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اسے روتا نہ دیکھ لے اس کی متعجب نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا سر بالکل نیچے جھکا لیا تھا۔ حریم کی وجہ سے وہ وقتی طور پر ایک ہوئے تھے۔ جو کیفیات اس کی تھیں یقیناً وہی اس شخص کی بھی تھیں اور جیسا بھی تھا حریم سے وہ بے تحاشا اور والہانہ محبت کرتا تھا۔

اس کے آپریشن اس کی زندگی کی فکر نے اس کے دل میں نرمی، گداز اور اچھائی کے جذبات وقتی طور پر پیدا کروا دیے تھے تب ہی حریم کے لیے،''میری بیٹی نخرے دکھائے یا تنگ کرے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''اس سے بڑے تکبر سے کہنے والا۔

''ہماری بیٹی کو ہوش آ گیا ہے۔''

''ہماری بیٹی کو ان شاءاللہ صبح ICU سے روم میں شفٹ کروا دیا جائے گا۔''

بڑے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ حریم ''میری بیٹی'' سے ''ہماری بیٹی'' ہوئی تھی، اسے بھی طنز، نفرت اور تکبر سے صرف ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے ''خرد'' کہہ کر اس کا نام لے کر مخاطب کیا جا رہا تھا، حریم کے سبب ہونے والے اس وقتی اچھے برتاؤ کے باوجود اس شخص کا اپنا نام لینا، خرد سے اپنائیت سے بات کرنا دل کو سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس ظالم اور متکبر انسان کی اس کے ساتھ یہ سب نرمی اور اچھائی اپنی بیٹی کی وجہ سے ہے، یہ جاننے کے باوجود اس کا دل چاہا تھا وہ اس شخص سے کہے۔

''تمہیں میرا نام لینے کا کوئی حق نہیں۔''

''تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرور نہیں۔''

''تم صرف حریم سے مطلب رکھو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

''مگر یہ صرف دل کی سوچیں تھیں وہ اس سے ایسا کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ اس احسان کی شکر گزار اور بہت زیادہ ممنون تھی جو اس نے اس کی اولاد کی زندگی بچانے میں تعاون اور مدد فراہم کر کے اس کے اوپر کیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے کمرے کو پورا کا پورا الٹ کر رکھ دیا تھا۔ صرف رائٹنگ ٹیبل اور سائڈ ٹیبل کی درازیں ہی کیا اس نے پوری کی پوری الماری تک خالی کر کے دیکھ لی تھی۔ جب کہ اس کی الماری میں کسی نوکر کے گھسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ پورا کمرہ چھان رہا تھا۔

مگر وہ سفید لفافہ جس کی اسے تلاش تھی، کہیں پر بھی نہیں تھا۔ اک امید جو دل میں پیدا ہوئی تھی کہ شاید کمرے کی صفائی کے لیے آنے والی کسی ملازمہ نے اسے کہیں رکھ دیا ہوگا وہ معدوم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی تھی۔

''اب وہ کیا کرے، کس سے پوچھے کہ خرد کے ساتھ ساڑھے چار سال پہلے کیا ہوا تھا، وہ اس طرح گھر چھوڑ کر کیوں گئی تھی؟ اس کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی تھی جو وہ ممی کے روکنے پر نہیں رکی۔ اور اس کے نام ایک خط نور افزا کو دے کر خاموشی سے چلی گئی؟ آخر اس خط میں خرد نے کیا لکھا تھا، کیا؟ اور وہ دوسرا خط اور وہ فون؟

خرد اسے کچھ بتائے گی نہیں، دوسرا بتانے والا، حقیقت حال جاننے والا کوئی نہیں ہے۔

سارا سامان کمرے میں بکھرائے، مایوس اور ناامید وہ دونوں ہاتھوں میں سر دیے پریشان بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

شمالی علاقہ جات میں شدید بارشوں اور انتہائی خراب موسم کی وجہ سے معمول کی پروازیں شدید متاثر ہوئی تھیں۔ کئی دنوں کے تعطل کے بعد اب کہیں جا کر پروازیں بحال ہوئیں تو وہاں پھنسے سیاح اور دوسرے بہت سے لوگوں کا ایسا رش لگ گیا کہ جہاز میں سیٹ کا حصول ایک ٹھیک ٹھاک مسئلہ بن گیا۔ انہیں کراچی فوری طور پر واپس پہنچنا تھا۔

☆......☆......☆

حریم کو روم میں شفٹ ہوئے چھ دن ہوگئے تھے اور اب اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ ابتدائی دو، تین دنوں کے بعد پھر اسے بخار ہونا بھی ختم ہوگیا تھا اور اس کا درد اور بے چینی جو شروع میں بے تحاشا ہوئی تھی وہ بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ روم میں شفٹ ہونے کے بعد حریم کو ابتدا میں جوس، سوپ اور دودھ وغیرہ دیا جا تا رہا تھا اور اب پچھلے ایک روز سے اسے جوس، دودھ اور سوپ کے ساتھ انڈوں وغیرہ پر مشتمل کھانا بھی دیا جانے لگا تھا، پچھلے ایک دو روز سے حریم کو بیڈ پر سے اترنے اور کمرے میں چند قدموں کی چہل قدمی کی اجازت بھی مل گئی تھی۔

سرجری کے بعد حریم کے مزاج میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ وہ خرد کو کسی بھی وقت اپنے پاس سے ہٹنے نہیں دیتی تھی وہ دن رات سوتے جاگتے ہر وقت اسے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی اشعر بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کی نگاہوں سے دور ہوتا تو وہ۔

''پاپا کہاں ہیں؟''

''پاپا کو بلائیں۔'' کی گردان شروع کر دیتی تھی۔ چار سال کے بجائے اس نے یک دم ہی کسی ایک ڈیڑھ سال کے بچے کی طرح بی ہیو کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی، چڑچڑے پن اور ضد کا مظاہرہ کرتی۔

اس روز اس کی فزیکل تھراپی پروگرام کے تحت اسے کھانسنے اور سانس لینے کی ایکسرسائز کروائی جا رہی تھی۔ کھانسنے کی یہ مشق اس

لیے بے حد اہم تھی کہ اس کے نتیجے میں سرجری کے بعد نمونیہ کے ہونے کے خطرات سے بچا جا سکتا تھا۔ اور اب تھراپی سے فارغ ہونے کے بعد بیڈ پر لیٹی وہ خرد اور اشعر دونوں سے ضدی لہجے میں گھر چلنے کو کہہ رہی تھی۔

''بس بیٹا! ایک دو دن میں چلے جائیں گے۔'' خرد نے کہا مگر حریم نے غصے اور ضد میں رونا شروع کر دیا تھا۔

''حریم کو آج گھر جانا ہے۔''

اشعر سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا وہ فوراً ہی کرسی پر سے اٹھ کر حریم کے پاس بیڈ پر آ گیا۔

''گھر تو ہماری پرنس نے دو، تین دن میں چلے ہی جانا ہے، لیکن اگر پرنس پاپا سے پرامس کرے گی تو ہسپتال میں اچھے بچوں کی طرح بی ہیو کرے گی اور گھر جا کر بھی جو ماما، پاپا کہیں وہ سب باتیں مانے گی تو پھر پاپا پرنس کو گھمانے ڈزنی لینڈ لے جائیں گے۔''

اس بات میں ساتھ گھومنے پھرنے کی بات بھی تھی اور وہ بھی اس کے لئے ایک نئی جگہ کے نام کے ساتھ سوا سے آخر کار خوشی کا اظہار تو کرنا ہی پڑا۔ ''ڈزنی لینڈ؟ وہ کیا ہوتا ہے پاپا؟'' گھومنے پھرنے کے ذکر پر وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ پیار سے اسے ڈزنی لینڈ کے متعلق بتانا شروع کیا۔ وہ کتنی دور ہے کہاں ہے۔

حریم رونا دھونا بھول کر جہاز میں بیٹھنے کے نام سے ہی پر جوش ہو گئی۔

''حریم ایروپلین میں بیٹھ کر امریکہ جائے گی۔ ڈزنی لینڈ جائے گی، علینا کے گھر جائے گی پاپا! حریم نعمان انکل کے گھر جائے گی ناں۔'' وہ بیٹی کی ذہانت اور اس کے شاندار حافظے پر مسکرایا۔ امریکہ کا نام سنتے ہی اسے یہ یاد آ گیا تھا کہ نعمان انکل اور علینا وہیں پر رہتے ہیں۔ اس نے مسکرا کر سر اقرار میں ہلایا۔ ''حریم اور علینا سلیپنگ بیوٹی کا کیسل بھی دیکھیں گے؟''

وہ اپنی فیورٹ فیری ٹیل کا ذکر سنتے ہی خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

''ماما! ہم ڈزنی لینڈ جائیں گے۔'' حریم نے خرد کو جو ان باپ بیٹی کی گفتگو کے دوران خاموشی سے مسکرا رہی تھی۔ شریکِ گفتگو کیا۔ بے تحاشا جوش کے ساتھ۔

''ہاں حریم ڈزنی لینڈ جائے گی، وہاں خوب انجوائے کر کے آئے گی۔'' یہ بات کہتے ہوئے خرد کے لبوں سے اچانک ہی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ اس نے بغور خرد کے چہرے کو دیکھا۔ خرد کے دل میں اس وقت کیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کس سوچ نے اسے یک دم ہی اتنا اداس کر دیا تھا۔ حریم نے ''ماما ہم ڈزنی لینڈ جائیں گے۔'' کہا تھا اور خرد نے جواب میں ''ہم'' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ خرد نے ''ہم'' کا لفظ کیوں نہیں بولا، اس کے دل کو اچانک ہی ایک نامعلوم سے خوف نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ سلیپنگ پلز خاصی کثیر تعداد میں کھا کر اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ بروقت ہسپتال لے آئے جانے کے سبب جان بچ گئی تھی مگر زرینہ اکلوتی بیٹی کے اس عمل سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ وہ کوئی کم عمر اور امیچور لڑکی نہیں تھی۔ مگر حرکت اس نے

ایک انتہائی بچکانہ اور خطرناک سی کی تھی۔

''اگر سارہ کو کچھ ہو جاتا۔'' زرینہ اس کی جان بچ جانے کے باوجود بھی اس خوف سے باہر نہیں نکل پا رہی تھیں۔

''سارہ! خود کو سنبھالو ڈارلنگ، دنیا میں صرف اشعر ہی نہیں ہے۔ لعنت بھیجو اس پر۔ دفع کرو اسے۔ تمہارے لیے ایک سے بڑھ کر ایک شاندار لوگ موجود ہیں۔''

اپنے پروفیشن میں درجۂ کمال کو پہنچ جانے والی، ایک کامیاب کیریئر رکھنے والی ان کی حسین اور ذہین بیٹی اپنی اس جنونی محبت کے ساتھ انہیں بے تحاشہ ہراساں کر رہی تھی۔ اشعر کو خرد کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں دیکھ لینے کے بعد سے اس کی یہی کیفیت تھی اور ایسے ہی ایک جنونی لمحے میں رات کی تنہائی میں اپنے کمرے میں اس نے سلیپنگ پلز کی اوور ڈوز کے ذریعے اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ کئی برس قبل اشعر کی جب اچانک بالکل آناً فاناً خرد کے ساتھ شادی ہوئی، تب بھی سارہ نے ایسے ہی جنونی ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے انتہائی تیز دھار بلیڈ سے اپنی دونوں کلائیاں بری طرح زخمی کر ڈالی تھیں۔ بستر پر بیٹھ کر اپنی دونوں کلائیوں سے انتہائی تیز رفتاری سے بہتے خون کو وہ سکون سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کمرے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کی ایک ملازمہ نے پڑا دیکھا تھا۔ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے اس کی جان بچائی جا سکی تھی۔

جب خرد اور اشعر کی آناً فاناً ہوئی شادی اور اس شادی ہی کے روز خرد کی ماں کے مر جانے نے انہیں یہ آسانی اور یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ سارہ کی خودکشی کی کوشش خاندان میں سب سے چھپا پائی تھیں۔ اور سارہ کی یہ انتہائی خطرناک حرکت اپنی ہی جان لینے کی ایسی سفاکانہ کوشش نے انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ بیٹی کی خواہش پورا کرنے لے جوان سے ہو سکتا ہے وہ کریں۔

اشعر کے معاملے میں سارہ انتہائی جذباتی اور جنونی تھی۔

گزرے ماضی کی باتیں تھیں۔ خرد، اشعر کی زندگی سے نکل جانے کے بعد بھی جب اشعر کسی بھی طرح سارہ کی طرف متوجہ نہ ہوا اور سارہ انتہائی میچور انداز میں اپنے کیریئر اور اپنے پروفیشن میں آگے سے آگے بڑھنے کی جدوجہد میں لگی رہی تب انہیں لگنے لگا کہ ماضی کی وہ جذباتیت اس کا بچکانہ پن تھی۔ اب سارہ میچور ہو گئی ہے۔ مگر یہ ان کی غلط سوچ تھی۔ ان کی بیٹی اشعر حسین کے معاملے میں آج بھی اول روز جیسی ہی جنونی تھی۔

اشعر اسے نہیں دیکھتا، یہ وہ سہہ لے گی، اشعر اسے نہیں اپناتا۔ یہ وہ سہہ لے گی مگر اشعر اس کے بجائے کسی اور کو دیکھے، اشعر اس کے بجائے کسی اور کو اپنا لے، یہ وہ آج بھی کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔

یہ ابنارمل پن تھا، یہ پاگل پن تھا وہ اپنی بیٹی کے اس پاگل پن کا کیا کریں؟

''بہت کامیاب پلاننگ کی تھی۔ آپ نے اسے اشعر کی زندگی سے نکالنے کی۔'' سارہ نے ان کی بات کا جواب دیے بغیر اپنی بات کہی، وہ طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے مرنے کیوں نہیں دیا گیا ہے، اسے بچا کیوں لیا گیا ہے۔ اس بات پر اس کا چیخنا چلانا

کئی دنوں کے بعد بھی ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

''آپ کے ہر پلان کو ناکام بناتی وہ پھر جیت گئی۔آپ کی بیٹی ہار گئی۔میں سارہ اجمل اس معمولی خرد احسان سے ہار گئی۔میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔میں اس لڑکی سے ہارنے کے بعد اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

اس نے پھر چلا چلا کر رونا شروع کر دیا تھا۔اور اس کی کیفیت سے ہراساں زرینہ دیوانہ وار ڈاکٹر کو بلانے دوڑی تھیں۔انہیں اپنی بیٹی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔انہیں وہ ایک نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔اپنی اکلوتی اولاد کو نفسیاتی مریض بنتے دیکھنا، اس پر پاگل پن کا دورہ پڑتے دیکھنا، اس کی ہمت اور برداشت سے بہت زیادہ تھا۔وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگتی ہوئی بری طرح رو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

جتنے دن حریم آئی سی یو میں رہی تھی۔وہ آفس بالکل نہیں گیا تھا، مگر جب سے وہ روم میں شفٹ ہوئی تھی۔تب سے اس نے روزانہ تھوڑی دیر کے لیے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔وہ آفس جاتا اور اپنے ضروری اور اہم کام نمٹا کر جلدی ہی واپس بھی آجاتا۔

حریم کو روم میں شفٹ ہوئے دس دن ہو چکے تھے اپنے روم کے باہر کوریڈور میں چند منٹوں کی مختصر چہل قدمی کی اجازت ملنے کے بعد آج اسے ہسپتال کے گارڈن تک جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔امکان یہی تھا کہ کل یا پھر پرسوں اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

وہ دوپہر بارہ، سوا بارہ بجے حریم کو بتا کر، اس سے اجازت لے کر آفس چلا گیا تھا، وہاں سے شام ساڑھے چار بجے واپس آیا تو حریم لیٹی ہوئی کھیل رہی تھی۔خرد کچھ دور کرسی پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔

وہ حریم کے پاس آ گیا ''کیا کھیلا جا رہا ہے پرنسس؟'' اپنی بے زاری اور ناراضی کے اظہار کے لیے منہ سے جواب دینے کے بجائے اس نے اسے dough دکھا دیا۔وہ اس کی بے زاری دور کروانے کے لیے کچھ دوسرے کھیل اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔اس نے کاغذ کا جہاز بنا کر اسے اڑا کر دکھایا۔اس نئے کھیل میں اسے کچھ ایکسائٹمنٹ محسوس ہوئی۔

''پاپا! حریم کو بھی دیں۔حریم بھی پلین اڑائے (اڑائے) گی۔''

اس نے اسے احتیاط سے بیڈ پر اٹھا کر بٹھا دیا۔اس کے پیچھے تکیے لگا دیے اور اس کے ہاتھ میں کاغذ کا جہاز پکڑا دیا، پہلے بنایا ہوا جہاز اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''اب پاپا کا اور حریم کا مقابلہ ہوگا۔دیکھتے ہیں زیادہ دور تک کس کا جہاز جائے گا اور زیادہ دیر تک کس کا جہاز اڑے گا۔جس کا پہلے نیچے گرا، وہ ہارے گا۔''

حریم کا ہاتھ درست زاویے سے پکڑ کر اس نے خود اس کے ہاتھ سے جہاز اڑوایا اور اسی وقت اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود جہاز کو بھی ہاتھ سے چھوڑا۔اپنا والا جہاز جو اس نے جان بوجھ کر غلط طریقے سے پھینکا تھا ایک سیکنڈ ہی اڑ کر سامنے میز پر جا کر گرا تھا۔

''پاپا ہار گئے۔'' حریم نے خوش ہوتے ہوئے خوب زور سے تالی بجائی تھی مگر وہ حریم کی طرف نہیں دیکھ پایا تھا۔وہ حریم کے خوشی

سے دمکتے چہرے کی طرف نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس کی نظریں میز پر گرے جہاز پر مرکوز تھیں۔ وہ میز پر کھانے کے خالی باکس میں جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اس میں جا کر گرا تھا۔

یادداشت پر پڑا قفل، ساڑھے چار سال پرانے ماضی کی دھند میں لپٹا وہ منظر جیسے یک دم ہی اس کی آنکھوں کے سامنے پھر سے روشن ہو گیا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا، نور افزا اس کے کمرے میں آئی تھی، وہ اگلے روز آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنا بڑا والا براؤن بریف کیس جو وہ دبئی ساتھ لے کر گیا تھا، وہ اس نے میز پر کھول کر رکھا تھا۔ بیڈ پر بیٹھا وہ اس میں سے نکالی فائلز اور کاغذات کو اپنے دفتر کے روز مرہ استعمال والے نسبتاً چھوٹے بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔ شدید غصے اور طیش کے عالم میں اس نے وہ لفافہ ہاتھ سے پوری قوت سے دور پھینکا تھا۔ غصے سے بھری اس کی نگاہوں نے لفافے کو میز پر کھلے پڑے بریف کیس میں جا کر گرتے دیکھا تھا۔

اگلی صبح ان کا ملازم دلشاد اس کے کمرے میں تھا جو چیزیں اسے آفس ساتھ لے جانا تھیں، وہ، وہ اسے گاڑی میں رکھ کر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میز پہ رات سے کھلا وہ براؤن بریف کیس دفتر جانے کی اپنی اس تیاری کے دوران اس نے دلشاد سے کہہ کر بند کروا کر اپنی الماری میں رکھ دینے کے لیے کہا تھا۔

چند مہینوں بعد وہ کسی دفتری کام سے پھر کہیں بیرونِ ملک جا رہا تھا، تب اس نے اپنی جانے کی تیاری کرتے وہ بریف کیس نکالا تھا مگر پچھلے ٹرپ میں پتا نہیں کہاں سے ٹکرا کر، گر کر اس کا سفری براؤن بریف کیس کچھ خراب سا ہو گیا تھا۔ اس نے وہ واپس الماری میں رکھ دیا تھا اور پھر وہ بہت قیمتی بریف کیس یونہی اس کی الماری میں اس انتظار میں پڑا رہا تھا کہ کب وہ اس کی مرمت اور درستی کا کام کروائے گا اور کب اسے دوبارہ استعمال میں لائے گا۔

اب حریم کے ساتھ کھیلے گئے اس کھیل نے جیسے اس منظر کو اس منظر کے ساتھ لے جا کر ایک دم ہی جوڑ دیا تھا۔ ذہن کی بند گرہیں، یادداشت پر پڑا قفل یک دم ہی کھل گیا تھا۔ وہ حریم کے پاس سے فوراً کھڑا ہوا۔

''پاپا! پلین اڑائیں۔'' حریم نے اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''پرنسس! آپ ماما کے ساتھ پلین اڑاؤ۔ پاپا ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔'' جھک کر اس کے گالوں پر پیار کر کے اس نے اسے پیار سے سمجھایا، وہ بہت جلدی میں اور بہت بے قرار تھا۔

خرد، قرآن پاک بند کر کے فوراً حریم کے پاس بیڈ پر آ گئی تھی۔ اسے کہیں جانے کی عجلت میں دیکھ کر اس نے حریم کا دھیان اپنی طرف کر لیا تھا۔ ''پاپا کو ہرا دیا ہے، ماما کو ہرا کر دکھاؤ تو ہم تمہیں مانیں۔''

آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی دوڑاتا وہ اپنے گھر پہنچا تھا۔

کسی بھی طرف نظر ڈالے بغیر دو، دو، تین اسٹیپس ایک وقت میں پھلانگتا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ آتے ہی

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ الماری کی طرف بڑھا۔

وہ براؤن بریف کیس الماری کے سب سے نچلے خانے میں رکھا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے باہر نکالا، کانپتے ہاتھوں سے، دل میں یہ دعا مانگتے کہ اس کی یادداشت ٹھیک طرح اس کا ساتھ دے رہی ہو۔ اس نے اسے کھولا۔ بریف کیس کے اندر اس کے دوسرے بھی چند بے کار اور فالتو کاغذات پڑے تھے، ایک قلم بھی رکھا تھا اور ان کاغذوں میں وہ سفید لفافہ بھی رکھا تھا۔ وہ لفافہ جس کے اوپر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا، وہ لفافہ بالکل سادہ تھا۔ پہلی بار اسے دیکھے بغیر اس پر نظر ڈالے بغیر، اسے ہاتھ سے پوری قوت سے دور پھینک دیا تھا۔ ساڑھے چار سالوں بعد آج اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

وہ لفافہ کوئی باقاعدہ لفافہ نہیں تھا۔ وہ کاپی کے صفحات کو موڑ کر ہاتھ سے بنایا گیا ایک لفافہ تھا۔ لفافہ بریف کیس میں سے اٹھاتے اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھولا۔ کھولنے کی کوشش میں ہاتھ سے بنا وہ لفافہ ایک صفحہ کی صورت پورے کا پورا کھل گیا تھا اور اس میں تہہ ہوئے سفید رنگ کے کاپی کے سائز کے کاغذ اس کے ہاتھوں میں آ گئے تھے وہ انتہائی عجلت اور بے قراری سے ان کاغذوں کی تہیں کھول رہا تھا۔

اشعر کے عجلت بھرے انداز کو اس نے تعجب سے دیکھا تھا۔ اس کی اس درجہ عجلت اور بے قراری کو دیکھتے وہ اپنا وظیفہ ادھورا چھوڑ کر حریم کے پاس اٹھ کر آ گئی تھی تاکہ وہ جہاں کہیں بھی جانا چاہ رہا ہے وہاں فوراً جا سکے۔ اشعر فوراً ہی چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اب وہ حریم کے ساتھ کاغذ کے جہاز اڑانے والا کھیل، کھیل رہی تھی۔ حریم کے ساتھ اس کھیل کو کھیلتے اس کا ذہن اشعر کے اس عجلت اور بے قراری لیے انداز کو سوچ رہا تھا۔

انہیں گھر واپس آئے ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہوا تھا۔ آتے ہی اپنا سامان رکھ کر وہ فریش ہونے باتھ روم میں چلی گئی تھیں۔ شاور لے کر باہر نکلیں تو کچھ ہی دیر بعد ان کی حسب ہدایت نور افزاء ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کر کے وہ ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ چائے کے آہستہ آہستہ گھونٹ لیتی وہ کچھ سوچ رہی تھیں، ان کے چہرے پر بہت زیادہ ٹینشن اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی انتہائی گہری سوچ میں ہیں، جیسے کوئی چیز انہیں بہت زیادہ پریشان کر رہی ہے۔

☆......☆......☆

حریم کے کے روم میں شفٹ ہو جانے کے بعد سے، جیسے جیسے اس کی حالت بہتر ہوتی چلی جا رہی تھی ویسے ویسے اس کے ذہن میں آنے والے کل، اپنے اور حریم کے مستقبل کے متعلق سوچیں آنے لگی تھیں۔

آگے کیا ہوگا۔ کہاں ہوگا۔ کیا وہ حریم کو ساتھ لے کر واپس نواب شاہ چلی جائے گی۔ چند ہزار روپوں کی کوئی نئی جاب تلاش کرے گی اور پھر سے ایک انتہائی جدوجہد اور مشقت کی زندگی گزارنے کے باوجود بیٹی کو وہ کھلونے نہیں دلا سکے گی، جو اس کی ایک فرمائش پر اس کا

باپ فوراً لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ اپنی طرف سے بہت اچھے اسکول میں اسے تعلیم دلوائے گی مگر اس اسکول کا اس شاندار اسکول کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہوگا، جہاں اس کا باپ اسے پڑھوائے گا اور جہاں صرف امراء کے بچے پڑھتے ہیں۔ بیٹی کی کوئی معمولی سی فرمائش جو وہ پورا مہینہ انتظار کرنے کے بعد تنخواہ ملنے پر بمشکل پوری کر پائے گی وہ اس کا باپ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کر دے گا۔ اس کا باپ اسے گھمانے کے لیے ڈزنی لینڈ، امریکہ لے جانے کی بات کرتا ہے اور وہ بہت تیر مار لے تو شہر کے اندر ہی موجود کسی تفریح گاہ تک اسے لے جاسکے گی۔ اور خدانا خواستہ حریم کی زندگی میں پھر کوئی مشکل آئے تو اس کا باپ اپنے پیسے، اپنی طاقت کے بل پر وہ مشکل چٹکی بجاتے حل کر دے اور وہ اب بھی پہلی کی طرح پیسے ہی جوڑ کے رہ جائے اور وہ کہیں سے کوئی غیبی مدد آ جانے کا انتظار ہی کرتی رہ جائے۔ اس شخص کی زندگی بھر شکل نہیں دیکھنا، اپنی بیٹی کو اس کے سائے سے بھی بچا کر رکھنا ہے۔ اسے ہمیشہ اس سے دور رکھنا ہے، یہ ساری وہ جذباتی باتیں تھیں جن کا حقیقت کی زندگی میں صرف یہ مقصد نکلتا تھا کہ حریم کو ان آسائشوں، ان سہولتوں سے دور رکھوایا جائے، جن پر اس کا پورا پورا حق ہے۔ حریم کی بیماری اور اپنی انا کی پسپائی کے بعد اب جب وہ جذباتی ہوئے بغیر ٹھنڈے دل سے حریم کے مستقبل کو سوچ رہی تھی تو اسے پتا چل رہا تھا کہ اس کی بہتری، اس کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ باپ کے پاس اسے وہ سب عیش و آرام اور آسائشیں ملیں گی جو وہ ہزار چاہنے پر بھی کبھی بیٹی کو نہیں دے سکتی۔

اشعر نے دوسری شادی کر لی ہوتی، دوسری عورت سے بھی اس کی اولاد ہوتی تب تو شاید وہ یہ بات اس طرح نہ سوچ رہی ہوتی لیکن ایک مہینے تک دن رات مسلسل، ہمہ وقت جس طرح وہ اپارٹمنٹ میں حریم کے ساتھ رہا تھا اور اب اتنے سارے دنوں سے ہسپتال میں بھی جس طرح تمام وقت حریم کے قریب گزارتا تھا اس سے یہ بالکل واضح تھا کہ اس نے دوسری شادی نہیں کی ہے، بلکہ وہ تنہا ہے اشعر نے حریم کو صرف اپنی بیٹی کے طور پر ہی قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ وہ اس سے بے تحاشا اور والہانہ محبت بھی کرنے لگا تھا۔ اشعر کی حریم سے محبت میں اسے ہرگز کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ایک آنسو، ایک اداسی بھرے اس کے چہرے کے تاثر تک سے بے چین ہو جاتا تھا۔ صرف پیسے کی، عیش و آرام کی، دولت کی بات ہوتی تو شاید وہ اس بات کو اس طرح نہ سوچ رہی ہوتی تب شاید حریم کو اشعر کو سونپ دینا اتنا آسان فیصلہ بھی نہ ہوتا لیکن اب جب کہ یہ بات بالکل واضح اور روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ اشعر، حریم سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے تو وہ یہ بات کیوں نہیں سوچتی۔ اس ڈیڑھ مہینے میں اشعر نے اپنی جو چاہت، محبت اور بے حساب آسائشیں حریم کو دی تھیں۔ اس سب کو دیکھنے کے بعد وہ کسی اور سے تو کیا حریم سے ہی بے انتہا شرمندہ اور نادم تھی۔ جو محبتیں، جو آسائشیں، جو سہولتیں حریم کو اس کی زندگی میں اب جا کر ملی ہیں وہ بہت پہلے مل جانی چاہئے تھیں۔ حریم کا حق تھا اپنے باپ پر، اس کی محبت پر، اس کے روپے پیسے پر۔

گزرے چند دنوں میں اس نے حریم کے آنے والے کل کو سوچنا شروع کیا تھا۔

''اشعر کے پاس وہ ہر سہولت پائے گی، زندگی کے تمام خوش نما رنگ دیکھے گی اور اس کے پاس تنگدستی کی زندگی دیکھے گی، محنت مشقت کرتی ماں کو دیکھ کر زندگی کے پھیکے رنگ دیکھے گی، بڑی ہوگی تو اشعر اسے اس کی خواہش پر پڑھنے دنیا کی کسی بہترین، کسی اعلا ترین

یونیورسٹی میں اس کے پسند کے مضمون میں داخلہ دلوائے گا ورنہ وہ ذہین بچی ان تمام شاندار تعلیمی اداروں کے صرف خواب دیکھا کرے گی، جہاں اس کا باپ اسے کھڑے کھڑے پڑھنے بھیج سکتا ہے۔ زندگی اور آگے بڑھے گی، اس کی شادی کا وقت آئے گا۔ باپ کے پاس ہوگی تو اس کے ملنے والوں، دوستوں کے اچھے اچھے گھرانوں کے پڑھے لکھے قابل، اس کی بیٹی کے شایان شان اسے اس کے باپ ہی جیسی سہولتیں دینے والے بہت اچھے بہت قابل لڑکوں کے اس کے لیے رشتے آئیں گے اور اس کے پاس حریم کی خوب صورتی اور دیگر خوبیوں کی بدولت اسے پسند کر لینے والے بہت سے ان ہی جیسے مڈل کلاس لوگ اسے رشتے کے لیے دیکھنے آئیں گے اور محض اس کی ماں کی کم مائیگی اور یہاں سے جہیز میں کیا ملے گا، سوچ کر اسے ریجیکٹ کر جائیں گے۔

بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں والی اس کی بیٹی زندگی میں ہر جگہ پیسے کی کمی کی وجہ سے مار کھائے گی۔ ماں کی کم حیثیتی، اپنا مڈل کلاس بیک گراؤنڈ اسے رلائے گا اور پھر ایک روز وہ بہت پیاری بیٹی اس کے سامنے جواب طلبی کے لیے آ کر کھڑی ہو جائے گی۔

محض اپنی انا کی جیت۔ اپنی انا کو جتوانے، سرخرو رکھنے میں اس کی ماں نے اسے زندگی کی کتنی ہی خوبصورتیوں سے محروم کروا دیا ہے۔ زندگی کو اس کے لیے اتنا مشکل بنا دیا ہے۔

یہ ایک ماں کو سوچ کر دکھ نہیں ہوا کرے گا کہ میرے پاس اتنی تنگ زندگی گزارتی میری بیٹی کا یہ حق تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس سہولتوں سے آسائشوں سے بھری زندگی گزارتی۔

حریم ماں کے پاس رہے گی تو صرف محبت پائے گی۔ اور باپ کے پاس محبت اور پیسہ دونوں۔

حریم کی زندگی ہی کے لیے وہ اس شخص کے در پر آئی تھی، ورنہ اپنے منہ پر ذلت و رسوائی کی کالک ملنے والے ان ہاتھوں کو کیا وہ بھول گئی تھی؟ کیا اس نے معاف کر دیا تھا؟ نہ معاف کیا تھا نہ معاف کر سکتی تھی۔ مگر حریم کی محبت دوسرے ہر احساس پر حاوی تھی اور حریم کی محبت اس ماں سے کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کی بھلائی، بہتری، تحفظ، خوشیاں اور سکون سب باپ کے ساتھ رہنے میں ہے۔

اسے صرف اور صرف حریم کی بہتری اور اس کی خوشیوں کو سوچنا تھا، اپنے آپ کو اپنی ممتا کو، کہیں بہت دور ہٹا کر۔ اشعر بیٹی سے جتنی محبت کر رہا تھا اسے دیکھ کر یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ اب وہ حریم کو خود سے دو جانے دے گا، کیا وہ حریم کو اس سے چھین لے گا؟ کیا وہ حریم کی محبت میں، اس کی محبت کے صدقے میں اسے، حریم کی ماں کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دے گا؟ دونوں باتیں ممکن تھیں۔ لیکن اگر اس نے اس کے رحم...... کو قبول کرنے سے انکار کر دیا حریم کو اپنے ساتھ واپس لے جانے پر اصرار کیا تو پھر یقیناً وہ حریم کو اس سے اپنی طاقت کے بل پر چھین لے گا۔ وہ قانون اور عدالت کے کسی گورکھ دھندے میں پڑے بغیر اس کے چھیننے سے پہلے از خود اپنی خوشی سے، برضا و رغبت اپنی بیٹی اسے سونپ دینا چاہتی تھی۔ حریم کی محبت، اس کے خوبصورت کل، اس کے روشن مستقبل کی آرزو اسے اس کی جدائی کا مشکل ترین فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ حالات کے تھپیڑے سہہ کر، دنیا کی ٹھوکریں کھا کر کیا اب بھی وہ یہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ اس دنیا میں عزت صرف اور صرف پیسے کی اور پیسے والوں کی ہوتی ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا کیا وہ ہو سکتا تھا اگر وہ کسی صاحب حیثیت اثر و رسوخ

والے باپ کی بیٹی ہوتی؟

حریم کی آنکھ نہ کھل جائے اس خوف سے وہ اپنی سسکیوں کو دبا رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کر کے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ کبھی ایک خوبصورت گڑیا سمجھ کر جو محبت اس سے جتائی گئی اور جو ٹھوکر اسے ماری گئی وہ سارے زخم، وہ ساری اذیتیں اس مشکل فیصلے نے پھر سے تازہ کر دی تھیں۔ خرد احسان نام کی وہ ایک نازک اور خوبصورت سی گڑیا جو بن مانگے اور بن چاہے اشعر حسین کی جھولی میں ڈال دی گئی تھی۔ وہ اس بہت شاندار انسان کے لائق نہیں تھی۔ ہاں وہ اس کے قابل نہیں تھی۔ یہ سچائی اسے روز اول سے معلوم تھی؟ کیا بے طلب اور بن مانگے کسی کی زندگی میں شامل ہونے نے اسے اذیت نہ دی تھی، دکھ نہ پہنچایا تھا؟ اور ساتھ ہی اس احساس نے کیا اس کے وقار، اس کی انا کو مجروح نہ کیا تھا کہ جس کی زندگی میں وہ زبردستی شامل ہو گئی ہے وہ اس کے قابل نہیں، وہ اس کے لائق نہیں۔ محل نما گھر، نوکر چاکر، قیمتی گاڑیاں، بیش قیمت ملبوسات، جیولری، امپورٹڈ کاسمیٹکس، عیش و آرام اور بہت شاندار شریک سفر نہیں تھی وہ ان میں سے کسی بھی چیز کی اہل، اس کے قابل، لیکن جس کی وہ اہل نہیں تھی۔ اس کی تمنا بھی کب کی تھی اس نے؟ اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھنے والی وہ لڑکی نہیں تھی۔ ماں، باپ سے خودداری اور قناعت کی زندگی کو شعار بنا لینا سیکھنے والی خرد احسان خواب بھی اپنی حیثیت کے مطابق دیکھا کرتی تھی۔

آسمان پر چمکتے اس سورج کی، اشعر حسین کی آرزو وہ کیونکر کر سکتی تھی؟ اس کا ساتھ مل جانے پر وہ کیسے خوش ہو سکتی تھی؟ اس کی عزت نفس، اس کے نسوانی وقار نے اس شخص کی ان چاہی بیوی بنا دیے جانے پر بے حد ذلت محسوس کی تھی، خود کو بہت کم حیثیت ہوتا اور نیچے گرتا محسوس کیا تھا۔

ایک بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والا، دنیا کی اعلا ترین درس گاہوں سے اعلا ترین تعلیم حاصل کر کے آیا ہوا وہ بہت شاندار شخص زندگی کے ہر معاملے میں اس سے برتر تھا اور وہ کم تر۔ ماں کے ساتھ اپنی محدود دنیا، اس چھوٹے سے گھر میں، وہ وہاں کی راجکماری تھی، خود اعتمادی سے مالا مال تھی اور یہاں اس شخص سے ہر لحاظ سے کم تر۔ زبردستی اس کی زندگی میں شامل ہو کر وہ اپنی خود اعتمادی کھونے لگی تھی، ایک عجیب سے احساس کمتری میں مبتلا وہ اس شخص سے کترایا کرتی تھی۔

اپر کلاس سے تعلق رکھنے والوں کا وہ گھر، وہ گھرانہ چاہے اس کے سگے ماموں ہی کا تھا مگر وہ تو وہاں خود کو اجنبی، محسوس کیا کرتی تھی۔

اشعر اور ممانی ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ ان کی نظروں میں یہ تاثر پڑھ سکتی تھی کہ وہ دونوں اس نئے جڑنے والے رشتے سے خوش نہیں۔ وہ تقدیر سے، وہ ماں سے، ماموں سے شاکی ہوئی تھی۔ اسے زبردستی اس شخص کی زندگی میں شامل کروا کر انہوں نے اس سے اس کی ذات کا فخر ہی چھین لیا تھا۔ اشعر سے تو وہ صرف کتراتی، جھجکتی، شرمسار رہا کرتی تھی، اس کے مقابل خود کو بہت کم تر محسوس کیا کرتی تھی مگر اپنی ممانی سے اسے صرف شرمندگی اور ہچکچاہٹ ہی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ ان سے ڈر لگتا تھا۔ ایک نامانوس سا

خوف محسوس ہوتا تھا اسے ان سے، انہوں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس سے بات ہی بہت کم، بہت لیے دیے رہ کر کرتی تھیں، مگر اسے ان کی نگاہوں سے خوف آتا تھا، اسے ان کی نگاہوں میں ایک سرد اور خاموش سا تاثر نظر آتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اسے ممانی کی خاموشی سے ڈر لگتا ہے۔ اشعر کی خاموشی سے شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کی بے زار نگاہوں سے اپنا آپ بہت بے توقیر لگنے لگتا ہے، اسی بے زاری کی کیفیت میں رات میں جب وہ مجبوری کے عالم میں اس کے قریب آتا ہے تو اس کا رونے کو جی چاہتا ہے۔

لوئر مڈل کلاس سے نکل کر اپر کلاس میں اس شاندار شخص کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد وہ ویسی ہی تھی، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد اشعر حسین میں کچھ تبدیل ہونے لگا تھا۔ وہ تو ویسی ہی تھی، وہ تو زمین پر ہی تھی، مگر اشعر حسین نے اچانک اسے اپنی طرف، آسمان کی طرف بلانا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک روز اس کی خوبیوں کو سراہتے، اس سے محبت کا اقرار کر کے، اس سے والہانہ چاہت کا اظہار کرتے وہ اسے ایک جست میں اپنے برابر لے آیا تھا۔

''تمہیں پتا ہے خرد! تم بہت اچھی ہو۔ تم سی اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی ہمیشہ ایسی ہی رہنا خرد۔ تمہاری یہ سادگی، تمہاری یہ سچائی انمول ہے۔'' پھر اس نے کہا!

''شادی ہماری جا ہے جس بھی طرح ہوئی ہو، لیکن تمہیں ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤں، اگر مجھے انتخاب کا موقع ملتا، اگر دنیا کی تمام لڑکیوں میں سے مجھے اپنے لیے کسی ایک لڑکی کے انتخاب کا حق ملتا تو میرا انتخاب صرف تم ہوتیں خرد، صرف تم۔''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں خرد! تم سے اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔''

''تمہیں پتا ہے خرد! تم میرے لیے کتنی خاص ہو، کتنی اہم ہو۔''

''تمہیں اللہ نے خاص میرے لیے تخلیق کیا ہے۔ یہ اتنی سچی، اتنی سادہ، اتنی خالص اور نایاب لڑکی صرف میری ہے، صرف اور صرف میری۔ مجھے فخر ہوتا ہے تمہاری محبت پر، تمہارے ساتھ پر، تمہاری ہم راہی پر، تمہارا ہم سفر ہونے پر۔'' محبتوں کی شدتیں لیے، سچائیاں اور والہانہ پن لیے یہ اقرار، یہ اظہار اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ اسے ایسی شدید محبت ہو گئی تھی اس سے کہ سوچتی تھی وہ زندگی کو اب سے پہلے اس کے بغیر کس طرح گزارتی آئی تھی۔ اب تو اس سے جدا رہ کر ایک دن گزارنا محال لگتا تھا۔ وہ کسی دفتری کام سے کہیں چلا جاتا تو اس سے تو کچھ نہ کہتی مگر بے قراری سے اس کی واپسی کا ایک ایک پل گنا کرتی تھی۔ اس کی محبت میں وہ اپنی سدھ بدھ بھلا کر بیٹھی تھی۔ دل چاہتا تو خود کو ویسا بنا لے جیسا اس کی شریک سفر کو ہونا چاہئے، جو باتیں اسے پسند ہیں وہ سب اپنا لے، جو ناپسند ہیں وہ سب ترک کر دے۔

وہ اسے پارٹیز میں، دیگر تقریبات میں، اپنے ملنے جلنے والوں کے درمیان فخر سے، محبت سے، کسی اعزاز کی طرح ساتھ لے کر جاتا تھا۔ اشعر نے اس کی تعریفوں میں اور بھی بہت کچھ کہا تھا، اسے ان تمام لڑکیوں سے ہر اعتبار سے بلند اور برتر قرار دیا تھا۔ یہ اس کی محبت تھی جو وہ ایسی باتیں اس سے کہتا تھا، ورنہ وہ جانتی تھی وہ ابھی ویسی نہیں جیسا اشعر حسین کی بیوی کو ہونا چاہئے تھا۔ اسے اس تلخ سچائی سے آگاہی

دلوانے میں سارہ اجمل کے کسی تحقیر آمیز رویے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کی حقارت آمیز نگاہوں اور طنزیہ باتوں سے بہت پہلے سے وہ جانتی تھی کہ وہ اشعر کی محبت، اس کی چاہت سب کچھ ہے مگر وہ اس کے مقابلے میں ہر حقیقت میں بہت کم ہے۔

سارہ اجمل، اشعر کو صرف پسند نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ شادی کے بعد اپنے گھر پر ایک پارٹی میں سارہ اجمل سے پہلی ملاقات ہی میں وہ اس کی اشعر میں انوالومنٹ سے آگاہ ہوگئی تھی، وہ سارہ کی نگاہوں میں اپنے لیے حسد اور نفرت سے بھرے جذبات کو ابتدا ہی میں محسوس کرگئی تھی۔ سارہ اجمل کے ان رویوں میں نیا کیا تھا؟ جہاں تک اشعر کی بات تھی اس نے دیکھا تھا۔ اشعر کو سارہ سمیت دنیا کی کسی دوسری لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ سارہ کی برتھ ڈے پارٹی تھی، وہ سب اس پارٹی میں انوائیٹڈ تھے۔ سارہ نے بظاہر بڑی گرم جوشی سے بصیرت حسین، فریدہ اور اشعر کے ساتھ ساتھ اسے بھی خوش آمدید کہا تھا۔ اور پھر اسے اشعر کے پاس سے اپنی دوستوں سے ملانے کے لیے لے کر آ گئی تھی۔

''ان سے ملو یہ اشعر حسین کی وائف ہیں۔ وہ فلموں میں نہیں ہوتا، شہر کی لڑکیاں دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ اور گاؤں کی الھڑ مٹیار شہری بابو کا دل لے اڑتی ہے، بس کچھ ایسا ہی حادثہ ہوا ہے اشعر کے اور ان کے ساتھ۔''

بظاہر مسکراتے ہوئے سارہ نے جیسے ایک بڑا بے تکلف سا مذاق کیا تھا، بے تکلفانہ سا انداز جس پر اس کی تمام دوستیں محظوظ ہوتی ہنس پڑی تھیں۔

اسے بے عزتی کا احساس ہوا تھا۔

''Wish میں بھی گاؤں کی کوئی گوری ہوتی۔'' اپنے مذاق پر سارہ نے بلند قہقہہ لگایا تھا۔ وہ شرمندہ اور بری طرح کنفیوزڈ ان ہائی سوسائٹی کی بے انتہا ماڈرن لڑکیوں کے بیچ کھڑی تھی۔ سارہ کے بے ہودہ مذاق ختم ہوئے تو اپر کلاس کی پروردہ وہ کسی نہ کسی بڑے باپ کی بیٹیاں اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق سوالات کرنے لگیں۔ قیمتی لباس وزیورات اور اشعر کی ہم راہی کے باوجود اس کا انداز انہیں یہ بتا رہا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں، وہ ان کی کلاس میں نئی نئی داخل ہوئی ہے۔ اپنے ماں، باپ، اپنی پہچان پر اس نے زندگی میں کبھی شرمندگی محسوس نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی نہیں کی، پورے فخر سے اپنے ماں باپ کے بارے میں بتایا مگر پھر بھی اسے خود میں ایک کمی کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ وہ ان پر اعتماد اور بولڈ لڑکیوں کی طرح پر اعتماد نہیں، اس نے ان درس گاہوں کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی جن سے ان لڑکیوں نے تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ ان میں کوئی کونوینٹ کی پڑھی ہوئی تھی، کسی نے کسی امریکن اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی، کوئی IRA سے ڈگری یافتہ تھی تو کوئی LUMS سے پڑھ کر آئی تھی، کوئی انڈس ویلی میں پڑھ رہی تھی تو کوئی NCA میں اور کوئی سارہ اکمل کی طرح یو کے UK امریکہ کے کسی شاندار تعلیمی ادارے کا نام لے رہی تھی۔ ایک عام سے اسکول میں پڑھی، ایک چھوٹے سے کالج سے BSC کی خرد احسان، ان لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم تر تھی۔

اپنی گفتگو میں اردو کے چند الفاظ بحالت مجبوری استعمال کرتی وہ تمام لڑکیاں اسے ایسے ہی دیکھ رہی تھیں جیسے گاؤں کی کسی سیدھی

سادی کم علم سی لڑکی کو دیکھا جاتا ہے۔ سارہ نے اس پارٹی میں جو بدتمیزی اس کے ساتھ کی اس سے قطع نظر وہ یہ جانتی تھی کہ ابھی اس میں بہت کمی ہے۔ اشعر کی کلاس کی لڑکیوں کی طرح بولڈ اور مغرب زدہ نہیں، لیکن کونفیڈینٹ اور سب سے بڑھ کر اعلا تعلیم یافتہ تو اسے ہونا ہی چاہئے۔

سارہ کے ہاں پارٹی میں اس نے کیا محسوس کیا، سارہ نے اسے کس طرح تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بنایا، اس نے یہ سب اشعر کو نہیں بتایا تھا۔ وہ اشعر حسین کی بیوی ہے اور شوہر کی عزت ہر جگہ رکھوانا اس کا فرض ہے، اس کی ذمہ داری ہے اگر کسی جگہ وہ بے عزت ہوگی تو وہ بے عزتی اس کی نہیں اشعر کی ہوگی۔ وہ خود کو اشعر کے معیار و مرتبے کے مطابق بنائے گی۔ اس کے خود سے عہد کیا تھا۔

آگے بڑھنا، MSC کرنا، یہ سارے شادی سے پہلے کے خواب تھے۔ اب اگر اسے یونیورسٹی میں ایڈمشن لینے کا، اعلا تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا تھا تو خود سے کیے اس عہد کے سبب۔ وہ اشعر کی صرف محبت نہیں بلکہ اس کے لیے فخر کا باعث بھی بننا چاہتی تھی۔ اشعر اسے آگے پڑھنے کی بخوشی اجازت دے رہا تھا، اور اس نے خوشی خوشی فوراً ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا، بغیر اپنے دل میں چھپی کوئی بھی سوچ اس پر ظاہر کیئے۔ وہ اعلا تعلیم اب اپنے لیے نہیں صرف اور صرف اس کے لیے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ملکوں ملکوں گھومے، دنیا کی اعلا ترین یونیورسٹیز میں سے ایک یونیورسٹی میں پڑھے، اعلا ترین جگہوں پر جاتے وہاں کئی ملکوں، کئی خطوں کی حسین، قابل اور ذہین عورتوں، لڑکیوں سے ملے، انہیں خود میں دلچسپی لیتا پانے کے بعد کیا اشعر کا نصیب وہ معمولی تعلیمی قابلیت رکھتی عام سی لڑکی تھی؟

اشعر سمجھتا تھا اپنی پسند کے مضمون میں ایک اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لیے کوشاں وہ اپنے شوق کی تکمیل کر رہی ہے وہ اس سے کہتی بھی تو یہی تھی، سچ وہ اسے بتاتی تو وہ اس پر خفا ہوتا اور اپنے دل میں دکھی بھی، وہ اسے اپنی محبت، اپنی دیوانگی کیسے اور کیوں کر سمجھا پاتی۔ وہ اس کی طرح بولڈ نہیں، اس کی طرح لفظوں کا خوبصورت استعمال نہیں جانتی، اسے لفظ نہیں آتے، اسے تو اس شخص سے محبت کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا۔ لیکن اپنے شوہر کی محبت میں دیوانی وہ لڑکی واقعی دیوانی تھی، پاگل تھی۔

☆......☆......☆

بے وقوف تھی، احمق تھی، وہ تو واقعی کسی چھوٹے سے گاؤں کی ایک بہت سادہ، بہت معصوم لڑکی تھی۔ وہ دنیا کے ہر انسان کو اپنے جیسا سمجھتی تھی۔ سیدھا اور سچا۔ دنیا کا اصل روپ، دنیا کی گھناؤنی شکل تو ابھی اس انجان لڑکی نے دیکھی ہی نہ تھی۔ اسے تو جو اچھا لگتا تھا تو اس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا تھا جو برا تو چہرے پر صاف لکھا ہوتا کہ برا لگتا ہے۔

اسے لگتا تھا اسے ناپسند کرنے اور اس سے نفرت کرنے والوں میں سارہ اجمل اور اس کی طرح کی اشعر کی جاننے والی دوسری غیر شادی شدہ لڑکیوں کے سوا اور کوئی نہیں، لیکن وہ غلط تھی۔ سارہ اجمل اور دوسری لڑکیوں کی نفرت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ اس نفرت کے آگے جو ایک عورت نے جب اس پر ظاہر کی تو اس کے گھر کو، اس کی زندگی کو جلا کر ایک پل میں راکھ کر ڈالا۔ اس عورت کا اس نے کیا بگاڑا تھا، اسے اس سے اتنی شدید نفرت کیوں تھی وہ کبھی وجہ نہیں جان پائی۔ اشعر کے خوابوں کے مطابق، اس کے معیار کے مطابق خود کو بنا لینے کی خواہش میں

یونیورسٹی جانے، آگے تعلیم حاصل کرنے کی سادہ سی آرزو کاش اس نے نہ کی ہوتی، اس عورت کی ساری سچائی جان لینے پر اس نے یہ جانا کہ اس کا گھر توڑنا اس عورت نے اس روز سے شروع کر دیا تھا، جس روز وہ پہلی بار یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا یونیورسٹی جانا تو اس شاطر عورت کے لیے صرف اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ بنا تھا۔

اس عورت نے روز اول سے طے کر رکھا تھا کہ اپنے بیٹے کی زندگی سے خرد احسان کو نکال کر دم لے گی، خرد احسان کو بیٹے کی نگاہوں سے گرا کر دم لے گی وہ یونیورسٹی نہ جاتی، آگے نہ پڑھتی، وہ عورت کوئی نہ کوئی موقع پیدا کر لیتی۔

فریدہ حسین، اس کی ممانی بھی تھیں، وہ اس کی ساس بھی تھیں ہاں وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ان میں اس کے لیے اتنا زہر بھرا ہے۔

اس کی شادی کو بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ جب اشعر اس کے لیے شوہر سے بڑھ کر محبوب بن گیا تھا اور بصیرت حسین، وہ بس اس کے ماموں تھے، ان کے پاس ان کے کمرے یا اسٹڈی میں جا کر بیٹھتی تو ایسا لگتا جیسے اپنے سسرال میں نہیں میکے میں بیٹھی ہے۔ سامنے شفقت اور محبت آنکھوں میں لیے بزرگ اس کے سسر نہیں صرف ماموں ہیں۔ ہاں فریدہ حسین کے ساتھ اس کا اول روز جیسا ہی پر تکلف تعلق تھا۔ ان کا لیا دیا سرد سا انداز دیکھ کر اس کا بار بار دل چاہتا تھا جیسے وہ اپنے ماموں اور شوہر کی من چاہی ہے، ایسے ہی ممانی کی بھی من چاہی بن جائے۔ وہ بھی اسے بہو کے طور پر دل سے قبول کر لیں۔ ان کے لحاظ سے وہ سوچتی تو اسے ان کا رویہ سو فیصد درست نظر آتا۔ اشعر ان کا اکلوتا، لاڈلا بیٹا تھا۔ وہ ان کا بہت لائق اور بہت شان دار سا بیٹا تھا۔ نجانے کیسے کیسے اعلا گھرانوں کی حسین حسین لڑکیاں اور ان کے والدین اشعر کے رشتے کے لیے ان کے اشارۂ ابرو کے منتظر بیٹھے تھے اور ان کے بیٹے کی تقدیر ایک انتہائی معمولی لڑکی کے ساتھ جوڑ دی گئی تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اگر وہ کسی بھی اچھی بہت اونچے گھرانے کی لڑکی کے خواب دیکھتی تھیں تو ایسے خواب تو ہر ماں اپنی اولاد کے لیے دیکھتی ہے۔ تقدیر کو یہ منظور نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے دل کی شدید آرزو تھی وہ اپنی ساس کی بھی من چاہی بن جائے۔ مگر وہ ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ کبھی کوئی ایک لفظ بھی تو انہوں نے اسے برا نہیں کہا تھا پھر بھی وہ اتنے جاہ و جلال، رعب و دبدبے اور تمکنت رکھنے والی خاتون تھیں۔ ایک تکلف تھا، ایک فاصلہ تھا، ایک دیوار کھنچی تھی اس کے اور فریدہ حسین کے بیچ۔ مگر پھر یہ فاصلہ، یہ دوری اور یہ تکلف بہت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا تھا۔ جیسے اشعر ابتدا میں اس سے بے زاری کا اظہار کرنے کے بعد پھر اسے پسند کرنے لگا تھا، اس سے محبت کرنے لگا تھا ایسے ہی فریدہ حسین بھی اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ وہ خود اس کے قریب ہوئی تھیں، انہوں نے اس کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق قائم کر لیا تھا، انہوں نے اس سے کہا تھا وہ انہیں ممانی نہیں بلکہ اشعر کی طرح ممی کہا کرے۔ وہ فریدہ حسین کو اپنے پیسے اور طاقت پر غرور اور گھمنڈ رکھنے والی ایک مغرور عورت سمجھا کرتی تھی، جب کہ حقیقت کتنی مختلف تھی۔ ساس یا ممانی کیا وہ تو اس کی فکریں کرنے لگی تھیں جیسے ایک ماں اپنی بیٹی کی کرتی ہے۔ وہ کہتی تھیں ان کی دونوں بیٹیاں بیاہ کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں، ایک ملک سے باہر ہے تو دوسری شہر سے، مگر اب اس کے جانے کے بعد انہیں گھر میں بیٹی کی کمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا وہ بصیرت حسین اور اشعر سے بھی بڑھ کر اس کی خوبیوں کو سراہتیں۔

بصیرت حسین رخصت ہوئے تب وہ بہت بری طرح ٹوٹی تھی۔ تب اشعر سے بھی بڑھ کر فریدہ حسین نے اسے سنبھالا تھا۔ اسے اپنے سینے سے

لگا کر روتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''کبھی بھی یہ مت سمجھنا خرد! کہ میرے ماموں چلے گئے میں تنہا رہ گئی۔ دل کی ہر بات جیسے بصیرت سے کہتی تھیں، اب مجھ سے کیا کرنا۔ کیونکہ میں تمہیں بیٹی صرف زبان سے نہیں کہتی، دل سے مانتی بھی ہوں۔''

پھر انہوں نے ایسا کر کے بھی دکھایا تھا۔ بصیرت حسین کے بعد انہوں نے اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا، اس کی چھوٹی، بڑی ہر چیز ہر ضرورت کا انہیں دھیان رہتا تھا، وہ اس کے کھانے پینے، اس کے لباس، ایک ایک چیز کا بالکل اسی طرح خیال رکھتی تھیں۔ جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کا رکھا کرتی ہے۔ اشعر کے آفس سے آنے کے وقت بے ڈھنگے حلیے یا بغیر میک اپ اور جیولری کے ہوتی تو اسے کسی ماں ہی کی طرح ذرا غصہ دکھا کر شوہر کو قابو میں رکھنے کے گن سمجھا کر فوراً سجنے، سنورنے کا حکم دیتیں۔ اس پر ماموں کی جدائی کا بہت زیادہ اثر ہوا تھا، اس صدمے کے باوجود اس نے یونیورسٹی جانا شروع نہیں کیا تھا۔ تب انہوں نے ہی اسے یونیورسٹی جوائن کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے ہاں بھی اکثر لے جایا کرتی تھیں۔ اپنی این جی او اور دیگر سوشل ورک سے متعلق بھی کئی سیمینارز، کانفرنسز میں بھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس کا مان بڑھا گئی تھیں۔ وہ اسے اپنے جاننے والوں سے ''یہ میری بہو نہیں میری بیٹی ہے۔'' کہہ کر متعارف کرواتی تھیں۔

وہ اسے اپنی بہن زرینہ اجمل کے گھر بھی اپنے ساتھ لے کر گئی تھیں۔ سارہ اکمل کی وجہ سے وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی مگر فریدہ کے اصرار پر ان کی خاطر چلی گئی تھی۔ وہاں اس کی خضر عالم سے ملاقات ہوئی تھی۔ خضر جسے پہلے بھی ایک دو بار زرینہ کے گھر کسی پارٹی میں وہ دیکھ چکی تھی اور جواب یونیورسٹی میں اس کا کلاس فیلو بھی تھا۔ جس ماحول سے نکل کر وہ آئی تھی وہاں مردوں سے دوستی تو کیا بے تکلفانہ بات چیت ہی بہت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ اشعر سے شادی کے نتیجے میں اس کی کلاس تبدیل ہو گئی تھی، اس کلاس میں اچھائی اور برائی کے معیار کچھ اور تھے مگر وہ اپنے ماحول، مزاج اور تربیت کے خلاف کسی لڑکے سے کیسے بے تکلف گفتگو اور دوستی کر سکتی تھی۔

اگلی بار خضر ان کے گھر آیا۔ زرینہ نے فریدہ کے لیے کوئی چیز اس کے ہاتھ بھجوائی تھی، تب فریدہ کے بلانے پر وہ اخلاقاً وہاں آ کر بیٹھی تو ضرور مگر سلام دعا سے ہٹ کر خضر سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ سارا وقت فریدہ ہی خضر سے بات کرتی رہیں۔ خضر کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اسے اس کی بداخلاقی پر ٹوکا۔ ''گھر آئے مہمان کے ساتھ اخلاق سے بات کرنا چاہئے۔''

اسے پتا تھا وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ مردوں سے حد سے بڑھ کر کترانے والی اس کی عادات اشعر کی کلاس میں بداخلاقی، ایٹی کیٹس کے خلاف سمجھی جاتی تھیں۔ مگر اپنی خامی کا ادراک کر لینے کے باوجود بھی اس کے لیے اپنے مزاج کو تبدیل کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

خضر نے کلاس میں اس کے پاس آ کر اس سے نوٹس اور لیکچرز مانگنے شروع کیے تو اپنی ممی کی بہن کا رشتے دار سمجھ کر وہ اسے اپنی چیزیں دے تو دیتی ہاں کوئی لمبی چوڑی اور فالتو بات اس کی اس سے ہرگز نہ ہوتی۔ جب وہ ایسے لیے دیے رہنے والے اور محتاط مزاج کی تھی تو کسی لڑکے کے اس سے بے تکلف ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی دوستی صرف سامعہ اور ندرت کے ساتھ تھی۔ حماد جو

سامعہ کا فرسٹ کزن بھی تھا اور ان دونوں کا نکاح بھی ہو چکا تھا۔ وہ کبھی کبھار سامعہ ہی سے کوئی بات کرنے، کچھ لینے، کچھ دینے ان لوگوں کے پاس آتا۔ ان لوگوں کی کلاسز شروع ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب حماد کے ساتھ خضر نے بھی ان لوگوں کے پاس آنا شروع کر دیا۔ حماد تو ان لوگوں سے سلام دعا کے بعد صرف سامعہ سے مخاطب ہوتا جب کہ خضر ان تینوں لڑکیوں سے دوستانہ سی بات چیت کرنے لگتا۔ وہ سوائے مسکرانے کے کچھ بھی نہیں بولتی۔ خضر کے بے تکلف اور دوستانہ انداز کی بدولت بہت جلدی ندرت اور سامعہ کی اس کے ساتھ بے تکلفی اور دوستی ہو گئی تھی۔ اب خضر، حماد کو گھسیٹ کر اکثر ان لوگوں کے درمیان آ کر بیٹھ جاتا۔ وہ تینوں لائبریری میں ہوتیں، خضر، حماد کو بھی وہاں لے آتا۔ وہ ایک کم گو اور بے حد ریزروسی لڑکی ہے اس بات کو خضر اور حماد دونوں سمجھتے تھے اور وہ دونوں ہی اس سے محتاط انداز میں آپ جناب کر کے ہی بات کیا کرتے تھے۔ خضر زبردستی ان کے گروپ میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا، حماد کو بھی کھینچ کھینچ کر ان تینوں کے پاس لے آتا تھا۔ اس کے ان لوگوں کے پاس اس طرح آنے کی کوئی اور وجہ سوچی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ خرد شادی شدہ تھی، صرف خضر کیا تقریباً ساری کلاس بلکہ کئی ٹیچرز تک یہ بات جانتے تھے، سامعہ نکاح شدہ تھی اور خضر اس کے شوہر کے ہم راہ ان کے گروپ میں آیا کرتا تھا، رہ گئی ندرت تو اس کی بات چیت بھی اعلانیہ طور پر طے تھی، بس باضابطہ منگنی ہونے کی دیر تھی۔ تین شادی شدہ، نکاح اور منسوب شدہ لڑکیوں کے پیچھے آنے کا خضر کا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے کہ وہ خرد کے اسائمنٹس اور لیکچرز کے باآسانی حصول کے لیے ان لوگوں کے گروپ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ آپس میں ان تینوں نے اس بات پر خضر کا بہت مذاق اڑایا تھا جب کہ سامعہ جیسی منہ پھٹ اور صاف گو لڑکی نے تو خضر کے منہ تک پر یہ بات کہہ دی تھی اور اس نے بجائے شرمندہ ہونے کے فوراً گردن ہلا کر اس کے اندازوں کی تائید کر دی تھی۔ وہ دونوں جیسے ان کے گروپ کے آن آفیشل ممبرز بن گئے تھے۔ یہ آن آفیشل ممبرز جس وقت ان تینوں کے پاس لائبریری، کلاس روم یا کسی بھی اور جگہ آ کر بیٹھتے تو اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستی مسکراتی اور بے تکان باتیں کرتی خرد احسان یک دم ہی محتاط ہو کر بیٹھ جاتی۔ پھر وہ بہت کم بولتی اور بہت تکلف سے بولتی۔ جواب میں ایسا ہی کچھ انداز خضر اور حماد کا بھی ہو جاتا تھا۔

خضر لیکچرز اسائمنٹ اس سے یونیورسٹی میں لیتا اور اکثر وہ اسی شام اسے لوٹانے ان کے گھر آ جاتا۔ اشعر کبھی موجود ہوتا کبھی نہیں، مگر فریدہ تو ہمیشہ ہی شام کے ان اوقات میں گھر پر ہوا کرتیں۔ جب وہ اس کی لی ہوئی چیزیں لوٹانے آتا۔ وہ واپس جانے لگتا تو فریدہ اسے محبت اور اصرار سے بٹھا لیتیں، اسے روک لیتیں، جلدی سے کسی بھی ملازمہ کو آواز لگا کر اس کے لیے چائے اور اسنیکس لانے کو کہتیں۔ اسے لگتا تھا کہ فریدہ، خضر کو بہت زیادہ پسند کرتی تھیں۔ وہ اس کی باتوں، کھلنڈرے انداز کو بہت زیادہ انجوائے کرتی تھیں۔ خضر کو بھی ان کے ساتھ باتیں کرنے میں مزا آتا تھا تب ہی تو اس کے جو اسائمنٹس اور لیکچر وغیرہ وہ اسے اگلے روز یونیورسٹی میں لوٹا سکتا تھا محض وہ دینے کے لیے ان کے گھر اکثر و بیشتر آ جایا کرتا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر والوں کی کمی محسوس کرتا تھا۔ وجہ جو بھی تھی۔ بہر حال وہ فریدہ کی وجہ سے ہمیشہ وہاں بیٹھتی، فریدہ کی وجہ سے خضر کی میزبانی کرتی، جسے اس کی ممی اتنا زیادہ پسند کرتی تھیں، وہ اس کے ساتھ بداخلاقی کیسے برت سکتی تھی، خضر بھی محتاط ہی ہو کر اس سے بات کرتا تھا۔

لیکن یہ اس شاطر عورت کا کمال تھا جس نے یہ تمام سچویشنز اتنی ہوشیاری سے ترتیب دی تھیں کہ ایسا لگے جیسے اس کی خضر کے ساتھ دوستی ہوگئی ہے۔ اگر وہ اپنے خلاف بنے گئے کسی سازشی جال سے آگاہ ہوگئی ہوتی تو اشعر پر واضح کر دیتی کہ اس کا خضر عالم سے دوستی کا کوئی تعلق نہیں ہے پر وہ اشعر کو وضاحتیں کس بات کی دیتی جب کہ اس کے دل میں کوئی چور، کوئی شیطان تھا ہی نہیں۔ مگر اسے علم نہیں تھا کہ چھوٹے چھوٹے بظاہر بہت بے ضرر اور عام سے واقعات، معمولی معمولی باتیں جن کی نہ اس کی نگاہوں میں کوئی اہمیت تھی نہ اشعر کی۔ لیکن وہی معمولی باتیں اور بے ضرر واقعات دراصل اشعر کے دل میں اس کے خلاف شک اور بداعتمادی کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے بنیادوں کا کام کر رہے تھے۔

وہ سوچ بھی کیسے سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کتنا گھناؤنا کھیل کھیل رہی ہیں۔ ایک بہت چاہنے والی ماں کا روپ دھار کر وہ اسے پوری طرح اپنے زیر اثر لے چکی تھیں، ممی کو کسی بات کے لیے ''نہ'' کہنا ان کے کسی حکم، کسی فیصلے کے خلاف جانے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔

خضر سے اس کا ہر تعلق ممی کی خاطر اور رشتے داری کے لحاظ میں تھا۔ پھر بھی غلطی تو اس کی تھی۔ اس کی معصومیت، اس کی سادگی جسے اشعر ہمیشہ بہت زیادہ سراہتا تھا، اس کی اسی معصومیت، اسی سادگی کو اس بے انتہا چالاک عورت نے بڑی ہوشیاری سے اپنے حق میں استعمال کر ڈالا تھا۔

وہ اسے اس کے شوہر کی نگاہوں سے گرانے کے لیے کتنی چالاکی سے اس کے گرد ایک دائرہ تنگ کر رہی تھیں، اسے اپنے ایک شاطرانہ جال میں پھنسا رہی تھیں۔ وہ اسے خود اعتمادی کا درس دیتی تھیں۔ وہ ان کے سمجھانے اور بہت نصیحتوں کے باوجود اپنے حد سے زیادہ محتاط اور ریزرو انداز کو تبدیل نہیں کر پاتی تھی۔ حالانکہ اگر فریدہ، اشعر کے دل میں شک کا زہر نہ انڈیلتیں تو وہ جانتی تھی کہ اشعر کتنا کھلے ذہن کا بندہ تھا۔ وہ ایک کیا اپنے دس کلاس فیلوز سے دوستی کر لیتی، اس کے لیے ان لڑکوں کے ان کے گھر پر یا فون آ جاتے اشعر کبھی کوئی غلط بات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتا۔ خود اس کی کتنی لڑکیوں اور عورتوں سے پروفیشنل حوالوں سے بھی وہ کسی دوسرے حوالے سے بھی دوستیاں تھیں۔ لیکن بات تو ساری یہی تھی، ان کی چالاکی کی تھی۔ وہ اس بے وقوف لڑکی کو بھی خوب اندر تک جان گئی تھیں اور اپنے بیٹے کو تو وہ اچھی طرح سمجھتی ہی تھیں۔ اپنے کھلے ذہن کے لبرل بیٹے کے دل میں بیوی کے لیے شک پیدا کروانے کے لیے انہوں نے بڑی ہوشیاری بڑی مہارت سے کام لیا تھا۔ وہ ٹھنڈا کر کے کھا رہی تھیں۔

سچائی آنکھوں کے سامنے آئی تو پتا چلا ماموں کے مرنے کے بعد سے ان کا کیا کوئی کام، کوئی عمل، کوئی بات یہاں تک کہ ان کے منہ سے نکلا ایک لفظ تک بے مقصد نہیں تھا۔

وہ اس عورت کے تیار کردہ ڈرامے کے دو مرکزی کردار تھے۔ اس کا تیار کردہ یہ ڈرامہ بہت مضبوط کہانی رکھتا تھا۔ اشعر کا بیرون ملک بزنس ٹور اور خضر کا ایکسیڈنٹ۔ ان دونوں واقعات کا ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہونا کیا وہ شک کر سکتی تھی اس بات پر کہ خضر کے ایکسیڈنٹ کا

وہ سارا قصہ اس ڈرامے کا حصہ تھا، اس ڈرامے میں طے یہی کیا گیا تھا کہ یہ سارا واقعہ تب ہو جب اشعر اپنے معمول کے کسی بزنس ٹرپ پر گیا ہوا ہو، تا کہ اس کے واپس آنے کے بعد اس سارے قصے کو اپنی مرضی کے رنگ بھر کر اس کے گوش گزار کیا جا سکے۔ تب وہ واقعہ کیا کوئی بھی واقعہ نہ اسے جھوٹ لگا تھا نہ ڈرامہ مگر بعد میں سوچنے پر سمجھ سکتی تھی کہ اس سارے ڈرامے میں وہ عورت کبھی بھی تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ زرینہ اجمل بھی تھیں، خضر عالم بھی تھا۔ زرینہ اجمل کے اس ڈرامے میں شامل ہونے کے عوامل کو سمجھنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی سارہ اجمل کو اس کی محبت تک رسائی دلوانا، لیکن خضر عالم؟ وہ کیوں فریدہ حسین یا زرینہ اجمل کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن بیٹھا تھا۔

ایکسیڈنٹ کا وہ سارا واقعہ ایک ڈراما تھا مگر اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے خضر نے خود کو زخمی تو کیا تھا، خود کو چوٹیں تو لگائی تھیں۔ اگر اپنی گاڑی واقعی کہیں جان بوجھ کر نہیں بھی ٹکرائی تھی۔ تب بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا تھا کہ کسی بھی ہسپتال میں زخمی بن کر سر پر، ہاتھوں، پیروں پر پٹیاں جکڑ کر تو یقیناً لیٹا جا سکتا ہے، مگر بعد میں اتنے سارے دنوں تک لنگڑانے کی اتنی کامیاب اداکاری مسلسل نہیں کی جا سکتی۔ خضر عالم کے ایکسیڈنٹ پر زرینہ اجمل رو رو کر ہلکان ہو گئی تھیں۔

خضر کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملتے ہی فریدہ ہسپتال بھاگی تھیں، وہ وہاں کئی گھنٹے مسلسل رہی تھیں۔ صبح سے شام ہو گئی تھی اور فریدہ گھر واپس نہیں آئی تھیں۔ اس نے انہیں ہسپتال فون کیا۔ پتا چلا کہ ایکسیڈنٹ میں خضر کا بہت زیادہ خون بہہ گیا ہے۔ اسے بہت زیادہ مقدار میں بلڈ کی ضرورت ہے۔ بلڈ بینک سے فوری طور پر بلڈ ملا تو ہے مگر خون کی ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ ان کی آواز میں بہت پریشانی تھی، وہ تو سڑک پر پڑے کسی ایسے انجان لاوارث زخمی کے بارے میں بھی اگر یہ جان لیتی کہ اس کے خون دے دینے سے اس کی جان بچ سکتی ہے تو لازماً اسے اپنا خون دے دیتی۔

اس کی اس ہمدردانہ اور خدا ترس فطرت سے اس کی دشمن بخوبی آگاہ تھیں، تب ہی تو اپنے ڈرامے کی تیاری کے آغاز میں جب انہوں نے ڈرامے کے تمام سینز ترتیب دیے ہوں گے، تب ایکسیڈنٹ کا یہ سین بھی اس میں لازمی طور پر شامل کر لیا ہوگا۔ جہاں اتنی باریک بینی سے تمام تر جزئیات پر انہوں نے پہلے سے پورا کام کر رکھا تھا۔ وہاں انہیں اس کا بلڈ گروپ پہلے سے معلوم کر لینا کون سا ناممکن کام تھا۔

اس کے متعلق ان کے اندازے واقعی درست تھے۔ خون کی کمی، خون کی فوری ضرورت، خون کا بہت ضائع ہونا اور جان کو خطرہ جیسی ان کی باتیں سنتے ہی اس نے از خود وہ بات کہہ دی تھی جو وہ اس کے منہ سے کہلوانا چاہتی تھیں۔ وہ فریدہ حسین کے ساتھ بس ایک مرتبہ خون دینے ہی ہسپتال گئی تھی۔ وہاں اس نے اپنا خون بھی دیا تھا اور پھر اس کے بعد فریدہ کے ساتھ ہی کھڑے کھڑے خضر کی عیادت بھی کی تھی۔ اس ایک مرتبہ کے سوا وہ کبھی بھی خضر عالم کی عیادت کے لیے ہسپتال نہیں گئی تھی۔

زرینہ، ہسپتال میں خضر کے ساتھ رکی ہوئی تھیں اور فریدہ گھر پر سے بہن اور خضر دونوں کے لیے کھانا پکوا کر یا تو ڈرائیور کے ہاتھ بھجواتیں یا پھر خود لے کر جاتیں۔ دو، تین مرتبہ ہسپتال جانے کی تیاری کرتے کرتے انہوں نے اس سے سرسری سے انداز میں خضر کے لیے سوپ بنا دینے کو کہا جو انہیں اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

وہ سوپ تیار کر کے ان کے لئے جانے کے لیے پیک کر کے رکھ دیتی۔ کتنی چالاک تھی وہ عورت، کتنی مکار۔ اشعر کے آنے کے بعد قصداً ایکسیڈنٹ کی، اس کے بلڈ دینے کی بات اشعر کو اس کے سامنے بتائی۔ لیکن انداز ایسا اختیار کیا۔ جیسے اسے اپنے زخمی دوست کی بہت فکر پڑ گئی تھی، اس نے خود آگے بڑھ کر اپنے دوست کو فوراً جا کر خون دیا تھا۔ اسی کے سامنے ساری بات ہوئی تھی، اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے، میری بہو کتنی نرم دل، کتنی حساس ہے والا لہجہ اختیار کر کے، مگر لفظ وہ اپنا کر جو صرف یہ تاثر دیں جیسے خضر کا ایکسیڈنٹ اس کے لیے ایک بہت اہم بات تھی اور وہ خضر عالم، وہ ان کی سلگائی آگ کو اپنے چھوٹے چھوٹے تب اسے بہت سادہ اور غیر اہم لگتے جملوں سے کس طرح بھڑکا رہا تھا۔

''پہلے یہ صرف میری کلاس فیلو تھیں، اب میری محسنہ بھی بن گئی ہیں۔''

تب ہی تو پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ اپنی اس کلاس فیلو سے مجھے اتنی اپنائیت سی کیوں محسوس ہوتی ہے۔''

''چکھوں گا کیوں۔ میں تو پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ خرد کے ہاتھوں کا جب صرف سوپ اتنے مزے کا ہوتا ہے تو باقی چیزیں تو یقیناً بہت ہی اچھی بناتی ہوں گی۔''

ایسے غیر اہم گفتگو برائے گفتگو کے طور پر کئے گئے یہ فقرے نہ سادہ تھے نہ غیر اہم۔

اگر اشعر ناگواری کا اظہار کرتا تو لازماً وہ تمام باتوں کی وضاحت کرتی۔ اسے اس رات کا اشعر کا ردعمل یاد تھا۔ وہ کھانے کی میز سے بہت جلدی اٹھ گیا تھا۔ اس نے کھانا برائے نام کھایا تھا وہ کسی بات سے بہت الجھا ہوا اور بہت بے چین لگ رہا تھا۔ اسے الجھا ہوا اور اتنا بے چین سا دیکھ کر وہ کیسے وہاں رکی رہ سکتی تھی۔ نور افزا سے کافی بنانے کا کہہ کر وہ فریدہ اور خضر سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آنے لگی تھی۔ اسے فریدہ کی بات یاد تھی۔ وہ اسے کافی پینے کے لیے بضد ہو کر روک رہی تھیں۔ وہ اپنے کالج اور یونیورسٹی کے دنوں کے کچھ بہت ہی یادگار اور دلچسپ قسم کے واقعات ان لوگوں کو سنا رہی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس زبردستی بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹھو خرد! اتنی جلدی کیا ہے بھئی، ابھی تو اتنا مزا آ رہا ہے، میں تم دونوں کو اپنے کالج کا ایک بہت ہی مزے دار قہقہہ سناتی ہوں۔''

اس میں بچپنا اور معصومیت تو تھی مگر اسے وہاں رکنے میں اس وقت ہرگز کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس کی سوچ کا مرکز اس وقت صرف اور صرف اشعر تھا۔ وہ جتنی بھی نادان ہو پر ایسی نہیں تھی کہ اس کا شوہر کسی پریشانی میں مبتلا نظر آ رہا ہو اور وہ نیچے قہقہے لگا رہی ہو۔ فریدہ نے اس کے بچپنے، اس کی نادانی کے متعلق کچھ اندازے غلط بھی لگائے تھے، اس رات جب وہ ان کے بہت زیادہ اصرار کے باوجود وہاں نہیں رکی تھی، اپنے کمرے میں چلی گئی تھی تب یقیناً وہ بہت زیادہ جھنجھلائی ہوں گی۔

پتا نہیں وہ کس وجہ سے پریشان تھا۔ کوئی دفتری پریشانی تھی اس کی طبیعت خراب تھی یا کوئی اور مسئلہ تھا، لیکن وہ اسے شام سے ہی خاموش خاموش لگ رہا تھا۔ اس کے پوچھنے پر اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر مزید سوالات کا سلسلہ روک دیا تھا۔ اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی تو اپنے قرب اور اپنی محبت سے اسے اس کی پریشانی میں کچھ تھوڑا سا آرام، تھوڑا سا سکون تو دے سکتی ہے۔ وہ اس کے بالکل قریب آہستہ آہستہ اس کا سر دبا رہی تھی اور وہ اس سے سر دبواتے دبواتے سو گیا تھا، اس کے سو جانے کے بعد بھی وہ اس کا سر ہولے ہولے دباتی رہی تھی، اس کے چہرے کو محبت اور فکر کے ملے جلے رنگوں سے تکتی رہی تھی۔ دل ہی دل میں یہ دعا بھی مانگتی رہی تھی کہ اس کی جو بھی پریشانی جو بھی ٹینشن ہے وہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائے۔

رات اپنی خاموشی اور سنجیدگی سے اس نے اسے جتنا پریشان کیا تھا صبح اپنے شدتیں لیے محبت کے انداز سے بے تحاشہ حیران اور بہت زیادہ خوش تھی۔

''خرد! ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا۔ میری زندگی کی ہر صبح یونہی ہو، میں آنکھیں کھولتے ہی سب سے پہلے تمہیں دیکھوں، تمہیں اپنے قریب پاؤں۔''

اور اس کی بانہوں میں چھپے، اس کی محبتوں سے مسحور ہوتے اس کے جسم کے روئیں روئیں سے یہی صدا آ رہی تھی کہ وہ ہمیشہ اس سے یونہی محبت کرے گی، اس کے لیے اس کی محبت کبھی کم ہو جائے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اشعر حسین صرف اس کا شوہر نہیں تھا، وہ اس کی کل کائنات تھا، وہ اس کی دنیا، اس کی زمین اس کا آسمان سب کچھ تھا۔ وہ سامنے نظر نہ آتا تو اسے کائنات کا ہر رنگ پھیکا لگتا تھا۔

اس ایک دن کی پریشانی، سنجیدگی اور خاموشی کے بعد اشعر پھر سے پہلے جیسا ہو گیا تھا، خضر عالم کے حوالے سے جو باتیں جس


## اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب **اردو ادب کے مشہور افسانے** بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دُکھ مجھے دے دو، وہ بڈھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عید گاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمٰن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمر بند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونا لیزا، اے۔ حمید)؛ (اوورکوٹ، غلام عباس)؛ (مہالکشمی کا پُل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جوگندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

زاویے سے اسے دکھانے کی کوشش کی گئی تھیں بظاہر اس نے انہیں نظرانداز کردیا تھا، ذہن سے جھٹک دیا تھا، مگر وہ باتیں اس کے دل سے نکلی نہیں تھیں۔ اشعر کے لیے، اس کی خاطر وہ دنیا کے کسی بھی انسان سے چاہے وہ اسے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو ہر تعلق توڑ سکتی تھی۔ خضر عالم تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

کاش وہ اس پر اپنی بدگمانی ظاہر نہ کرتا بس کسی بھی انداز میں اسے یہ باور کرادیتا کہ وہ خضر عالم کو پسند نہیں کرتا، پھر سب کچھ کس طرح بدل جاتا۔ جو کچھ ہوا وہ پھر کبھی بھی نہ ہوتا۔

خضر عالم نے بھی کبھی اسے کلاس فیلو سے ہٹ کر کسی اور نظر سے نہیں دیکھا تھا وہ کم عمر اور جذباتی سا نوجوان لڑکا تھا، جسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا بہت شوق تھا۔ اسے امریکہ اعلا تعلیم کے لیے جانے کا بہت شوق تھا۔ وہ ان دنوں ایک امریکن یونیورسٹی ہی میں اپنے داخلے کی کوششیں کررہا تھا۔ اسے ایک امریکی یونیورسٹی میں داخلہ ملنے بھی لگا تھا مگر اس کے والد نے اس کے وہاں جانے کے لیے اسے پیسہ دینے سے انکار کردیا تو اس کا جانے کا سارا خواب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس کے والد کی کویت میں اچھی جاب تھی مگر ابھی اس کے چھوٹے تین بھائی بہن اور بھی زیادہ تعلیم یافتہ تھے، اس کے والد کا کہنا تھا وہ اکیلا ان کا لاڈلا نہیں جو وہ اسے امریکہ پڑھنے بھیج دیں اور دوسرے بچوں کو اچھی بنیادی تعلیم بھی نہ دلاسکیں۔ اس سے چھوٹے تینوں بھائی بہن ابھی اسکول میں پڑھتے تھے۔

وہ ان کے گروپ میں شامل ہوا تھا تو اس کی باتیں وہ سنا ہی کرتی تھی، اس کے والد نے اسے کراچی پڑھنے بھیجا تھا، وہ اسے یہاں تعلیم اور رہائش کے لیے رقم بھی باقاعدگی سے بھجواتے تھے مگر یہاں جس علاقے میں دو کمروں کے ہی سہی، آٹھویں منزل پر ایک فلیٹ میں وہ رہ رہا تھا، وہ شہر کا خاصا اچھا علاقہ تھا۔ اپنے والد کے بھیجے ہوئے پیسوں میں نہ وہ اس جگہ رہائش افورڈ کرسکتا تھا نہ ذاتی گاڑی۔ یہ رہائش اور یہ گاڑی اس نے آنرز کے دوران اپنی محنت اور کوششوں سے حاصل کی تھی۔ وہ کمپیوٹر پروگرامنگ میں ماہر تھا وہ شہر کے پوش علاقے میں قائم ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں بطور انسٹرکٹر شام کے اوقات میں جاب کرتا تھا اور وہیں سے اس کے تعلقات بڑھے تھے تو وہ کئی پرائیوٹ اداروں کے لیے کمپیوٹر پروگرامنگ اور اس کمپیوٹر سے متعلق دوسرے امور میں چھوٹے موٹے پروجیکٹس اپنے ہاتھ میں لے کر ٹھیک ٹھاک پیسے کما لیا کرتا تھا۔

خضر گروپ میں بیٹھ کر بانگ دہل اپنی محبت کی داستان بھی سب کو سناتا تھا۔ مہرین نام کی وہ لڑکی خضر کے والد کے بچپن کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ خضر اپنے بچپن سے اسے جانتا تھا اور بچپن ہی سے پسند بھی کرتا تھا۔ اس کے والد کے وہ دوست کویت ہی میں اپنی فیملی کے ساتھ شروع سے مقیم تھے مگر ان کا لیونگ اسٹینڈرڈ خضر کی فیملی سے بہت اونچا تھا۔ اسٹیٹس کے فرق کی وجہ سے خضر اب تک اپنی محبت کا کسی سے اظہار نہیں کرسکا تھا۔ مہرین بھی اسے پسند کرتی تھی مگر اس پسندیدگی کو آگے بڑھانے کے لیے اس کے گھر رشتہ بھیجنے کے لیے پیش رفت تو خضر ہی کو کرنا تھی۔ لیکن خضر کو لگتا تھا اسٹیٹس کے فرق کی وجہ سے اس کے والدین مہرین کے ہاں رشتہ لے جانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ سامعہ، ندرت، حماد سب اس سے اظہار ہمدردی بھی کرتے تھے اور وہ اپنے والدین کو مہرین کے گھر رشتہ لے جانے پر آمادہ کرنے کے طریقے بھی سمجھاتے

تھے۔ ایک لڑکا جو صبح شام کسی دوسری لڑکی سے عشق کی داستانیں ان لوگوں کو سنایا کرتا تھا، وہ اس کے بارے میں یہ سوچ بھی کیسے سکتی تھی کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے اور وہ اس میں دلچسپی لے بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اس میں دلچسپی لینے کا محض ڈرامہ کر رہا تھا۔ اشعر کے سامنے جب اس کا خضر پر نہیں اشعر پر دھیان ہوتا تب وہ ایک دو پل کے لیے اسے گہری نگاہوں سے اس طرح ضرور دیکھتا، جنہیں اشعر محسوس کر سکے، انہیں دل میں ناپسند کر سکے اور باقی تمام وقت یونیورسٹی میں یا ان کے گھر آنے پر وہ اس سے نظریں نیچے کر کے احترام سے اس طرح بات کرتا جیسے کسی رشتے کی بھابھی سے کی جاتی ہے۔

دوغلا پن، اداکاری، مکاری، چالاکی، کمینگی ان سب کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں جا کر ختم ہونے والا تھا۔ جن دنوں اسے کوئی اسائمنٹ ملا ہوتا، کوئی Test ہونے والا ہوتا گھر پر اچانک ہی فریدہ کے مہمانوں کی آمدورفت بڑھ جاتی۔ اس کی کوکنگ کی تعریفیں کرتی فریدہ اس سے لنچ کا، شام کی چائے کا اچھا سا انتظام کرنے کو کہتیں، گھر پر کسی کو نہ آنا ہوتا تو وہ اسے اپنے ساتھ اپنے کسی نہ کسی ملنے والے کے ہاں لے جانا چاہتیں۔ وہ دن کے اوقات میں پڑھ لیا کرتی تھی، مگر ان مصروفیات میں لگ کر اس کا پڑھائی کا حرج ہوتا، اس ٹیسٹ والے دن بھی فریدہ نے دن بھر اسے اتنا زیادہ مصروف رکھا تھا کہ یونیورسٹی سے آ کر کتابیں رکھنے کے بعد اسے رات گئے تک انہیں ہاتھ لگانے تک کا موقع نہیں مل پایا تھا۔

اس نے ان سے معذرت کرتے۔ ''ممی میرا Test ہے۔'' کہا تو انہوں نے لاپروائی سے ''چھوڑو رات میں پڑھ لینا۔'' اس نے ان سے کہا کہ وہ رات میں اشعر کی موجودگی میں زیادہ دیر تک پڑھتی نہیں ہے۔

''کیوں بھئی تمہیں جتنا پڑھنا ہوتا ہے اور جب تک پڑھنا ہوتا ہے تم پڑھا کرو۔ اشعر کیا اپنے سارے کام تمہیں ذہن میں رکھ کر ترتیب دیتا ہے جو تم ایسا کر رہی ہو۔ اپنا زندگی بھر کا تجربہ تمہیں بتا رہی ہوں خردا! شوہر کو کبھی بھی بلاوجہ سر پر نہیں چڑھانا چاہئے۔ یہ جو مرد ذات ہے ناں بڑی عجیب شے ہے ایک بار بیوی محبت میں جھک جائے تو یہ عمر بھر اسے اپنے سامنے جھکاتے ہی رہتے ہیں۔''

اپنے ہی بیٹے کے خلاف بولتی وہ اسے حقیقتاً اپنی ساس نہیں ماں لگی تھیں۔ ایک جذباتی اور بے وقوف سی ماں جو بیٹی کی محبت میں اسے داماد کے خلاف الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی ہو۔ وہ ان کی نصیحتوں پر ہنسی تھی۔ وہ ٹیسٹ بہت اہم تھا فریدہ کے ساتھ مصروف رہ کر کوئی تیاری نہیں ہو سکی تھی۔ فریدہ کے ساتھ تو لحاظ اور تکلف کا رشتہ تھا مگر اشعر کی بات تو دوسری تھی۔ وہاں تکلف وکلف والا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا اگر وہ پوری رات جاگ کر پڑھے گی تو اس کی ٹیسٹ تیاری مکمل ہو سکے گی، ورنہ ہرگز نہیں۔ پہلے بھی اس کے کئی ٹیسٹ خراب گئے تھے۔ صبح شام کی فریدہ کے ساتھ یہ مصروفیات اس کی پڑھائی پر بہت زیادہ اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اشعر اسے سونے کے لیے بلانے آیا تھا۔ اس کے منع کرنے پر اس نے اصرار کیا تو اپنی ڈھیر ساری نامکمل تیاری کو دیکھتے وہ اشعر کے اصرار پر جھنجھلا سی گئی۔ اشعر نے دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا وہ یک دم ہی اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور اس کے ہٹتے ہی اس کے اندر شرمندگی اور ندامت پیدا ہوئی تھی۔ اس نے اسے ہرٹ کر دیا ہے، اسے ناراض کر دیا ہے۔

اس نے اپنے شوہر کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اس نے اسے ہر طرح کی آزادی دی تھی، اسے محبوب کی طرح رکھتا تھا اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ شوہر کے حقوق اور اپنے فرائض بھول جائے۔

اپنی بدتمیزی پر وہ کتنی دیر تک شرمندگی میں میز پر سر رکھ کر بیٹھی رہی تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر کافی دیر بعد جب بہت ہمت کر کے وہ میز پر سے اٹھ کر اس کے پاس آئی تو وہ سو چکا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہو کر سو گیا تھا۔ وہ بیڈ کے دوسرے کونے پر لیٹ کر رو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اسے ابھی سوتے سے اٹھا دے، اس سے اپنی بدتمیزی کی ابھی معافی مانگ لے، مگر اسے سوتے سے جگانے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ساری رات اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتے روتی رہی تھی، صبح ہونے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ میز پر اس کی وہ ساری کتابیں، فائلیں جو چند گھنٹے پہلے اس کے لیے بے حد اہم تھے اب اپنی ہر اہمیت کھو چکے تھے۔ کوئی ٹیسٹ، کوئی کتاب، کوئی پڑھائی بلکہ دنیا کا دوسرا کوئی بھی کام، دنیا کا دوسرا کوئی بھی انسان اس کے لیے اس شخص سے بڑھ کر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ صبح ہو گئی تھی اور اس نئی صبح میں وہ اسے خود سے بہت زیادہ ناراض دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچتی تھی کبھی ہماری لڑائی ہو گی تو کیا ہو گا، کیسا ہو گا، کون کسے منا رہا ہو گا۔ اشعر کی ناراضی، خاموش ناراضی ہوتی ہے، وہ غصے میں خاموش ہو جایا کرتا ہے، اجنبی بن جایا کرتا ہے یہ اس نے اس روز دیکھا تھا۔ ناراض ہو کر اس کی طرف نہ دیکھنا، اس سے بات نہ کرتا وہ اتنا اجنبی لگ رہا تھا کہ وہ تعجب سے سوچ رہی تھی کہ کیا زندگی میں کبھی بے تکلفی سے بغیر کسی ڈر اور خوف کے اس شخص سے اس نے بات بھی کی ہو گی؟ کیا اس اجنبی کے دل تک اسے واقعی رسائی حاصل ہے، کیا واقعی وہ اس کے دل میں رہتی ہے۔

وہ ناراضی، اس کی معافی سے ختم ہو گئی تھی مگر ناراضی میں اشعر کا جو اجنبی روپ اس نے تھوڑی سی دیر کے لیے دیکھا تھا اس نے اسے اتنا زیادہ ڈرا دیا تھا کہ اس نے بہت سچے دل سے دعا کی تھی کہ وہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس سے ناراض نہ ہو۔

اسے اشعر کی خاموشی اور اس کے اجنبی انداز نے چند منٹوں ہی میں بہت بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اشعر کی ناراضی اور اجنبیت کے بعد جب وہ اسے منا لینے میں کامیاب ہو گئی تو اشعر نے ایک بہت خوب صورت بات اس سے کہی تھی، اس کی اس خوب صورت ترین بات کو سن لینے کے بعد رات بھر بے چین رہا، اس کا دل یک دم ہی ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔

''تمہیں خود پر بھروسہ نہ ہو، مگر مجھے میری خرد پر پورا بھروسہ ہے۔''

یہ جملہ اس نے اس کی ٹیسٹ کی تیاری کے حوالے سے کہا تھا، مگر اسے اس سارے جملے میں جو لفظ سب سے زیادہ اچھے، سب سے زیادہ پیارے لگے تھے، وہ ''میری خرد'' اور ''بھروسا'' تھے۔

دوپہر میں وہ یونیورسٹی سے آئی تو اس کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد فریدہ بھی آ گئیں۔ ان دونوں نے ساتھ لنچ کیا تھا۔ لنچ کے دوران انہوں نے اس سے اس کے ٹیسٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کی ٹیسٹ کی جیسی تیاری تھی ٹیسٹ بھی ویسا ہی ہوا تھا۔ بہت برا۔ مگر اس نے کہا۔

''اچھا ہوا امی۔''

''تم نے رات میں پڑھا تھا؟'' انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ اپنی اور اشعر کی کوئی بات ان سے نہیں چھپاتی تھی۔ اس نے انہیں اپنی رات کی حرکت اور اشعر کی ناراضی بتا ڈالی۔ وہ اشعر کے معاف کر دینے کے باوجود اپنی رات کی حرکت پر اب تک شرمندہ تھی اور فریدہ کو ساری بات اسی شرمندگی لیے انداز میں بتا رہی تھی۔

فریدہ نے اس کی شرمندگی پر اسے فوراً ٹوکا تھا، وہ آخر اتنا شرمندہ ہو کس بات پر رہی ہے؟ میاں بیوی کو برابر کے درجے پر رہنا چاہئے، ایک حاکم، ایک محکوم، یہ کون سا طریقہ ہے۔ وہ ایک فیمینسٹ تھیں، ایک این جی او چلا رہی تھیں، عورتوں کے حقوق کے لیے، انہیں مردوں کے مساوی حقوق دلانے کے لیے عملی کوششیں کرتی تھیں اور جہاں کہیں مرد اور عورت کی حیثیت اور مرتبے کے تعین کا معاملہ آتا پھر چاہے سامنے ان کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، وہ عورت کی طرف کی بات کرتی تھیں۔

اس روز بھی اور اس روز کے بعد بھی باتوں باتوں میں انہوں نے اس کا اور اشعر کا براہ راست نام لیے بغیر اسی طرح کی باتیں کی تھیں۔ کبھی اپنی اور بصیرت حسین کی زندگی کی مثال دیتیں، کبھی اپنی کسی جاننے والی کے حوالے سے کوئی بات بتاتیں۔

وہ اپنی شادی شدہ زندگی کی مثال اسے پیش کرتیں۔ انہوں نے اور اس کے ماموں نے ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار ہوئے بغیر ایک بہت نارمل، بہت خوشگوار شادی شدہ زندگی گزاری تھی وہ اپنی کسی ایسی جاننے والی کا کوئی حوالہ دیتیں جو شوہر کی غلامی کرتی اور اس کی جوتیاں سیدھی کرتی اور شوہر اسے اپنا غلام ہی سمجھا کرتا تھا، برا بھلا کہتیں۔

''سارا قصور ان عورتوں کا ہوتا ہے جو مردوں کو آسمان پر چڑھا کر اپنی عزت نفس کو مار دیتی ہیں، اپنی شناخت ختم کر دیتی ہیں۔ عورت صرف بیوی یا ماں بن کر رہے، اس کے علاوہ اس کا اپنا کوئی تشخص، کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ بھی اہلیت رکھتی ہے وہ بھی خود کو منوانا چاہتی ہے، کیوں شادی کے بعد عورت کو شوہر کے موڈ کے مطابق اس کی پسند ناپسند کو دیکھتے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔''

مختلف موقعوں پر کسی نہ کسی دوسرے فرد پر رکھ کر یہ باتیں دراصل وہ زہر تھا، جو اس کے اندر انڈیلنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ فریدہ حسین اس کے ناپختہ اور سادہ ذہن کی بڑی چالاکی سے برین واشنگ کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

وہ اشعر سے برابری کرنے لگے، بدتمیزی کرنے لگے اس کے لیے فریدہ نے اپنی طرف سے بڑا کامیاب اور اثر انگیز کام کیا تھا۔ وہ ان خیالات کا شکار ہو بھی جاتی اگر اسے اشعر سے ایسی شدید ایسی والہانہ محبت نہ ہوتی۔

مگر اشعر کی محبت کے آگے اپنا، وجود، اپنی پہچان، اپنا تشخص یہ الفاظ بہت خوش نما سہی بہت پہلے ہی اس کی اپنی ذات اس کے لیے سراسر غیر اہم ہو چکی تھی۔

جس ڈیزائنر سے وہ اپنے ملبوسات تیار کرواتی تھیں، وہیں اسے ساتھ لے جاتیں، اس کے بھی لباس وہیں سے تیار کرواتیں۔

جس مشہور میک اپ آرٹسٹ اور ہیر اسٹائلسٹ کے پاس وہ جایا کرتی تھیں وہیں اسے بھی ساتھ لے جاتیں۔

اگر ہیئر اسٹائلسٹ اس سے کہتی کہ وہ اپنے بالوں کو کٹوا لے، تب اسٹائلسٹ کی تائید کرتی وہ بھی اس سے محبت سے یہی بات کہتیں۔

وہ ان کی باتوں میں آ کر اپنے بال کٹوا بھی لیتی اگر اسے یہ یاد نہیں رہتا کہ اس کے یہ لمبے بال اشعر کو کس قدر پسند ہیں، وہ اس کے ان لمبے بالوں کو دیوانہ تھا اور اگر وہ کسی اسٹائلش اور ماڈرن لک کی خاطر ان بالوں کو کٹوا لیتی تو اشعر کو کس قدر دکھ ہوتا۔

بہت بعد میں سمجھ میں آیا تھا کہ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہے گی، اپر کلاس کی آزاد خیال عورتوں کی طرح اپنی مرضی سے ہر کام کرنا شروع کر دے گی، ہمہ وقت کسی ماڈل کی طرح تیار رہنا شروع کر دے گی، اشعر کی پسند کو جاننے کے باوجود اپنے بال کٹوالے گی اور سب سے بڑھ کر اشعر کے ساتھ زبان چلانا شروع کر دے گی، اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے لگے گی تو اشعر اس سب کا کیا مطلب نکالے گا۔ اشعر کے دل میں شک تو پیدا کر ہی چکی تھیں، اب چاہتی تھیں ان کے بیچ جھگڑا ہو، تلخی رہنے لگے، ان کے رشتے میں دراڑ آ جائے۔

ان کے آزادی اور برابری کے نظریات و خیالات کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ بے وقوف، احمق سب کچھ تھی مگر محبت کرنا اور محبت نبھانا بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ بعد میں جب ان کے ان نظریات کا پس منظر اس کی سمجھ میں آیا تو اس نے روتے ہوئے اس بات پر اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر ادا کیا کہ وہ ان کی ان باتوں میں آئی نہیں۔ ورنہ آج جو اس کا دل اور ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا، میرے ساتھ غلط ہوا ہے، زیادتی ہوئی ہے، وہ اطمینان وہ دل کا سکون اور اپنی نگاہوں میں اپنی عزت کیسے رکھ پاتی۔ ایک غلطی کے سوا، اس نے اس عورت کی باتوں میں آ کر کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، ایسا کچھ نہیں کیا تھا جو اسے خود اپنے آپ سے شرمسار و نادم کرنے کا باعث بنتا۔ اس رات کی اپنی وہ غلطی ایسی اس کے دل کو لگی تھی کہ اس نے یونیورسٹی سے گھر آ کر اور خاص طور پر اشعر کے سامنے پڑھنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ وہ دنیا کی ایسی ہر چیز کو ہمیشہ کے لیے ترک کر سکتی تھی، چاہے وہ اسے کتنی ہی محبوب کیوں نہ ہوتی جو اشعر کو ذرا بھی تنگ کرتی۔

وہ یونیورسٹی میں ہے، خضر کے کہنے پر آج یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے کوئی گروپ ممبر نہیں رک رہا، سب گھر جلدی جا رہے ہیں۔ فریدہ کا اسی وقت اس کے موبائل پر فون آتا ہے ڈرائیور اپنے کسی کام سے کہیں گیا ہوا ہے، وہ پتا نہیں کب واپس آئے گا لہٰذا آج وہ یونیورسٹی سے گھر واپس خضر کے ساتھ آ جائے۔ تب موبائل بند کرتے ہوئے اس نے کیا سوچا تھا؟ وہ تو ان سے بات ختم کرنے کے بعد مسکرائی تھی۔ وہ واقعی اس سے بہت محبت کرتی تھیں، انہیں ہر پل اس کی فکر رہا کرتی تھی۔ ان کی محبت اپنی جگہ مگر خضر سے اس کا یہ کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ آج ڈرائیور کی عدم موجودگی کے سبب وہ اسے اس کے گھر ڈراپ کر دے۔ اس کا ارادہ رکشہ یا ٹیکسی سے گھر چلے جانے کا تھا۔ لیکن اسی وقت خضر خود اس کے پاس آ گیا تھا۔

وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس ابھی ابھی فریدہ آنٹی کی کال آئی ہے، وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ خرد کو گھر ڈراپ کر دے۔ تب وہ ممی کی اپنے لیے محبت اور چاہت پر پھولی نہیں سمائی تھی۔ ممی کی محبت پر سرشار وہ خضر کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔ جب کہ خضر کا اسے چھوڑنے آنا ایک سازش کی کڑی تھا تو وہ اسے چھوڑ کر گیٹ سے واپس کس طرح جا سکتا تھا۔ اسے کوئی کتاب چاہیے تھی اور وہ لینے اس کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔ اسے لاؤنج میں بٹھا کر وہ اپنے کمرے سے کتاب لینے چلی گئی تھی۔ ایک دو منٹ میں ہی اس نے اسے کتاب لا کر دے دی تو بجائے صوفے پر سے اٹھنے کے وہ کتاب کے اوراق پلٹتا اس سے کسی اسائنمنٹ کے متعلق پوچھنے لگا تھا۔ اسی وقت دوسرے کمرے میں فون کی بیل

بجی تھی۔ ٹیلی فون کسی ملازمہ نے ریسیو کرلیا تھا۔ اس کال کے آنے کے بعد خضر فوراً ہی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ تب وہ نہیں سمجھی تھی۔ مگر بعد میں سوچا تو لگا تھا خضر صوفے پر بیٹھا جیسے انتظار ہی اس کال کا کر رہا تھا۔ خضر اسی وقت واپس چلا گیا تھا۔ مگر اشعر کی اس روز اس کے پاس کال نہیں آئی تھی۔ روز اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی وہ اسے فون کرتا، اس کی خیریت پوچھتا، اسے اس کا ایسا کرنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ کچھ دیر اس کی کال کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے اسے خود فون کرلیا تھا۔ وہ اپنے انداز سے کسی میٹنگ یا دوسرے کام میں مصروف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں وہ اسے الجھا ہوا لگا تھا، ورنہ فون پر اس کی آواز سنتے ہی جو وہ ہنستے ہوئے کوئی نہ کوئی پرلطف سی بات کرتا آج اس کا وہ انداز نہیں تھا۔ وہ بے تحاشہ سنجیدہ تھا۔ شاید وہ اس وقت کسی پیچیدہ دفتری مسئلے کی وجہ سے الجھن میں تھا، پریشان تھا۔ اس کے مزاج کو سمجھتی تھی پتا تھا وہ اسے کریدے گی بھی تب بھی بات اگر اسے نہیں بتانی ہوگی تو کبھی نہیں بتائے گا۔ اس سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں اس کا موڈ خوشگوار بنانے کے لیے کرنے لگی تھی۔ اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا تھا۔ وہ ندرت کی منگنی میں اشعر کی اجازت سے گئی تھی، وہ ہر جگہ ہی اس کی اجازت سے جایا کرتی تھی، بلکہ اس رات جب اس نے اشعر کو ندرت کی منگنی کے بلاوے کا بتایا، اس سے وہاں جانے کی اجازت لینا چاہی تو وہ اس کے اجازت لینے پر ناراض ہوا تھا۔

”تمہیں کہیں پر بھی جانے آنے کے لیے اس طرح اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری دوست کی انگیج منٹ ہے تمہارے نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے اسے بخوشی اسے وہاں جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ خود اسے اتنی خوشی خوشی وہاں چھوڑنے جا رہا تھا پھر ہوا کیا تھا۔ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈرائیور کی طرح اسے تقریب میں چھوڑنے اور پھر واپس لینے پہنچے، اس نے اسے منع کرنا چاہا تھا اور وہ اس کی تیاریوں کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتا شرارت سے کہہ رہا تھا کہ جتنی خوب صورت وہ آج لگ رہی ہے وہ اسے چھوڑنے اور لینے کے لیے گاڑی کے چار چکر لگا تا کیا، سارا وقت ندرت کے گھر کے باہر کھڑا ہو کر اس کا کئی گھنٹوں تک انتظار بھی کر سکتا ہے وہ اس روز اس کی کتنی تعریفیں کر رہا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھا اسے تیار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آج اپنی شادی اور ولیمہ کے دن سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے اوپر پرفیوم اسپرے کیا تھا، آہستہ سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی کہ ان کی شادی کو ایک سال ہو چکا ہے تو کیا ہوا، آج وہ اتنی حسین لگ رہی ہے کہ وہ آج اس کے ساتھ کسی نئے نئے شادی شدہ، رومینٹک کپل کی طرح پوری رات جاگنا چاہے گا۔ وہ راستے بھر اسی طرح کی باتیں کرتا رہا تھا۔

اس نے راستے میں اسے پھولوں کے کنگن خرید کر اپنے ہاتھوں سے پہنائے تھے، اور اس روز وہ آخری بار بجی تھی، آخری بار اشعر نے اسے سراہا تھا، آخری بار کوئی پیار بھری سرگوشی کی تھی، آخری بار اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

اس روز کے بعد اس کی زندگی ایسی اجڑی تھی کہ پھر زندگی میں وہ کبھی بجی نہیں تھی، خود کو سنوارا نہیں تھا۔ جس کے لیے خود کو سجاتی اور

سنوارتی تھی اس نے اس روز کے بعد سے اسے اپنے دل سے نکال کر باہر پھینک دیا تھا، اس روز کے بعد کبھی کوئی زیور خرد احسان کے جسم پر نہیں سجا تھا، کبھی زرق برق لباس اس نے نہیں پہنا تھا، میک اپ کی کسی چیز کو نہیں چھوا تھا، اپنے لمبے بالوں کو جو اشعر کو بہت زیادہ پسند تھے، کبھی دوبارہ نہیں کھولا تھا۔ وہ دن خرد احسان اور اشعر حسین کی خوشگوار اور محبت بھری شادی شدہ زندگی کا آخری دن تھا۔

وہ اس سے رخصت ہو کر خوش خوش دوستوں کے پاس پہنچی تھی۔ سامعہ اسے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی کہ خضر نے اس کے انتظار میں ان لوگوں کو باہر روک کر رکھا ہوا تھا اور خضر یہ بتا رہا تھا کہ اسے اکٹھے ہونے کا انتظار اس لیے تھا کہ آج اس کے پاس سب کو سنانے کے لیے دو، دو خوش خبریاں ہیں۔ دو دوسرے سرپرائز ہیں۔ وہ یہ دونوں خوش خبریاں سب کو ایک ہی وقت میں دینا چاہتا تھا۔ پہلی خوش خبری یہ کہ اس کا ڈلاس یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوگیا ہے اور دوسری یہ کہ اس کے والد آخر کار مہرین کے گھر رشتہ لے جانے کے لیے نہ صرف یہ کہ تیار ہوگئے ہیں بلکہ وہاں رشتہ لے بھی گئے ہیں۔ ابھی مہرین کے گھر والوں نے ہاں نہیں کہی مگر اس کے لیے تو یہی خوشی بہت بڑی خوشی ہے کہ اس کے والدین اس کا رشتہ مہرین کے گھر لے تو گئے۔ امریکہ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے جانا اور اپنی من پسند لڑکی کے مل جانے کی امید پیدا ہو جانا۔ یہ دونوں خوشیاں خضر عالم کے لیے بہت زیادہ بڑی خوشیاں تھیں۔

وہ سب لوگ ان ہی دو باتوں کو آپس میں ڈسکس کرتے ندرت کی منگنی کے فنکشن کو بھرپور انداز میں انجوائے کر رہے تھے۔ وہ بھی وہاں بہت انجوائے کر رہی تھی مگر جب کھانا لگنے لگا تو تکے، کباب اور بھنے گوشت کی خوشبو سے اس کا جی متلانے لگا۔ کھانا کھانا تو دور اسے تو اس خوشبو ہی سے متلی سی ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

آج دوپہر میں بھی اسے کھانے کی رغبت نہیں ہوئی تھی اور باقاعدہ لنچ کی جگہ شام کے وقت اس نے چائے کے ساتھ نمکین بسکٹ لے لیے تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ وہ رات میں مکمل نیند لے کر صبح اٹھتی تو بجائے فریش اٹھنے کے اس پر تھکاوٹ طاری ہوتی، صبح صبح خالی پیٹ ہی متلی سی محسوس ہوتی، طبیعت پر بوجھل پن اور کسلمندی چھائی رہتی۔ اس کے ایگزامز شروع ہو رہے تھے اور اس کی بہت ساری تیاری رہتی تھی وہ اپنی تھکاوٹ، کسلمندی، طبیعت کے بوجھل پن، بھوک کم لگنے اور اپنی ایسی ہر تبدیلی کو ایگزیمز کی ٹینشن کے ساتھ جوڑ رہی تھی، مگر اس وقت بھنے اور گرلڈ گوشت کی خوشبو سے اس کا جی متلایا تو اس کے دماغ میں ایک دوسری سوچ آئی۔ یہ ایگزیمز کی ٹینشن تھی یا کچھ اور؟ اس کے لب آپ ہی آپ بے اختیار مسکرائے، واقعی وہ احمق تھی جو ایسی کوئی بات ابھی تک سوچ نہیں پائی تھی۔

وہ سوفٹ ڈرنک کی بوتل ہاتھ میں لے کر قصداً لان کے اس کونے میں جہاں کھانے کی خوشبو اسے کم سے کم آئے وہاں بیٹھی اپنی حماقتوں پر خود کو برا بھلا بھی کہہ رہی تھی اور اس نئے نئے سے احساس کو پا کر خوش بھی ہو رہی تھی۔

وہ کھانا کیوں نہیں کھا رہی، سامعہ نے اس سے آ کر پوچھا تھا۔ اب وہ حماد اور خضر کے سامنے اسے کیا بتاتی، لہٰذا مسکرا کر بھوک نہ لگنے کا جواز پیش کر دیا تھا۔ اس کے اور اشعر کے درمیان طے ہوا تھا کہ جیسے ہی کھانا شروع ہوگا وہ اسے کال کر دے گی۔ بجائے کال کے اس نے اسے میسج کیا۔ میسج ٹائپ کرتے اس کے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''جلدی سے آجائیں، میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

ابھی اسے اشعر کو میسج کیے چند سیکنڈز ہی ہوئے تھے کہ حماد جو باہر اپنی گاڑی سے کچھ لانے گیا تھا اس نے اسے آکر بتایا کہ اس کی گاڑی باہر کھڑی ہے۔ وہ بوتل واپس میز پر رکھ کر فوراً اٹھ گئی تھی۔ شاید اشعر اس کے میسج کرنے سے کافی پہلے ہی اسے لینے گھر سے نکل چکا تھا۔ اس وقت اشعر کے پاس جانے کی اسے اتنی زیادہ ایکسائمنٹ ہو رہی تھی کہ وہ ندرت کے روکنے کے باوجود بالکل نہیں رکی تھی۔ اسے اشعر کے پاس فوراً پہنچنے کی بہت جلدی تھی جو احساس ابھی ابھی اس نے پایا تھا وہ اسے اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو آج پہلے ہی سے اتنے خوشگوار اور رومینٹک موڈ میں تھا یہ بات سن کر تو وہ پتا نہیں کس طرح سے خوشی کا اظہار کرتا۔

وہ باہر نکلی تو گاڑی میں اشعر کی جگہ ڈرائیور کو دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی۔ پھر وہ اسے لینے کیوں آیا۔ وہ سب خیریت تو تھی۔ کچھ پریشان سا ہوتے اس نے ڈرائیور سے اشعر کا پوچھا۔ وہ تو کہہ رہا تھا اسے اشعر نے کہا تھا وہ اسے لینے چلا جائے۔ وہ اشعر کی طبیعت کی طرف سے فکرمند ہوتی مگر واپس پہنچی تھی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ فریدہ اپنے کمرے میں سونے جاچکی تھیں اور اشعر بھی شاید کمرے میں ہی تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو تمام لائٹس آف کیے وہ سو رہا تھا۔ اس کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی، اسے آج ساری رات جگائے رکھنے کی پیار بھری دھمکیاں دیتا وہ خود کس طرح اتنی جلدی سو گیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی، جھک کر اسے دیکھا، اس کی پیشانی آہستگی سے چھوئی، وہ بظاہر سوتا ہوا لگ رہا تھا مگر جب وہ اس کی طرف جھکی، اسے نزدیک سے دیکھا تو ایک شک سا ہوا جیسے وہ سو نہیں رہا، وہ جاگ رہا ہے۔ وہ بہت چوکس نیند سوتا تھا، اگر وہ واقعی سو رہا ہوتا تو اس کے ہاتھ لگاتے ہی اس کی آنکھ چاہے نہ بھی کھلتی پر وہ تھوڑا سا تو ہلتا، اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش تو ہوتی، وہ گہری نیند کے ہی عالم میں غنودگی ہی کی کیفیت میں ایک پل کے لیے تو آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتا، مگر اب تو وہ بالکل ساکت لیٹا رہا تھا۔

وہ لباس تبدیل کر کے خاموشی سے بیڈ کے دوسرے کونے پر آکر لیٹ گئی تھی۔ اس نے کروٹ اشعر کی طرف لی ہوئی تھی اور وہ بغور اسی کو دیکھ رہی تھی۔ جو ایک خوشی اسے دستک دیتی محسوس ہو رہی تھی وہ اسے بتانا چاہتی تھی، اس کے شک کو کنفرم کرنے کے لیے وہ اسے کل ہی ڈاکٹر کے پاس لے چلے وہ آج رات ہی اس کے ساتھ کل ڈاکٹر کے پاس جانے کا پروگرام طے کر لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے جاگا ہوا لگ رہا تھا مگر وہ خود کو بار بار یقین دلا رہی تھی کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ اشعر کے لیے کتنی زیادہ اہم تھی، وہ جانتی تھی۔ اس کی اشعر کے موبائل پر نظر پڑی جو اس وقت ہمیشہ کی طرح اشعر کے پاس والی بیڈ سائڈ ٹیبل پر نہیں بلکہ رائٹنگ ٹیبل پر پڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ایک دم بیڈ پر سے اٹھی۔ رائٹنگ ٹیبل پر جا کر اس نے موبائل کو دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اشعر کا موبائل آف تھا۔ اس نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیا، اسے آن کیا۔ وہ اس کے Inbox میں اپنا کچھ دیر پہلے بھیجا ہوا میسج دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے میسج میں اسے سرپرائز دینے کی بات کی تھی۔ اور اس نے اس کے میسج کو اہمیت دیے بغیر موبائل آف کر کے سو جانے کو ترجیح دی تھی؟ موبائل آن کیے محض ایک یا دو سیکنڈز ہی ہوئے ہوں گے جب اس نے موبائل کی اسکرین پر موبائل پر کسی پیغام کے وصول کرنے کی اطلاعی گھنٹی سنی۔ جس الجھی کیفیت میں وہ گھری تھی اس میں گھرے اس نے اس آنے والے میسج کو کھولنا چاہا، اس کا کچھ دیر قبل بھیجا Message، اشعر کے موبائل کے آن ہوتے ہی اسے اب پہنچا تھا۔ اور وہ سمجھ

رہی تھی کہ وہ اس کا میسج پڑھ لینے کے بعد موبائل آف کر کے سو گیا ہے، جب کہ اس نے تو اس کے کال یا Message کرنے کا انتظار کیے بغیر ہی نجانے کب سے موبائل آف کر کے میز پر ڈالا ہوا تھا۔ آخر کیوں؟ وہ بری طرح پریشان، بری طرح مضطرب تھی۔ اشعر کو کیا ہوا تھا؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ موبائل آف کر کے کبھی نہیں رکھتا تھا، تو ایسے وقت میں جب وہ گھر سے باہر کہیں گئی ہوئی تھی اور اسے بلانے کے لیے اسے اس کے موبائل ہی پر اس سے رابطہ کرنا تھا وہ اسے آف کیسے کر سکتا تھا؟ وہ پوری رات جاگتی رہی۔

صبح ہوتے کہیں جا کر اس کی آنکھ لگی تھی۔ وہ ایکسرسائز کے لیے ٹریک سوٹ پہنے کمرے سے نکل رہا تھا، جب سوئی جاگی کیفیت میں اس نے اسے کمرے سے نکلتے دیکھا، ایک تو پوری رات جاگتی رہی تھی اس کا بھی طبیعت پر اثر تھا اور پچھلے کئی دنوں کی طرح صبح اٹھتے ہی طاری ہونے والی تھکاوٹ، متلی کی سی کیفیت سر گھومتا اور چکر آتے محسوس ہوئے تو وہ فوراً اپنے اندر اتنی قوت پیدا نہ کر پائی کہ بیڈ پر سے کھڑی ہو سکے، اس کے پیچھے کمرے سے باہر جا سکے، اپنی اس کیفیت سے بستر پر لیٹ کر چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے وہ اشعر کے لوٹنے کا لیٹے لیٹے ہی انتظار کرنے لگی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے اس کی پھر آنکھ لگ گئی تھی۔ اس بار آنکھ کھلی تو باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ نہا رہا تھا۔ چند منٹ بستر پر لیٹے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت اس کی طبیعت کچھ دیر پہلے کے مقابلے میں بہتر تھی۔ وہ نہا کر تولیے سے بال خشک کرتا باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔ وہ بیڈ پر جاگی ہوئی بیٹھی تھی، وہ اس سے دیکھ کر خوشگوار انداز میں مسکرا رہی تھی۔ مگر وہ اس پر نظر ڈالے بغیر تولیہ کندھوں پر پھیلائے وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس طرح، جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو، وہ اندر ہی اندر بے چین ہوئی تھی، اشعر اسے روز جیسا نہیں لگ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت اس سے کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔ لیکن کیوں؟ آخر وہ کیا تھا؟ وہ اس کے کہے بنا بھی جب اس کی آنکھوں کی محبت اور چاہت سمجھ سکتی تھی تو اس وقت اس کی آنکھوں میں موجود غصہ، ناراضی بے زاری اور اجنبیت اسے کیوں نظر نہیں آئی۔ وہ اس سے برہم تھا، غصے میں تھا، اجنبیت اور لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر کیوں؟ اندر ہی اندر بری طرح الجھتے اور پریشان ہوتے وہ اس کے پاس آ گئی تھی۔ وہ اس سے خوشگوار موڈ میں بات کر رہی تھی اور وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی، ایک آدھ بات کا جواب دیا بھی تھا تو اس کی طرف دیکھے بغیر، یوں جیسے خود پر جبر کر کے خود کو بلوانے پر آمادہ کر رہا ہو۔ وہ اتنا اجنبی، اتنا پرایا، اتنا دور لگ رہا تھا کہ بلاوجہ ہی اس کا دل خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کیا کرے، کس طرح اس کے اس اکھڑے اور خراب موڈ کو ٹھیک کرے۔

اسے لگا کہ اگر اپنے مزاج کے برخلاف وہ تھوڑا سا بولڈ تھوڑا سا رومینٹک اور خود سپردگی کا مظاہرہ کرے گی تو اس کا خراب موڈ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کبھی اس کے بلانے سے پہلے خود اس کے پاس آ جاتی خود کو نچھاور کرنے والا ایک محبوبہ کا سا انداز اختیار کرتی تو اس کی ایسی ہر پیش قدمی اسے ہمیشہ بہت خوش کیا کرتی تھی۔ اسے اپنے وجود کے اندر ایک خوشگوار تبدیلی محسوس ہو رہی ہے، ایسی اچھی، ایسی خوشی کی

بات وہ اس انتہائی برے موڈ میں اسے بتا کر خوشی کی اس خبر کی اہمیت کم ہوتی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

ابھی نہیں رات میں جب وہ اچھے موڈ میں ہوگا، ایک رومینٹک سی جگہ وہ کینڈل لائٹ ڈنر کر رہے ہوں گے تب وہ اسے یہ بات بتائے گی، تب وہ اپنی خوشی کا اس طرح پر جوش ہو کر اظہار کرے گا جیسے اظہار کرتا وہ اسے دیکھنا چاہتی ہے۔

''یہ چونچلے ہر وقت اچھے نہیں لگتے ہیں خرد! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے، ایک موقع ہوتا ہے۔''

اس نے بہت زور سے، بڑی نفرت سے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا تھا، اتنی قوت سے، اتنی زور سے کہ ایک سیکنڈ کے لیے اس کا پورا سر گھوم گیا تھا وہ حیرت سے، بے یقینی سے، صدمے سے اسے دیکھ رہی تھی، جو ابھی اس نے کیا اس پر دل کو بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہر وقت کا یہ بچپنا اور تھرڈ کلاس رومینٹک حرکتیں اچھی نہیں لگتی ہیں خرد! شوہر کا کس وقت کیسا موڈ ہے، بیوی میں اتنا سینس ہونا چاہئے کہ اس کے موڈ کو سمجھ سکے۔'' اسے لگا جیسے اشعر نے اس کے منہ پر کھینچ کر ایک تھپڑ مارا ہے، اسے کوئی بہت بری گالی دی ہے۔ ذلت اور بے عزتی کا ایسا احساس کہ وہ سن سی جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی بیٹھی رہ گئی۔ وہ کمرے سے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ کیا محسوس کر رہی تھی اسے نہیں پتا تھا، بس ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرے جا رہے تھے۔ اپنا آپ اتنا ہلکا اتنا بے وقوف لگ رہا تھا کہ اس کا دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اس نے اسے کبھی سخت اور غصیلی نگاہوں تک سے نہیں دیکھا تھا اور آج بغیر کسی غلطی، بغیر کسی قصور کے وہ اس کی اس بری طرح انسلٹ کر کے گیا تھا کہ وہ ذلت اور دکھ زیادہ محسوس کر رہی تھی یا بے یقینی زیادہ تھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ بیڈ پر اوندھی زار و قطار رو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بجا تو جلدی سے وہ اٹھ کر بیٹھی ہتھیلیوں اور دوپٹے سے رگڑ رگڑ کر چہرے کو جلدی جلدی صاف کیا، آواز کو بمشکل نارمل بنا کر آنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی آنسوؤں کے نشان تھے، گیلا پن تھا اور لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ اندر آنے والی ہستی فریدہ تھیں۔ وہ بری طرح گھبرا کر فوراً اٹھی تھی، ان کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں بدقت مسکرائی تھی مسکرانے کی اس کوشش میں وہ ناکام تھی۔ مگر وہ پہلے ہی سے کسی دوسری بات پر کچھ پریشان معلوم ہو رہی تھیں، اس لیے لگ رہا تھا کہ انہوں نے اس کے روئے ہوئے چہرے اور بھرائی آواز کو محسوس نہیں کیا۔ انہوں نے آتے ہی تشویش سے اس سے اشعر کے متعلق پوچھا تھا۔

''اشعر کو کیا ہوا خرد! ناشتا کیے بغیر چلا گیا۔ موڈ بھی کچھ اکھڑا اکھڑا لگ رہا تھا۔ تم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی؟''

لیکن جو سوال وہ ممی سے جا کر کرتی وہ وہی سوال تشویش اور پریشانی سے اس کے پاس آ کر کر رہی تھیں کہ کل اس کے جانے کے بعد اشعر کا موڈ جس بھی بات پر خراب ہوا تھا وہ اس بات سے اس کی طرح لاعلم ہیں۔

وہ انہیں کیا بتاتی یہ تو وہ خود نہیں جانتی تھی تو ان سے کیا کہتی سوائے ایک جھوٹی اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لانے کی کوشش

کر کے یہ کہنے کی کہ۔

''ان کی آنکھ دیر سے کھلی تھی، وہ ایک میٹنگ کے لیے لیٹ ہو گئے ہیں، اسی بات پر ذرا موڈ آف ہے۔آپ فکر مت کریں، آفس جا کر غصہ اترے گا تو ناشتہ وہیں کر لیں گے۔''

فریدہ اس جواب پر مطمئن ہو کر کمرے سے فوراً ہی چلی گئی تھیں اگر وہ ایک آدھ سیکنڈ مزید ٹھہرتیں تو وہ ان ہی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔

ان کے کمرے سے...... جاتے ہی اس کے بڑی مشکلوں سے روکے آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔وہ روتے روتے پھر بستر پر لیٹ گئی تھی۔اب وہ ایک ٹک فون کو دیکھ رہی تھی۔فون کی یہ بیل شاید اب بجے گی، شاید اب، شاید اب۔

''سوری خرد! میں نے تمہارے ساتھ روڈلی بی ہیو کیا۔یار! دراصل اس وقت میرا موڈ فلاں شخص سے، فلاں بات پر خراب تھا۔'' وہ اسے اتنی اچھی طرح سمجھتا ہے، اسے پتا ہے وہ کتنی حساس ہے، کتنے چھوٹے دل کی ہے، وہ اس کے بدصورت رویوں کی عادی نہیں، وہ جانتا ہوگا اور بس ابھی کچھ ہی دیر میں اس کا فون آنے والا ہے۔

وہ صبح سے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔فریدہ آج صبح سے گھر پر نہیں تھیں۔وہ آج پورا دن کسی ورک شاپ میں بہت بزی رہی تھیں۔فریدہ کے گھر دیر سے آنے کی وجہ تھی، پر اشعر، وہ اب تک گھر کیوں نہیں آیا تھا؟ وہ کہاں تھا؟ وہ پورا دن اس کے فون کا انتظار کرتی رہی تھی، یک دم ہی اسے اس کی دوسری طرح سے فکر لاحق ہوئی تھی۔وہ خیریت سے تو تھا۔وہ اس کے موبائل پر کال ملانے لگی تھی۔اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔اس کے کل رات اور آج صبح کے تمام انداز کو ذہن میں رکھتے ہوئے بالکل واضح نظر آ رہا تھا کہ اس نے موبائل جان بوجھ کر آف کر رکھا ہے۔

اپنا قصور ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ تھک چکی تھی۔وہ اس سے ناراض ہے مگر کس بات پر؟ بہت سوچنے کے بعد اسے واحد بات صرف یہی سمجھ آ رہی تھی کہ کل رات اسے دیر ہو گئی تھی۔وہ بہت رومینٹک موڈ میں تھا، وہ اس کی واپسی کا شدت سے انتظار کر رہا تھا اور جب اسے واپس آنے میں دیر ہوئی تو اس کا موڈ خراب ہو گیا، وہ اس سے ناراض ہو گیا اسے غصہ آ گیا۔وہ بہت بے قراری ٹیرس پر کھڑی تھی۔اسے بہت نقاہت ہو رہی تھی، پورے دن بھوکے پیاسے رہنے اور مسلسل روتے رہنے سے اس کی طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی۔اسے مسلسل کھڑے رہنے میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی، مگر وہ ٹیرس پر کھڑی رہی۔

آخر بارہ بجے کے قریب اس کی گاڑی گیٹ پر آ کر رکتی نظر آ ہی گئی تھی وہ گاڑی اندر لے آیا، وہ گاڑی سے باہر اترا وہ اسے وہاں کھڑی دیکھتی رہی۔وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو تھکے تھکے قدم اٹھاتی وہ کمرے میں آ گئی۔ہمیشہ کی طرح بہت ہینڈسم، بہت باوقار اس کا وہ محبوب شوہر کمرے میں آیا تو اس کے چہرے پر نہ کوئی پچھتاوا تھا نہ افسوس، نہ دکھ۔وہاں صبح ہی کی طرح اس کے لیے صرف اور صرف سرد مہری، بے گانگی اور لاتعلقی تھی۔چند سیکنڈز وہ بالکل خاموش رہی۔وہ صبح اس کے ساتھ کیا کر کے گیا تھا اسے یاد تھا اس کی انا اسے بات کرنے

میں پہل کرنے سے روک رہی تھی۔

اس کی وضاحت اسے کرنا چاہیے تھی، معذرت نہ بھی سہی لیکن بات کرنے میں پہل اسے کرنی چاہیے تھی۔ مگر اس کی محبت اس کی انا پر حاوی تھی۔ وہ بے وجہ اس سے ناراض ہے تو کیا ہوا، محبت میں یہ نہیں دیکھا جاتا، محبت میں تو بس اپنے محبوب کو فوراً منا لیا جاتا ہے چاہے اپنی غلطی ہو یا نہیں۔ اس کے چہرے پر صبح کی طرح غصہ اور برہمی تو نہیں مگر سرد مہری اور اجنبیت ایسی پھیلی تھی کہ بات کرنے میں پہل کرنے کے لیے اسے اپنے اندر ہمت پیدا کرنا پڑی تھی۔ اس کے پوچھے سوالوں کا اس نے لاتعلقی سے اسے جواب دیا، کھانے کو منع کیا اور باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی وہ اس سے کوئی شکوہ کرنے یا اسے اس کی زیادتی کا احساس دلانے کے لیے نہیں، بلکہ صرف اپنا قصور جاننے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ خود کو ہمت دلا رہی تھی کہ وہ روئے گی نہیں، وہ بس اس سے وجہ پوچھے گی اس کی خفگی کی۔ وہ وجہ بتائے گا اور چاہے اس وجہ کو سننے کے بعد بھی اسے اپنی کوئی غلطی نظر نہیں آئے پھر بھی وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ مگر باتھ روم سے نکل کر بجائے بیڈ کی طرف آنے کے وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے، ایسے جیسے وہ اسے دکھائی ہی نہیں دے رہی ہے، وہ اس سے بات کرنے کے لیے اس کی منتظر بیٹھی ہے اسے یہ نظر ہی نہیں آ رہا ہے، وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اسے اپنے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کا شکار لگنے لگے تھے۔ وہ اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا، اس کے باوجود وہ اسٹڈی میں اس کے پاس اور اپنا قصور پوچھا تھا۔ چاہت سے، پیار سے، التجائیہ انداز میں۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سرد اور بے تاثر لہجے میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کا سرد، اجنبی انداز اس کے پورے جسم میں خوف سے بھری ایک سرد لہر دوڑا رہا تھا۔

''مجھے میرا کام کرنے دو۔ مجھے نیند آئے گی تو کمرے میں آ جاؤں گا اور اب پلیز یہاں کھڑے ہو کر یہ مظلومانہ سے ڈائیلاگز بول کر میرا وقت مت ضائع کرو، میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔''

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر اسٹڈی سے باہر نہیں نکالا تھا مگر اس کا لہجہ ایسا برفیلا، ایسا سرد تھا کہ گھسیٹ کر اسٹڈی سے باہر نکالا جانا اتنا اذیت ناک نہ ہوتا جتنا یہ لب و لہجہ۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا اور چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ اشعر کا کون سا روپ تھا۔

وہ اس کے وجود سے بے زار تھا۔ وہ واپس کمرے میں آ گئی اپنا وجود جو اس وقت صبح سے بھی زیادہ ہلکا اور بے وقعت لگ رہا تھا اسے اس نے بیڈ پر گرا دیا تھا۔ صرف اس کے دل کو نہیں اشعر نے ایک ہی دن میں اس کی روح تک کو زخمی کر ڈالا تھا، کچل ڈالا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اس لیے کہ دنیا میں یہی وہ واحد چیز تھی جس پر اسے اختیار تھا۔

''تمہیں پتا ہے خرد! تم بہت اچھی ہو۔ تم سے اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہمیشہ ایسی ہی رہنا خرد۔''

''میں تو ویسی ہی ہوں مگر تم بدل رہے ہو۔''

''تمہیں پتا ہے خرد! تم میرے لیے کتنی خاص ہو، کتنی اہم ہو۔''

''اگر تم نے مجھے اپنے دل سے نکال دیا ہے تو پھر تو اب میں کچھ بھی نہیں رہی ہوں، نہ خاص نہ اہم۔'' وہ بے آواز آنسو بہاتی

رہی۔

رات کے آخری پہر وہ کمرے میں آیا تھا، اس پر نظر ڈالے بغیر وہ بیڈ کے بالکل دوسرے کونے پہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کی پشت کو آنسو بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ ہر بات کے باوجود دل میں ایک چھپی آرزو تھی، وہ اسے آواز دے لے، صرف اس کا نام لے لے، وہ ایک پل میں اس کے پاس چلی جائے گی، سب کچھ بھلا کر، سب کچھ فراموش کر کے۔ لیکن اس نے اسے نہیں پکارا تھا، وہ اس کی پشت کو دیکھتی رہی، وہ بازو جو ہر رات اس کے گرد ہوتے تھے آج اس کے قریب کہیں نہیں تھے وہ جاگ رہا تھا وہ جانتی تھی۔ اپنے آنسوؤں پر اسے اس پل کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی کروٹ دوسری طرف کر لی تھی۔ اس نے اپنے گلے میں پڑا لاکٹ کھول رکھا تھا، وہ اس میں موجود اس کی ہنستی مسکراتی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ بالکل خاموشی سے آنسو بہاتے، کوئی آواز پیدا نہ کرتے بھی یہ جانتی تھی کہ وہ اس کے رونے کو محسوس کر رہا ہے، وہ جاگا ہوا ہے۔

''میری نیند خراب ہوتی ہے یا اچھی۔ آئندہ رات میں آپ کو رونا ہو یا ہنسنا ہو، سونا ہو یا جاگنا ہو آپ کمرے سے اٹھ کر کہیں نہیں جائیں گی۔''

وہ اپنے چہرے پر اس کی نرم سی انگلیوں کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ اس کے آنسو صاف کر کے اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا، اور اس نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ اس سے شادی کے بعد وہ پہلی رات تھی جب اس شخص کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ بظاہر کھردرے سے لہجے میں اسے مخاطب کرتے وہ اس کے آنسو کتنے پیار سے صاف کر رہا تھا، وہ اس کے کھردرے لہجے کو نہیں اس کی نرم انگلیوں کے لمس کو محسوس کر رہی تھی۔

اسے یاد تھا وہ پہلی رات تھی جب اشعر کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور شاید اس کی محبت اشعر کے دل میں۔ اس رات پہلی مرتبہ وہ اپنے دل کی خوشی کے ساتھ اس کے قریب گئی تھی۔ صرف اتنا چھوٹا سا یہ احساس پا لینا کہ وہ اسے روتا دیکھنا نہیں چاہتا، اسے اس کی محبت میں مبتلا کروا گیا تھا۔

آج وہ انگلیاں اس کے آنسو صاف نہیں کر رہی تھیں، وہ ہاتھ پیار سے اس کے گرد رکھے نہیں گئے تھے، اس کے دل میں آج بھی اس کی ویسی ہی محبت تھی مگر شاید اس کے دل میں اب خرد احسان کی ویسی محبت نہیں رہی۔

''میری محبت کو اپنے دل سے کبھی مت نکالنا اشعر! اگر تم نے مجھے اپنے دل سے نکال دیا تو میں زندہ کس طرح رہوں گی۔ تمہارے دل کے سوا میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔''

صبح ہو چکی تھی۔ وہ ساری رات اس سے رخ موڑے بستر پر لیٹا رہا تھا، وہ صبح ہونے پر اس سے رخ موڑے ہی بستر پر سے اٹھ رہا تھا۔

''خرد ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا، ہمیشہ میری ایسی ہی پروا کرنا، میری زندگی کی ہر صبح یونہی ہو، میں آنکھیں کھولتے سب سے

پہلے تمہیں دیکھوں، تمہیں اپنے قریب پاؤں۔''

اس کی زندگی کی اس نئی صبح میں وہ اس کے قریب تھی مگر وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا، وہ بالکل خاموش بیٹھی اسے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔اس کے شوہر نے کل اسے بتایا تھا، وہ اچھی بیوی نہیں، اسے اس کے موڈز کو سمجھنا نہیں آتا، وہ کوشش کر رہی تھی اس وقت اچھی بیوی بن سکے، وجہ جو بھی تھی مگر اس کے شوہر کا موڈ بتا رہا تھا کہ وہ اس سے حد درجہ بے زار اور تنگ آیا ہوا ہے۔وہ اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا، وہ اس کی آواز نہیں سننا چاہتا اپنی شکل کہیں گم کرنا اس کے اختیار میں نہیں تو کم از کم وہ اسے اپنی آواز سے تو چھٹکارا دے سکتی ہے۔

وہ اس پر نظر ڈالے اور اسے خدا حافظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔وہ پورا دن پوری رات رو رو کر تھک چکی تھی اسے اب رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔وہ نڈھال سے انداز میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور پرسوں رات تک اسے یہ یقین تھا وہ اسے اپنی طبیعت کے بارے میں بتائے گی اور وہ اسے لے کر اسی وقت ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔

ایک دکھ سے بھری ہنسی اس کے لبوں پر آ ئی تھی۔وہ اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں، وہ تین دن سے کنگھے کو نہ چھوئے اپنے بالوں کو برش کرنا چاہتی تھی، وہ تین دنوں سے پہنا ہوا شکن آلود لباس تبدیل کرنا چاہتی تھی۔

اس سے بہت محبت کرنے والے اس کے شوہر کو تو اس کی کوئی حالت نظر نہیں آ رہی تھی۔وہ تین دنوں سے بھوکی پیاسی اپنا قصور ڈھونڈتی پھر رہی ہے وہ تو نہیں مگر باقی سب لوگ تو آنکھیں رکھتے ہیں گھر پر فریدہ ہیں، وہ اسے اس طرح اس اجڑے حال میں دیکھ کر کیا سوچیں گے اس نے منہ ہاتھ دھو کر الجھے بکھرے بالوں کو اوپر اوپر سے برش کر کے کلپ میں جکڑا، اس کے بعد الماری سے ایک دوسرا لباس نکالا، مگر لباس تبدیل کرنے کا اس کا بالکل دل نہ چاہا تھا۔

فریدہ اپنے آفس جا چکی تھیں، اس نے نور افزا سے اپنے لیے کمرے میں ناشتہ منگوایا۔وہ اس کے لیے ٹرے میں سجا کر بہت اچھا سا ناشتہ لے آئی تھی۔مگر گھر کے تمام ملازمین میں نور افزا اس کے پر خلوص اور نرم انداز کے سبب اسے سب سے زیادہ پسند کرتی تھی وہ اس گھر کی سب سے پرانی ملازمہ تھی۔

اس نے شکریہ کہہ کر اس ناشتے کی تعریف کی تو وہ مسکرا دی۔نور افزاء کے کمرے سے چلے جانے کے بعد اس نے ناشتے کی طرف دیکھا تھا۔سوجی میدے کا پراٹھا اس کا فیوریٹ اور ساتھ میں ہری مرچ اور پیاز والا پاکستانی اسٹائل کا اس کا پسندیدہ آملیٹ، اس نے پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑا، اسے آملیٹ کی پلیٹ کی طرف بڑھایا، آملیٹ پراٹھے پر رکھ کر اس نے نوالہ بنایا، نوالہ منہ کی طرف لے کر گئی، اس کی نظر اپنے برابر رکھے بالکل خاموش ٹیلی فون پر پڑی۔وہ بھوکی ہے تو ہوا کرے، وہ بیمار ہے تو ہوا کرے، وہ مر رہی ہے تو مرا کرے۔نوالہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ناشتے کی ٹرے اپنے سامنے سے بہت دور ہٹا کر وہ بیڈ پر گر کر رو رہی تھی۔یہ بدترین خود ترسی تھی، یہ بدترین خود اذیتی تھی۔وہ سب کچھ جانتی تھی سمجھتی تھی، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی۔جب محبت بہت ہوتی ہے تو پھر امیدیں بھی

بہت ہوتی ہیں۔ ٹیلی فون کو ایک ٹک تکتے وہ بستر پر لیٹ گئی تھی۔

لنچ پر فریدہ گھر پر تھیں۔ وہ کھانا ٹھیک سے کیوں نہیں کھا رہی، اس سے پوچھ رہی تھیں، جو پلیٹ میں چمچہ گھماتی کچھ بھی نہیں کھا رہی تھی۔ اس کا جی متلا رہا ہے اسے کھانے کی خواہش نہیں ہو رہی، اس نے اپنے نہ کھانے کی انہیں یہ وجہ بتا کر مطمئن کر دیا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر شاید انہیں کچھ شک ہوا تھا، تب ہی یہ پوچھنے لگی تھیں کہ کیا اس کا اور اشعر کا کوئی جھگڑا ہوا ہے۔

وہ انہیں کچھ نہیں بتا سکی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ دنیا کے کسی بھی فرد چاہے وہ اشعر کی ماں ہی کیوں نہ ہو، اشعر کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی۔

اس کے پاس اپنی حالت کے لیے سب سے مناسب بہانہ ایگزیمز تھے۔ وہ ایگزیمز جو اسے یاد بھی نہیں تھے کہ کب ہونے والے ہیں۔ اس کے موبائل فون کا اسکرین روشن ہوا کالاس فیلو یا شاید کوئی سہیلی پیپرز ہی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ اس نے اس کی کال ریسیو نہیں کی تھی، ایک ضد سی تھی اس کی کہ اشعر اسے کال نہیں کرتا تو وہ دنیا کے کسی بھی دوسرے فرد کی کال ریسیو نہیں کرے گی۔

وہ باقی کا پورا دن بھی اپنے کمرے ہی میں بند رہی تھی۔

وہ آج بھی دیر سے واپس آیا تھا۔ واپس آ کر وہ کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ وہی فاصلہ، وہی ان دیکھی دیوار کھڑی کر کے، وہ اسے بالکل بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس پر ایسی یاسیت، ایسی مردنی سی چھا رہی تھی، وہ اتنے زیادہ ڈپریشن میں تھی کہ اچانک ہی اس کے دل میں مرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اگر ابھی اس وقت وہ یہیں بیٹھے بیٹھے مر جائے تب بھی کیا وہ یونہی اسے نظر انداز کر کے بریف کیس میں اپنی فائلیں رکھتا رہے گا؟ ''یہ کیا پاگل پن ہے۔'' اس نے خود اپنے آپ کو جھڑکا۔ میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا ہو ہی جاتا ہے، اتنی عام سی بات پر اتنا زیادہ ڈپریشن، اتنی زیادہ منفی اور یاسیت بھری سوچیں؟

''کل صبح تو میں دبئی جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آ جاؤں پھر ملتے ہیں۔''

وہ اس کی خوب صورت آواز سن رہی تھی، وہ اشعر حسین کی بیوی جو اس کے لیے بہت اہم تھی، بہت خاص تھی، جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا، اپنے کسی جاننے والے کو اپنے دبئی جانے کا بتا رہا تھا تب آگاہ ہوئی تھی اس بات سے کہ کل صبح وہ ملک سے باہر جا رہا ہے، مگر شاید یہ صرف ایک تاثر تھا جو دیا جا رہا تھا کہ وہ اسے نظر نہیں آ رہی، وہ اسے نظر آ رہی تھی تب ہی تو وہ اسے سہارا دینے فوراً اٹھ کر اس کے پاس آیا تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر نکلنے کے لیے قدم اٹھا رہی تھی، جب اسے بہت زور سے چکر آیا تھا۔ اسے اپنے سامنے ہر چیز گھومتی نظر آ رہی تھی، وہ سہارے کے لیے کسی چیز کو پکڑنا چاہتی تھی مگر اسے دیوار اور دروازہ ہر چیز دو، دو تین تین نظر آ رہی تھیں وہ اس کے پاس آیا تھا، اس نے اسے فوراً تھام لیا تھا اس کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دیا تھا۔ مگر اپنے گرد رکھا وہ ہاتھ اسے اپنے شوہر کا ہاتھ نہیں لگا تھا، وہ ہاتھ انسانیت کے رشتے کے تحت رکھا جانے والا ہاتھ تھا۔ اسے بہت شدت سے رونا آ رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے اوپر سے ہٹا کر خود بیڈ تک آ گئی تھی۔ اسے چکر آ رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ دوبارہ اسے آگے بڑھ کر تھام لے گا۔ باتھ روم کے دروازے سے بیڈ تک کا فاصلہ اس نے یوں طے کیا تھا

کہ جیسے کئی میل چلی ہو۔ وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر گر گئی تھی۔

کئی سیکنڈ وہیں کھڑے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ لائٹس آف کر کے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا تھا، مگر اس نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اسے کیا ہوا ہے یہ تک نہیں پوچھا تھا۔ وہ پوری رات جاگتی رہی تھی۔ صبح ہوگئی تھی۔ وہ تیار ہو رہا تھا۔ اسے اس کا قصور بتائے بغیر اس سے ناراض وہ ملک سے جا رہا تھا۔

''میں جا رہا ہوں، آج ڈاکٹر کو ضرور دکھا آنا'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ اسے اس طرح چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے جانے کی تیاری کرتا نظر آ رہا تھا۔ مگر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یوں چلا جائے گا۔ اسے اس کا قصور بتائے بغیر صرف سزا سنا کر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ واپس آئے گا، جس بھی بات پر روٹھا ہے مگر اس کی محبت اسے کھینچ کر واپس کمرے میں لے آئے گی، وہ الٹے قدموں بھاگتا ہوا واپس کمرے میں آئے گا، اسے اپنے سینے سے لگا لے گا۔

''میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتا، خرد! تم میرے لیے سب سے خاص ہو، تم میرے لیے سب سے اہم ہو۔ میں تم سے ناراض ہو کر تم سے دور ہرگز نہیں جا سکتا۔''

اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی، وہ یک دم ہی بیڈ پر سے اٹھی، اور بغیر دوپٹے بغیر چپل کے کمرے سے باہر بھاگی، وہ ٹیرس پر بھاگتی ہوئی آئی اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کے گھر کا گیٹ چوپٹ کھلا تھا۔ ڈرائیور گاڑی باہر نکال رہا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھا اشعر اپنے گھٹنوں پر بریف کیس رکھے اس میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے مضبوطی سے ریلنگ کو تھام لیا تھا۔

گاڑی ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کا یقین ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوا تھا۔ اس کی محبت، اس کے یقین اور اس کی امیدوں کو اپنے ہی پیروں تلے روندتا وہ اس سے دور، اپنے گھر سے دور، ملک سے دور پتا نہیں کتنے سارے دنوں کے لیے چلا گیا تھا۔ وہ ٹیرس پر کھڑی نجانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

''ممی! میں آپ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آئی مین کسی گائنا کولوجسٹ کے پاس۔''

تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے اس نے فریدہ سے اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔ اشعر کے جانے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اور فریدہ ساتھ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں، جب اس نے اس سے یہ بات کہی۔

''آج ڈاکٹر کو ضرور دکھا آنا'' صبح یہ بات بے تاثر سے انداز میں کہہ گیا تھا۔ مگر اشعر حسین کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو خرد احسان کے نزدیک اس کی کہی ہر بات کی بہت اہمیت تھی۔ اس کے لیے اس کی کہی ہر بات اپنی ذات سے بھی زیادہ اہم تھی۔ اشعر کا لہجہ چاہے جتنا بھی بے تاثر اور جذبات سے عاری رہا ہو مگر اپنے دل میں اسے اس کی فکر تھی۔ وہ اس کی طرف سے فکر لے کر ہی گھر سے گیا ہے۔

فریدہ جو اورنج جوس کے سپ لیتی اخبار کی کسی خبر میں پوری طرح گم تھیں اس کی بات پر بری طرح چونک گئیں، انہوں نے اخبار

سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر ایک دم ہی وہ مسکرانے لگی تھیں۔

''میرے منہ کی بات کہہ دی تم نے۔ میں بھی آج تم سے یہی کہنے والی تھی۔ بہت دنوں سے کہہ تو یہی رہی ہو کہ ایگزیمز کی ٹینشن ہے، کمزوری ہے، بھوک نہیں لگ رہی مگر مجھے آثار کچھ اور ہی نظر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے میں دادی بننے والی ہوں۔''

وہ جملے کے اختتام پر کچھ شوخی سے بولیں۔ وہ جواب میں پھیکی سی ہنسی زبردستی ہنسی۔ اس کی زندگی کی بہت بڑی خوشی تھی مگر وہ خوشی کی طرح مل نہیں رہی تھی۔

''میں ڈاکٹر طیبہ نادر سے آج ہی کا اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ بہت اچھی گائناکولوجسٹ ہیں۔ سمجھو شہر کی چند بہترین گائناکولوجسٹ میں سے ایک ہیں۔''

فریدہ نے جوس کا بھرا ہوا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا، جوس اور اخبار دونوں ان کی توجہ سے محروم ہو چکے تھے۔ اب ان کی توجہ صرف اور صرف اس پر تھی۔ اس نے یاسیت میں ڈوبے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

پھر فریدہ اسے اسی شام ڈاکٹر طیبہ نادر کے کلینک لے بھی گئی تھیں۔ فریدہ بہت خوش بہت پرجوش تھیں۔ جب کہ وہ سب کچھ جیسے ایک مشینی سے انداز میں کر رہی تھی۔ اس کے پریگنسی ٹیسٹ کی رپورٹ Positive آئی تھی وہ تب بھی خوش نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ماں بننے والی ہے، اتنی بڑی خوشی کی خبر بھی اسے خوشی دینے میں ناکام تھی۔ وہ کہاں تھا جس کے لیے یہ بات اتنی ہی اہم ہونا چاہیے تھی جتنی اس کے لیے، وہ کہاں تھا جس کے ساتھ اس خوشی کو وہ شیئر کرتی وہ رپورٹ لے کر فریدہ کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی۔ فریدہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھیں اور وہ ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ فریدہ خوش خبری کی تصدیق ہو جانے کے بعد بے حد خوش تھیں۔ وہ دادی بننے والی ہیں اس بات کی انہیں بے حد خوشی تھی۔

''تم نے اشعر کو بتایا؟'' ایک موڑ کاٹتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں، میں سوچ رہی تھی، پہلے کنفرم ہو جائے پھر انہیں بتاؤں گی۔''

اب وہ انہیں سچ کیا بتاتی کہ ان کے بیٹے نے پچھلے کئی دنوں سے اس سے سرے سے بات کرنا ہی بند کر رکھی ہے اور وہاں جا کر بھی اس نے اسے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ فریدہ کو البتہ دبئی پہنچنے کے اسی روز اس نے کال کر کے انہیں اپنی خیریت بتائی تھی اور اس نے محض اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے انہیں یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اسے بھی فون کر چکا ہے، وہ اس سے فون پر رابطہ نہیں کر رہا تھا مگر فریدہ سے تو اس کا مسلسل رابطہ تھا فریدہ آج ہی یہ خوش خبری دے سکتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کی جانب سے اتنے بدترین رویوں کے مظاہرے کے بعد بھی اس کا دل یہ کیوں چاہ رہا تھا کہ اسے یہ اطلاع وہ خود دے۔ اس خبر کو سن کر خوشی سے بھرا جو والہانہ تاثر اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

''ممی! آپ کی اشعر سے بات ہو تو پلیز ابھی انہیں یہ بات مت بتایئے گا۔ جب وہ واپس آئیں گے تو میں خود۔''

وہ نظریں جھکا کر ذرا جھجکتے ...... ہوئے ان سے کہہ پائی تھی۔

وہ اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر خوب کھل کر ہنسی تھیں۔

''بے فکر رہو۔ میں اسے کچھ نہیں بتا رہی۔ مجھے پتا ہے، یہ بات اپنے شوہر کو خود بتانا کسی بھی بیوی کے لیے کتنا اہم اور خوب صورت عمل ہوتا ہے۔''

وہ ان کی شوخ ہنسی سے مزید کچھ اور اپنے آپ میں سمٹ سی گئی تھی اور اگر خرد احسان اس پل نظریں اٹھا کر فریدہ حسین کے چہرے کی طرف دیکھ لیتی تو ان آنکھوں میں اپنے لیے موجود یہ استہزائیہ تحریر ضرور پڑھ لیتی۔

''بے فکر رہو خرد احسان! یہ بات میں اپنے بیٹے کو ابھی کیا مرتے دم تک پتا نہیں چلنے دوں گی۔ اشعر کے واپس آنے پر اسے خود اپنے پریگننٹ ہونے کی اطلاع دینے کی بات کہہ کر تو میرا آدھا مسئلہ تم خود ہی حل کر رہی ہو۔ تم جیسی رومینٹک ایڈیٹ بہو نے میرا آدھا مسئلہ تو خود بخود ہی حل کر دیا ہے، باقی کا میں خود حل کراوں گی۔ یہ خبر اشعر سے چھپا کر رکھنا تو میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ بات اسے اگر پتا چلنے دوں تو مجھ سے بڑا بے وقوف تو کوئی دنیا میں ہوگا ہی نہیں۔''

☆......☆......☆

اب بات صرف اس کی زندگی کی نہیں تھی، اب ایک دوسری زندگی اس کی زندگی کے ساتھ جڑ گئی تھی۔ اپنے لیے نہ بھی سہی مگر اپنے بچے کے لیے خوراک سمیت اپنی ہر چیز کا اسے بہت زیادہ خیال رکھنا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا تھا، فریدہ نے بتایا تھا اور وہ خود بھی یہ بات سمجھتی تھی کہ پریگنسی کے شروع کے تین مہینے بہت اہم ہوتے ہیں، ان میں ذرا سی بھی بد احتیاطی بچے کی جان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اسے اچھی خوراک لینا چاہیے خوش رہنا چاہیے اپنے آپ کو ہر طرح کی ٹینشن اور دباؤ سے دور کر کے بالکل مطمئن اور ریلیکس رہنا چاہیے۔ سب کچھ سمجھتی تھی مگر کھانے کے لیے لقمہ منہ میں لے کر جاتی تو وہ واپس آنے لگتا تھا۔

فریدہ اس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں، وہ اس کے لیے اس کی پسند کی چیزیں خود بناتیں، اسے اچھی طرح کھانے کو کہتیں اور وہ اپنے بچے کی خاطر خود پر جبر کر کے وہ زبردستی کھانے کی کوشش کرتی تو اسے رونا آنے لگتا، اسے وہ کھانا اتنا بدمزا اتنا برا لگتا کہ پورا کھانا اپنے سامنے سے اٹھا کر پھینک دینے کو جی چاہتا۔ ڈاکٹر نے آئرن، کیلشیم اور دیگر ضروری وٹامز پر مشتمل جو ادویہ اسے تجویز کی تھیں، وہ ان سب کو پابندی سے لے رہی تھی مگر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ خود کو دیکھتی تو آنکھوں کے نیچے پڑے گہرے حلقے، کمزور زرد چہرہ اسے صدیوں کا بیمار بناتا۔

زبردستی لقمے حلق سے اتارنے کی کوشش کرتے ایک بار وہ فریدہ کے سامنے رو پڑی تھی۔ وہ اس کے رونے پر حیران نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا پہلی پہلی بار جب کوئی عورت ماں بننے کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے تو یاسیت، اداسی اس طرح کی کیفیات اکثر اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں اور وہ اسی طرح کی اداسی کا شکار ہے اور وہ اشعر کو بھی مس کر رہی ہے۔

وہ اسے مس کر رہی تھی؟ اسے فریدہ کے جملوں اور اندازوں پر ہنسی بھی آئی اور خود پر ترس بھی۔ وہ انہیں کیسے بتائے کہ اسے دس گئے چھ دن ہو گئے ہیں اور ان تمام دنوں میں اس نے ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا ہے۔ اس کے جانے سے پہلے کے تین دنوں کو شامل کر لے تو آج اشعر کو اس سے بات کیے پورے نو دن ہو چکے ہیں۔ ان تمام دنوں میں سوائے فریدہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانے کے وہ اور کہیں بھی نہیں گئی تھی۔ فریدہ گھر پر ہوتیں تو وہ نیچے اترتی، ورنہ سارا وقت اپنے کمرے میں خود کو ساری دنیا سے کاٹ کر بالکل بند رکھتی۔ وہ امتحان جن میں پوزیشن لینے کی اسے بہت خواہش تھی شروع بھی ہو چکے تھے اور پیپرز دینے کے لیے جانا تو بہت دور کی بات اسے تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھی، وہ کسی ڈگری کے حصول کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ وہ پیپرز کیوں نہیں دے رہی، فریدہ نے اس سے پوچھا تو اسے وہ پیپرز اور پڑھائی یاد آئی تھی۔

اس نے نظریں جھکا کر سادہ سے لہجے میں انہیں یہ جواب دیا کہ اپنے پریگننٹ ہونے کی خوش خبری پانے کے بعد اب فی الحال اس کی ترجیحات بالکل بدل گئی ہیں۔ اس رات فریدہ نے کھانے میں اس کے لیے خاص طور پر اس کی پسند کی مکس سبزیاں بنوائی تھیں۔ ٹیبل پر اور بھی تمام چیزیں اس کی پسند کے مطابق تھیں۔

''اور لو، بس اتنا سا کھایا ہے۔'' خود پر جبر کر کے جتنا اس سے کھایا جا سکا تھا اس نے کھا لیا تھا اب مزید خود پر جبر کرنا یوں لگ رہا تھا کہ جو کھا چکی ہے وہ سب بھی واپس باہر آ جائے گا۔

''بس ممی! اور دل نہیں چاہ رہا۔''

''بہت ستا رہی ہو تم مجھے۔'' انہوں نے اسے ذرا خفگی سے گھورا۔ ''اشعر واپس آ جائے، وہی تمہیں دیکھے گا۔''

اسے ایسا لگا جیسے اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔ وہ اس سے بات کرنے کا روادار نہیں، اس کی آواز سننے کو تیار نہیں، وہ کیا اس کے کوئی نخرے اٹھائے گا۔ اس نے ایک بار فون کر کے اس کی طبیعت بھی نہیں پوچھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ تو جانتا تھا ناں؟ فریدہ کے سامنے اس نے خود پر ضبط کیے رکھا تھا مگر کمرے میں آتے ہی وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

اس کی زندگی میں خوشیاں اور دکھ، ہنسی اور آنسو ہر چیز صرف اور صرف اس شخص سے وابستہ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا تکیہ اپنی طرف کھینچا، اس تکیہ کو اپنے ساتھ لگائے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ ''تمہیں میں یاد نہیں آتی؟ کیا تمہیں میں ایک پل کے لیے بھی یاد نہیں آتی۔''

اس کے پاس رکھا اس کا موبائل یک بارگی بہت زور سے بجا۔ اس نے بے تابی سے موبائل ہاتھ میں لیا، اشعر کا فون تھا، اس نے ایک مائیکرو سیکنڈ کی بھی دیر لگائے بغیر کال ریسیو کی۔

''اشعر۔'' اس کے منہ سے ہیلو نہیں اس کا نام نکلا، اور اس نام کو لیتے ہی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے لگا جیسے اس کے دل کی سچی پکار اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس وقت اسے شدتوں سے یاد کر رہی تھی اور وہ اس کی آواز سن لی گئی تھی۔

''خرد۔'' صرف اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس کا وہی اشعر ہے، وہی جو اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے لبوں سے اپنا نام اتنی محبت سے سن کر اس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا یوں جیسے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بولے۔

''آپ کیسے ہیں؟'' اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس چپ کو توڑنے کے لیے وہ آنسوؤں کو روکتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''تم کیسی ہو'' اس کے سوال کے جواب میں اس نے بے قراری سے سوال کیا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کب واپس آئیں گے؟'' وہ آنسوؤں کو جتنا روکنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی زیادہ بہے چلے جا رہے تھے۔ وہ اس سے اسی لہجے میں بات کر رہا ہے، وہ اس سے اسی انداز میں بات کر رہا ہے یعنی وہ اپنے شوہر کے دل سے نہیں نکلی، وہ اس کے دل میں جہاں رہتی تھی، اسی مقام پر ہی ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے، یہ لہجہ اسی اشعر کا لہجہ ہے، جو اس سے محبت کرتا ہے، اس کی روح جیسے جسم میں واپس آ رہی تھی، اس کا مردہ تن جیسے پھر سے زندہ ہو رہا تھا۔

''میں جلدی بہت جلدی واپس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کر رہی ہو؟''

''میں تمہارے بغیر مر رہی ہوں۔ تم آؤ گے تو میں زندہ رہوں گی۔ تم میری زمین ہو، تم میرا آسمان ہو، تم پاس نہیں ہو تو میں خود کو بھری دنیا میں بالکل تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے ابھی ناراض ہو گئے تھے ایسے پھر کبھی ناراض مت ہونا۔ جیسے ابھی اجنبی بن گئے تھے ایسے پھر کبھی مت اجنبی مت بننا۔''

بہت کچھ تھا جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی مگر وہ اتنی دور تھا وہ اسے اپنے آنسوؤں سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہاں بہت، بہت زیادہ انتظار کر رہی ہوں، بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں۔ پلیز جلدی واپس آ جائیں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔''

اسے اس سے کوئی شکوہ بھی تھا، اس سے یاد نہیں تھا۔

''میں بہت جلدی واپس آؤں گا، مجھے بھی تم بہت یاد آ رہی ہو، مجھے بھی تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔'' وہ اس کے لہجے میں اپنے لیے بہت والہانہ پن بہت بے قراری، بڑی شدتیں محسوس کر رہی تھی۔ یوں جیسے اگر اس پل وہ اس کے سامنے ہوتی تو وہ بھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔

''آپ جب واپس آئیں گے، میں آپ کو ایک بات بتاؤں گی۔'' روتے روتے بولتے اس کا ہاتھ خود بخود اپنے پیٹ پر پڑا تھا وہ جیسے کسی کے ہونے کو محسوس کرنے لگی تھی کسی کی دھڑکنوں کو سننے لگی تھی۔ اشعر کے بغیر یہ خوشی کتنی ادھوری تھی، کتنی نامکمل تھی۔ وہ آنکھوں کے سامنے ہو گا، وہ پاگل ہو گا وہ اس خوشی کو سن کر خوش ہو رہا ہو گا، تب ہی یہ خوشی، اسے خوشی لگ سکے گی۔ وہ اسے کیا بتانا چاہتی ہے، وہ پوچھ رہا تھا اور وہ روتے روتے مسکرا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں ابھی نہیں۔ جب واپس آئیں گے تب۔ فون پر نہیں بتاؤں گی۔''

بڑا دل فریب منظر تھا اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بہت اہم جاننے والی وہ لڑکی اپنی ایک چھوٹی سی، سادہ سی خوشی کو پورا کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہی ایک چھوٹی سی خواہش آنے والے دنوں میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی بن گئی تھی۔

سچ سے بہت پیار کرنے والی وہ لڑکی جانتی نہیں تھی کہ شادی کے بعد جب کوئی عورت ماں بننے والی ہوتی ہے تو اگر اس کا واسطہ گھٹیا ذہنیت کے شیطان صفت لوگوں سے پڑا ہو تو اسے اپنی کوکھ میں پلتے وجود کو اپنے شوہر ہی کا بتانے کے لیے گواہیاں بھی لانا پڑتی ہیں، ثبوت بھی پیش کرنے پڑتے ہیں۔

وہ اسے اسی رات یہ بات بتا دیتی۔ زندگی میں جو کچھ ہوا وہ سب تب بھی ہوتا مگر کم از کم اس کی اولاد کے وجود کو ایک گالی تو نہ بنا دیا جاتا۔ مگر فریدہ حسین کے اس کے متعلق اندازے صحیح تھے۔

اشعر کا فون بند ہو جانے کے بعد بھی وہ موبائل کان سے لگائے ویسی ہی مدہوش سی لیٹی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب بھی اس کے کانوں میں نرم نرم سے لہجے میں محبت بھری سرگوشی کر رہی ہو۔

''خرد! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ تم میرے لیے بہت خاص ہو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا خرد!''

اور یہ بات خرد احسان نے ہمیشہ یاد رکھی تھی مگر انہیں کہنے والا کہہ کر بھول گیا تھا۔ وہ اس پوری رات خوشی سے جاگتی رہی تھی۔ کتنی مختصر سی بات ہوئی تھی۔ اس کی اشعر کے ساتھ۔ مگر وہ چند فقرے کتنے اہم تھے اس کے لیے۔ وہ اس پوری رات ان ہی جملوں کو گھڑی گھڑی دوہراتی رہی تھی۔

اس کی واپسی کا اس رات ہی سے اس نے لمحہ گن گن کر انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ واپس آئے گا، سب سے پہلے وہ اسے ان دونوں کی زندگی کی وہ سب سے بڑی خوشی کی خبر سنائے گی اور اس کے بعد گزرے دنوں کی کسی تلخی کا کوئی ذکر کیے بغیر وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بہت سا روئے گی۔ وہ اس سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہیں کرے گی۔ وہ اس سے فقط اتنا کہے گی وہ اسے یہ بتا دے، اس کے اندر کون سی چیز ہے جو اسے ناپسند ہے اور اس کے مزاج میں، اس کے رویے میں، اس کی باتوں میں، اس کے انداز میں، اس کے ظاہر میں، اس کے باطن میں، جس چیز کو ناپسند کرتا ہے ایسی اپنی ہر عادت، ہر بات کو وہ اسی وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دے گی۔

وہ خود کو سر سے پاؤں تک اس کی پسند کے رنگ میں ڈھال لے گی۔ وہ زندگی میں دوبارہ کبھی ایسا موقع نہیں آنے دے گی۔ جب وہ اس سے یوں خفا ہو جائے، یوں اجنبی ہو جائے۔

''خرد! میں نے اس روز تمہیں بہت غلط باتیں کہی تھیں، تم مجھ سے ناراض ہو نا'' اس نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اسے فون پر نہیں کہہ پائی مگر جب وہ سامنے ہوگا تو اس کے سینے پر سر رکھ کر وہ اس سے یہ ضرور کہے گی۔

''تم سے ناراض! میں کبھی بھی نہیں۔ تم نے جو کچھ بھی کہا، مجھ سے جس بھی بات پر خفا ہوئے تھے تو میں تم سے نہیں، اپنے آپ سے ناراض ہوگئی تھی۔ کہیں نہ کہیں میں تمہاری امیدوں کے خلاف ثابت ہوئی تھی تب ہی تو تم مجھ سے خفا ہوئے تھے۔'' وہ اس سے اتنی محبت کرنے والا شخص یک دم ایسا کس طرح کرسکتا تھا، یقیناً کہیں نہ کہیں غلطی اس کی رہی ہوگی، کہیں نہ کہیں غلطی اسی سے ہوئی ہوگی، جسے وہ خود محسوس نہیں کرسکی ہوگی۔

''خرد! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا خرد!'' وہ پوری رات ان جادوئی اثر رکھنے والے لفظوں کو اپنے گرد گونجتا سنتی رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی من چاہی تھی، وہ صرف اس کے گھر میں نہیں، وہ اس کے دل میں بھی رہتی تھی۔

پورے دس روز بعد اس صبح وہ ناشتے کی میز پر بڑی خوشی سے آ کر بیٹھی تھی۔ ناشتے میں اس کی پسند کی بہت سی چیزیں تھیں اور اسے وہ سب چیزیں بہت اچھی لگ رہی تھیں، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوب سیر ہو کر ناشتہ کرے۔ فریدہ نے اسے جوس کا گلاس دیا، اس نے بخوشی چند گھونٹوں میں اس گلاس کو خالی کر دیا، وہ آملیٹ کھا رہی تھی، وہ ٹوسٹ کے اوپر خود اپنے لیے مکھن لگا رہی تھی۔

''بہت خوش لگ رہی ہو۔'' فریدہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اپنے اور اشعر کے بیچ ہوئی کسی تلخ بات کا ذکر اس نے ان سے نہیں کیا تھا مگر خوشی کی بات وہ انہیں بتا رہی تھی۔

''جی ممی، رات اشعر کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بہت جلدی واپس آ جائیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے انہیں بتایا۔

''تم نے خوش خبری سنا دی ہوگی اسے، اس لیے بھاگا بھاگا جلدی واپس آ رہا ہے۔'' انہوں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''نہیں، ابھی میں نے کوئی بات نہیں بتائی۔ بس وہ خود سے جلدی واپس آ رہے ہیں۔'' اسے اپنی خوشی چھپانا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ ماں بننے جا رہی ہے، اب تو کچھ میچور ہو جائے۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو گھر کا۔ مگر وہ تو ایسی ہی تھی اس کا خوشی اور اس کے دکھ سب آنکھوں سے چھلک جایا کرتا تھا۔

''اچھی بات ہے یہ تو۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں اسے وہاں مزید کتنے دن لگ جائیں گے۔ تم لوگوں کی ویڈنگ اینی ورسری تو یونہی گزر گئی، اب میں سوچ رہی ہوں کچھ لیٹ ہی سہی مگر ایک پارٹی رکھ لی جائے۔ ذرا ہلا گلا کر کے اس موقع کو سیلیبریٹ کیا جائے۔ اشعر آ جائے تو ہم تینوں مل کر پارٹی کہاں رکھنی ہے اور کس کس کو انوائٹ کرنا ہے فائنل کرلیں گے...... اپنے ناشتے کو بھرپور انداز میں انجوائے کرتے ہوئے اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

☆......☆......☆

''آج تم نے آملیٹ بہت مزے کا بنایا ہے۔''

نورافزا ٹیبل پر چائے کی کیتل رکھنے آئی تو وہ اس سے بولی تھی۔ نورافزا اس تعریف پر سادگی سے مسکرا دی، دل میں اس بات پر حیران ہوتے کہ آملیٹ تو اس نے روز ہی کی طرح بنایا ہے۔ پھر وہ روز سے زیادہ مزے کا کس طرح بن گیا۔ وہ کیتل میں سے اپنے کپ میں

چائے ڈالنے لگی تھی، اپنے کپ میں ڈال چکی تو اس نے فریدہ کے کپ میں بھی چائے ڈال دی۔ ان کے کپ میں شکر ملائی اور اپنے میں نہیں ڈالی۔ آج دل چاہ رہا تھا ناشتے کی اس میز پر اس کی موجودگی کا احساس پانے کے لیے وہ اسی کی طرح پھیکی چائے پیے۔ اس پھیکی چائے کے مزے سے گھونٹ لیتے ہوئے وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ وہ اس وقت یہاں نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے ساتھ تھا، اس کی ایک بہت پیاری، نشانی اس کی ایک بہت خاص امانت وہ اپنے وجود میں چھپائے اپنے خون سے سینچ رہی تھی۔

وہ ماں بننے والی ہے، اشعر سے بات ہونے کے بعد زندگی کی اس نئی اور خوشگوار تبدیلی نے اسے پھر سے خوشی دینی شروع کر دی تھی۔ اشعر اسے پہلے سے بھی بہت زیادہ اپنے نزدیک لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں اسے بیٹا چاہیے ہوگا یا بیٹی۔ پتا نہیں اس کی زیادہ خواہش کیا ہوگی۔ اگر ان کے بیٹا ہوا تو وہ اس کے کیا نام رکھیں گے اور بیٹی ہوئی تو اس کا پتا نہیں کیا نام رکھا جائے گا۔ لیکن نام تو ممی رکھیں گی۔ ہاں پوتے یا پوتی کا نام رکھنے کا پہلا حق تو دادی ہی کو ملنا ہے۔ اور اس کا وہ بیٹا یا بیٹی دیکھنے میں کیسا ہوگا، اس کے جیسا؟ اشعر کے جیسا؟ پھیکی چائے کے گھونٹ بڑے مزے میں لیتے اس کی سوچیں پتا نہیں کہاں سے کہاں جا پہنچیں تھیں۔ وہ تو اپنی سوچوں میں یونہی گم ہی رہتی کہ فریدہ کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ اسے کوئی بات بتا رہی تھیں۔

''رات زرینہ کا فون آیا تھا بتا رہی تھی کہ مہرین کے پیرنٹس اپنی فیملی کی کوئی شادی اٹینڈ کرنے کراچی آئے ہوئے ہیں۔ شاید آج کل میں وہ خضر سے ملنے اس کے گھر پر آئیں گے۔''

اس وقت اس کی سوچوں کا محور اشعر، وہ خود اور ان کا ہونے والا بچہ تھا، خضر کے رشتے دار اس کے ممکنہ ساس سسر کی کراچی آمد کے ذکر میں اسے کوئی دلچسپی محسوس ہو نہیں رہی تھی مگر فریدہ کی خاطر مروتاً وہ مکمل توجہ سے ان کی بات سننے لگی۔

جب وہ خضر کو اتنا زیادہ پسند کرتی تھیں اس سے اتنا پیار کرتی تھیں تو اس کا رشتہ طے ہونے کے اس سارے معاملے میں ان کی دلچسپی تو لازمی بات تھی۔ دو چار دن پہلے زرینہ کے گھر آئی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ ویسے تو مہرین کے والدین کو خضر کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں مگر وہ ہاں کہنے سے پہلے ایک بار خضر سے ملنا اور اس کے کراچی میں رہن سہن کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ خضر کو اس کے بچپن سے جانتے تھے۔ اب پچھلے چند سالوں سے وہ یہاں تنہا رہ رہا تھا۔ وہ ڈھائی تین سالوں سے اپنے گھر اور والدین سے دور یہاں اس کی طرح کی زندگی گزار رہا تھا، کس طرح رہتا تھا، اس کے دوست کون لوگ تھے، وہ کس طرح کے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ جیسی باتوں کا وہ خضر سے مل کر اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔ وہ خضر سے مل کر مطمئن ہو جاتے تو یہ رشتہ باضابطہ طور پر طے ہو جانا تھا۔ خضر اور مہرین کی منگنی کر دی جانی تھی۔

''زرینہ بتا رہی تھی خضر بری طرح کونشس ہو رہا ہے اگر انہیں میرا گھر پسند نہیں آیا' اگر انہیں میرے گھر میں کسی چیز کی کمی لگی۔ میں نے زرینہ سے کہا' اس پاگل کو سمجھاؤ وہ تمہارے گھر کو نہیں تمہیں دیکھنے تم سے ملنے آ رہے ہیں۔ انہیں بھی پتا ہے وہ ایک اسٹوڈنٹ کے گھر جا رہے ہیں، جس کا فی الحال کوئی مستقل ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے۔ کون سا وہ کل اپنی بیٹی تم سے بیاہ رہے ہیں۔ اتنا اندازہ تو وہ بھی لگا سکتے ہیں

کہ پڑھائی کے دوران جو لڑکا اپنا لائف اسٹائل اور اسٹینڈرڈ اتنا اچھا Maintain کر کے رکھ سکتا ہے' پڑھائی ختم کرنے کے بعد آئندہ دو' تین سالوں میں وہ خود کو کتنی اچھی طرح اسٹیبلش کر چکا ہوگا۔

وہ مروتاً سر ہلاتے دلچسپی لینے جیسا تاثر فریدہ کو مسلسل دے رہی تھی۔ ناشتے کے بعد فریدہ اپنے آفس چلی گئی تھیں۔ ان کی واپسی شام میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں لان میں بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھیں۔ فریدہ نے تو چائے کے ساتھ صرف ایک بسکٹ ہی لیا تھا جبکہ وہ دو' تین بسکٹس کے ساتھ ایک چکن سینڈوچ بھی کھا چکی تھی۔ آج پورا دن اس نے بستر پر لیٹ کر ٹی وی دیکھنے اور کھانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ گھر پر اور بالکل اکیلے آخر وہ اپنی خوشی اور سیلیبریٹ کرتی بھی کس طرح۔

اشعر سے جلدی آنے کو کہا تھا، دن اور وقت نہیں بتایا تھا کبھی اسے لگتا وہ آج ہی آ جائے گا، کبھی لگتا کل اور کبھی لگتا جلدی جلدی میں بھی اسے وہاں اپنے کام نمٹا کر تو آنا ہوگا، وہ اگلی فلائیٹ سے تو پاکستان نہیں آ سکتا تھا۔ شاید ابھی اسے واپسی میں تین چار دن لگنے تھے۔ وہ مزید یہ تین چار دن اس کے بغیر کس طرح گزارے گی۔ یہ انتظار خوشگوار، خوشیوں سے بھرا تھا، اس لیے اچھا بھی لگ رہا تھا اور دل کو بے چین اور بے قرار بھی بہت زیادہ کر رہا تھا۔ کاش وقت کو پر لگ جائیں۔ یہ تین چار دن ایک پل میں گزر جائیں۔ وہ ایک پل آج کے اس دن اس شام کے وقت میں بیٹھی رہے اور پلکیں جھپکا کر کھولے تو اس دن اور اس وقت میں پہنچ جائے جب وہ گیٹ سے گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وقت کو پر لگ جائیں وراشعر آ جائے۔ فریدہ کے موبائل پر کسی کی کال آئی تھی' وہ اس کال کو سننے لگی تھیں۔

''اچھا تم ہو۔'' دوسری طرف کی آواز سن کر وہ خوشگوار سے انداز میں ہنسی تھیں۔ وہ خضر کی کال تھی' وہ قدرے لاتعلق سے انداز میں چائے کے گھونٹ لیتی فریدہ کی اس کے ساتھ گفتگو سن رہی تھی۔

''دولہا میاں کو دیکھنے ہونے والے ساس سسر آ رہے ہیں' ذرا اچھی طرح تیار ویار ہو جانا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

''میں بھی آ جاؤں۔ کیوں بھئی زرینہ اور اجمل کافی نہیں ہیں کیا مورل سپورٹ کے لیے۔'' انہوں نے خضر کی کسی بات کے جواب میں بلند قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا' اچھا فکر مت کرو۔ نہیں رکھوں گی اپنی کل کی کوئی اور مصروفیت' ہاں خرد سے بھی کہہ دوں گی۔'' چند سیکنڈز اس کی بات خاموشی سے مسکرا کر سنتے انہوں نے قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

''خضر کا فون تھا۔ کل شام چائے پر آ رہے ہیں مہرین کے ممی' ڈیڈی اس کے گھر۔ زرینہ اور اجمل کل لازمی ہوں گے وہاں پر پھر بھی مجھ سے کہہ رہا ہے آپ بھی آئیں۔ امی پاپا یہاں نہیں ہیں، آخر آپ لوگوں کے علاوہ یہاں میرا اور ہے ہی کون۔ میں اکیلے میں مہرین کے ممی' ڈیڈی کے سامنے بہت نروس ہو جاؤں گا۔'' اپنا چائے کا کپ دوبارہ میز پر سے اٹھاتے ہوئے انہوں نے اسے بتایا تھا۔

''لنچ اور ڈنر پر تو ان لوگوں کی اپنی کچھ اور مصروفیت ہے' اس لیے شام کی چائے پر آ رہے ہیں۔ شاید ساڑھے چھ' سات بجے تک

آ ئیں گے۔ تمہیں بھی انوائٹ کیا ہے خضر نے۔'' چائے کے سپ لیتے وہ مزید گویا ہوئی تھیں۔ ''میں کیا کروں گی جا کر۔ آپ چلی جائیے گا ممی۔'' خضر کے ہونے والے ساس' سسر کی اس کی گھر آمد' اتنی غیر متعلقہ بات میں اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

اس پوری رات وہ سوئی جاگی کیفیت میں رہی تھی۔ کبھی اس کی آنکھ لگ جاتی پھر اچانک ہی اشعر کی آواز اپنے پاس سنائی دیتی، ایسا لگتا وہ آ گیا ہے، وہ اس کے بالکل پاس کھڑا ہے، اس کی آنکھ کھل جاتی۔ صبح ہونے سے پہلے اس نے خواب میں اشعر کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنی گود میں ایک بہت پیارے سے' چھوٹے سے بچے کو دیکھا تھا۔ وہ لڑکا تھا یا لڑکی اسے جاگنے پر بالکل یاد نہیں تھا۔ اسے آنکھ کھلنے پر باقی خواب کی کوئی بات یاد نہیں رہی تھی ہاں ایسا لگا تھا کہ شاید اس نے اس بچے کو گلابی کمبل میں لیٹا دیکھا تھا۔ اسے خواب ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور اگر ہوتا تو بھی اسے خوابوں کی تعبیریں جاننا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ کمبل گلابی رنگ کا تھا تو کیا اس بات کا یہ مطلب تھا کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہونے والی تھی۔ ہر ماں کی طرح شاید اس کی خواہش بھی بیٹے کی تھی مگر بیٹی کو سوچنا بھی اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کی بیٹی۔ وہ جب پیدا ہوگی تو کیسی دکھے گی؟ کیا اپنی ماں کے جیسی؟ کیا اپنے باپ کی جیسی؟ اور اشعر وہ اپنی بیٹی سے کیسی محبت کرے گا۔ اسے پتا تھا دقیانوسیت سے اس نے چاہے دل میں بیٹے کی آرزو کی تھی مگر اشعر ایسا نہیں۔ بیٹی ہو یا بیٹا وہ ایک ہی طرح خوش ہوگا۔ بلکہ اپنی بیٹی سے بعد میں چاہے ان کے ہاں بیٹا بھی پیدا ہو جائے، بیٹے کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہی محبت کیا کرے گا۔ بیٹیاں باپ کو زیادہ پیاری جو ہوتی ہیں۔ سوچتے سوچتے وہ اپنی حماقتوں پر خود ہی ہنس پڑی تھی۔ بیٹی اور اس کے بعد بیٹا، اس نے تو بیڈ پر بیٹھے بیٹھے چند منٹوں میں اپنی اور اشعر کی ایک مکمل فیملی بنا ڈالی تھی۔

فریدہ آج گھر پر ہی تھیں۔ کل رات ہی انہوں نے اس کے ساتھ آج شاپنگ پر جانے کا پروگرام بنایا تھا وہ اپنے اور اس کے موسم سرما کے کپڑوں کی خریداری کرنا چاہتی تھیں۔ ساتھ ہی گھر کے لیے کچھ دوسرا سامان بھی انہیں خریدنا تھا۔ شاپنگ کرتے ہوئے فریدہ نے اس کے اور اپنے لیے سردیوں کے موسم کے لحاظ سے کچھ کپڑے خریدے تھے۔ اب مزید شاپنگ کے لیے وہ ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور کی طرف جا رہی تھیں' پھر اس کے بعد اپنی ڈریس ڈیزائنر کے پاس جانا تھا تاکہ اپنے اور خرد کے موسم سرما کے ملبوسات اس سے تیار کروا سکیں۔ ابھی وہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ فریدہ کے موبائل پر زرینہ کی کال آ گئی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے انہوں نے کال ریسیو کی تھی۔ زرینہ انہیں خضر کے گھر سے فون کر رہی تھیں۔ وہ اپنی ایک عدد ملازمہ کو لے کر خضر کے گھر صبح سے پہنچی ہوئی تھیں۔ یہ ساری بات اسے فریدہ کی ان سے گفتگو سے سمجھ میں آئی تھی۔

''ہاں بات تو خضر کی بالکل صحیح ہے' اچھی تو گھر کی بنی ہوئی چیزیں ہی لگتی ہیں۔ باہر سے کتنا ہی کچھ کیوں نہ لے آؤ' وہ اسٹینڈرڈ آ ہی نہیں سکتا جو گھر کی بنی چیزوں کا ہوتا ہے۔'' وہ گاڑی سڑک پر مناسب رفتار سے چلاتے زرینہ کے کسی بات کے جواب میں بولی تھیں۔

''بھئی تمہاری اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔ میری بیٹی کوکنگ واقعی لاجواب کرتی ہے۔'' انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا

''خرد سے بنوانا ہے۔ ہاں اس وقت وہ ہے تو میرے ساتھ ہی۔ ہم دونوں ساس' بہو اس وقت شاپنگ کے لیے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ اچھا تم ٹھہرو میں خرد سے پوچھ کر تمہیں بتاتی ہوں۔'' زرینہ کو ہولڈ کروا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''زرینہ کہہ رہی ہے اگر خرد تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس خضر کے ہاں آ سکے تو۔ اسے تمہارے ہاتھ کا بنا چاکلیٹ کیک اور چکن پائی بہت پسند ہے۔ کہہ رہی ہے اگر خرد آ کر یہ دو چیزیں بنا دے تو بہت اچھا ہو جائے گا۔

مگر اس کا کہیں پر بھی جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ممی سے کہے کہ خضر کے ہونے والے ساس سسر تو شام سات بجے تک آئیں گے۔ وہ یہ دونوں چیزیں گھر پر جا کر بنا دے گی اور شام میں جب ممی' خضر کے گھر جا رہی ہوں گی تب اپنے ساتھ یہ دونوں چیزیں لیتی جائیں گی۔ مگر یہ ساری بات بہت لمبی تھی جبکہ ممی نے اس وقت زرینہ آنٹی کو ہولڈ کروا رکھا تھا۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے صرف اور صرف ممی کی خوشی کی خاطر اقرار میں گردن ہلانا پڑی تھی۔ فریدہ جنہوں نے فون کو ہاتھ میں رکھ کر زرینہ کو ہولڈ کروا رکھا تھا فوراً ہی کان سے لگا کر ان سے بولیں۔

''آ رہی ہے خرد۔ لیکن خبردار میری بیٹی کو زیادہ تھکنا وکانا نہیں۔ بڑی نازک ہے میری بیٹی' میں اسے زیادہ کام وام کرتا نہیں دیکھ سکتی۔'' اگلے سات آٹھ منٹ ہی میں فریدہ' خضر کی بلڈنگ کے احاطے میں اپنی گاڑی پارک کر رہی تھیں۔ وہ فریدہ کے ساتھ اوپر آ گئی تھی۔

''زیادہ خود کو تھکانا نہیں۔ زرینہ اپنی ملازمہ کو ساتھ لائی ہوئی ہے۔ سب کام اسی کو سمجھا کر اس سے کرواتے رہنا۔ کچن میں کرسی ڈال کر بیٹھ جانا۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تمہیں لینے آ جاؤں گی۔ اتنی دیر میں جتنا کام ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ باقی رخسانہ کو سمجھا دینا۔''

خضر کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر بیل کرتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا تھا۔ اس وقت سوا دو بجے رہے تھے۔ فریدہ اسے یہاں چھوڑ کر پانچ چھ منٹ، کی ڈرائیو پر واقع اس ڈپارٹمنٹ اسٹور میں جا رہی تھیں۔ جہاں وہ لوگ شاپنگ کے لیے آئے تھے۔ زرینہ کی ملازمہ رخسانہ نے آ کر ان کے لیے دروازہ کھول دیا تھا' اس کے پیچھے پیچھے زرینہ بھی دروازے پر آ گئی تھیں' خضر بھی اندر سے دروازے پر آ گیا تھا۔ فریدہ' زرینہ اور خضر سے سلام دعا کر کے دروازے ہی سے واپس جا رہی تھیں۔

''دیکھو بھئی زرینہ! میری بیٹی کو زیادہ تھکانا مت۔ میں قریب ہی شاپنگ کر رہی ہوں اور ایک سے ڈیڑھ کے اندر اندر اسے لینے آ جاؤں گی۔''

زرینہ سے ایک بار پھر یہی بات کہہ کر فریدہ واپس چلی گئی تھیں۔ اور وہ زرینہ کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

''بہت شکریہ خرد! آپ آ گئیں۔ مامی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں' واقعی کوکنگ آپ بہت اچھی کرتی ہیں۔ آپ کے ہاتھوں کے بنے سارے ہی کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ خضر نے اپنے گھر آ جانے پر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کی سیٹنگ میں کچھ تبدیلی کر رہا تھا، اس کے آ جانے کا شکریہ ادا کر کے وہ دوبارہ اپنے ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے فرنیچر، ادھر سے ادھر کھسکائے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ خضر کے گھر پہلی مرتبہ آئی تھی، ایک ڈیڑھ ماہ قبل خضر نے اپنے گھر پر یونہی دوستوں کی ایک گیٹ ٹو گیدر رکھی تھی۔ جس میں کلاس میں سے بھی اپنے تمام دوستوں کو انوائیٹ کیا تھا۔ وہ تو خیر اس ڈنر میں شریک نہیں ہوئی تھی مگر اگلے روز سامعہ اور ندرت نے اس سے خضر کے اپارٹمنٹ کی کافی تعریف کی تھی۔ ایک بیڈ اور ایک مشترکہ ڈرائنگ، ڈائننگ اور کچن پر مشتمل اس کا یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ جس علاقے میں تھا اسے اور اس کے Tenant کے ابھی اسٹوڈنٹ ہونے کو ذہن میں رکھا جاتا تو واقعی یہ بات بالکل ٹھیک تھی کہ خضر نے اپنے بل بوتے پر اپنا لیونگ اسٹینڈرڈ بہت اچھا Maintain کر رکھا تھا۔ اس کے والد کے بھیجے جانے والے پیسوں کے مقابلے میں اس کی خود کی محنت کا زیادہ عمل دخل تھا۔

وہ' زرینہ اور ان کی ملازمہ کے ساتھ کچن میں تھی۔ مطلوبہ تمام سامان زرینہ نے وہاں منگوا کر رکھا ہوا تھا' سو اس نے جلدی جلدی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ زرینہ نے بھی بیک وقت کئی چیزیں بنانی شروع کی ہوئی تھیں۔ کچن میں نظر آتے ڈھیر سارے لوازمات کو دیکھ کر نظر آ رہا تھا کہ زرینہ' خضر کے ساس سسر کے لیے خوب ٹھیک ٹھاک قسم کی شاندار سی ٹی پارٹی کا اہتمام کر رہی ہیں۔

''خضر جب سے کراچی آ کر رہنے لگا ہے لگتا ہے اللہ نے میری بیٹے کی خواہش پوری کر دی ہے۔ ڈھائی تین سالوں میں اس کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ سوچتی ہوں یہ پڑھنے امریکہ چلا جائے گا تو میرا اس کے بغیر دل کیسے لگے گا۔''

وہ کام کرتے ہوئے اس سے خضر کے لیے اپنی چاہت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کی یہ چاہت صرف لفظوں ہی سے نہیں ان کے عمل سے بھی ثابت ہوتی تھی۔ ''میں نے تو کئی بار خضر سے کہا ہے کہ ہمارے گھر کے ہوتے الگ کیوں رہتے ہو مگر اسے اچھا نہیں لگتا ماموں' ممانی کے گھر جا کر رہنا۔ انا بہت ہے اس لڑکے میں۔''

زرینہ نے دہی بڑے بنانے کے لیے پسی ہوئی ماش کی دال میں نمک ملاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ ان سے باتیں کرتی ہوئی تیز تیز کام بھی کرتی جا رہی تھی۔ فریدہ کو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آ جانا تھا اس لیے وہ چاہتی تھی۔ اتنی دیر میں کیک اور چکن پائی بنانے کا کام جتنا کر سکتی ہے وہ کر لے۔

چکن پائی کے لیے زرینہ نے اپنی ملازمہ سے چکن ابلوا کر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے مرغی کے ریشے کرنے کو کہا اور ساتھ ہی اس کے بعد مرغی میں کیا کیا ڈال کر پکانا ہے یہ بھی سمجھا دیا تھا۔ وہ خود چکن پائی کے دوسرے مرحلے کے لیے مکھن اور انڈوں کو بیٹ کر رہی تھی پھر بیٹ ہوئے مکھن اور انڈوں میں میدہ ملانے لگی تھی۔

''خضر آج بہت نروس ہے۔ پسند بھی تو بہت کرتا ہے مہرین کو۔ حالانکہ ایک طرح سے ان لوگوں نے ہاں کہہ دی ہے آج کی ساری کارروائی تو محض رسمی ہے مگر یہ لڑکا بلاوجہ اس قدر گھبرایا ہوا ہے۔''

زرینہ ڈرائنگ روم میں خضر کی کوئی بات سننے گئی تھیں۔ وہاں سے چند منٹ میں واپس آئیں تو ہنستے ہوئے بولی تھیں اسے وہاں آئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا۔ زرینہ کو کسی ڈش کی تیاری کے لیے فریش کریم اور کسی دوسری ڈش کے لیے مشرومز چاہیے تھے۔ وہ کچن

سے باہر نکل کر خضر کے پاس ڈرائنگ روم میں گئیں تا کہ اسے یہ دونوں چیزیں لانے کے لیے کہہ سکیں اس نے کیک کی تیاری کا کام بھی شروع کر دیا تھا جبکہ زرینہ کی ملازمہ اس کے قریب ہی کھڑی چکن پائی کے لیے مرغی فرائی کر رہی تھی۔ زرینہ نے ڈرائنگ روم سے آواز دے کر اپنی ملازمہ کو بلایا تھا۔ وہ ان کی بات سننے ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی۔ اسے ڈرائنگ روم میں فون بجنے کی آواز آئی تھی شاید زرینہ یا خضر کا موبائل بجا تھا۔ دو منٹ بعد اس نے زرینہ کی ہنستی ہوئی آواز ڈرائنگ روم سے آتی سنی تھی۔ وہ بلند آواز میں اسی سے مخاطب تھیں۔

''خرد! تمہاری ساس صاحبہ کا فون تھا۔ کہہ رہی ہیں میری بہو کو تم زیادہ تھکا تو نہیں رہیں۔ میں بس دس منٹ میں اسے لینے آ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ اسٹور سے نکل گئی ہے اور اب راستے میں ہے۔ دس منٹ کیا میرے خیال سے وہ پانچ چھ منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی۔''

انہیں تو اس کی فکر ویسے بھی بہت رہا کرتی تھی۔ اب جب سے وہ پریگننٹ ہوئی تھی تو انہیں پہلے سے بھی زیادہ اس کی فکر لگی رہا کرتی تھی۔ وہ ممی کی محبت پر مسکراتی پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے اپنے ہاتھ چلانے لگی تھی۔ زرینہ کی ملازمہ جو ان کے بلانے پر ڈرائنگ روم میں گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی اسی لیے اپنے کام کے ساتھ وہ وقفے وقفے سے اس کی فرائی کرنے کے لیے رکھی گئی ریشے ہوئی مرغی میں بھی چمچہ چلانے لگی تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ یقیناً یہ زرینہ آنٹی کی ملازمہ تھی جسے انہوں نے فریش کریم اور مشرومز کا کین لانے بھیجا تھا کیونکہ خضر کی باتیں کرنے کی آواز تو اسے ڈرائنگ روم سے آ رہی تھی۔ وہ سانچے کو اوون میں رکھنے کی تیاری کر رہی تھی اسی وقت ہی اپارٹمنٹ کی بیل بجی تھی۔ یہ زرینہ آنٹی کی ملازمہ بھی ہو سکتی اور ممی بھی۔ اگر یہ ممی تھیں تو وہ واقعی بارہ' تیرہ منٹ میں اسے لینے آ گئی تھیں۔ اس نے دل میں یہ سوچتے کہ وہ ممی سے کہے گی وہ یہاں آدھا پون گھنٹہ زرینہ آنٹی کے ساتھ گپ شپ لگا لیں۔ اس نے فوراً ہی سنک کا نل کھول کر میدہ وغیرہ لگے اپنے ہاتھوں کو کھنگالا اور پھر دوپٹے سے گیلے ہاتھوں کو خشک کرتی فوراً ہی کچن سے باہر نکل آئی۔ اسے دروازہ کے پاس سے خضر کی اور کوئی زنانہ آواز آئی جو شاید ممی ہی کی تھی۔

''کون ہے خضر۔ کیا آ گئیں۔'' ...... وہ آگے کہنا چاہتی تھی۔ ''کیا آ گئیں ممی۔'' مگر اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی تھی' منظر ہی کچھ اتنا حیرت انگیز' اتنا ناقابل یقین دیکھ لیا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے فریدہ کے برابر اشعر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر خوشی تو ہونا ہی تھی مگر خوشی سے بھی زیادہ اسے اتنے غیر متوقع انداز میں یہاں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ممی تو پاس ہی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں شاپنگ کر رہی تھیں نا' وہاں اشعر کہاں سے آ گیا اور اشعر واپس کب آیا۔ اس کی آج یا کل واپسی کی تو وہ شدتوں سے منتظر تھی مگر اسے یہاں اس وقت دیکھنے کی ذرا بھی امید نہیں تھی۔ خیر یہ حیرت تو بعد میں بھی کی جا سکتی ہے، بعد میں ممی اور اشعر سے پوچھ لے گی، اشعر کی یہاں غیر متوقع آمد کی تفصیلات فی الحال تو اسے اتنے سارے دنوں بعد اپنے سامنے موجود پا کر وہ صرف اور صرف خوش ہونا چاہتی تھی۔ اسے اتنے اچانک' اتنے غیر متوقع انداز میں سامنے پا کر وہ خوشی اور حیرت کی زیادتی کے سبب فوری طور پر کچھ بول نہیں پا رہی تھی' اگر فریدہ اور خضر یہاں نہ ہوتے تو وہ دوڑتی ہوئی جا کر اس کے سینے سے لگ جاتی' کہنے سننے کی ہر مشکل ہی سے نجات مل جاتی۔ لیکن یہ ممی اور اشعر اس طرح سے خاموش کیوں ہیں اور زرینہ آنٹی وہ

ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں ناں، بیل کی آواز سن کر اور پھر ممی کی آواز سن کر بھی وہ ڈرائنگ روم سے باہر کیوں نہیں نکلیں۔ اور وہ ڈرائنگ روم کے بالکل قریب ہی تو کھڑی ہے۔ اس وقت، ڈرائنگ روم کے اندر اتنی خاموشی کیوں ہے اور ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ڈرائنگ روم میں کوئی بھی نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اسے اندر کا جتنا منظر نظر آ رہا تھا وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ اسے ان تمام پر حیرت ہو رہی تھی۔

اشعر کو غیر متوقع طور پر سامنے دیکھنے کی اس خوشی کے ساتھ ان تمام باتوں نے مل جل کر اسے کچھ الجھن میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ اشعر اور ممی دونوں ان کی طرح خاموش کیوں ہیں۔ شاید وہ اس کی حیرت کو انجوائے کر رہے ہیں، اشعر کو ایک دم سامنے پا کر جو وہ سرپرائز ڈ رہ گئی ہے اس سے وہ خاموشی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ان دونوں کے تاثرات اتنے ناقابل فہم سے کیوں ہیں اور یہ خضر اس طرح سے سر جھکا کر کیوں کھڑا ہے' اسے کیا ہوا ہے۔

''اشعر! آپ کب آئے' ممی آپ۔'' اشعر سے مخاطب ہو کر اس نے فریدہ سے کہنا چاہا۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ انہیں اشعر شاپنگ کرتے کہاں مل گیا' کیا انہیں اس کی واپسی کا پتا تھا کیا انہوں نے اچانک اشعر کو اپنے ساتھ لا کر اسے سرپرائز دینا چاہا تھا مگر فریدہ نے اس کی بات پوری ہونے نہیں دی تھی۔ اس کی بات کاٹ کر وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھیں۔

''خرد تم؟ تم یہاں؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' جیسے وہ شدید شاک کے عالم میں ہوں۔ جیسے انہوں نے اسے ابھی ابھی یہاں دیکھا ہو۔ انہوں نے اس طرح صدمے سے چور لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ وہ حیرت سے گنگ ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے وہ خود ہی تو اسے یہاں چھوڑ کر گئی تھیں۔ ابھی پندرہ سولہ منٹ پہلے تو ان کا فون آیا تھا کہ وہ اسے لینے آ رہی ہیں اور اب وہ اسے دیکھ کر یوں حیران پریشان کھڑی تھیں جیسے انہیں پتا نہیں تھا کہ وہ یہاں ہے۔ ممی کا عجیب وغریب انداز، ان کے ناقابل فہم الفاظ کچھ بھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ وہ ممی کی اسی بات اور اسی انداز کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ممی نے یک دم ہی بھرائے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''خرد! تم یہاں خضر کے ساتھ۔ تم یہاں اس طرح۔ میرے خدا۔ خدا یہ منظر دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی۔''

اس کے سر کے اوپر ایک دم ہی جیسے وہ وزنی چھت آ گری تھی' اس کے وجود کو جیسے کسی نے بم سے اڑا ڈالا تھا۔ اسے جیسے کوئی زندہ زمین کے اندر دفن کر رہا تھا یہ ممی کیا کہہ رہی تھیں۔ نہیں اسے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ممی کچھ اور کہہ رہی ہیں وہ ان کی بات صحیح سے سن نہیں پا رہی۔

''مم۔ ممی! آپ کیا۔'' بے تحاشا الجھے ہوئے سے انداز میں اس نے فریدہ سے پوچھنا چاہا۔ کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، ان کی ان باتوں کا مفہوم کیا ہے۔ شاید ممی اس سے کوئی مذاق بہت سنجیدگی کے ساتھ کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ الجھا الجھا، اٹکتا ہوا جملہ ممی نے مکمل ہونے نہیں دیا تھا۔

''اتنی بے حیائی۔ اتنی بے غیرتی۔ اشعر کے منہ پر یہ کالک ملتے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی خرد۔ ایسی گھناؤنی حرکت کرتے یہ بھی یاد نہ

رہا کہ تم کسی کی بیوی ہو' ایک عزت دار گھرانے کی بہو ہو۔ پڑھائیوں کے بہانے بنا کر ہماری عزت سے نجانے کب سے کھیل رہی ہو۔''

اس بار اسے لگا نہیں تھا' واقعی اس کے جسم کو بم سے اڑا دیا گیا تھا وہ اپنے جسم کے چیتھڑے بکھرے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے قریب اپنے ہی جلے ہوئے گوشت کی بو آ رہی تھی۔ وہ فریدہ حسین کا تھپڑ کھا کر زمین پر گر پڑی تھی۔ پوری قوت سے مارا گیا یہ تھپڑ ایسا تھا کہ یک دم ہی لہرا کر وہ دیوار سے ٹکرائی اور دیوار سے ٹکراتی زمین پر گر پڑی تھی زمین پر گرتے ہوئے اس نے اس عورت کو دیکھا تھا۔

''دیکھو بھئی زرینہ میری بیٹی کو زیادہ تھکانا مت۔'' ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اسے یہاں چھوڑ کر جانے والی یہ عورت جسے وہ ممی کہتی تھی جو اسے میری بیٹی کہتی تھی جب یہاں سے جا رہی تھی تو اس کے وجود کے ساتھ ایک ٹائم بم باندھ کر گئی تھی ۹ منٹ بعد کا ٹائم سیٹ کر کے' جب وہ واپس آئے گی تو یہ بم بلاسٹ ہو جائے گا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے زیادہ اذیت' زیادہ تکلیف کس بات سے پہنچ رہی ہے اس کے کردار پر ایک انتہائی رکیک الزام لگایا جا رہا ہے اس پر یا اس حقیقت کو جان کر کہ جسے وہ ممی کہتی ہے جسے وہ ماں کا درجہ دیتی ہے وہ اندر سے اتنی نیچ' اتنی گھٹیا عورت ہے۔ وہ نجانے کب کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ایک انتہائی مکروہ کھیل کھیل گئی ہے، اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہاں لا کر اس نے یہ سارا منظر بڑی احتیاط سے پلان کر رکھا تھا۔ اس نے ان کا اتنا گھناؤنا روپ پہلی بار دیکھا تھا، انسان اتنی پستی میں بھی اتر سکتا ہے، پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کیسے یقین کرے کہ یہ عورت جو خود کو اس کی ماں کہتی ہے اندر سے اتنی غلیظ سوچ کی مالک ہے۔ اس سے اتنی شدید نفرت کرتی ہے۔

''بہت ستا رہی ہو تم مجھے۔ اشعر واپس آ جائے وہی تمہیں دیکھے گا۔''

''خرد! بیٹا ناشتہ تو ڈھنگ سے کر لو۔''

''کبھی بھی دل میں اس بات کا ملال مت لانا خرد! کہ میرے ماموں چلے گئے میں تنہا رہ گئی۔ اب میرے پیچھے میرا کوئی والی وارث نہیں کبھی اشعر کی جانب سے کوئی زیادتی ہو تو اب شکایت لے کر کس کے پاس جاؤ گی۔ دل کی ہر بات جیسے بصیرت سے کہتی تھیں ایسے ہی مجھ سے کہنا مجھے ممی صرف کہنا نہیں ہے بلکہ دل سے ماں سمجھنا۔ بھی کیونکہ میں تمہیں بیٹی صرف زبان سے نہیں کہتی دل سے مانتی بھی ہوں۔'' اور آج ایک ماں اپنی بیٹی پر کتنا گندا' کتنا رکیک الزام لگا رہی تھی۔

''کیا نہیں دیا تھا اشعر نے تمہیں۔ محبت عزت' چاہت' آزادی' اس کی دی آزادی کا ایسا ناجائز استعمال۔ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر اتنی گندگی' اتنی غلاظت اتنی پستی۔'' ماں کے نام کو، ماں کے رشتے کو رسوا کرنے والی، اس رشتے کی دھجیاں اڑانے والی اسے نیچ پن اور پستی کے طعنے دے رہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ماں کے رشتے کی اتنی بری طرح توہین کرنے والی، اس رشتے کا نام لے کر اتنی ذلالت کا ثبوت دینے والی اس عورت کے منہ پر وہ تھوکتی مگر ہو الٹ رہا تھا۔ اس عورت نے روتے ہوئے نفرت و حقارت سے اس کے قریب زمین پر تھوکا تھا۔ اس عورت نے ایک پل میں اس کے وجود کو گندگی اور کچرے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ وہ عورت چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ بلند

آوازوں میں اس کی آواز ابھر ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ عورت اس پر حاوی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسے اس کی کوئی بات مکمل نہیں کرنے دے رہی تھی۔ وہ اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی وہ بولنے کے لیے منہ کھولتی اور وہ عورت چلاتی ہوئی آواز میں اس کی اس آواز کا گلا گھونٹ دیتی۔

''ممی! آپ بالکل۔ اشعر ایسا کچھ نہیں۔''...... وہ اب بھی اس عورت کو ممی کہہ کر مخاطب کرتے یہ کہنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تم بالکل غلط بات کر رہی ہو۔ جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے یہاں تم خود لے کر آئی تھیں۔ تمہارے کہنے پر تمہارے ساتھ میں یہاں آئی تھی کیوں کر رہی ہو تم یہ گھناؤنا ڈرامہ۔ لیکن اگر وہ عورت اسے یہ بات پوری کہنے دیتی تب نا۔ اس عورت نے زور زور سے روتے پھر چلانا اور بولنا شروع کر دیا تھا۔

''اچھا ہوا آج بصیرت زندہ نہیں ورنہ جس بھانجی کو اتنی چاہت سے بہو بنا کر لائے تھے اس کی یہ شرم ناک حرکت دیکھ کر دکھ اور شرم سے مر ہی جاتے۔'' اس نے روتے روتے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''اشعر! خدا کے لیے اس عورت کو چپ کراؤ۔ خدا کے لیے اس کی یہ گندی زبان بند کرواؤ۔ ورنہ میں شرم سے مر جاؤں گی۔''

وہ کئی فٹ گہری زمین میں زندہ دفن کی جا رہی تھی' اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اشعر کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس کے بچاؤ کے لیے آ جائے۔ وہ اسے اس ظالم عورت کے چنگل سے نکالے اس میں طاقت نہیں اس سفاک عورت کا مقابلہ کرنے کی' اشعر بچا سکتا ہے۔ اسے اس کے ظلم سے، صرف اشعر بچا سکتا ہے، اسے اس عورت کی گھناؤنی اور گندی زبان سے اسے بے حیا، بے غیرت قرار دینے والی، عزتوں سے کھیلنے والی کہنے والی یہ عزت دار عورت اس کی گندی اور غلیظ زبان کوئی آ کر سن لے، جو گھٹیا ترین لفظ اس نے اپنی پوری زندگی کبھی نہ سنے تھے نہ کہے تھے وہ خود کو عزت دار کہنے والی، ایک پاک باز لڑکی کو جو اس کی بہو تھی، جو اس کے بیٹے کی عزت تھی، جو اپنی کوکھ میں اس کے بیٹے کی امانت کو پروان چڑھا رہی تھی کتنے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس پر کتنے رکیک الزام لگا رہی تھی۔ ایک سوچی سمجھی انتہائی گھناؤنی سازش اور مکروہ جھوٹ کا سہارا لے کر اسے بدنام کرنا چاہتی تھی۔

''تمہاری اور خرد کی دوستی پر میں نے' اشعر نے' ہم نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کیا۔ ہم نے ہمیشہ تمہیں اپنے گھر میں عزت دی اور تم نے ہمارے ہی گھر کی عزت کو۔

اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنے لیے یہ سب سن کر اس کا شرم سے مر جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ کوئی کچھ بول کیوں نہیں رہا، کوئی اس عورت کی گندی زبان تالو سے کھینچتا کیوں نہیں۔ وہ اتنے شرمناک الزام لگائے چلی جا رہی ہے۔ خضر کیوں چپ ہے وہ کیوں اس عورت کے آگے کچھ نہیں بول رہا' کیوں اس کے اتنے گندے' اتنے غلیظ الزام کی تردید نہیں کر رہا کیوں نہیں کہہ رہا کہ یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ اشعر، وہ کیوں خاموش ہے۔ کیوں نہیں اس کی بکواس بند کروا رہا، کیوں نہیں کہہ رہا کہ اس کی خرد کے بارے میں اتنے غلیظ لفظ نہ بولے، کیوں نہیں وہ اس عورت کو چپ کروا رہا، کیوں نہیں کہہ رہا کہ خبردار میری خرد کے لیے آگے کوئی گندا الفاظ مت بولنا۔

''یہ کیسا گندا' کیسا گھناؤنا کھیل کھیلتے رہے ہو تم اس کے ساتھ مل کر۔ تمہارا نفس' تمہاری جوانی اتنی سرکش تھی۔''

''اشعر چپ کرواؤ اس عورت کو' اشعر اس کی گندی زبان بند کرواؤ۔''

''جس نے گناہ ثواب کا احساس ہی مٹا دیا۔''

اس عورت کی زہر اگلتی گندی زبان اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جا رہی تھی۔

''تم دونوں نے مل کر ہمارے منہ پر کالک مل دی۔'' زار قطار روتے ہوئے اس نے امید بھری نگاہوں سے پھر اشعر کو دیکھا' وہ گم صم سا دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا، وہ اس کی التجائیہ نگاہوں کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہارے ہوئے شکست خوردہ انسان کی طرح بالکل خاموش کھڑا تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اشعر اس عورت کی سازش کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس عورت نے چاہے جتنی بھی مکاری سے یہ سارا منظر ترتیب دیا ہو، چاہے آنکھوں سے اشعر کو جو کچھ بھی دکھایا جا رہا ہو مگر اس کا دل اس منظر کو کبھی سچ نہیں مان سکتا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے، اور محبت کی تو بنیاد ہی اعتماد پر کھڑی ہوتی ہے۔ اشعر کیوں نہیں کرے گا اس کا اعتبار۔ لیکن اس کی یہ پیہم خاموشی کیا بتا رہی تھی۔ کیا وہ اس پر اعتبار کھو رہا تھا، کیا وہ اس پر بھروسہ اور یقین کھو رہا تھا۔ نہیں ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ شاید شاک میں آ گیا ہے اس لیے خاموش ہے۔

''ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل۔'' وہ یک دم ہی اس عورت کے سامنے آئی۔ اسے مزید کوئی شرم ناک بات کہنے سے روکنے کے لیے۔

''ممی! خدا کے لیے۔''

''ایسی غلیظ اور گھناؤنی حرکت کر کے' اتنا بڑا گناہ کر کے ابھی بھی تم میں اتنی ہمت ہے کہ میری اور اشعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکو۔'' اس عورت نے اسے بہت زور سے اپنی پوری قوت سے دھکا دے کر اپنے سامنے سے ہٹایا۔ اس کے یوں دکھا دینے سے وہ سنبھل نہیں سکی تھی۔ دیوار کے نوکیلے کونے سے ٹکراتی وہ منہ کے بل زمین پر بہت زور سے گری تھی۔ اس بری طرح فرش پر گرنے سے اس کے ہاتھ پاؤں' سر اور پیٹ پر چوٹ لگی تھی۔ اس کے پیٹ پر بڑی شدید چوٹ لگی تھی۔ اس کے سر سے دیوار کے نوکیلے کونے سے ٹکرانے کی وجہ سے خون نکلنے لگا تھا مگر اس کے ہاتھ خون بہتی پیشانی پر نہیں بلکہ اپنے پیٹ پر گئے تھے۔

''میرا بچہ۔'' اس کے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔ ''میرا بچہ۔'' وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اگر اس عورت کے اس گندے کھیل میں اس کے بچے کو کوئی نقصان پہنچ گیا پھر۔ وہ اس عورت کا تھپڑ کھانے پر نہیں وہ اس عورت کے خود کو اتنی بری طرح ٹھوکر مارے جانے پر نہیں۔ وہ خود پر لگے رکیک الزامات پر نہیں' وہ اپنے بچے کے لیے رو پڑی تھی۔ ماں کی کوکھ، اس دنیا میں آنے سے پہلے ان بچے کی محفوظ پناہ گاہ کہیں یہ محفوظ پناہ گاہ ہی اس کے بچے کی قبر نہ بن جائے۔ اس کے پیٹ میں اتنی شدید تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ درد سے چلا اٹھی تھی۔ وہاں اس ماں کے سوا کسی کو بھی اس کے بچے سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہاں تو ایک سوچا سمجھا ڈرامہ اس وقت عمل میں لایا جا رہا تھا۔

''اچھا ہوا آج احسان زندہ نہیں۔ اچھا ہوا آج میمونہ زندہ نہیں' اچھا ہوا آج بصیرت زندہ نہیں۔ ورنہ تمہارے ماں' باپ اور بہت چاہنے والا ماموں وہ سب بھی اسی ذلت سے گزرتے جس سے اس وقت میں اور اشعر گزر رہے ہیں۔ وہ بھی یونہی زندہ درگور ہو رہے ہوتے جیسے میں اور اشعر ہو رہے ہیں۔''

وہ عورت چپ نہیں ہو رہی تھی' وہ اسے گندی گندی گالیاں دیے چلی جا رہی تھی اور اشعر وہ خاموش کھڑا تھا۔ وہ اس کے کردار کے گواہی کیوں نہیں دے رہا تھا، وہ اپنی ماں کو چپ ہو جانے کو کیوں نہیں کہہ رہا تھا۔

''تم تو نہ بیٹی کہلانے کے لائق ہو نہ بہو نہ بیوی۔ ہر رشتے کی حرمت پامال کر ڈالی ہے خود تم نے۔'' وہ اس مکار عورت کے منہ پر تھوک کر کہنا چاہتی تھی۔

''کہ بیوی' ماں' ساس' دادی کچھ بھی کہلانے کے لائق تو تم نہیں رشتوں کی حرمتوں کا نام لینے والی تم خود ہر رشتے میں ایک گالی ہے۔'' مگر جھوٹی ہو کر وہ عورت اس پر حاوی تھی اور وہ سچی ہو کر اس کی آواز دبانے میں ناکام تھی۔ اشعر بالکل چپ تھا۔ اس کی چپ کہہ رہی تھی کہ وہ اس عورت کی سازش کے جال میں پھنس رہا ہے۔ وہ ہمت کر کے بڑی مشکلوں سے اٹھی' اپنی پیشانی سے بہتا خون اس نے بغیر دیکھے ہاتھ سے صاف کیا۔ وہ عورت جھوٹی ہو کر اس پر حاوی ہو رہی ہے اور وہ سچائی اور حق پر ہوتے دب رہی ہے۔ کیوں؟ وہ چپ نہیں رہے گی۔ وہ اس عورت کی ساری سازش، اس کی گندی ذہنیت، اس کی اصل شکل ابھی اشعر کے سامنے ظاہر کر دے گی۔ ابھی اور اسی وقت۔

وہ چیخ چیخ کر اس عورت کی ساری سازش کا پردہ فاش کر دے گی۔ وہ اشعر کو اس کی ماں کا اصلی گھناؤنا چہرہ دکھا دے گی۔ اس عورت کے جھوٹ اس کی سازش کا پردہ فاش کرنے کے لیے تو اتنے لوگ ہیں اتنی گواہیاں ہیں۔ زرینہ ہیں' ان کی نوکرانی ہے اور سب سے بڑھ کر تو خضر ہے۔ مگر خضر وہ اس عورت سے ڈر کر چپ کیوں ہے، اس نے اپنا سر جھکا کر کیوں رکھا ہے، وہ اس عورت کے الزامات کی تردید کیوں نہیں کر رہا۔ وہ عورت صرف اس پر ہی نہیں خضر پر بھی تو الزام لگا رہی ہے خضر کسی بات سے خائف ہے، وہ آخر کچھ بول کیوں نہیں رہا ہے۔

وہ خضر کے پاس آئی تھی۔ ''تم چپ کیوں ہو۔ تم سچ کیوں نہیں بولتے۔ بتاؤ سچ۔ بولو خدا کے لیے بولو کہ یہ جھوٹ ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ وہ اس کے کہنے کے باوجود بھی نظریں جھکائے چپ کھڑا تھا۔ خضر سچ بول دے گا تو اس عورت کا سارا مکر و فریب ابھی اور اسی وقت بے نقاب ہو جائے گا۔ اس نے خضر کو بولنے پر پھر اکسایا تھا، اس عورت سے کیوں ڈر رہا ہے، وہ آخر چپ کیوں ہے اور اس کے رونے' جھنجھوڑنے اور التجائیہ انداز کے جواب میں خضر بولا تھا۔ مگر کیا۔ اس کی آنکھیں صدمے کی زیادتی سے پھٹ گئی تھیں۔ اسے لگا تھا اس عورت کے لنگڑے لولے جھوٹ اور بے بنیاد کردار کشی کا پردہ تو ابھی کے ابھی خضر کے ایک سچ سے فاش ہو جائے گا اور وہ خضر عالم جو کویت میں رہنے والی، اپنے والد کے دوست کی بیٹی مہرین علی سے اپنے بچپن کی محبت کی داستانیں یونیورسٹی میں بیٹھ کر سب کو پابندی سے سنایا کرتا تھا۔ جس کے ہونے والے ساس سسر آج اس کے گھر آنے والے تھے۔ جن کی آمد کے لیے وہ بہت پرجوش تھا۔ اس عورت کے جھوٹ کا پردہ فاش نہیں کر رہا تھا، وہ ان پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ جس گناہ کا وہ عورت الزام لگا رہی تھی، وہ اپنے اس گناہ کا برملا اعتراف کر رہا تھا، وہ اپنے گناہ

گار ہونے کا بانگ دہل اقرار کر رہا تھا۔

''مزید جھوٹ اور دھوکے کی زندگی میں نہیں جی سکتا۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں' کسی کو چاہنا کوئی جرم نہیں جو ہم سب سے منہ چھپاتے پھریں' اپنی محبت کو چھپانے کے لیے ہزار جھوٹ بولیں۔ ہم کیوں جھوٹ بولیں خرد! ہم نے محبت کی ہے کوئی گناہ نہیں۔''

جو ہمیشہ اس سے احترام سے آپ، آپ کر کے بات کرتا تھا اس کے لبوں سے بولا گیا یہ جھوٹ، اتنی ڈھٹائی اتنی دیدہ دلیری اور اتنی مضبوطی سے بولا گیا تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر سے اکھڑنے لگے تھے۔

''خضر تم۔ میرے اللہ۔ تم بھی۔'' آخر کون کون شامل رہا تھا اس عورت کی اس سازش میں۔ آخر اس سازش کا سلسلہ کہاں تک پہنچا ہوا تھا؟ آخر یہ سازش اس کے خلاف چلی کب سے جا رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین پوری کی پوری کھینچ لی گئی تھی۔ وہ دو جھوٹے اپنے مکروہ جھوٹ کے ساتھ اس کے سامنے تن کر کھڑے تھے اور وہ ایک سچی اپنی تمام تر سچائی اور بے گناہی کے باوجود مجرم اور گناہ گار بنی کھڑی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تھی، اس سے چلا چلا کر سچ بتانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کے سچ کی گونج ان دونوں کے جھوٹے کے آگے دب گئی تھی، اس کا سچ ان کے جھوٹ کے آگے دب گیا تھا۔ سچ اپنی تمام تر طاقت اور سچائی کے باوجود ہار رہا تھا، جھوٹ اپنی تمام تر کمزوری اور جھوٹے ہونے کے باوجود جیت رہا تھا۔ سچ اور جھوٹ کی جنگ میں فتح جھوٹ کو مل رہی تھی۔ سچ ہار رہا تھا۔ بابا کہاں تھے جو جھوٹ بولنے کو مشکل اور سچ بولنے کو آسان قرار دیتے تھے۔ ''بابا آپ کہاں ہیں؟ آئیں آ کر دیکھیں آپ کی بیٹی سچ بول رہی ہے اور ہار رہی ہے، اس کے سچ کو کوئی سن نہیں رہا، جو جھوٹ بول رہے ہیں وہ جیت رہے ہیں۔ ان کا جھوٹ اس پورے اپارٹمنٹ میں گونج رہا ہے۔''

خضر اور اس مکار عورت کے بولے جھوٹ کے بعد اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا' اس کے گرد گھیرا انہوں نے بہت تنگ کر دیا تھا۔ اسے کسی بھی طرح خاموش کھڑے اشعر کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا، وہ آنکھوں میں دکھ اور صدمہ لیے شاید اس سازش کو سچ ماننے لگا تھا، اسے اشعر کو ساری سچائی خود ہی بتانی تھی۔ وہ ساری تکلیف اور سارا درد بھلاتی بھاگتی ہوئی اشعر کے پاس آئی تھی۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔'' اس نے اس کے بازو کو جکڑ کر روتے ہوئے کہا تھا۔ اور اسے لگا تھا وہ ان کی بات ضرور سنے گا۔ وہ جانتا ہے وہ جھوٹ نہیں بولتی اشعر جانتا ہے خرد جھوٹ نہیں بولتی' اگر وہ کسی دوسرے کو جھوٹ کہہ رہی ہے تو اس کی بات میں کوئی نہ کوئی صداقت ضرور ہوگی۔ مگر اس نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ بے حس' کسی پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑا رہا تھا۔ اسے اس کے بازو سرد اور جذبات سے عاری محسوس ہوئے تھے۔

''آپ کو میرا یقین ہے نا۔ آپ کو پتا ہے نا میں ایسی نہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔ اشعر۔ خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں ایسی نہیں۔ میرا یقین کریں۔''

وہ روتے روتے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی وہ اس کے پیروں سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھی۔

وہ روتی رہی، وہ خاموش کھڑا رہا۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا' میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں آپ کی وہی خرد ہوں' وہی خرد جو صرف اور صرف آپ سے محبت کرتی ہے۔ جو صرف اور صرف آپ کی ہے۔'' وہ کسی بھکارن کی طرح اس کے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے اس سے اپنے کردار کی گواہی مانگ رہی تھی' اسے اپنے کردار کی گواہی دے رہی تھی۔

وہ بت کے مانند ساکت کھڑا تھا۔ مگر پھر یکا یک ہی اس کے ساکت جسم میں حرکت پیدا ہوئی تھی وہ ایک جھٹکے سے اس سے دور ہٹا تھا ایک ذراسی جنبش سے اس نے اپنے پیروں سے لپٹی اس لڑکی کو خود سے دور ہٹایا تھا۔ وہ زمین پر گری بے یقینی سے اسے خود سے دور جاتا دیکھ رہی تھی وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ اسے روک لینا چاہتی تھی' وہ اسے اپنا یقین دلائے بغیر کہیں پر بھی جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

''اشعر میری بات سنیں۔ پلیز میری بات سنیں۔ مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ خدا کے لیے رک جائیں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔ آپ کی خرد ایسی نہیں ہے۔ اشعر آپ کی خرد نہیں نہیں۔

اسے بہت زور سے چکر آیا تھا' وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھی' وہ اپارٹمنٹ کے دروازے ہی پر گر گئی تھی۔ وہ دروازے سے نکل کر کب کا آگے جا چکا تھا۔

''آپ کی خرد ایسی نہیں اشعر۔ آپ کی خرد ایسی نہیں خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ خدا کے لیے۔''

وہ زمین پر گری روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ وہ عورت اسے روتا چھوڑ کر اپنے بیٹے کے پیچھے بھاگی تھی۔ زمین پر پڑے روتے ہوئے اشعر کو پکارتے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو خضر بھی اپارٹمنٹ سے جا رہا تھا' وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ شرمندگی تھی نہ تاسف۔

''کیوں بولا تم نے یہ جھوٹ۔ کیوں۔ بولو جواب دو۔ میرے کردار پر اتنی بڑی یہ تہمت تم نے کیوں لگائی ہے۔''

'آئم سوری خرد! تمہارے ساتھ جو ہوا اس کے لیے مجھے واقعی افسوس ہے۔ مگر فریدہ آنٹی کی پیشکش اتنی اٹریکٹو تھی میں انکار نہیں کر سکا۔ تم تو جانتی ہو نا امریکہ پڑھنے کے لیے جانا میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے۔ فریدہ آنٹی کی بدولت اگر میرا یہ خواب پورا ہونے لگا تھا تو میں بلاوجہ کی کسی اخلاقیات کو گلے کا ہار بنا کر اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں کامیابی اور خوشی بار بار دستک نہیں دیتی۔ بہرحال تمہارے ساتھ جو بھی ہوا' اس پر مجھے تم سے حقیقت میں بہت ہمدردی ہے۔''

وہ ایک ترحم بھری ہمدردانہ سی نگاہ اس پر ڈال کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ اپنی چیخ کو دبانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھے فرش پر بیٹھی تھی۔ ایک ساس نے جو خود کو ماں کہا کرتی تھی اپنی بہو کی عزت کو دس، بیس لاکھ روپے میں نیلام کر دیا تھا اپنی بہو کو رسوائی کروانے کے کام میں تعاون کے عوض اس نے کسی کو چند لاکھ روپے دیے تھے؟ چند لاکھ روپے، چند حقیر نوٹ کی قیمت صرف چند لاکھ روپے تھی؟ یہ اوقات

تھی خردا حسان کی، اس کی عزت یہ تھی اس ساس کی نگاہوں میں اپنی بہو کی کی اوقات وہ جو اس کی اگلی نسل کی امین تھی۔ وہ جو اس کے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی تھی اس کی عزت کا سودا ایک ساس نے' ایک ماں نے' ایک عورت نے چند ٹکوں کے عوض کر دیا تھا وہ اس سے اتنی نفرت کرتی تھی، اتنی نفرت کہ اس نے کسی کو پیسے دیئے تھے اسے رسوا کروانے کے لیے اس کے کردار پر تہمت لگوانے کے لیے، اسے بدکردار اور شوہر کی امانت میں خیانت کرنے والی ثابت کروانے کے لیے اسے اس کے شوہر کی نگاہوں سے گروانے کے لیے وہ محبت کے نام پر لٹ گئی تھی۔ محبت کا نام لے لے کر وہ عورت کس طرح اسے اپنی انگلیوں پر نچاتی رہی تھی۔

میری بیٹی کہہ کہہ کر وہ کیسے اسے بے وقوف بناتی آئی تھی۔ کتنی ہوشیاری سے اس نے آج کا یہ سارا منظر اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ اس کے ساتھ کون کون شریک رہا تھا اس ڈرامے میں۔ اس کی رسوائی کا تماشا لگوانے میں' اس کے دامن کو داغ دار کرانے میں۔ خضر عالم' زرینہ اجمل۔ اس اپارٹمنٹ میں اس وقت وہ بالکل تنہا تھی' زرینہ اور ان کی نوکرانی' وہ دونوں فریدہ اور اشعر کے آنے سے پہلے اس اپارٹمنٹ سے نکل چکی تھیں۔ اپر کلاس کی یہ عزت دار عورتیں اندر سے کتنی گھٹیا تھیں۔ اس نے اپنے وجود کو گھسیٹ کر اس جگہ سے باہر نکالا جہاں اس کی عزت، اس کے کردار، اس کی آبرو کو داغ دار کیا گیا تھا، اس کے بے داغ دامن پر چھینٹیں اڑائی گئی تھیں۔ کسی عورت کے کردار پر تہمت لگا دینا، دنیا کا سب سے آسان کام کرنے والی بھی ایک عورت ہے۔ اس نے پوری زندگی اپنے آپ کو، اپنی عورت کو کتنا سنبھال سنبھال کر اور بچا بچا کر رکھا تھا اور آج صرف چند منٹوں میں اس کے کردار کی دھجیاں اڑا دی گئی تھیں۔

وہ گرتی پڑتی اس بلڈنگ سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے اشعر کی خود سے بے وجہ ناراضی یاد آ رہی تھی۔ وہ ندرت کے گھر گئی تو سب کچھ ٹھیک تھا اور واپس آئی تو۔ اس کے پیچھے اسی عورت نے کوئی زہر اس کے کانوں میں انڈیلا تھا۔ وہ اس کا اتنا چاہنے والا شوہر اس سے اچانک ہی اتنا دور کیوں ہو گیا ہے، وہ وجہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اور اس کی ہنستی بستی زندگی میں آگ لگانے والی' اس کے بہت چاہنے والے شوہر کو اس سے دور کر دینے والی وہ عورت اس کی سب سے بڑی ہمدرد' سب سے بڑی چاہنے والی بنی ہوئی تھی۔ اس عورت کی سازشوں کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا تھا، کب سے وہ یہ گندا کھیل کھیل رہی تھی۔

وہ سڑک پر روتی ہوئی چل رہی تھی، اس کے ذہن میں گزرے دنوں کی ہر غیر اہم بات جو در حقیقت غیر اہم نہیں تھی۔ آتی جا رہی تھی۔ اور اشعر۔ وہ کیا اس کی ان گھٹیا باتوں کو سچ سمجھنے لگا تھا، کیا اس لیے وہ پورے نو دنوں تک اس سے اتنا ناراض، اتنا دور رہا تھا۔ وہ اس کے کردار پر شک کرتا رہا تھا، یہ سوچ کر اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی، وہ تین راتیں جب وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر اس سے لاتعلق لیٹا رہا تھا، تب وہ یہ سوچ سوچ کر روتی رہی تھی کہ اشعر مجھ سے کس بات پر ناراض ہے اور اشعر وہ اس کے کردار پر شک کر رہا تھا۔ وہ شک کی آگ میں جل رہا تھا۔ اشعر نے اس پر شک کس طرح کر لیا، اس کی ماں کی لگائی ہوئی شک کی آگ اگر بہت زور آور تھی تو کم تو اس کی محبت بھی نہیں تھی۔ اسے ماں کا دکھایا جھوٹ نظر آ گیا اور اس کی سچی محبت نظر نہیں آئی۔

اس نے ہاتھ دے کر ایک ٹیکسی کو روکا وہ اس میں بیٹھ کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ اپنے گھر۔ پتا نہیں وہاں اس کے ساتھ کیا کیا جانے

والا تھا اس کے ساتھ مزید کیا کچھ ہوتا رہتا تھا مگر اس ایک گھر کے سوا اس کے پاس جانے کے لیے کوئی دوسری جگہ ہی نہیں تھی۔ اور پھر وہ آخر کیوں نہ جائے اپنے گھر۔ اس نے کیا غلط کیا ہے۔ وہاں وہ عورت بھی ہوگی مگر اسے اس سے نہیں صرف اشعر سے مطلب ہے۔ وہ اشعر کے پاس جارہی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے گھر جارہی ہے، وہ اپنے گھر جارہی ہے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے ٹیکسی سے اتری۔

اس کا پرس وہیں خضر کے اپارٹمنٹ میں کہیں پڑا تھا اس نے چوکیدار سے ٹیکسی والے کو کرایہ دینے کے لیے کہا۔ وہ اپنے گھر کے اندر آ گئی۔ وہ پورے راستے روتی آئی تھی' وہ پورے راستے خود پر لگائے اتنے گندے الزامات' اتنی بدترین تہمت پر سسکتی آئی تھی۔ اشعر نے اس پر شک کیا' اس بات پر ذلت اور کرب سے دل کو کرچی کرچی ہوتا دیکھتی آئی تھی۔ اس نے اپنی بے گناہی کا اشعر کو یقین دلایا مگر وہ اس کا یقین کیے بغیر اسے روتا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس بات پر وہ اپنے اندر درد کی شدید ٹیسیں اٹھتی محسوس کرتی آئی تھی، جب اس کی ماں اس کی بیوی اس کی محبت اس کی خرد پر اتنے گھٹیا ترین الزام لگا رہی تھی، اس کے سر پر سے عزت کی چادر کھینچ کر اسے بے عزت کر رہی تھی۔ تب وہ چپ کیوں رہا تھا، اس نے اپنی ماں کی گندی زبان بند کیوں نہیں کروائی تھی، محبت میں اعتبار سب سے پہلی چیز ہے۔ اگر وہ اس سے واقعی محبت کرتا تھا تو اسے اس پر اعتبار بھی کرنا چاہئے تھا، چاہے دنیا کا کوئی بھی فرد آ کر اس سے کچھ بھی کہہ جاتا، چاہے دنیا کا کوئی بھی فرد آ کر خرد کے خلاف کوئی بھی الزام لگا جاتا چاہے اس کی آنکھ اسے کوئی سا بھی منظر دکھا جاتی۔ وہ اشعر بے اعتباری پر اپنی محبت کو بے عزت و رسوا ہوتے، اپنی انمول چاہت کو بے آبرو ہوتے دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس وقت اپنے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے روتے اور سسکتے دل نے یک دم ہی اشعر کے حق میں دلائل اور گواہیاں پیش کرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ عورت خرد کی ساس ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ساس، بہو کا رشتہ ہے، جب وہ بہو کے رشتے میں جہاں ایک دوسرے پر عموماً اعتماد اور محبت اتنی نہیں ہوتی، جب وہ اس عورت کی مکاریوں اور چالوں کا شکار ہوگئی تھی تو اشعر کی تو وہ ماں ہے۔ وہ ماں جسے وہ بہت اچھا سمجھتا ہے۔ جسے وہ دنیا کی بہترین عورت قرار دیتا ہے۔ جسے وہ دنیا کے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اپنا سمجھتا ہے۔ جسے وہ اپنا رول ماڈل، اپنا آئیڈیل مانتا ہے، وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ کس طرح سوچ سکتا تھا۔ اس مکار ترین عورت نے جس طرح بڑی چالاکی سے اسے اپنے دام میں لے رکھا تھا، اس سے اپنا ہر من چاہا کام کروایا تھا، ایسے ہی اس نے اشعر کو بھی نجانے کس کس وقت کون کون سی بات کس زاویے سے دکھائی ہوگی۔ بظاہر سادہ انداز میں۔ ایسے جیسے روٹین کی کوئی بات کر رہی ہو۔ ایسی کتنی ہی بظاہر معمولی باتیں تو اس کے سامنے کی تھیں۔

''خرد نے خون دیا۔''

''خرد نے سوپ بنایا۔''

اشعر ایک دم ہی اس پر شک نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں نے بڑا گندا کھیل کھیلا تھا۔ ان بہت محبت کرنے والے میاں بیوی کے بیچ بدگمانیاں اور دوریاں پیدا کروانے کے لیے بڑی مذموم حرکتیں کی تھیں۔ اور اس گھٹیا عورت کی حکمتِ عملی چالاکی اور عیاری پر اس طرح مشتمل تھی کہ اس پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اشعر کا قصور نہیں ہے۔ اشعر کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو خود اس وقت بہت ٹوٹا ہوا، بہت نڈھال ہوگا۔ وہ

اشعر کو شروع سے آخر تک سب کچھ بتائے گی، ایک ایک بات، اس کی ماں کی ایک ایک چال اسے سمجھائے گی۔ کیسے اس نے ان دونوں کو بیک وقت اپنی گھٹیا چالوں کا شکار بنایا ہے سب کچھ بتائے گی۔ اشعر کو دکھ تو بہت ہوگا' ماں کا جو ایک عظیم عورت کا بت اس نے اپنے دل میں بسا رکھا ہے وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ وہ اشعر کو کوئی دکھ دینے کا کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس کی ماں کی سچائی اس کے سامنے لائے بغیر اب اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ لٹے لٹے قدموں سے' بے دم سے انداز میں گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی مگر جیسے ہی اس کے دل نے اشعر کے حق میں بولنا شروع کیا۔ اسے بے قصور ثابت کرنا شروع کیا وہ فوراً ہی دیوانہ وار بھاگتی اندر آئی۔ پورچ اور اس کے بعد کا درمیانی تمام راستہ' طویل روش طے کر کے وہ اپنے گھر کے رہائشی حصے کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ دیوانہ وار بھاگتی اندر اپنے کمرے میں یا جہاں کہیں پر بھی اشعر تھا وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔

''اشعر! مجھے اپنے دل میں چھپا لو' مجھے اپنی پناہوں میں لے لو' یہ دنیا بہت گندی' بہت خطرناک جگہ ہے۔ میں تمہارے بغیر تنہا اس دنیا کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس دنیا کے ظلم سے بچا لو اشعر۔'' پاگلوں کی طرح، دیوانگی کے عالم میں انتہائی تیز رفتاری سے اس نے سامنے موجود دونوں اسٹیپس چڑھے، لکڑی کے بہت مضبوط اور بہت خوب صورت مرکزی دروازے پر ہاتھ رکھا تاکہ گھر کے اندر جا سکے۔

اس نے ابھی دروازے پر صرف ہاتھ رکھا تھا اور اندر سے ٹھیک اسی وقت کسی نے دروازہ کھول لیا تھا۔ دروازے کے سامنے تن کر وہ عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر سے محبتوں کا ماسک اتر چکا تھا۔ اپنی مکروہ اور گھناؤنی شکل لیے وہ اس کے سامنے دروازے کے آگے تن کر اس کا راستہ روک کر کھڑی تھی۔ وہ فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک مکروہ ہنسی تھی۔

''آپ نے میرے ساتھ اتنی نیچ حرکت۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انسان اتنا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے۔''

''پیر کی خاک کو سر پر بٹھا لیا تھا میرا بیٹے نے۔ مجھے اسے اس غلطی سے روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔'' وہ عورت حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دو کمروں کے کوارٹر سے اٹھ کر آئی۔ سرکاری اسکول ماسٹر کی بیٹی جسے میں اپنے گھر کی نوکرانی رکھنا پسند نہ کرتی۔ اسے میرے اتنے شاندار بیٹے کی بیوی بنا دیا جائے اور وہ احمق اسے سر کا تاج سمجھ کر سر پر سجا لے' میرے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا تھا خرد احسان۔''

وہ اپنے اندر کا زہر بے خوف و خطر باہر نکال رہی تھی۔ اس کو یوں دیکھ رہی تھی' جیسے زمین پر رینگنے والے کسی حقیر کیڑے کو دیکھا جاتا ہے۔ ابھی پیر رکھیں گے اور کیڑے کو اپنے پیروں تلے مسل کر رکھ دیں گے۔

''میں آپ کے بیٹے کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ گندا کھیل کھیلتے اتنا تو سوچ لیتیں۔ میرا نہیں تو اس بچے ہی کا خیال کر لیتیں جو آپ کے خاندان کا وارث بنے گا' آپ کے بیٹے کے نام کو آگے چلائے گا

''بچے کی ماں۔'' وہ عورت بلند آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔ ''کون سا بچہ۔ کس کا بچہ۔ میں ایسی کوئی بات نہیں جانتی۔ وہ استہزائیہ

نگاہوں سے اسے دیکھتے حقارت سے بولی تھی۔

''تمہیں میرا کھلا چیلنج ہے یہ خرد احسان! اگر اس زندگی میں تم یہ ثابت کر کے دکھا سکو کہ تمہاری کوکھ میں پلتا بچہ اشعر کا ہے۔ اگر اشعر تمہاری اس بات کا یقین کر لیتا ہے نا تو تم جیتیں میں ہاری۔''

وہ اسے اس وقت جن چیلنج دیتی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں' وہ نگاہیں اس کے باوجود کو بالکل سن کر گئی تھیں۔ خوف کی ایک انتہائی سرد لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ وہ عورت اب کیا کرنے والی تھی۔ وہ اپنے بچے کو اس عورت کی کسی گھناؤنی سازش کا شکار نہیں ہونے دے گی۔ وہ اشعر کو ابھی اور اسی وقت ایک ایک بات بالکل صاف صاف بتا دے گی۔ اس عورت کی ساری سازش وہ اشعر کے سامنے ابھی اسی وقت بے نقاب کر دے گی۔ وہ اشعر کی بیوی ہے۔ اس نے ہزار لوگوں کے سامنے اسے اپنے نکاح میں لیا تھا' وہ کہیں سے بھاگ کر نہیں آئی۔ وہ کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں اس کے ہونے والے بچے کی ماں ہے' اسے ماں کی لگائی ہر آگ کے باوجود خرد کی بات سننا ہو گی۔

''آپ سامنے سے ہٹیں مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ اب میں ہر بات صرف اپنے شوہر سے کروں گی۔'' وہ دروازے کے سامنے پوری طرح پھیل کر کھڑی تھی۔ اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ روک کر۔ اس نے غصے اور نفرت سے اسے سامنے سے ہٹنے کو کہا۔

''شوہر'' وہ عورت ایک مرتبہ پھر زور سے ہنسی تھی۔ ''میرا بیٹا اب زندگی بھر تمہاری شکل پر تھوکے گا بھی نہیں۔ ہو کس گمان میں تم خرد احسان۔ کسی بدکردار عورت کو کوئی مرد بیوی بنا کر نہیں رکھتا۔'' وہ اس پر حقارت بھری نظریں ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ گھر میرا ہے۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے اور اس گھر میں صرف وہی رہ سکتا ہے جسے میں یہاں رہنے دوں۔ میرے بیٹے کی حماقتوں اور نادانیوں کے سبب تم جیسی کم تر لڑکی نے اس گھر میں خوب عیش کر لیے۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر بہت کچھ حاصل کر لیا' اب یہاں سے اپنا ناپاک وجود سمیٹ کر چلتی پھرتی نظر آؤ۔ عزت سے یہاں سے خود دفع ہو جاؤ تو اچھا ہے ورنہ مجبوراً مجھے تمہیں دھکے مار کر یہاں سے باہر نکالنا پڑے گا۔''

اسے دھمکاتے اس عورت نے ایک سیکنڈ کے اندر دروازے کے آگے سے ہٹ کر دروازہ زوردار دھماکے سے واپس بند کر دیا تھا۔ اس نے اسے گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیا تھا، وہ لکڑی کے مضبوط دروازے کو خود پر بند ہوا بالکل ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا قیامت ابھی آئی نہیں تھی، آنے والی تھی۔ قیامت اب خضر عالم کے گھر، جیسے وہ قیامت سمجھتی تھی وہ تو صرف قیامت کی آمد کا ایک اعلان تھا، ایک پیغام تھا۔ قیامت تو اب اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس عورت کا پلان یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتا تھا کہ اس کا بیٹا اشعر حسین، خرد احسان کو خضر عالم کے اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ بالکل تنہا رنگے ہاتھوں پکڑ لے، اس عورت کے عزائم تو اس سے بہت بڑھ کر تھے بہوؤں سے تو بہت سی ساسوں کو نفرت ہو سکتی ہے، مگر وہ شاید دنیا کی واحد عورت تھی، جسے اپنے بیٹے کی اولاد تک سے محبت اور چاہت تو کیا کوئی ہمدردی تک نہیں تھی۔ وہ عورت کن پستیوں تک اتر سکتی تھی، وہ اس کے ساتھ کیا کیا کچھ کر سکتی تھی اگر اب بھی یہ نہ سمجھ پائی تو پھر آخر کب سمجھتی ہے۔ ''تمہیں میرا کھلا چیلنج ہے یہ خرد احسان اگر اس زندگی میں تم یہ ثابت کر کے دکھا سکو کہ تمہاری کوکھ میں پلتا بچہ اشعر کا ہے'' اس

عورت کی یہ دھمکی محض دھمکی نہیں تھی۔ وہ اپنی گندی چالیں چلتی حالات کو اس موڑ پر لے آئی تھی کہ آج اسے ایک باکردار اور حیادار لڑکی کو اپنے حق میں پیش کرنے کے لیے ثبوت اور گواہیاں تلاش کرنی پڑ رہی تھیں۔ اس پر اس کے گھر کے دروازے کو بند کیا جا رہا تھا۔ اسے گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جا رہا تھا اور اس کا شوہر، وہ کہاں تھا۔ کیا اس کے علم میں ہے یہ بات کہ اس کی ماں اس کی بیوی کو گھر کے اندر داخل تک نہیں ہونے دے رہی ہے۔ ''اشعر کہاں ہے' کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہے۔ کیا اس کی موجودگی میں اس کے ساتھ......نہیں۔'' اس کے دل نے فوراً اشعر کے حق میں گواہی دی تھی۔ وہ ماں کی سازشوں کا شکار ہو کر چاہے اس وقت اس سے جتنا بھی ناراض ہو مگر وہ اس کے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس پر اپنے گھر کے دروازے کبھی بھی بند نہیں کر سکتا۔ اس نے اس بند دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کیا تھا۔ اس گھر میں صرف وہ عورت نہیں، اگر اشعر گھر پر نہیں بھی ہے تب بھی کئی ملازم موجود ہیں، اس میں سے آکر کوئی بھی اس کے لیے دروازہ کھول سکتا ہے۔ وہ دروازہ بجاتی رہی' اندر سے دروازہ کسی نے بھی نہیں کھولا۔ اسے اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر اس کی دستک سننے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر لاؤنج کی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ اسے کھڑکی میں سے نور افزا نظر آئی تھی۔ وہ لاؤنج سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔

''نور افزا! دروازہ کھولو۔'' نور افزا نے سیڑھیوں پر یوں قدم رکھ دیا تھا جیسے اسے پیچھے سے اس کی آواز سنائی ہی نہیں دی ہے۔

''او میرے خدا۔''......اسے جیسے اب حقیقت میں یہ سمجھ میں آنا شروع ہوا کہ اب تک جو ہو رہا تھا' وہ کوئی معمولی سازش نہیں بلکہ اسے اس گھر اور اشعر کی زندگی سے نکالنے کے لیے تیار کیا گیا ایک انتہائی مضبوط منصوبہ تھا۔ وہ یک دم ہی کھڑکی کے سامنے سے ہٹی' وہ بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہونے کے دوسرے راستوں کی طرف آئی تھی۔ کچن کا باہر کھلنے والا دروازہ، ڈرائنگ روم کا لان میں کھلنے والا دروازہ، بیک یارڈ سے اندر جانے کا راستہ۔ ہر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس پر اس کے گھر کے دروازے بند تھے۔ اس گیٹ سے اندر گھسنے دیا گیا تھا مگر گھر کے اندر داخلے کا ہر راستہ اس کے لیے بند تھا۔ اس گھر میں چوکیدار اور ڈرائیور کو ملا کر کل دس ملازمین وہ تھے جو دن رات یہیں رہتے تھے۔ یہیں اس گھر کے پچھلے حصے میں ان سب کے سرونٹ کوارٹرز تھے اور اس وقت اسے کہیں کوئی ملازم نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار، اندر نظر آتی نور افزاء، اور بیک یارڈ میں بیٹھ کر پڑھائی کرتے نور افزا کے نواسے جمال کے سوا اسے گھر کے کسی کونے میں کوئی ملازم نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس عورت نے سارے نوکروں کو کہاں غائب کر دیا تھا اور اشعر وہ کہاں تھا؟ وہ بھاگتی ہوئی پھر گھر کے مرکزی حصے کی طرف آئی تھی۔ وہ پورچ میں آئی' اس نے اب توجہ سے وہاں کھڑی گاڑیوں کو دیکھا تھا۔ اشعر کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ وہ خضر کے اپارٹمنٹ سے گھر واپس ہی نہیں آیا ہے۔ وہ چوکیدار کی طرف آئی تھی۔

''نور بابا! کیا اشعر گھر واپس آئے ہیں۔ کیا وہ گھر پر ہیں۔''

چوکیدار سامنے سڑک پر جو کئی نظریں جمائے خاموش اور لاتعلق یوں بیٹھا رہا جیسے اسے اس کی آواز سنائی نہیں دی جیسے اسے اس کا وجود دکھائی نہیں دیا۔ خوف و دہشت سے کانپتی وہ بے یقین نگاہوں سے چوکیدار کو دیکھتی' وہاں سے پیچھے ہٹی تھی۔ یہ گھر واقعی فریدہ حسین کا گھر

تھا۔ یہ سب نوکر واقعی فریدہ حسین کے نوکر تھے۔ مایوسی میں گھری وہ پھر پچھلے حصے میں آئی۔ اس نے کیاریاں' کتابیں پھیلائے بنچ پر بیٹھے جمال کو دیکھا۔ اس سال پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری کرتا نورافزا کا یہ پندرہ سالہ نواسا جو اس کے نرم اور خلوص لیے انداز سے ہمت پکڑتا' کبھی کبھار اس سے پڑھائی میں مدد لینے کے لیے اس کے پاس آجایا کرتا تھا۔ وہ بھی اپنی نانی ہی کی طرح یہاں پر ملازم تھا اور کاموں سے فارغ ہونے کے بعد گھر کے اس پچھلے حصے میں بیٹھ کر پڑھائی کیا کرتا تھا۔

''جمال! نورافزا میری بات کا جواب نہیں دے رہی۔ تم اپنی نانی کی طرح مت کرنا' پلیز مجھے بس صرف اتنا بتا دو کہ کیا اشعر گھر پر ہیں۔'' جمال نے کچھ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر اپنی کتاب ہی پر نظریں مرکوز رکھتا بہت ہلکی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔ ساڑھے تین بجے کے قریب وہ دبئی سے گھر آئے تھے' آتے ہی بیگم صاحبہ کے ساتھ کہیں چلے گئے تھے' اس کے بعد سے وہ گھر پر واپس نہیں آئے۔''

جمال نے ہچکچاتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ بولنے کے بعد اس نے خوف زدہ نظروں سے دائیں بائیں دوبارہ دیکھا تھا۔ وہ جمال سے اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ اسے اپنے پاس کھڑا دیکھ کر جتنا زیادہ ڈرا ہوا محسوس ہو رہا تھا' اسے دیکھتے وہ اس کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ اس کی بات کا جواب جمال نے بہت ڈرتے ڈرتے دیا تھا اور یہ نظر آرہا تھا کہ وہ اس کی اپنے قریب موجودگی سے بری طرح خوفزدہ ہے۔ وہ آہستگی سے اس کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔

اس کا دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اشعر گھر پر نہیں تھا مگر پھر آخر وہ کہاں تھا۔ اس عورت نے اشعر تک پہنچنے کا ہر راستہ اس کے لیے بند کر دیا تھا۔ اس کا موبائل اس کے پرس میں پڑا تھا اور وہ پرس خضر کے گھر پر۔ وہ عورت اسے گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دے رہی۔ آخر وہ اشعر سے رابطہ کس طرح کرے۔ اس کے ہاتھ میں چند روپے تک نہیں کہ وہ اشعر سے رابطے کی کہیں باہر سے کوشش کر سکے۔ صرف چند گھنٹوں کے اندر وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دی گئی تھی۔

وہ اشعر حسین کی بیوی اپنے ہی گھر کے اندر بے سہارا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ بالکل خالی تھے۔ اس کے پاس اپنے شوہر سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ محلے میں کسی کے گھر سے جا کر کوشش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا یہ تو اپنا تماشا خود لگوانے والی بات تھی، جو بات ابھی کسی کو بھی نہیں پتا اس کا خود اشتہار لگوانے والی بات تھی اور ایک بات اور بھی تھی۔ وہ اس وقت اپنا گھر چھوڑ کر ایک منٹ کیا' ایک سیکنڈ کے لیے بھی کہیں باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس عورت کی نیت' اس کے ارادے' اس کے عزائم سب بہت خطرناک تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اشعر گھر پر واپس آئے اور وہ اس وقت گھر پر موجود نہ ہو۔ اشعر کی ماں اسے گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دے رہی مگر وہ ہے تو اپنے شوہر کے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی۔ اشعر آئے تو اسے یہاں موجود دیکھ لے اس کی ماں اس کی بیوی کو اندر داخل نہیں ہونے دے رہی وہ اس گھر کی چار دیواری سے ایک انچ بھی دور نہیں ہٹے گی۔ اسے اس وقت عزت اور بے عزتی کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس عورت کے ارادے انتہائی خطرناک تھے۔ آج جو کچھ وہ اس کے ساتھ اب تک کر چکی تھی، یوں لگ رہا تھا اس پر رونے اور ماتم کرنے کا اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ وہ

عورت اس کے ساتھ مزید ابھی کچھ اور بھی پہلے سے بھی زیادہ سنگین کر گزرنے والی ہے۔ اپنا شاک اپنا صدمہ اپنا دکھ اپنے آنسو سب پس پشت ڈال کر خود کو زندگی میں آئی اس ناگہانی مصیبت سے باہر نکالنے کے لیے اسے خود کو مضبوط بنانے کی ضرورت تھی۔ ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ صرف رونے اور آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کسی بھی قیمت پر اور کسی بھی طرح اشعر سے رابطہ کرنا تھا اسے یہ بات بتانا تھی کہ اس کی ماں نے ان دونوں کو اپنی بہت گندی سازش کا نشانہ بنایا ہے۔ اسے اشعر کے سامنے اس کی ماں کی ساری اصلیت لانی تھی۔ مگر وہ اشعر سے رابطہ کس طرح کرے، اس کے پاس اشعر سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور اشعر وہ۔ وہ گھر لوٹ نہیں رہا ہے۔ وہ جس انداز میں خضر کے اپارٹمنٹ سے نکل کر گیا تھا اسے اس کا وہ لٹا ہوا اور ٹوٹا بکھرتا انداز یاد تھا۔ وہ شدید ترین صدمے اور شاک کے زیر اثر تھا۔ وہ تو یہ نہیں جانتا ناں کہ جو کچھ بھی اس نے دیکھا وہ اس کی ماں کی گھناؤنی سازش ہے۔ وہ بری طرح شاکڈ تھا۔ اشعر کو اس پر یقین تھا مگر اتنا گھٹیا منظر دیکھ کر وہ فوراً تو شاک سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اشعر کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی ان رشتوں کے لیے کوئی بھی غیرت مند مرد کتنا حساس ہو سکتا ہے وہ سمجھتی تھی اور یہ سب یقیناً فریدہ حسین بھی سمجھتی تھی۔ تب ہی تو اس دھڑلے سے وہ اسے اس کے شوہر کے گھر میں داخل ہونے سے روک رہی تھی اس نے یہ سارا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا، آج سے پہلے تک کا بھی اور آج کے اس دن تک کا بھی اس عورت کا کوئی کام بغیر پلاننگ کے نہیں تھا۔

وہ جانتی تھی غم و غصے کا شکار ہو کر اشعر فوراً گھر واپس آئے گا، اس نے گھر سے سارے نوکروں کو بھی پتا نہیں کہاں غائب کر دیا تھا اور اب وہ اسے اس گھر سے نکالنے کی دھمکیاں دے رہی تھی اس کا وجدان اسے بتا رہا تھا کہ وہ عورت جو اس سے اتنی شدید نفرت کرتی ہے وہ اپنی کسی بھی پلاننگ کو کبھی ناکام نہیں ہونے دے گی۔ وہ اسے اس گھر سے اور اشعر کی زندگی سے باہر نکال دینے کا تہیہ کر چکی ہے۔ اشعر گھر واپس آ جائے، اشعر جلدی سے گھر واپس آ جائے ورنہ یہ عورت جو قیامت اس پر ڈھانے کا ارادہ کر چکی ہے اسے پورا کر کے ہی دم لے گی۔ اشعر پتا نہیں دنیا کے کس کونے میں جا چھپا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس وقت اس کے پاس اپنا موبائل ہوتا بھی تب بھی شاید اشعر اس وقت اس کی کال ریسیو نہیں کرتا۔ وہ جس حالات میں خضر کے گھر سے اس وقت نکل کر گیا تھا اسے دیکھ کر تو لگ رہا تھا وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد یہاں تک کہ اپنی ماں کی بھی کال ریسیو نہیں کر رہا ہوگا۔ اس عورت نے جال ہی اتنا گندا بچھایا تھا۔ وہ اشعر کی کیفیت اس کے صدمے اس کے شاک کو سمجھ رہی ہے تو وہ کیوں اسے نہیں سمجھ رہا، اسے کیوں یہ خیال نہیں آ رہا کہ جو کچھ دیکھا ہے اس پر یقین کرنے یا صدمے میں مبتلا ہونے سے پہلے ایک بار خرد سے تو جا کر پوچھ لے کہ یہ سب آخر تھا کیا۔ اشعر گھر واپس آ جاؤ۔ اشعر خدا کے لیے جلدی گھر واپس آ جاؤ۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے تمہاری ماں سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر تم واپس نہیں آئے ناں تو پتا نہیں یہ ظالم عورت اور کون سا ظلم مجھ پر توڑ ڈالے گی۔ مجھے اس عورت کے ظلم سے بچا لو اشعر۔"

وہ مرکزی دروازے کی سیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی اس کی نگاہیں بہت دور گیٹ پر جمی تھیں۔ گیٹ کے سامنے سے گزرتی ہر گاڑی پر اسے اشعر کی آمد کا گمان ہو رہا تھا۔ کسی گاڑی کی رفتار گیٹ کے پاس آ کر ہلکی پڑتی اس کی امیدوں کا بجھتا دیا پھر سے روشن ہونے لگتا۔ اس کی

آنکھوں سے بڑی خاموشی سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر اس کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

ایک سال پہلے ماں کے مرنے پر اس نے سوچا تھا میں تنہا رہ گئی ہوں مگر آج اسے حقیقت میں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔

شام کے چھ بج رہے تھے' اس وقت جب وہ خضر عالم کے گھر سے تہنیتیں لینے کے بعد اپنے گھر واپس آئی تھی اور اب رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس پر اس کے گھر کے دروازے پورے دو گھنٹوں سے بند تھے اور اشعر کا دور دور کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ ''اشعر خدا کے لیے گھر لوٹ آؤ۔ میں بہت مشکل میں ہوں، میں کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والی ہوں، مجھے ایسا لگ رہا ہے، تمہاری ماں اب پتا نہیں میرے ساتھ کیا کر گزرنے والی ہے۔ تمہیں ہماری محبت کا واسطہ ہے میری پکار سن لو، مجھے اس عورت سے آ کر بچا لو اشعر۔''

گھر کا وہ مرکزی دروازہ کھولا گیا تھا مگر اسے اندر بلانے کے لیے نہیں بلکہ دھمکانے کے لیے۔ ''تم ابھی تک یہاں ہو۔ کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کہ دھکے کھا کر نکالے جانے کا بہت شوق ہے۔'' وہ عورت اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی، وہ اسے اس گھر سے صاف الفاظ میں نکل جانے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت اور سفاکی ہی سفاکی بھری ہوئی تھی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اس وقت اس پر رحم کھا سکتا تھا مگر فریدہ حسین نہیں۔ ان کو آنکھوں میں اس کے لیے وہ نفرت تھی کہ ان کا بس نہیں چلتا، ورنہ اس کا وجود، اس کی ہستی مٹا کر رکھ دیں۔

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہاں سے جانے کو نہیں کہا۔ جب تک اشعر گھر واپس نہیں آ جاتے' میں یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔'' اندر ہی اندر اس عورت کی نفرت بھری نگاہوں سے اس کا دل ڈوبا تھا مگر بظاہر اس نے خود کو مضبوط ظاہر کر کے جرات سے یہ بات کہی۔

''میں اشعر حسین کی بیوی ہوں' کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں' جسے آپ گھر سے نکل جانے کا حکم سنا سکیں۔''

فریدہ حسین نے نفرت اور غیض وغضب سے بھری ایک نظر اس پر ڈالی تھی۔ ''لگتا ہے میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں نے دو گھنٹے پہلے تمہیں یہاں سے نکل جانے کو کہا تھا۔ اب آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی یہ منحوس شکل لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میرا بیٹا جہاں کہیں ہے' وہ اس وقت تک گھر واپس نہیں آئے گا جب تک تمہارے ناپاک وجود سے اس کا گھر پاک نہیں ہو جاتا

فریدہ حسین فیصلہ کن لہجے میں بولی تھیں۔ ''اور یہ جو شوہر شوہر کا مسلسل راگ الاپ رہی ہے تو چلو ایک گھنٹے کی میں نے تمہیں اور مہلت دی۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر اشعر گھر واپس آ گیا تو وہ بے غیرت مرد میرا بیٹا نہیں' تمہارا شوہر ہوگا اور اگر نہیں آیا تو میرا غیرت مند بیٹا جو کسی آوارہ' بدچلن عورت کو اپنی بیوی کا درجہ دینے کو ہرگز تیار نہیں۔''

وہ دروازے کے اندر واپس جانے لگی تھیں پھر کچھ یاد آنے پر مڑی تھیں۔

''یاد رکھنا خرد احسان! صرف ایک گھنٹے کی مہلت میں تمہیں اس گھر میں اور دے رہی ہوں۔ اگر ایک گھنٹے بعد بھی تم مجھے یہیں پر نظر آئیں تو میں تمہیں چوکیدار سے دھکے لگوا کر گھر سے باہر نکال دوں گی۔''

دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اسے جو کہا گیا وہ صرف ایک دھمکی نہیں تھی، وہ عورت اپنے کہے ہر لفظ پر عمل کر گزرنے والی تھی۔ اس کی نفرت اور انتقام سے بھری آنکھیں بتا رہی تھیں وہ آج اس پر کوئی رحم نہیں کھائے گی۔

''ایک گھنٹہ...... صرف ایک گھنٹہ۔'' وہ خوف و دہشت سے کانپنے لگی تھی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اسے اب حقیقت میں قیامت خود پر آتی نظر آ رہی تھی، اس کے گرد گھیرا تو اب تنگ ہوا تھا، اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین تو اب کھینچی جا رہی تھی، اس کے سر پر سے چھت تو اب چھینی جا رہی تھی۔ ''اشعر تم کہاں ہو؟ مجھے اس مشکل میں تنہا چھوڑ کر تم کہاں ہو؟ آ کر دیکھو تمہاری ماں مجھے کیا کیا کہہ رہی ہے، آ کر دیکھو تمہاری ماں میرے ساتھ کیا کر رہی ہے، آ کر دیکھو تمہاری ماں میرے ساتھ کیا کرنے والی ہے۔'' اسے اپنے ہاتھ پاؤں میں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھوں سے آنسو تک بہنا رک گئے تھے اگر ایک گھنٹے کے اندر اشعر گھر واپس نہیں آیا پھر۔ وہ عورت محض دھمکی نہیں دے رہی، وہ اسے واقعی دھکے دے کر اس گھر سے باہر نکال دے گی۔ پھر وہ کیا کرے گی۔ وہ کہاں جائے گی۔ پوری دنیا میں اس گھر کے سوا اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ پوری دنیا میں اشعر کے سوا اس کا کوئی اپنا نہیں۔ وہ اس کا ایک اپنا اس وقت کہاں تھا، وہ دنیا کے کس کونے میں جا چھپا تھا۔ وہ مصیبت کی اس گھڑی میں اس کے پاس کیوں نہیں آ رہا تھا۔ اسے اس عورت سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اس عورت کی آنکھوں سے چھلکتی نفرت اور انتقام سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ جو کچھ وہ اب اس کے ساتھ کرنے والی تھی وہ اب تک کی ہر بات سے بہت زیادہ خوفناک تھا۔ اس کا خوف و ہراس میں ڈوبا ذہن بالکل بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی کلائی پر بندھی گھڑی نے اسے وقت کا احساس دلایا تھا۔ سوا آٹھ بجے اسے دھمکی دی گئی تھی، ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا اور اب ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ گھڑی میں آگے بڑھتی سیکنڈوں کی سوئی اسے وقت کے بہت تیزی سے گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ خوف کی سرد لہریں مسلسل اس کے جسم میں دوڑ رہی ہیں۔ اس کے پاس وقت تنگ ہو رہا تھا اور اشعر وہ پتا نہیں اس اتنی بڑی دنیا میں کہاں جا چھپا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کہاں جائے۔ کس سے جا کر پوچھے کہ اس کا شوہر کہاں ہے۔ وہ ظالم عورت اس گھر کی مالکن تھی، اس کا شوہر اس کے قریب کہیں موجود نہیں تھا اور وہ ظالم عورت اپنی کہی کو پورا کرتی اسے واقعی اس گھر سے باہر نکال سکتی تھی۔ ایک دم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال پہلی مرتبہ آیا تھا۔

اتنی ہوشیاری سے یہ سارا پلان اس عورت نے اسے صرف اشعر کی نظروں سے گرانے کے لیے نہیں بلکہ اس کی زندگی سے باہر نکالنے کے لیے بنایا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ صرف ان کے بیچ دوری اور بدگمانی پیدا کروا کر مطمئن ہو جانے والوں میں سے نہ تھی۔ جو اسے یہ چیلنج دے رہی تھی کہ وہ اپنے بچے کا باپ اشعر کو ثابت کر کے دکھا دے، اس عورت کے انتقام اور اس کی نفرت کی حد کیا ہو سکتی تھی۔ اسے اس گھر سے نکال کر وہ اشعر کے وہاں آنے پر اس کے متعلق جو فرضی کہانی گھڑ کر اسے سنا سکتی تھی۔ جو اس کی موجودگی میں اشعر کے کانوں میں شک کا زہر انڈیلتی رہی تھی وہ اسے خود یہاں سے نکال کر اشعر کے سامنے کیا کیا ڈرامہ کر سکتی تھی۔

صرف چند گھنٹوں میں وہ بیس اکیس سال کی کم عمر' نادان اور بھولی بھالی لڑکی سے چالیس پینتالیس سال کی پختہ' سمجھ دار اور لوگوں کے چہروں سے ان کی نیتوں کو پہچان لینے والی عورت بن گئی تھی۔ صرف چند گھنٹوں کے اندر دنیا نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخنے محبتوں اور سچائیوں کی باتیں کرنے والی اس لڑکی کو دنیا اور اس میں بسنے والے لوگوں کی ساری سچائی سمجھا دی تھی۔ مصیبت میں انسان کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے یہ بھی بتا دیا تھا۔ دنیا کے نجانے کس گوشے میں چھپا اس کا شوہر آنکھوں دیکھے ایک جھوٹ پر یقین کرنے لگا تھا۔ اس کے حق میں کہیں سے کوئی گواہی نہیں آنے والی تھی۔ اسے خود کچھ سوچنا ہوگا' خود کچھ کرنا ہوگا۔ اسے گھر سے نکال کر مزید جو ڈرامہ وہ عورت کرنے والی ہے وہ اس کے ایسے کسی ڈرامے، کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ وہ اپنی اور اشعر کی محبت کو اس عورت کی نفرت سے ہارنے نہیں دے گی۔ اگر اشعر یوں گھنٹے کے اندر واپس نہیں آیا، اگر وہ عورت اسے یہاں سے نکال دینے میں کامیاب ہوگئی تو بھی وہ اپنی بے گناہی اور اس عورت کی سازش کا کوئی نہ کوئی ثبوت اشعر کے لیے ضرور چھوڑ کر جائے گی۔

یہ بات سوچتے ہی اس کا دل پھر رونے لگا تھا۔ پھر ہراساں ہونے لگا وہ یہاں سے آخر جائے گی کہاں۔ اس گھر کے سوا اس کی دوسری پناہ گاہ ہے کون سی۔ اس کے اندر کوئی اس سے کہہ رہا تھا اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس کے پاس رونے اور ڈرنے کا وقت نہیں ہے۔ بجکر ۳ منٹ ہو گئے تھے۔ اس عورت کی دی دھمکی کے مطابق اس کے پاس اب صرف ۳ یا ۴ منٹ باقی بچے تھے۔ اسے اشعر کے نام ایک خط لکھنا چاہیے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔ خط......لیکن اس کے پاس تو نہ کاغذ ہے' نہ قلم۔ وہ تو اس سرد ترین رات میں اپنے گھر سے باہر کھلے آسمان کے نیچے سیڑھی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے صرف ایک سیکنڈ سوچنے میں لگایا پھر، وہ ایک دم ہی سیڑھی پر سے اٹھی تھی۔ اٹھ کر اس نے چوکنی نگاہوں سے دائیں بائیں' آگے پیچھے اور اوپر دیکھا تھا۔ اس کے لیے اشعر سے رابطے کا، اس گھر میں داخلے کا ہر راستہ بند کر کے وہ عورت اندر اپنے کمرے میں یقیناً ہیٹر جلائے اسے دیے ایک گھنٹے کے گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ اوائل دسمبر کی ایک بہت سرد رات تھی، سرد ہوائیں ایسی چل رہی تھیں کہ جیسے جسم کو چھیل ہی ڈالیں گی۔ دن میں موسم اتنا زیادہ سرد نہیں تھا، لیکن اس وقت اس نے سوٹ کے اوپر جو اس کی ہم رنگ شال اوڑھ رکھی تھی وہ سردی کا مقابلہ کرنے میں ناکام تھی۔ مگر اسے اس وقت سردی' رات' اندھیرا' بھوک' پیاس کوئی بھی چیز محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آنے والے لمحوں کے خوف نے باقی ہر احساس کو مٹا دیا تھا۔ اس پل اسے بے عزتی اور ذلت تک کا احساس ہونا ختم ہو گیا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی' چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی گھر کے پچھلے حصے میں بنے سرونٹ کوارٹر کی طرف آگئی تھی۔ پچھلا پورا حصہ خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

نور افزا کے کوارٹر کے سوا باقی سب کوارٹرز ویران اور اندھیرے پڑے تھا۔

وہ دبے پاؤں اپنے ہی پیروں کی آہٹ سے سہمتی نور افزا کے کوارٹر کے پاس آگئی تھی۔ دروازے کے باہر سے اس نے جمال کو آہستہ سے آواز دی تھی۔ نور افزا یقیناً ابھی بھی گھر کے اندر ہی تھی۔ کمرے میں صرف جمال تھا۔ غالباً سردی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے وہ اب اپنے کوارٹر میں چارپائی پر بیٹھ کر پڑھائی کر رہا تھا۔ جمال نے دروازے کو نیم وا کر کے خوف زدہ سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''مجھے ایک کاغذ اور پین' پنسل کچھ بھی دے دو' جلدی سے۔ پلیز۔'' وہ اشعر حسین کی بیوی اس کے نام خط لکھنے کے لیے اس کے گھر کے ایک ملازم لڑکے سے کاغذ اور قلم منت بھرے لہجے میں مانگ رہی تھی۔

جمال کچھ کہے بغیر پلٹا' اس نے چارپائی پر سے اپنی ایک کاپی اٹھائی۔ اس کے درمیان سے کئی صفحے پھاڑے اور وہیں پڑا اپنا پین اٹھایا۔ ایک سیکنڈ میں اس نے دونوں چیزیں خوف زدہ انداز میں اس کے حوالے کردی تھیں۔ اب جمال کی طرح اس نے بھی ادھر ادھر یہ دیکھ کر اطمینان کیا تھا کہ اسے کاغذ اور قلم لیتے کسی نے دیکھا تو نہیں ہے۔

''یہ بات کسی کو بھی بتانا مت جمال۔'' سرگوشی نما آواز میں التجائیہ لہجے میں یہ بات کہتے وہ فوراً وہاں سے پلٹی تھی۔ کسی اور جگہ بیٹھنے کے بجائے وہ دوبارہ اسی سیڑھی پر پہلے کی طرح آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لیے ہر راستہ' ہر امکان بند کردینے کے بعد اندر بہت مطمئن بیٹھی وہ عورت اس وقت اسے دیکھ تو نہیں رہی تھی مگر کسی وقت اٹھ کر دیکھ تو سکتی تھی۔ وہ جگہ بدل کر اسے شک کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ کاغذ گود میں رکھ کر اسے اپنی چادر میں چھپا کر اور اپنا چہرہ گھٹنے پر رکھ کر ایسے جیسے وہ گھٹنے پر سر رکھے رو رہی ہے۔ وہ بہت چھپ کر اور ڈر کر اپنے شوہر کو یوں خط لکھ رہی تھی جیسے کوئی چوری کر رہی ہو جیسے کوئی بہت بڑا جرم کر رہی ہو اور پکڑے جانے پر سزا ملنے کا خوف دامن گیر ہو۔ اتنی احتیاط کے باوجود اسے گھڑی گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے وہ عورت اسے کہیں نہ کہیں سے یہ کرتا دیکھ رہی ہے وہ ہر اگلے سیکنڈ سر اٹھا کر ادھر ادھر خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا آپ اس وقت کسی جاسوسی ناول کے اس کردار کے جیسا لگ رہا تھا موت جس کے سر پر منڈلا رہی ہو، جس کا قاتل اس تک کسی بھی لمحے پہنچ جانے والا ہو۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ کانپتی انگلیوں میں قلم بہت چھپا کر پکڑے روتے ہوئے وہ پتا نہیں کیا لکھ رہی تھی۔ جو جو کچھ اس کے دل میں آرہا تھا لکھے جارہی تھی۔ اس کے پاس لفظ سنوارنے اور مضمون ترتیب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر چونکہ گھٹنوں پر کاغذوں کو چھپانے کے لیے رکھ رکھا تھا' اس لیے اس کے آنکھوں سے گرنے والے آنسو باوجود ہزار احتیاط کے کاغذ پر گر رہے تھے۔ پین کی سیاہ روشنائی جگہ جگہ سے پھیل رہی تھی۔ وہ خوف زدہ اور دکھ میں ایک ہی وقت میں مبتلا تھی۔ خوف اس بات کا کہ کہیں وہ عورت اسے خط لکھتے دیکھ نہ لے اور دکھ اس بات کا کہ زندگی میں آج وہ اس مقام پر آکر کھڑی ہوگئی ہے کہ اسے اپنے محبوب شوہر سے مخاطب ہونے کے لیے، اس تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایک خط کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ بغیر کسی گناہ کے، بغیر کسی قصور کے اسے اپنی صفائیاں دینی پڑ رہی ہیں۔ وہ مظلوم ہے، اس کے ساتھ آج بدترین ظلم ہوا ہے اور اسے خود ہی اپنے آپ کو بے گناہ بھی ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔ اپنے پریگنینٹ ہونے کی وہ ایک بات جو نجانے وہ کتنے خوب صورت انداز میں اپنے شوہر کو بتانا چاہتی تھی' آج ایک کاغذ پر لکھنا پڑ رہی ہے۔ وہ کاغذ جو پتا نہیں اس تک پہنچ بھی پائے گا کہ نہیں۔ اس کی آنکھوں سے متواتر گرتے آنسو اس کی بینائی کا راستہ روک رہے تھے۔ وہ جو لکھ رہی تھی، اسے صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ خوف سے کانپتی انگلیوں کے سبب قلم پر اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی، قلم اس کے ہاتھ سے گھڑی گھڑی پھسل رہا تھا۔ اس کی لکھائی بہت خراب اور ٹیڑھی میڑھی ہو رہی تھی۔ اس ٹیڑھی میڑھی اور بہت خراب لکھائی کو اس کے آنسو سیاہی پھیلا کر مزید بدنما بنا رہے تھے۔ وہ ابھی بہت کچھ لکھنا چاہتی تھی۔ جمال کے دیئے کاغذ بھی ابھی بچے ہوئے تھے، مگر وقت نہیں

بچا ہوا تھا۔ اس کی کلائی پر بندھی گھڑی نو بج کر دو منٹ بجا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تھا پھر اپنے خط لکھے کاپی کے ان کاغذوں کو بڑی سرعت سے ایک سیکنڈ کے اندر تہہ کیا تھا۔ کاپی کے درمیانی صفحات میں سے پھاڑے آپس میں جڑے ہوئے جو دو صفحے اس کے پاس ابھی باقی بچے ہوئے تھے۔ اس نے ان کاغذوں کو فولڈ کر کے انہیں ایک لفافے جیسی شکل دی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے خط لکھے کاغذ اپنے بنائے اس لفافے میں رکھے تھے۔ وہ اس خط کو کہاں رکھے' کسے دے جو یہ خط بحفاظت اشعر تک پہنچ جائے۔ خط لکھ لیا تھا اور یہ نہیں پتا تھا کہ گھر سے باہر بیٹھی ہو کر وہ اسے آخر ایسی کون سی جگہ چھپائے جہاں یہ فریدہ حسین کی نگاہوں سے چھپا رہے اور اشعر تک پہنچ جائے، بالکل اسی طرح جیسے چند منٹ پہلے خط لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ نہیں جانتی تھی کہ خط میں لکھے گی کیا۔ اگر واقعی فریدہ حسین نے اسے گھر سے نکال دیا تو وہ جائے گی کہاں، خط میں اپنے شوہر کو کون سی جگہ بتائے گی۔ جہاں وہ اسے گھر پر موجود نہ پا کر ڈھونڈتا ہوا آ جائے۔ اس پورے شہر میں کیا، اس پورے ملک میں کیا، اس پوری دنیا میں اس ایک گھر کے سوا اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس ایک شخص اشعر حسین کے سوا اس پوری دنیا میں اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا، کوئی اپنا نہیں تھا۔ ماں کے مرنے پر نہیں ماموں کے مرنے پر نہیں مگر آج اپنے شوہر کے موجود ہوتے وہ خود کو بھری دنیا میں بالکل تنہا، بے بس اور اکیلا پا رہی تھی۔ جو خوفناک سچ اس کا وجدان اسے دکھا رہا تھا، جو قیامت وہ عورت اس پر توڑنے کا اعلان کر رہی تھی وہ اب بھی اس سے بچ جانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

وہ اب بھی اشعر کی واپسی کی منتظر تھی۔ وہ واپس آ جائے گا' وہ اسے اس عورت کے ظلم سے بچا لے گا لیکن اگر وہ آج رات گھر واپس نہیں آیا۔ اگر واقعی اس عورت نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تو وہ کہاں جائے گی' کیسے جائے گی اور اپنے شوہر کے نام اپنا یہ خط جو اس عورت کے گھڑے ہر جھوٹ کے جواب میں اس کی بے گناہی کا واحد ثبوت ہوگا۔ اسے کس کو سونپ کر جائے گی' کس پر بھروسہ کرے گی۔

جمال؟ لیکن اس کے پاس اب وقت بہت کم ہے۔ گھڑی نو بجکر 7 بجا رہی تھی۔ آٹھ منٹ میں وہ سرونٹ کوارٹر تک جا کر وہاں جمال سے بات کر کے اسے خط پکڑا کر پھر وہاں سے یہاں تک واپس شاید نہیں آ سکتی تھی، اگر آ بھی پاتی تو اس میں بہت رسک تھا۔ اللہ میرے لیے کوئی راہ کھول دے، مجھے کوئی راستہ سمجھا دے، میں یہ خط کسے دوں، کہاں رکھوں کہ یہ اشعر تک ضرور پہنچ جائے۔ فریدہ حسین نے کسی جلد بازی میں نہیں بڑی منصوبہ بندی اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد آج کے دن کے تمام واقعات پلان کیے تھے، ابھی جو کچھ کر رہی تھی، جو کچھ ہو رہا تھا اور جو ہونے والا تھا وہ سب اس کے اس سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا۔ اس شاطر عورت کی فریدہ حسین کی شیطانی چالوں سے بچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، لیکن وہ یہ چاہتی تھی کہ اگر وہ یہاں سے نکال دی جائے تو اس عورت کو اپنی من چاہی اپنی سوچی کوئی گھٹیا کہانی اشعر کے سامنے گھڑنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ عورت کن پستیوں تک اتر سکتی تھی اس میں اب کیا شک کیا ابہام باقی رہ گیا تھا' اسے خود گھر سے نکال کر وہ اشعر سے یہ تک کہہ سکتی تھی کہ خرد' خضر کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ جو اسے یہ کہہ سکتی ہے کہ وہ پوری زندگی اپنے بچے کو اشعر کا بچہ ثابت نہیں کر سکے گی وہ عورت مزید کیا کچھ نہیں کر سکتی، نہیں کہہ سکتی۔ اسے اس عورت کے مزید کسی ناپاک اور غلیظ منصوبے کامیاب نہیں ہونے دینا تھا۔ گھڑی نو بج کر گیارہ منٹ بجا رہی تھی اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اس خط کو کہاں رکھے'

کسے دے۔ وہ سیڑھی پر سے بے چینی کے عالم میں اٹھی تھی' اسے کھڑکی کے پاس کسی کی جھلک سی نظر آئی تھی۔ شاید کوئی اسے جھانک کر گیا تھا' اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ نورافزا تھی۔

وہ دیوانہ وار کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر نورافزا جلدی سے کھڑکی کا پردہ کھینچنے لگی تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ اس نے فوراً سلائیڈنگ کھڑکی کھینچ کر تھوڑی سی کھولی۔

''نورافزا! پلیز میری بات سن لو۔ میرا یہ خط' میرا یہ خط' اگر تمہاری مالکن مجھے یہاں سے نکال دے تو اشعر کو دے دینا۔ پلیز دیکھو میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

نورافزا کھڑکی کے پاس سے ہٹنے لگی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ ''نورافزا! یاد ہے تمہیں۔ میں جمال کی پڑھائی کے لیے اشعر کے علاوہ الگ سے بھی پیسے دیا کرتی تھی۔ یاد ہے کبھی تمہاری طبیعت خراب ہوتی تو تمہیں کچن سے ہٹا کر میں خود کام کرلیا کرتی تھی۔ یاد ہے کبھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی تو میں فوراً دے دیا کرتی تھی۔ یاد ہے تم کہتی تھیں' میں بہت نرم دل کی ہوں' میری جیسی مالکن تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

اس نے روتے ہوئے اپنی ملازمہ سے التجا کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی پر اپنی کسی نیکی کا احسان جتانے کی کم ظرف ترین حرکت کی تھی۔ اپنے احسان کا صلہ مانگا تھا۔ ایسی کم ظرفی کی بات کرتے نورافزا سے تو کیا اسے خود اپنے آپ تک سے بہت شرم آئی تھی۔ مگر وہ کیا کرتی، اسے نورافزاء کو اپنی بات سننے کے لیے روکنے کا اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی مالکن سے اتنی زیادہ خائف تھی کہ خرد احسان سے تو کیا اس کے سائے تک سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی، اس کی سماعتیں اندر لگی ہوئی تھیں اور اسے لگ رہا تھا جیسے لاؤنج کے بند دروازے کے اس پار کوئی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ ''نورافزاء! پلیز دیکھو میرے پاس شاید وقت نہیں ہے۔''

وہ شدید خوف اور پریشانی سے پھر اس سے منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ نورافزاء نے گھبرا کر ایک نظر لاؤنج کے بند دروازے پر اور پھر اس پر ڈالی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ بہت تیزی سے لے لیا تھا۔ بہت بڑی سی چادر جو وہ ہمیشہ اوڑھے رہتی تھی' اس کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے لفافہ اپنے گریبان میں ڈال لیا تھا اور ساتھ ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں فوراً کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا تھا۔

بند پردے کے اس پار اندر کا اب کوئی منظر اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے اندر سے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو شاید حقیقت تھی' یا اس کا واہمہ تھی مگر یہ آواز اسے بری طرح ڈرا رہی تھی۔ کسی طرح آج کی یہ رات خیریت سے گزر جائے' کل صبح ان شاءاللہ اشعر گھر واپس آجائے گا۔ کل صبح تک ان شاءاللہ وہ اس صدمے کی حالت سے باہر نکل آئے گا۔ وہ منظر جس طرح اس کی ماں نے اس کے سامنے پیش کیا' اس سے بے شک وہ بہت زیادہ غم وغصے کا شکار ہوا ہوگا مگر اس کے متعلق وہ کوئی غلط بات کبھی نہیں سوچے گا۔ ابھی جس صدمے جس غصے کی حالت میں وہ ہے کل جب اس سے باہر نکلے گا ٹھنڈے دل اور دماغ سے تمام حالات کا دوبارہ سے جائزہ لے گا تو سب سے پہلے یہی سوچے گا کہ اس کی خرد اتنی نیچ کوئی حرکت کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ وہ منظر جس طرح اس کی ماں نے اس کے سامنے پیش کیا اس سے بے شک

وہ بہت زیادہ غم وغصے کا شکار ہوا ہوگا۔مگر اس کے متعلق وہ کوئی غلط بات کبھی نہیں سوچے گا۔بس آج کی رات گزر جائے ،کل کی صبح اس کی اس گھر کی چار دیواری کے اندر بخیریت آ جائے ،بس پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔اس نے اپنے پیچھے لکڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبا تھا۔اس کے پورے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔وہ سخت ترین سردی میں پوری کی پوری پسینوں میں نہا گئی تھی۔سر سے پاؤں تک بری طرح کانپتی وہ سیڑھی سے اٹھ گئی تھی۔ وہ کہاں جائے، کہاں جا کر چھپے جہاں اس ظالم عورت سے وہ خود کو بچا سکے۔

''اشعر! تم کہاں ہو۔ بچالو مجھے اس عورت سے ۔ یہ عورت نہیں ناگن ہے ۔ جو میری، تمہاری اور ہمارے بچے کی ہم تینوں کی زندگیوں کو ڈس لینا چاہتی ہے۔''اس نے اشعر کو دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ پکارا تھا۔اس نے اپنا تنا ہوا سر گھما کر گیٹ کی طرف دیکھا، شاید اشعر آ گیا ہو، شاید اشعر آ گیا ہو۔

''میرا دیا ایک گھنٹہ پورا ہو گیا ہے خرد احسان۔''اس بار وہ عورت اپنے پیچھے گھر کا وہ مرکزی دروازہ بند کر کے دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔ دونوں زینے اتر کر وہ اس کے بالکل مقابل کھڑی تھی۔''یہ لو اپنے راستے کا کرایہ جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ اور یہ چیک۔ اسے اپنا حق مہر سمجھو یا اتنا عرصہ جو میرے بیٹے کے ساتھ رہی ہو اس خدمت کا معاوضہ لیکن اس میں اتنی رقم لکھی ہے جو تم نے اپنے ماں باپ کے گھر کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔''اس عورت نے ہزار ہزار کے چند نوٹ اور ایک چیک اس کے منہ پر مارا تھا۔

''اب خود یہاں سے جانا پسند کرو گی یا میں نور خان کو آواز دوں۔''کوئی لچک' کوئی گنجائش اس کے لہجے میں نہیں تھی پھر بھی وہ اس سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''ممی! ایسا مت کریں۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے مت نکالیں۔ میں یہاں سے کہاں جاؤں گی۔''اس وقت اس ظالم عورت سے رحم کی بھیک مانگنے کے سوا اس کے پاس خود کو بچانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ زار و قطار روتے اس سے رحم کی التجا کر رہی تھی۔

''صرف ایک بار اشعر کو واپس آ جانے دیں۔ وہ آ کر اگر کہیں گے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں تو آپ سے وعدہ کرتی ہوں یہاں سے فوراً چلی جاؤں گی۔''

''خبردار جو اپنی ناپاک زبان سے میرے بیٹے کا نام لیا' وہ تھوکتا ہے تمہاری شکل پر۔ وہ یہاں ہوتا تو جو میں کر رہی ہوں' وہ بھی کر رہا ہوتا۔ایک آوارہ' بدچلن بیوی کو کوئی مرد اپنے گھر میں نہیں بساتا۔نور خان۔''

اسے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیتے اس نے ساتھ ہی چوکیدار کو زور سے آواز دی تھی۔ چوکیدار اس کے آواز دیتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز تیز چلتا اس طرف آنے لگا تھا۔

''ممی صرف آج کی رات' صرف آج کی رات مجھے یہاں رہنے دیں۔ اپنی بہو سمجھ کر نہیں' اپنے بیٹے کی بیوی سمجھ کر نہیں' صرف انسانیت کے ناتے۔ میں اتنی رات کو کہاں جاؤں گی۔''

وہ بری طرح روتے ہوئے بولی تھی۔ وہ چوکیدار کو اس طرف آتا دیکھ رہی تھی، اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے پھانسی کی سزا

پالینے والے کسی مجرم کو تختہ دار پر لے جایا جا رہا ہو۔ اور وہ زندگی کی طلب میں موت سے بھاگ جانے کی آخری کوشش کر رہا ہو۔

اس عورت کے سفاک اور ظالم چہرے کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ ایک رات کیا' میں تمہیں یہاں مزید ایک منٹ نہیں رہنے دوں گی۔

''نور خان! اسے گھر سے باہر نکالنا ہے۔ اگر زبان سے کہا مان لیتی ہے تو ٹھیک ہے' نہیں تو اسے ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر نکالنا ہے۔''

چوکیدار اس کا حکم مانتا اس کی طرف بڑھا تھا۔

''چلو بی بی!''

ممی...... صرف آج رات مجھے یہاں رہنے دیں' صرف آج کی رات۔ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔'' چوکیدار سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے وہ روتے ہوئے گڑگڑا رہی تھی۔

''ممی...... صرف آج کی رات...... ممی صرف آج کی رات...... مجھے اپنے گھر میں رہنے دیں۔ میں اتنی رات کو کہاں جاؤں گی ممی...... صرف آج کی رات کی مہلت دے دیں ممی...... آپ کو ماموں کا واسطہ ہے' آپ کو آپ کے بچوں کا واسطہ ہے' آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔''

چوکیدار اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا اور وہ پوری طاقت صرف کر کے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی گردن موڑ کر مسلسل اس عورت سے التجائیں کر رہی تھی۔ اس کی کوئی التجا اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ عورت کسی سلطنت کی ظالم اور مغرور ملکہ کی طرف اپنے غلام کو اپنے حکم کی تعمیل میں اپنے مجرم کو ملک بدری کی سزا دیتا دیکھ رہی تھی۔ چوکیدار اسے کھینچتا ہوا گیٹ تک لے آیا تھا۔ وہ روتے ہوئے گردن موڑ موڑ کر ''ممی صرف آج کی رات'' پکارے چلی جا رہی تھی۔ اسے لمبے چوڑے قوی الجثہ چوکیدار نے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کی تمام تر مزاحمت کے باوجود اسے گیٹ سے باہر دھکیل دیا تھا، چونکہ وہ خود کو باہر نکالے جانے سے بچانے کے لیے شدید ترین مزاحمت اپنے جسم کی تمام تر طاقت استعمال کر کے کر رہی تھی جو اس لمبے چوڑے قوی مرد کے آگے ہاتھی اور چیونٹی جیسا معاملہ تھا، مگر اپنے جسم کی اس طاقت کے استعمال کے دوران جب اسے باہر دھکیلا گیا تو وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھی۔ وہ اوندھے منہ گیٹ سے باہر زمین پر گر پڑی تھی۔ اسے باہر نکالنے کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گیٹ واپس بند کر لیا گیا تھا۔ گیٹ کے اندر سے وہ نوٹ اور وہ چیک کسی نے باہر اس کی طرف پھینکا تھا۔ تیز ہواؤں میں وہ تمام چیزیں اس کے گرد ادھر ادھر بکھری تھیں۔ ایک نوٹ ہوا کے زور سے اچھلتا کچھ دور جا گرا تھا۔

اس کام کے ساتھ ہی اندر گھر کی تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ دروازے' گیٹ ہر چیز بند ہونے اور لاک ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک منٹ کے بعد اب اندر سے کوئی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اپنی چوٹوں کو فراموش کیے ہونٹ پر سے بہتا خون صاف کیے بغیر وہ زمین پر سے اٹھی تھی۔ اگلے پل وہ زور زور سے اپنے گھر کی بیلیں بجا رہی تھی۔ اپنے گھر کا گیٹ پیٹ رہی تھی۔

''ممی......صرف آج کی رات مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دیں' صرف آج کی رات۔ میں رات کے وقت کہاں جاؤں گی۔ صرف آج کی رات ممی۔آپ سے وعدہ کرتی ہوں' اشعر کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں گی۔ممی صرف آج رات مجھے اپنے گھر میں پناہ دیں۔اندر مت آنے دیں۔ میں باہر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی رہوں گی جیسے ہی صبح ہوگی' یہاں سے فوراً چلی جاؤں گی۔ممی......صرف آج کی رات۔''

وہ بلبلیں کیے جا رہے تھی' وہ گیٹ پیٹے جا رہی تھی۔وہ روتے ہوئے اس عورت کو آوازیں دیے جا رہی تھی جو اس محل نما گھر کے اندر بہت دور اپنے جس آرام دہ کمرے میں لیٹی ہوگی وہاں تک تو اس کمزور لڑکی کی کوئی التجا اس کے کانوں تک پہنچ بھی نہیں رہی ہوگی۔وہ گیٹ پیٹتے پیٹتے تھک گئی تھی، وہ فریاد کرتے کرتے نڈھال ہوگئی تھی، اب وہ صرف گیٹ پر لگی تمام فینسی بیلوں کو یکے بعد دیگرے دبائے چلی جا رہی تھی۔اپنی ان بیلوں کی آواز اسے گیٹ تک سنائی دے رہی تھی۔مگر گھر کے اندر کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔مگر اس کی پکار سننے والا یہاں کوئی نہیں تھا، اس کی فریاد سننے والا یہاں کوئی نہیں تھا۔خرد احسان پر اس کے اپنے گھر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔اس کا شوہر پتا نہیں دنیا کے کس حصے میں روپوش ہوا بیٹھا تھا۔وہ تنہا لڑکی بے امان و بے سائبان کھلے آسمان کے نیچے کھڑی تھی۔اسے گیٹ پیٹتے، بلبلیں کرتے اور اس عورت کو آوازیں دیتے نجانے کتنی مدت گزر گئی تھی۔اس کے جسم کے اندر ہمت، طاقت سب ختم ہوگئی تھی، وہ گیٹ کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔سڑک پوری سنسان تھی، اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔یہ شہر کی وہ سب سے زیادہ پوش لوکیلیٹی تھی جہاں دن کے وقت بھی لوگوں کے گھروں کے باہر اور سڑک پر، سناٹا رہا کرتا تھا۔اس محل نما گھر ہی کی طرح یہاں کے باقی تمام گھر تھے، جن کی دیواریں اتنی اونچی اور اتنی سنگ لاخ تھیں کہ باہر ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع اندر آرام دہ کمروں میں بند لوگوں کو ہو نہیں سکتی تھی۔یہ وہ علاقہ تھا جہاں پڑوس میں موت ہو جائے تو پڑوسی کو دنوں اس موت کی خبر تک نہیں ہو پاتی تھی۔باقاعدہ شرکت کی دعوت دی جائے تو تدفین اور سوئم میں شرکت کر لیتے تھے۔ایسے میں ان اونچے اونچے، بڑے بڑے محلوں کے اندر سڑک پر بیٹھی کسی لڑکی کی کمزور آواز کہاں پہنچی ہوگی۔اس سرد رات شہر کے اس مہنگے ترین رہائشی علاقے کی یہ سڑک گیارہ بجے اس طرح سنسان اور ویران پڑی تھی جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔اسے گیٹ کے باہر بیٹھے گیارہ بج چکے تھے۔اسے اس عورت کے دل میں رحم جاگنے کی امید کرتے گیارہ بج چکے تھے۔اسے اشعر کا انتظار کرتے گیارہ بج چکے تھے۔

''تمہیں خود پر بھروسہ نہ ہو، مگر مجھے میری خرد پر پورا بھروسہ ہے۔'' کہاں تھا وہ اس پر پورا بھروسہ کرنے والا آ کر دیکھے اس کی خرد کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیسے اس کی ہستی مٹائی جا رہی ہے، فنا کی جا رہی ہے، اسے زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔اس کی نظریں گیٹ سے زیادہ سڑک پر جمی تھیں۔ابھی ایک گاڑی اس سڑک پر آئے گی، ابھی ایک گاڑی اس گیٹ کے باہر آ کر رکے گی، ابھی ایک شخص اس گاڑی سے باہر اترے گا، ابھی ایک شخص اس کے پاس آ کر اسے اپنی بانہوں میں چھپا لے گا۔''میرے ہوتے تم کبھی تنہا نہیں ہو خرد۔'' ہوا کے سرد تھپیڑے اس کے جسم سے آ کر ٹکرا رہے تھے۔خالی ہاتھ اور خالی دامن وہ کھلے آسمان کے نیچے اس گھر کے گیٹ کے باہر زمین پر بیٹھی رہی۔سڑک پر سے آنے والی اس ایک گاڑی کا انتظار کرتی وہ گیٹ کے باہر بیٹھی رہی، وہ زمین پر بیٹھی رہی، اس گھر سے خود کو قریب تر رکھنے کے لیے

وہ اس بلند آہنی گیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی جو اس پر بند تھا، جس میں اس کا داخلہ ختم کر دیا گیا تھا۔شاید اس ظالم عورت کو اس تنہا، جوان لڑکی پر ترس آ جائے، شاید بہت غیرت منداس کے شوہر تک اس کی کوئی فریاد پہنچ جائے۔ بہت غیرت مند تھا اس کا شوہر، وہ بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ تنہا اس کے گھر پر دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔اس کی غیرت اور عزت پر سخت چوٹ لگی تھی۔ اس کی نوجوان اور خوب صورت بیوی آدھی رات کے وقت سڑک پر بے یارو مدد گار بالکل تنہا بیٹھی تھی۔اپنے گھر سے نکال دی گئی تھی، جس کا دل چاہے آ کر اس تنہا لڑکی کے ساتھ جو چاہے کر جائے، اس کی عزت کو پامال کر جائے، اس بات سے اس غیرت مند انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی۔ غیرت کے یہ معنی ومفہوم وہ زندگی میں پہلی بار جان رہی تھی۔

گھڑی بارہ سے اوپر بڑھ چکی تھی۔اور گھڑی میں آگے بڑھتا ہر اگلا سیکنڈ اسے یہ بتا رہا تھا کہ اس کا یہاں بیٹھے رہنا بے سود ہے۔ اس کا غیرت مند شوہر اس مصیبت کی گھڑی میں اس کی عزت بچانے، اسے تحفظ دینے اس کے پاس نہیں آنے والا۔اپنی عزت بچا کر کسی محفوظ چھت تک اسے خود پہنچنا ہوگا۔ جو چھینٹیں بھی اس کے دامن پر اڑائی گئیں، جو داغ بھی اس کے کردار پر لگائے گئے پر ابھی تک اس کی عزت سلامت ہے، مگر یہاں آدھی رات کے وقت سڑک پر تنہا بیٹھے یہ عزت مزید کتنی دیر سلامت رہ پائے گی۔جب عزتوں کے محافظ تحفظ دینا بھول جاتے ہیں تب کمزور عورتوں کو اپنی عصمتوں کی حفاظت کے لیے خود ہی ہمت کرنی پڑتی ہے۔اس سرد ترین رات میں شاید سردی ہی کے سبب اس کے آنسو جم چکے تھے، برف بن چکے تھے، وہ روتے روتے تھک چکی تھی۔اس کے کمزور جسم میں مزید آنسو بہانے کی سکت نہیں تھی۔وہ گیٹ کے پاس سے زمین پر سے اٹھی تھی اسے بہت زور سے چکر آیا تھا۔خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے اس آہنی گیٹ ہی کا سہارا لیا تھا۔اس نے سر اٹھا کر اس عالی شان محل کی طرف دیکھا تھا۔جسے وہ اپنا گھر کہا کرتی تھی۔وہ محل اس کے قد سے بہت اونچا آسمان تک بلند تھا، اس محل کی بلندی آسمان کو چھو رہی تھی۔اس محل میں رہنے والے بہت اعلا تھے۔ بہت خاص تھے اور خرد احسان زمین پر پڑا ایک حقیر ذرہ زمین پر رینگتا ایک معمولی کیڑا تھا۔اس اونچے محل میں رہنے والا ایک شخص تھا، جو پتا نہیں اس سے کیا کیا کہا کرتا تھا، اس کی کہی باتوں کو سچ مان کر وہ خود کو اس محل کی ملکہ سمجھ بیٹھی تھی۔انسان اپنی اوقات بھولنے لگے تو اسے اس کی اوقات اس طرح یاد دلا دینی چاہیے۔ ''تمہیں پتا ہے خرد! تم میرے لیے کتنی خاص ہو، کتنی اہم ہو۔کبھی خود کو کسی سے کم مت سمجھنا۔اگر تم نے کبھی خود کو کسی کے مقابلے میں کم سمجھا تو مجھے لگے گا کہ شاید میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔'' کمی تو رہ گئی تھی، محبت میں نہیں اسے اس کی حقیقت، اس کی حیثیت سمجھانے میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والی وہ لڑکی کتنی مشکلوں سے جا کر کہیں آج سمجھ پائی تھی اپنی حقیقت، اپنی حیثیت، اپنی اصلیت۔خرد احسان اس اونچے محل میں رہنے والے بہت اونچے لوگوں سے بہت کم تر بہت معمولی، اشعر حسین کے پیروں کی خاک، دو کمروں کے کوارٹر سے اٹھ کر آئی کم حیثیت لڑکی، اپنی حیثیت سمجھائے جانے کے بعد اس بہت بڑے انسان کے گھر سے ذلتیں اور رسوائیاں ہمراہ لیے رخصت ہو رہی تھی۔اس اونچے محل کے سامنے سے اس نے اپنے قدم اٹھائے تھے۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں خرد! تم سے اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔'' اس کے قدم اٹھتے اٹھتے ایک

پل کے لیے رکے تھے۔ ''اگر دنیا کی تمام لڑکیوں میں سے مجھے اپنے لیے کسی ایک لڑکی کے انتخاب کا حق ملتا تو میرا انتخاب صرف تم ہوتیں، صرف تم۔'' اس محل پر نظریں جمائے اس نے اپنے قدم پھرا ٹھا لئے تھے۔''

''تمہیں اللہ نے خاص میرے لیے تخلیق کیا ہے۔ یہ اتنی خالص، اتنی سچی، اتنی سادہ اور نایاب لڑکی صرف میری ہے، صرف اور صرف میری، مجھے فخر ہوتا ہے تمہاری محبت پر، تمہارے ساتھ پر، تمہاری ہم راہی پر، تمہارا ہم سفر ہونے پر۔''

ہم سفر؟ اس محل پر سے نظریں ہٹا کر اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس سڑک پر تنہا چل رہی تھی۔ اس کی ہم سفری پر فخر کرنے والا اس کا ہم سفر ذلتوں اور رسوائیوں کے اس سفر میں اس کے ساتھ کہیں پر بھی نہیں تھا۔ اس نے یہ سفر اپنے ہم سفر کے بغیر بالکل تنہا طے کرنا شروع کیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ اس گھر میں آئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اس گھر سے جا رہی تھی۔ زمین اور آسمان کے بیچ خرد احسان کے لیے کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں رہی تھی۔ وہ بیچ سڑک پر سر جھکائے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں گر رہے تھے۔ اس سرد موسم میں ذلتوں اور رسوائیوں کی انتہا پر پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں نے گرنے سے انکار کر دیا تھا، اس کی آنکھیں نہیں رو رہی تھیں، اس کا دل رو رہا تھا، خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اپنے کردار پر اتنے شرمناک داغ لے کر اب وہ دنیا کے کس کونے میں جائے، کہاں پناہ ڈھونڈے، وہ بے دھیانی میں چلتی اس سڑک پر سے ایک دوسری سنسان اور ویران سڑک پر مڑ گئی تھی۔ وہاں بھی اندھیرا تھا، خاموشی تھی، خوفناک سناٹا تھا۔ ابھی تک تو صرف عزت کا تماشا لگا تھا مگر لگتا تھا آج رات یہ عزت انہیں سڑکوں میں سے کسی سڑک پر پامال ہو جائے گی۔ ذلت کی زندگی یا عزت کی موت، پاک دامن اور عزت دار عورتیں کس چیز کا انتخاب کرتی ہیں۔ سامنے سے بڑی تیز رفتاری سے ایک گاڑی اس سڑک پر اسی طرف آ رہی تھی۔ ذلت، رسوائی، تہمتیں اس زندگی سے یہ سب کچھ پانے کے بعد اب مزید اس زندگی کا کیا کرنا ہے۔ یہ ذلتیں، یہ رسوائیاں لے کر اسے زندہ نہیں رہنا، اسے یہ زندگی نہیں چاہئے، اسے موت چاہ ہے، اسے زندگی نہیں صرف موت چاہئے۔ نہیں زندہ رہنا اسے اس دنیا میں یہ دنیا اس کے لیے نہیں بنی۔ یہ دنیا صرف اور صرف فریدہ حسین جیسے مکار اور سفاک لوگوں کے لیے بنی ہے۔ خرد احسان جیسے بے وقوف لوگوں کو تو جینے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ زندگی کی تمنا میں پوری زندگی، زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں اور موت کی تمنا، موت کا فیصلہ صرف ایک لمحے کی بات ہوتی ہے، کہیں کسی کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑتا، صرف ایک بار موت کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی پڑتی ہیں ایک پل میں وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی، اندھیری سڑک پر وہ گاڑی اس کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے اور گاڑی کے بیچ میں صرف لمحے بھر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کے اور موت کے بیچ میں صرف ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب اس کے بالکل قریب ایک آواز ابھری۔

''ماما!'' کوئی اس کے اندر ہی سے اسے پکار رہا تھا۔ اس کے اپنے وجود میں سے اسے کوئی آواز دے رہا تھا۔

''میرا کیا قصور ہے ماما! آپ مجھے بھی مار دیں گی؟ مجھے زندہ رہنا ہے ماما۔ مجھے آپ کی گود میں آنا ہے، مجھے آپ کو دیکھنا ہے، مجھے آپ سے پیار کروانا ہے۔ مجھے آپ کو دیکھنا ہے ماما، مجھے آپ کے پاس آنا ہے ماما۔ مجھے مت ماریں ماما۔''

وہ ایک جھٹکے سے سامنے سے ہٹنے کی کوشش میں سڑک پر جا کر گری تھی۔ ایک سیکنڈ بھی دیر کرتی تو گاڑی اسے کچلتی ہوئی گزر جاتی۔

لمحے بھر میں ہٹنے کی کوشش کرتے وہ سڑک کے کنارے پر جا کر گری تھی۔ لمحہ بھر پہلے سڑک کے بیچوں بیچ جس جگہ وہ کھڑی تھی گاڑی اس جگہ پر سے تیز رفتاری سے گزرتی چلی گئی تھی۔

''نہیں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں تمہیں کبھی مرنے نہیں دوں گی۔ میرا بھی دل چاہتا ہے تم میری گود میں آؤ، میں تمہیں اپنے ساتھ لٹا کر خوب سارا پیار کروں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے تمہیں دیکھوں، تمہیں اپنی گود میں لٹاؤں، تم پر اپنی ساری چاہتیں وار دوں۔ مگر میرے بچے تمہیں ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤں یہ دنیا جس میں ابھی تم آئے نہیں ہو یہ بہت بری جگہ ہے۔ یہ دنیا اچھی جگہ نہیں ہے میرے بچے یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں ہے لیکن تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اس دنیا میں آنا چاہتے ہو تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گی، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ میں تمہیں کبھی مرنے نہیں دوں گی۔''

وہ سڑک پر سے کھڑی ہوگئی تھی۔ اس بار لڑکھڑاتے قدموں سے نہیں' وہ مضبوط قدموں سے زمین پر چل رہی تھی۔ عورت کمزور ہوسکتی ہے' بیوی کمزور ہوسکتی ہے' بہن کمزور ہوسکتی ہے' بیٹی کمزور ہوسکتی ہے' پر ماں کبھی کمزور نہیں ہوتی۔ جب بات اس کے بچے کی زندگی کی سلامتی کی آئے تو پھر اس وقت ماں کبھی بھی کمزور نہیں ہوتی۔ ایک گھنٹے سے سڑکوں پر بے سمت چلتی اس لڑکی کو اچانک ہی جیسے کسی نے بے دار کر دیا تھا۔ اس کے مردہ وجود میں جیسے کسی نے جان ڈال دی تھی۔ اس کے مرے ہوئے سب اعصاب پھر سے بیدار ہوگئے تھے وہ اب بے سمت نہیں چل رہی تھی۔ ان سڑکوں پر کسی بے روح جسم کی طرح پھرنا اس نے اب ترک کر دیا تھا۔ وہ اب مین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ مین روڈ پر پہنچ گئی تھی۔ مین روڈ پر ان رہائشی گھروں کے آگے کی سڑک جیسی ویرانی نہیں تھی۔ وہاں سخت ترین ٹھنڈ اور رات کا ایک بج جانے کے باوجود ٹریفک رواں دواں تھا، دن کے وقتوں جیسی گہما گہمی نہیں تھی۔ مگر ٹریفک تھا۔ اسے یہاں سے کہاں جانا ہے۔ وہ رکشہ روکے' ٹیکسی روکے یا کسی بس میں بیٹھے۔ اسے اس شہر کے اندر کسی جگہ پر نہیں اس شہر سے باہر اس دوسرے شہر میں جانا تھا جہاں سے ایک سال پہلے وہ اپنی مرتی ہوئی ماں کے ساتھ اس بڑے شہر میں آئی تھی۔ ایک سال پہلے جب وہ اس شہر میں آئی تھی تو دن کا وقت تھا، وہ ایک عالیشان گاڑی میں بیٹھی تھی، اس گاڑی کو اس کے ماموں کا ہینڈسم سا بیٹا ڈرائیو کر رہا تھا، برابر والی نشست پر اس کے ماموں بیٹھے تھے اور پیچھے وہ اپنی ماں کے ساتھ سہمی سہمی خوفزدہ بیٹھی تھی، یہاں آتے وقت کتنے لوگ اس کے ساتھ تھے اور یہاں سے جاتے وقت۔ نہ دن کا وقت تھا، نہ کوئی قیمتی گاڑی تھی نہ کوئی ساتھ کھڑا تھا۔ فقط وہ تھی اور اس کی رسوائیاں تھیں۔ جو لڑکی زندگی بھر کبھی گھر سے تنہا نکلی نہیں تھی۔ رات کے ایک بجے بالکل تنہا ایک سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ انجان اور معصوم لڑکی ایک سال کے بعد آج زندگی کے نجانے کتنے بہت سے رنگ دیکھ چکی تھی۔

یہاں آتے وقت کی بھولی بھولی لڑکی ایک سال میں زندگی کے ان تمام تجربات سے گزر گئی تھی جن سے لوگ ایک عمر گزار کر بھی نہیں گزرتے۔ اسے کہاں جانا تھا؟ بتول بانو کا گھر وہ گھر اس کا گھر نہیں تھا۔ بتول بانو اس کی کوئی رشتے دار نہیں تھیں۔ پر وہ انہیں اپنے بچپن سے جانتی ہے۔ وہ لوگ بھی اسے اس کے بچپن سے جانتے ہیں انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے گھٹنوں گھٹنوں چلنے سے لے کر بڑا ہونے تک دیکھا ہے۔ پر اس گھر کے مکین اس کی زندگی کے ہر پل کے گواہ تھے اور اس گھر کے سوا وہ دنیا میں اور کسی ایسی جگہ کو نہیں جانتی تھی جہاں وہ

اپنی رسوائیوں کی داستان لے کر اپنے کردار پر لگی تہمتیں لے کر پہنچ سکتی۔ مگر اس کے پاس تو وہاں تک پہنچنے کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ ذہن کو حاضر کر کے سوچنا شروع کیا تو یاد آیا وہ خالی ہاتھ کھڑی ہے اس کے پاس اپنی منزل تک پہنچنے کے پیسے بھی نہیں۔ اس عورت نے اس کی طرف ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے کرائے کے لیے اچھالے تو تھے' اس کی اوقات اسے یاد دلانے کے لیے وہ چند نوٹ اور ایک چیک اس کے منہ پر مارا تو تھا' اس کی اوقات اور حقیقت سے بہت بڑی رقم جو اس نے اس شہر میں آنے سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی وہ اس نے اپنے بیٹے کی خدمتوں کے عوض اسے دی تو تھی۔ ہاں بہت خدمت کی تھی اس نے اشعر حسین کی۔ ایک سال تک وہ اس کی بیوی کا رول نبھاتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ سوتی اور جاگتی رہی تھی۔ اس خدمت کا معاوضہ دے کر اسے رخصت کیا گیا تھا۔ کل وہ یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ میری خدمات مفت حاصل کر لی گئیں۔ ذلت کا پھر وہ شدید احساس رگوں کو کاٹنے لگا تھا۔ کہ زندہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے باوجود وہ خود کو مرا ہوا دیکھ رہی تھی، اس کی روح مر رہی تھی۔ وہ اندر سے ختم ہو رہی تھی۔ اپنی ذات پر سارا مان، سارا فخر، سب مٹ گیا تھا۔ وہ کسی کی عزت تھی، وہ کسی کی بیوی تھی اور ایک پل میں وہ کسی کی عزت نہیں رہی تھی، وہ سڑک پر کھڑی عورت بن گئی تھی۔

''باجی! آپ یہاں کھڑی ہیں۔ میں بہت دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔'' کوئی اس کے بالکل قریب آ کر بولا تھا۔

اس نے بری طرح چونک کر اپنے برابر میں دیکھا تھا۔ وہ جمال تھا' نور افزا کا پندرہ سالہ نواسا جمال۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور اس کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے اسے تلاش کر رہا ہے۔

''میں بہت دیر سے سب جگہ پر آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے لگا تھا آپ مین روڈ پر ہی آئیں گی۔ روڈ پر اس وقت اتنا رش بھی نہیں پھر بھی آپ مجھے مل نہیں رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا اگر آپ مجھے نہیں ملیں تو گھر جا کر مجھے اماں سے بہت ڈانٹ پڑے گی۔''

وہ گھر کے اندر جس طرح ڈرا' سہا تھا اس وقت اس کے برعکس اس سے ویسے ہی بات کر رہا تھا جیسے آج سے پہلے ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

''تمہیں نور افزا نے بھیجا ہے۔''

''ہاں اماں کو آپ کی بہت فکر ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا ہے آپ کو جہاں بھی جانا ہے' میں آپ کو وہاں پہنچا کر آؤں۔ بہت ڈرتے ڈرتے گھر کی پچھلی طرف کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلا ہوں۔ گیٹ کھول کر باہر نکلتا تو نور خان دیکھ لیتا۔'' اس 15 سال کے بچے کے لیے دیوار پھلانگ کر آنا، گھر سے چپکے سے نکلنا سب کچھ ایک ایڈونچر تھا۔

وہ اپنی ساری کارگزاری یوں سنا رہا تھا جیسے ابھی وہ اس کے بہادرانہ اور فلمی ہیرو جیسے انداز پر اسے سراہے گی مگر اس کی سنجیدگی اور لٹا پٹا انداز دیکھ کر جیسے اسے خود ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ یک دم ہی بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔ آج جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کا وہ گواہ تھا۔ ابھی کھلنڈرا نو عمر لڑکا تھا تو کیا ہوا، سمجھ تو ساری رکھتا تھا۔

''آپ کہاں جائیں گی۔ اماں نے مجھے کرائے کے لیے پیسے دے کر بھیجا ہے۔ آپ کو جہاں بھی جانا ہے' میں آپ کو وہاں پہنچا کر

آ ؤں گا۔''

''نورافزا''......اس کے دل نے شکر گزاری کے احساس تلے دب کر اپنی ملازمہ کا نام لیا تھا۔اس کے کسی اپنے کو اس پر ترس نہیں آرہا تھا۔اوراس بوڑھی بے بس نوکرانی کو ترس آ گیا تھا۔رات کے اس پہر وہ تنہا کہاں جائے گی، کیسے جائے گی۔اس بوڑھی نوکرانی نے اس پر رحم کھالیا تھا۔اپنے نواسے کو اس کے پاس پیسے دے کر بھیج کر،اس غریب عورت نے اپنی مالکن کے خوف کے باوجود کتنی ہمت، کتنی جرأت اور کتنی خدا ترسی کا کام کیا تھا۔نورافزا! آج جو نیکی تم نے میرے ساتھ کی ہے، میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی بہترین جزا عطا کرے، جو تم چاہو تمہیں بن مانگے ملے۔''

اپنے نواسے کو پیسے دے کر اس کے پاس بھیجنے والی وہ غریب اور جاہل عورت اس نے ہاورڈ آکسفورڈ اور yale Mit کے نام بھی نہیں سن رکھے تھے مگران جگہوں کے پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ قابلیت اور انسانوں کو پہچان لینے کی صلاحیت تھی اس کے اندر۔اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میرا مالک اور اس کی ماں آ کر اس لڑکی کو اس بری طرح دھتکار رہے ہیں تو شاید غلطی اس لڑکی ہی کی ہوگی۔شاید یہ ٹھیک کردار کی لڑکی نہیں ہوگی،شاید اس نے کوئی غلط کام کیا ہوگا بلکہ اس نے یہ سوچا تھا کہ حالات نے آخرایسا کون سا رخ اختیار کیا ہے، جو اس لڑکی پر اتنے گھناؤنے الزام لگ رہے ہیں۔وہ بری لڑکی نہیں یہ اس ملازمہ کو یقین تھا۔خاندانی عزت اور وقار نے غیرت مندی خوب سکھادی، Yale اور MIT کی ڈگریز نے قابلیت خوب جگادی،مگر یہ قابلیت اتنی سی بات سمجھانے میں ناکام رہی کہ میری اتنی حیادار بیوی جو مجھ تک سے آنکھوں میں حیا لے کر بات کرتی ہے۔کوئی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کرنے کے متعلق سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔بیوی کے کردار کا شوہر سے بڑھ کر گواہ اور کون ہوسکتا ہے۔ماں نے جو جھوٹ دکھایا وہ سچ نظر آنے لگا،مگر اس کی شرم وحیا،اس کی سچائی کچھ بھی یاد نہیں رہ سکی۔اس نے جمال کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔اسے اپنے قریب دیکھنے سے'اس کا ہاتھ پکڑنے سے اسے تحفظ کا احساس ہورہا تھا۔ وہ کم عمر دبلا پتلا سا لڑکا جس کی ابھی داڑھی مونچھیں تک بھی ڈھنگ سے نہ نکلی تھیں اسے تحفظ کا ایسا احساس دلا رہا تھا جسے اس کے ساتھ 15 سال کا ایک بچہ نہیں بلکہ کوئی توانا مرد کھڑا ہو۔وہ ہاتھ دے کر ایک ٹیکسی کو روک رہا تھا۔ساتھ ہی اس سے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کہاں جائے گی۔

''نواب شاہ۔''......اس کے جواب نے اسے حیران پریشان کردیا تھا۔وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ شہر کے اندر ہی کسی علاقے کا نام لے گی۔وہ اپنی نانی کے کہنے پر اپنی مالکن اور چوکیدار سے چھپ چھپا کر گھر کی دیوار پھلانگ کر اسے اس کی منزل تک پہنچانے آیا تھا،مگر اب اس بات سے پریشان ہورہا تھا کہ اسے کراچی سے نواب شاب تک چھوڑنے کس ذریعے جائے۔اسے اتنی دور چھوڑنے جانے اور پھر وہاں سے واپس آنے میں اسے کتنے گھنٹے لگ جائیں گے اور اگر اس دوران گھر میں اس کی غیر موجودگی کی خبر کسی طرح نور خان یا کسی اور کو ہوگئی پھر رات کے دو بج رہے تھے۔کسمپرسی، لاچار اور بے بسی کا عالم اور اس کے ساتھ موجود پندرہ سال کا لڑکا جو اس کا کوئی بھی نہیں لگتا تھا اس کی بحفاظت دوسرے شہر تک روانگی کا انتظام کررہا تھا وہ اسے رکشہ میں بٹھا کر اپنے رشتے کے ماموں غلام قادر کے گھر لے آیا تھا۔اس بچے کے لیے اتنی رات گئے اور وہ بھی بالکل تنہا اپنے اور اس کے کسی دوسرے شہر جانے کا انتظام کرنا مشکل کام تھا سو وہ مرد کے لیے اپنے ماموں کے

پاس چلا آیا تھا۔اس غریب بستی میں اس چھوٹے سے گھر میں سوتے ہوئے اپنے ماموں کو اٹھانے اور ساری بات سمجھانے میں جمال نے آٹھ منٹ لگائے تھے۔

''بات سنو جمال۔'' غلام قادر اور اس کے دوست حیات سے بات کر کے جمال اس کی طرف آیا تو اس نے فوراً ہی اسے مخاطب کیا تھا۔غلام قادر کچھ دیر قبل ان دونوں کو لے کر قریب ہی رہائش پذیر اپنے دوست حیات کے گھر آ گیا تھا۔اور اب حیات سے بات کر چکنے کے بعد یہ طے پا چکا تھا کہ حیات اپنی پک اپ میں اسے اور جمال کو لے کر نواب شاہ جائے گا۔ان تینوں سے الگ کھڑا ہونے کے باوجود اسے دور سے بھی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسے چھوڑنے کے لیے جانے پر آمادگی ظاہر کرتے حیات نے اس کام کے جتنے پیسے طلب کئے تھے اتنے شاید جمال کے پاس نہیں تھے۔دوستی اور تعلقات تھے تو کیا ہوا بہر حال حیات کو آدھی رات کو دوسرے شہر جانے اور پھر واپس آنے کے اپنی مرضی کے مطابق پیسے چاہیے تھے۔فی الحال یہ پیسے غلام قادر نے دے دیے تھے مگر ظاہر ہے اپنے رشتے کے اس ماموں کے ادھار دیے یہ پیسے جمال کو لازمی لوٹانے تھے۔جمال نے شاید غلام قادر سے وہ پیسے اسے کل ہی لا کر دے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ان دونوں سے بات چیت کرنے کے بعد جمال اس کے پاس آیا تو اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر مخاطب کیا تھا۔جمال اس کی بات سننے کے لیے توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ رکھ لو جمال۔'' اس نے اپنے جسم پر سجا واحد زیور اپنا نیکلس گلے سے اتار کر مٹھی میں دبا کر اسے جمال کو دینا چاہا تھا۔اس کے پاس اس وقت کوئی پیسے نہیں تھے اور وہ اس کم سن لڑکے اور اس کی بوڑھی نانی پر اپنے جانے کے کرائے کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔جمال بدک کر ایک دم یوں ہٹا تھا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔

''آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔آپ یہ مت کریں۔اسے پہن لیں۔'' وہ نوعمر لڑکا ایک دم ہی ایک باوقار اور سنجیدہ مرد بن گیا تھا اس کے ہاتھ میں زیور دیکھ کر وہ یوں شرمندہ ہو رہا تھا کہ ابھی زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''اسے رکھ لو جمال! منع مت کرو۔میں تمہاری بڑی بہن بن کر کہہ رہی ہوں۔''

''اگر آپ میری بڑی بہن کی طرح ہیں تو کیا میں آپ کا زیور لوں گا۔کیا بھائی بہنوں کا زیور لیتے ہیں۔'' الگ الگ لوگوں کے لیے غیرت کے الگ الگ معنی و مفہوم ہوتے ہیں۔پتا نہیں پندرہ سال کے لڑکے کا وہ اس وقت کس کے ساتھ موازنہ کر رہی تھی۔

''آئیے۔گاڑی میں بیٹھیں۔حیات' قادر ماما کا بہت اچھا دوست ہے وہ ہمیں وہاں تک پوری حفاظت سے پہنچا دے گا۔'' اسے مزید اصرار کا موقع دیے۔بغیر وہ اسے پک اپ کے قریب لے آیا تھا۔چند ہی سیکنڈز میں حیات نے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔گاڑی چلنا شروع ہوئی تھی۔یہ زندگی میں آگے کی طرف سفر نہیں تھا۔یہ خرد احسان کی واپسی کا سفر تھا۔ایک سال پہلے اس شہر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی، اپنا شہر اور اپنا گھر چھوڑ کر۔آج وہ واپس جا رہی تھی۔اپنے اسی شہر میں اس فرق کے ساتھ کہ اب ماں اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔اب وہاں اس کی ماں نہیں تھی۔یہ نیا سفر اور نیا شہر اسے راس نہیں آیا تھا۔وہ واپسی کا سفر طے کر کے پھر اپنے اسی شہر جا رہی تھی۔جہاں سے آئی تھی۔

اس کے برابر بیٹھا جمال بہت سنجیدہ اور متفکر سا نظر آ رہا تھا۔ وہ سارے راستے جمال کا ہاتھ پکڑے رہی تھی اور اس وقت بھی گاڑی سے باہر اترنے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہی اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''نور افزاء سے میرا بہت شکریہ کہنا جمال اور تمہارا ابھی بہت شکریہ۔ شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے مگر میں اور کیا کہوں۔ میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں زندگی میں بہت کامیابیاں اور بہت عروج دے۔''

☆......☆......☆


# سلگتے چہرے

ضوباریہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول......اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن پر سجی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لودے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرم سجل جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اُس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

رات کے بارہ بجے اپنے شوہر کے گھر کے گیٹ سے مایوس و نامراد چل پڑنے والی وہ لڑکی شاید اس کے ماں، باپ کی اس کے لیے کوئی دعائیں تھیں ان کی کوئی نیکیاں تھیں یا کسی پرائے کی سچے دل سے کبھی کی کوئی دعا تھی جو اپنے شوہر کے گھر سے رات کے وقت دھکے مار کر نکالی گئی۔ وہ تنہا و بے سہارا لڑکی اپنی عزت اور آبرو کی سلامتی کے ساتھ بحفاظت اس گھر تک آ گئی تھی۔ جہاں غربت تھی' پیسے کی تنگی تھی مگر دلوں میں وسعتیں تھیں۔ وہ اس گھر کے رہنے والے لوگوں کو اپنے بچپن سے جانتی تھی اور اسے یقین تھا کہ آگے مزید جو کچھ بھی ہو کم از کم یہ لوگ اسے اپنے گھر سے دھکے مار کر باہر نہیں نکالیں گے اسے ذلیل و بے عزت کر کے سڑک پر لے جا کر کھڑا نہیں کر دیں گے کھلے آسمان تلے بالکل بے سائبان کتنے گھنٹے تنہا اپنی عزت اور آبرو کی سلامتی کی دعائیں مانگتے، خوفزدہ و ہراساں ہوتے آخر کار وہ بحفاظت اس محفوظ پناہ گاہ اس چھت تلے آ گئی تھی جہاں اور کچھ ہو نہ ہو اس کی عزت ضرور محفوظ تھی۔ اپنے کردار پر، اپنی پارسائی پر بہت سی بدنما تہمتیں لے کر وہ یہاں آئی تھی۔ مگر اس پل عزت بچا کر یہاں تک پہنچ جانے نے اسے بتول بانو کے گلے لگ کر رلایا تھا۔ ہر تہمت کے باوجود بھی ایک چیز بچی تھی اس کے پاس اپنی ذات پر فخر کے لیے، اگر آج یہ بھی گنوا بیٹھی ہوتی تو پھر زندہ کس طرح رہتی۔ بتول بانو ان کے تینوں بیٹے' دونوں بہوئیں سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا یہ بتانے کی کوشش کرتے کرتے وہ بتول بانو کی گود میں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اشعر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے گلے' شکوے' ناراضیاں سب کچھ تھیں مگر اس کا انتظار ان سب سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ آئے گا، وہ اس کے پاس آئے گا تو اس کا اس کے ہاں آنا ہی اس بات کا واضح اظہار ہو گا کہ وہ اس پر بھروسا کرتا ہے، اس کا یقین کرتا ہے۔ اب کی بار وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ وہ آئے گا تو میں کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ اسے بہت گلے تھے' اسے بہت شکوے تھے۔ اسے بہت ناراضیاں تھیں۔ وہ اس سے لڑی نہیں، تب بھی اتنا تو ضرور پوچھے گی کہ ''سنو محبت کرنے والے کیا محبت کی آزمائش کے لمحوں میں یوں منہ موڑ جاتے ہیں؟'' حالانکہ اب دل میں اس کے حق میں پھر سے بہت گواہیاں تھیں، بہت صفائیاں، بہت وضاحتیں تھیں۔ ان کا دل اسے مسلسل اس سے بدگمان ہونے سے روک رہا تھا، اس کے خلاف سوچنے سے روک رہا تھا۔ اشعر نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا، وہ صرف اپنی ماں کی گندی چالوں کا نشانہ بنا ہے۔ وہ عورت اتنی چالاک، اتنی مکار اور اتنی شاطر تھی کہ اس کے شیطانی ذہن کی شاطر چالوں کو سمجھ لینا کوئی مذاق نہیں تھا۔ اس عورت نے اشعر کو اور اس کی دونوں کی نفسیات اور ان دونوں کے مزاج کو سامنے رکھ کر بڑی چالاکی سے ان کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا۔ وہ شیطان صفت عورت اس کا اور اشعر کا ذہن بیک وقت Read کر لیا کرتی تھی، یوں لگتا تھا وہ اس کے ذہن میں آتی سوچوں تک سے آگاہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ ایک انتہائی خطرناک تخریبی منصوبہ ساز ذہن رکھتی تھی۔ اور اس کے بنائے منصوبے میں کہیں کوئی نقص نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے اس منصوبے پر نجانے کتنے مہینوں سے آہستہ آہستہ عمل پیرا تھی۔ اور وہ دونوں اس منصوبے کو عمل میں لائے جانے کے وقت وہی کچھ کرتے چلے گئے تھے جو وہ عورت ان سے توقع کرتی تھی۔ ان دونوں نے اس کے تیار کیے ڈرامے میں اس کی منشا کے مطابق act کیا تھا، جو

وہ عورت کروانا چاہتی تھی، وہی کیا تھا۔ اس میں ان دونوں ہی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس عورت کی چالیں ہی اتنی خطرناک تھیں۔ وہ عورت جانتی تھی غم و غصے کا بری طرح شکار اشعر اس روز گھر واپس نہیں آئے گا، اس نے سارے نوکروں کو اس روز گھر سے غائب کر دیا تھا۔ یہ کھڑے کھڑے طے نہیں ہوا تھا کہ وہ آج خرد احسان کو اپنے گھر سے باہر نکال دے گی۔ اس عورت نے وہ سارا دن اس طرح، اسی ترتیب سے پلان کیا تھا، نجانے کتنے پہلے سے پلان کر رکھا تھا۔ جب وہ عورت اسے خود اپنے ساتھ محبت سے گاڑی میں بٹھا کر خضر کے اپارٹمنٹ میں لائی تھی تب کیا وہ سوچ پائی تھی کہ وہ عورت درحقیقت اس کے ساتھ کرنے کیا والی ہے؟ جب وہ اس عورت کی چالوں کا شکار بنتی چلی گئی ہے، اس کے گندے ذہن کو پڑھے بغیر اس کی منشا کے مطابق سب کچھ کیے چلی گئی ہے تو پھر اسے اشعر کو اتنی رعایت تو دینی چاہیے کہ وہ ماں کی چالوں کو سمجھے بغیر اس ساری صورت حال میں اس فطری انداز کا مظاہرہ کیوں کر گیا جس میں کوئی بھی شوہر اپنی غیرت اور عزت پر چوٹ پڑتی دیکھ کر مبتلا ہو جاتا ہے۔ اشعر کا ردعمل بالکل مرد کی فطرت خاص کر کسی بھی شوہر کے ایسی صورت حال میں ردعمل کے عین مطابق تھا۔ وہ عورت یہ بات جانتی تھی تب ہی تو یہ سب کچھ یوں ترتیب دیا تھا۔

بتول بانو کے گھر آ کر تیرہ' چودہ دن تو وہ پلنگ سے کھڑی ہی نہیں ہو سکی تھی۔ وہاں آتے ہی' پناہ کا احساس ملتے ہی جو وہ گری تو اگلے کئی دن اس کی حالت سنبھل نہیں سکی تھی بتول بانو اپنی بہو' بیٹے کے ساتھ اسے بمشکل ڈاکٹر کے پاس لے جا سکی تھیں۔ ان کے بڑے دو بیٹے شادی شدہ بیوی بچوں والے معمولی نوکری پیشہ لوگ تھے جن کی آمدنی سے ان کے بیوی بچوں کے اخراجات بمشکل پورے ہوا کرتے تھے۔ تیسرا بیٹا پڑھ رہا تھا اور اپنی پڑھائی کا خرچا نکالنے کے لیے اسے دو' دو جگہ پرائیویٹ نوکریاں کرنا پڑ رہی تھیں۔ ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے کے حالات جیسے ہو سکتے تھے' ویسے ہی ان کے گھر کے حالات تھے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی پریگنینسی میں پیچیدگیوں کے خطرات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ڈلیوری کے وقت پیچیدگیوں کے خطرات پیدا ہو گئے تھے مگر اتنا تو تھا کہ اس کا بچہ سلامت تھا۔ وہ بستر سے بغیر سہارے کے سیدھی کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے کبھی بے بسی سے اور کبھی روتے ہوئے مسلسل اشعر ہی کو پکار رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹے اس کی نظریں ہر پل اس چھوٹے سے گھر کے دروازے کو تکتی رہتی تھیں۔

اسے یہاں آئے یہاں بیس روز ہو گئے تھے اب تک تو اشعر شاک کی حالت میں گھر سے دور نہیں ہوگا' اب تک تو وہ گھر واپس آ گیا ہوگا' اب تک تو اسے نور افزاء سے وہ خط مل چکا ہوگا۔ اس کی ماں نے جو بھی گھٹیا کہانی خرد کی غیر موجودگی کی اسے سنائی ہو پر وہ وہاں اس کے لیے ایک خط چھوڑ کر آئی ہے اب تک تو وہ خط نور افزاء اسے دے چکی ہوگی۔ اب تک تو وہ اس خط کو پڑھ چکا ہوگا۔ پھر وہ اس سے رابطہ کیوں نہیں کر رہا۔

کہیں ایسا تو نہیں وہ خط اشعر کو ملا ہی نہیں ہے۔ نور افزا نے وہ خط اشعر کو دیا ہی نہیں ہے۔

نور افزا کے خلاف سوچنے کے لیے اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ بتول بانو کے گھر آنے کی اس اکسویں رات میں لیٹ کر بے چینی سے ادھر ادھر کروٹیں بدلتے اس نے سوچا تھا۔ اسے اشعر سے خود رابطہ کرنا چاہیے۔ مزید وہ اس انتظار اور اس کشمکش میں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی

کہ پتا نہیں اشعر کو خط ملا یا نہیں' وہ شاک سے باہر نکلا یا نہیں۔

وہ اشعر سے اس کے موبائل پر رابطے کی کوششیں کر کر کے تھک گئی تھی

مگر موبائل پر رابطہ کسی قیمت پر نہیں ہو پا رہا تھا۔ گھر پر فون کرنے کی کوشش کرنا کیا' ایسا سوچنا بھی حماقت تھا۔

آفس۔ ہاں اسے اشعر کے آفس میں اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ آفس میں رابطے کا خیال آتے ہی اس کے اندر ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اشعر کے آفس میں اس کے ذاتی نمبر پر کال کی۔ بیل بالکل ٹھیک جا رہی تھی۔ پہلی بیل اور پھر دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو۔'' اشعر کی آواز' یوں لگا تھا جیسے صدیوں بعد اس نے یہ آواز سنی ہے۔ اس کا دل ایک دم ہی بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے لگی تھیں۔

''تمہیں پتا ہے اشعر! تمہاری ماں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ میں مرتے مرتے بچی ہوں اور ہمارا بچہ۔''

وہ پتا نہیں کیا کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی دل چاہا تھا اسے خود پر ہوا ایک ایک ظلم روتے ہوئے بتا ڈالے' مگر جو وہ بولی وہ صرف اتنا سا۔

''ہیلو اشعر! میں خرد بات کر رہی۔'' اسے اس کا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ اس کی بات دوسری طرف سے آئی سرد آواز نے یکلخت ہی کاٹ دی تھی۔

''سوری میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتا۔'' سرد و سپاٹ لہجے میں بات پوری کرتے ہی دوسری طرف ریسیور بہت زور سے پٹخا گیا تھا۔

ریسیور کان سے لگائے وہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

''میرا بیٹا اب زندگی بھر تمہاری شکل پر تھوکے گا بھی نہیں۔ ہو کس گمان میں تم خرد احسان۔ کسی بدکردار عورت کو کوئی مرد بیوی بنا کر نہیں رکھتا۔'' فریدہ حسین اس کے سامنے کھڑی قہقہے لگا لگا کر ہنس رہی تھی۔ اس کا شوہر اسے آوارہ' بدچلن' بدکردار سمجھتا تھا۔ اسے آنکھوں دیکھی ہر بات پر یقین آ چکا تھا۔ ماں کی لگائی ہر آگ کو وہ سچ مان چکا تھا اس کی طرف کی بات سنے بغیر اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر وہ اسے مجرم قرار دے چکا تھا اس کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی خاموشی سے گرے۔ اسے خود پر ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ آج سب امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ سب خوش گمانیاں ختم ہو گئی تھیں وہ نہ محبت کرنا جانتا تھا' نہ محبت نبھانا۔

وہ محبت کرنے والی لڑکی خرد احسان مر چکی تھی مگر ابھی ایک بیوی زندہ تھی' ابھی ایک ماں زندہ تھی۔ اس بیوی کو اپنے لیے' اپنے ہونے والے بچے کے لیے اس شخص کی بہت ضرورت تھی۔ اب صرف عزت کا سوال تھا۔ ایک بیوی کو اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے اپنے کردار کی گواہی چاہیے تھی' اس پر اپنی بے گناہی ثابت کرنی تھی۔

وہ اپنے بچے کی زندگی کو ایک گالی کبھی نہیں بننے دے گی۔

اس نے اشعر کے آفس کے اسی پرسنل نمبر پر دوبارہ کالز کرنے کی بے شمار اور ان گنت بار کوششیں کی تھیں۔ مگر وہ نمبر اس کا اپنے شوہر سے رابطہ نہیں کرا رہا تھا۔ ''میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتا۔'' یہ تک کہنے والا کوئی اس نمبر پر موجود نہیں تھا۔ اس کی طبیعت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب ہوتی چلی جارہی تھی۔

اس کی پریگنینسی میں اتنی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں کہ ابتدا لیڈی ڈاکٹر کے پاس بتول بانو اس کی چھوٹی سی کلینک میں اسے لے جاتی رہی تھیں' اس نے ممکنہ خطرات سے آگاہ کرتے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اسے کسی تمام سہولیات والے بڑے ہسپتال میں لے کر جائیں تاکہ جب ڈلیوری کا وقت آئے اور خدانا خواستہ کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا ہو جائے تو اس سے باآسانی نمٹا جاسکے۔ خوراک' غذا' دوا ان چیزوں کا وہ ماں ہوش کہاں سے کرتی جسے اپنے بچے کی ولدیت ثابت کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کے موبائل اور اس کے پرسنل فون نمبر پر کالیں ملانے کے جتن کر رہی ہوتی اور وہاں اس کی پکار کا جواب دینے والا کوئی بھی نہ ہوتا تو اسے اپنا آپ کسی بازاری عورت جیسا ہی لگتا۔

وہ جن کے گھر میں رہ رہی تھی۔ ان تک سے نظریں چرا کر رہا کرتی تھی۔ ترس' ہمدردی سب اپنی جگہ مگر شوہر کی نظروں سے گری' ان لوگوں پر مالی بوجھ بن کر آ بیٹھی وہ لڑکی اب بتول بانو کے سوا اس گھر کے تمام مکینوں کے لیے صرف اور صرف ایک بوجھ ہی بنتی جارہی تھی۔ ایسا بوجھ جسے وہ پرانے تعلقات کے لحاظ میں اٹھا تو رہے تھے مگر دل کی خوشی سے ہرگز نہیں۔ جہاں اپنے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہوں وہاں یہ اضافہ بوجھ ان سفید پوشی کا بھرم رکھے لوگوں کے لیے کوئی خوشگوار چیز نہیں تھا۔ یہ اس کی پریگنینسی کا پانچواں مہینہ تھا اور اب اسے اشعر حسین کو اس کے دفتر کے پتے پر خط بھیجے بھی ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ ہر گزرتا دن اسے فریدہ حسین کا چیلنج یاد دلا رہا تھا۔ وہ اس زندگی میں اپنے بچے کو اشعر کے بچہ ثابت نہیں کر سکے گی۔ وہ خوف سے نئے سرے سے کانپنے لگتی۔

پھر یہ اس رات کی بات تھی جب چھٹا مہینہ پورا ہو کر اس کی پریگنینسی کا ساتواں مہینہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ اس رات اسے شدید درد محسوس ہونا شروع ہوا۔ وہ اس گھر کے لوگوں کو پہلے ہی بہت زیادہ پریشان کر رہی تھی' آدھی رات کے وقت وہ سب کو سوتے سے اٹھا کر مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے وہ پوری رات درد سے کراہتے' درد کو تنہا سہتے گزاری تھی۔ اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ تنہا درد سہنے کی وہ رات اتنی طویل تھی جیسے کبھی اس کی سحر ہوگی ہی نہیں۔ پھر آخرکار طلوع ہو ہی گئی تھی۔ صبح ہونے پر بجائے اپنی حالت بتول بانو کو بتانے کے وہ ہمت کر کے بمشکل اٹھ کر ٹیلی فون تک آئی تھی۔ اسے اس وقت فوراً ہسپتال جانا چاہیے۔ وہ جانتی تھی مگر وہ ایک آخری کوشش ہسپتال جانے سے پہلے کر لینا چاہتی تھی۔ اسے اتنا شدید درد ہو رہا تھا کہ وہ اپنی چیخوں کو مشکلوں سے روک رہی تھی دیوار کا سہارا لے کر وہ بمشکل فون نمبر ملا پائی تھی۔ اس کے وہی ذاتی نمبر۔ کیا پتا آج وہاں اس کی پکار سن لی جائے۔ مگر نہیں اس نمبر پر آج بھی وہ اس شخص تک رسائی پانے میں ناکام تھی۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ اس سے اب مزید بالکل بھی کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ کسی بھی لمحے گر پڑے گی۔

''میری اشعر سے بات کرادیں۔'' اپنی چیخ کو دباتے اس نے بمشکل کہا تھا۔لبوں کو دانتوں سے کچلتے وہ اپنی چیخوں کو دبا رہی تھی''سر اس وقت آفس میں نہیں ہیں۔''

غالباً فون بند کردینے والی تھی جب اس نے سیکریٹری کی آواز کے پیچھے' کہیں بہت دور اشعر کی آواز سنی۔وہ اس آواز کو میلوں کے فاصلے پر بھی پہچاننے میں کبھی دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھی

''وہ آفس ہی میں ہیں۔آپ میری ان سے بات کرائیے۔'' وہ اس بار درد سے چلائی تھی۔وہ اپنے چیخ کو دبا نہیں پائی تھی۔دیوار پر رکھا اس کا پسینے میں بھیگا ہاتھ دیوار پر سے تیزی سے پھسلنے لگا تھا۔اس کے پیر اس کے جسم کا بوجھ مزید اٹھانے سے انکاری ہورہے تھے' وہ کسی بھی لحہ گر پڑنے والی تھی' وہ رو پڑی تھی

''سوری میم! سر بزی ہیں' وہ آپ سے بات نہیں کرسکیں گے۔'' اس کی روتی ہوئی آواز سے پریشان ہوکر سیکریٹری نے بے بس سے لہجے میں کہا تھا۔

''آپ پلیز میری ان سے بات کرادیجئے' پلیز۔ان سے کہئے۔'' درد کی ایک شدید لہر اس کے اندر سے ایسی اٹھی کہ وہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکی' وہ رو رہی تھی۔اس کا لہجہ منت بھرا تھا۔وہ اشعر حسین کی بیوی جو آنے والے چند گھنٹوں میں اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔اس کی چند ہزار روپے ماہوار پر ملازم ایک سیکریٹری کی روتے ہوئے منت کررہی تھی۔

''آئم ویری سوری میم! آپ کی کوئی بھی کال ریسیو کرنے سے سر نے سختی سے منع کررکھا ہے۔''

اس کے رونے اور گڑگڑانے سے بوکھلا کر سیکریٹری نے مزید جھوٹ بولنے کے بجائے صاف بات کرنا مناسب سمجھا تھا اور پھر اس کی مزید التجاؤں سے بچنے کے لئے بات پوری کرتے ہی کھٹاک سے فون بند کردیا تھا۔

''دیوار پر پھسلتا اس کا ہاتھ نیچے آتا چلا گیا تھا' ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا درد سے چلاتی وہ زمین پر گری تھی اور اس کی چیخ سے پورا گھر گونج اٹھا تھا۔

بتول بانو اسے لے کر اسی سرکاری ہسپتال کے گائنی وارڈ میں پہنچی تھیں جہاں پچھلے چند ماہ سے اسے لے جاتی رہی تھیں۔یہاں طبی عملے کا وہی برتاؤ تھا۔جو سرکاری ہسپتالوں میں حالات کے ستائے پسے پسائے غریب لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔اگر ماں کمزور ہو' اس کی جسمانی حالت زیادہ اچھی نہ ہو تو 2 1 گھنٹے سے اوپر لیبر ماں اور بچے دونوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے اس دوران نارمل ڈلیوری نہ ہوسکے تو۔آپریشن کیا جائے۔

پورے اٹھارہ گھنٹے لیبر پین میں رہنے کے بعد جب نارمل ڈلیوری نہ ہوسکی جب ماں اور بچے دونوں کی جان مکمل طور پر خطرے میں جاچکی' ان کے بچنے کے امکانات بہت کم ہونے لگے تب وہ گائناکولوجسٹ ڈیوٹی پر پہنچیں' جن کی آمد کا کئی گھنٹوں سے انتظار تھا کہ وہ آئیں گی تو سیزیرین آپریشن کیا جائے گا۔اس کے پاس اپنے آپریشن کے لیے کیا کسی بھی چیز کے لیے ایک پیسہ تک نہیں تھا۔بتول بانو بے چاری

یہاں وہاں بھاگتی پتانہیں اپنے کسی جاننے والے سے قرض لے کر آئی تھیں۔ اس کا آپریشن ہوسکا تھا۔ اس کی اور اس کے بچے کی جان بچ سکی تھی اس کی بیٹی کی پیدائش ہوسکی تھی۔ اس کی بیٹی نے جب آنکھ کھولی جب اس دنیا میں پہلی سانس لی تو اسے عزت' ناموس اور اپنا نام دینے والا اس کا باپ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ اس کی بیٹی حریم حسین وہ ایک ایسے گھٹیا ترین باپ کی بیٹی تھی جس نے اپنی بیٹی کے وجود ہی کو ایک گالی بنا دیا تھا۔ جس گھڑی حریم حسین نے جنم لیا تھا اسی گھڑی ایک نئی خرد احسان نے بھی جنم لیا تھا۔ وہ خرد احسان جو اشعر حسین نام کے اس شخص سے انتہائی حدوں تک نفرت کرتی تھی جس نے بیوی پر لگائی تہمتوں کو تو کیا مٹایا ہوتا اس نے تو اپنی اولاد' اپنی بیٹی کو بھی ایک بہت گندی گالی بنا دیا تھا

ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ تب اس روز وہ اس شخص کے نام پر آخری بار روئی تھی۔ آخر بار اس نے اس شخص کے نام پر بچے اپنے تمام آنسو بہا ڈالے تھے۔ ''دعا کرتی ہوں اس زندگی میں اب عمر بھر تم کبھی میرے سامنے نہ آؤ۔ تم سے سامنا اب میں صرف روز حشر چاہتی ہوں اشعر حسین اس دنیا میں نہیں۔ اس زندگی میں نہیں۔

جب تک میں تمہیں معاف نہیں کروں گی میرا اللہ بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ اور اشعر حسین اپنی بیٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں اس روز میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ اپنے لیے معاف کرنے کا حوصلہ کر بھی لوں لیکن اپنی بیٹی کے لیے' اسے جو ذلت تم نے اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی بخشی اس کے لیے ہرگز معاف نہیں کروں گی۔''

اس کی کمزور' لاغر اور بیمار بچی وہ جن حالات میں اور جس طرح پیدا ہوئی تھی اسے کمزور اور بیمار پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔

اسے تنہا اپنی بیٹی کی پرورش کرنا تھی۔ اسے پالنا پوسنا تھا۔ اسے زندگی کی ہر سہولت فراہم کرنا تھی۔ اور یہاں زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لالے پڑ رہے تھے۔ اس کی بیمار اور کمزور بچی کو درکار مناسب علاج اور دواؤں کی فراہمی کے لالے پڑ رہے تھے۔ اس کی کیا حالت ہے اور کیا نہیں اس پر سوچنے' دھیان دینے کی اس کے پاس مہلت نہیں تھی۔

وہ حریم کی پیدائش کے ساتویں روز گھر کے قریب واقع اس اسکول چلی گئی تھی جہاں اگر اسے فوراً ملازمت مل جاتی تو اس کی بیٹی کو فوراً درکار بہت سی دوائیں خرید کر لائی جاسکتی تھیں۔ اس کی بیٹی کی پیدائش پر بتول بانو جہاں جہاں سے قرض لے کر آئی تھیں' اس قرض کو کسی کے تقاضے سے پہلے لوٹا دینے کے لیے اس کے پاس کچھ پیسے آسکتے تھے۔ اسے ہر حالت میں وہ ملازمت درکار تھی۔

فی الحال اس کی اپنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ملازمت کی تلاش میں ماری ماری پھر سکتی' اس کی چند دن کی بیمار قسمت نے یہاں اس کا ساتھ دیا تھا اسے بہت معمولی تنخواہ پر ہی سہی بہرحال اس اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ یہ پہلا قدم بہت چھوٹا اور معمولی سہی لیکن کم از کم اس نے اپنے بل بوتے پر زندگی کو خود گزارنے کا آغاز تو کیا تھا۔

بتول بانو یہ جان کر کہ وہ ملازمت شروع کر رہی ہے قدرے پریشان ہوئی تھیں۔ وہ اس رات پلنگ پر اس کے برابر بیٹھی اسے سمجھانے لگی تھیں۔ وہ حریم کو فیڈ کر رہی تھی۔ حریم ماں کی چھاتی سے لگی بہت پرسکون' بہت مطمئن ہونے کے قریب تھی اور بتول بانو آہستہ آواز

میں بولتی اسی کی محبت میں اسے یہ سمجھا رہی تھیں کہ...... وہ اشعر سے کراچی جا کر ملے فون پر بات کی وہ اہمیت نہیں ہو سکتی جو اس کے خود جانے کی ہو سکتی ہے۔ اسے یہ آخری کوشش ضرور کر دیکھنا چاہیے۔ اس کے لیے تب اشعر کا دل گداز نہیں ہوا تھا لیکن کیا پتا اب ایک باپ کا دل اپنی بیٹی کے لیے گداز ہو جائے۔ اور پھر وہ ساری آگ تو اس کی ماں کی لگائی ہوئی تھی۔ ورنہ کیا وہ اس سے محبت کیا نہیں کرتا تھا۔

''محبت۔''...... وہ طنزیہ انداز میں ان کی بات پر ہنسی تھی۔ ''محبت نہیں کی تھی بتول خالہ! میں اس کا من پسند کھلونا تھی پھر ایک روز اس کی ماں نے اسے اس کے پسندیدہ کھلونے کے کچھ عیب دکھائے تو اس عیب دار کھلونے کو اٹھا کر اس نے سڑک پر پھینک دیا۔''

''تمہارے ساتھ بہت زیادہ زیادتی ہوئی ہے بیٹا! میں مانتی ہوں یہ بات لیکن......''

''زیادتی نہیں ہوئی ہے بتول خالہ! مجھے میری حیثیت بتائی گئی ہے جسے میں نے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیار کیا تھا' اسی شخص نے میری ہستی خاک میں ملا دی' میری روح کو مار ڈالا' مجھ سے سر اٹھا کر زندہ رہنے کا حق چھین لیا' میری بیٹی کے وجود کو ایک شرم ناک گالی بنا دیا۔''

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اشعر تم سے بدگمان' تم اس سے ناراض' اس طرح ایک دوسرے سے دور ہو کر تو تم دونوں اشعر کی ماں کے منصوبے کو کامیاب بنا دو گے۔ تم دونوں کو الگ کروانا ہی تو اس کا مقصد تھا۔''

ماں کا دودھ پیتے پیتے حریم سو چکی تھی' وہ اب اسے آہستگی سے اس کی جگہ پر لٹا رہی تھی۔ اسے لٹا کر کمبل اوڑھاتے ہوئے اس نے بتول بانو کی طرف دیکھا تھا۔

''فریدہ حسین کون تھی اور اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا' مجھے یاد نہیں۔ مجھے یاد ہے تو صرف اتنا کہ مجھے بے اعتباری' ذلت اور رسوائی اس شخص نے دی ہے جو ساری دنیا میں میرا واحد اپنا تھا۔

''حریم کے پیدا ہونے کا لمحہ اشعر حسین کے انتظار کا آخری لمحہ تھا بتول خالہ! اب نہ میں زندگی بھر کبھی اس کی شکل دیکھوں گی' نہ اسے اپنی دکھاؤں گی۔''

اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا' اس میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ بتول بانو اس کے اتنے واضح اور صاف انکار کے باوجود اسے زندگی کے سرد و گرم اور اونچ نیچ سمجھانے لگی تھیں۔

''زندگی میں اور کتنا برا وقت آئے گا بتول خالہ! جب اپنی بچی کو اپنی کوکھ میں لیے رات کے اندھیرے میں کھلے آسمان تلے بے امان اور بے سائبان بالکل تنہا میں بھی سروائیو کر گئی۔ میری بیٹی بھی سروائیو کر گئی تو میں اور میری بیٹی ہماری باقی زندگی بھی اس شخص کے بغیر گزار سکتے ہیں۔''

مضبوط' مستحکم اور دوٹوک لہجے میں بتول بانو کو جواب دے کر وہ حریم کے برابر سونے لیٹ گئی تھی۔ اسے اس کے فیصلے میں اتنا

مضبوط دیکھ کر وہ بھی خاموشی سے لیٹ گئی تھیں۔

اور شاید اس کا وہ جملہ 'میں اپنی بیٹی کو تمہارے بغیر' تمہاری مدد' تمہارے سہارے کے بغیر خود پال لوں گی۔

اس بڑے بول کی سزا دینے کو تقدیر نے وہ داؤ چلایا کہ اسے لا کر اسی شخص کے در پر پھر پٹخ دیا

حریم کے علاج کے لیے پیسہ مانگنے جب اس شخص کے دفتر آئی تھی' اس روز اپنی اوقات زندگی بھر کے لیے بہت اچھی طرح پہچان لی تھی اور اب جب حریم کی سرجری ہو چکی تھی' وہ بہت تیزی سے رو بہ صحت ہو رہی تھی۔ شاید کل اسے ہسپتال سے ڈسچارج ہو جانا تھا۔ تب وہ جذبات کو ایک طرف رکھ کر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ حریم کی بہتری کے لیے اسے حریم کو خود سے جدا کرنا ہوگا۔

''کبھی اپنی ماما سے بدگمان مت ہونا بیٹا! کبھی یہ مت سوچنا کہ میری ماما مجھے پیار نہیں کرتی تھیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ تمہاری محبت ہی تمہاری ماما سے یہ فیصلہ کروا رہی ہے حریم۔''

!حریم کو اشعر کے پاس چھوڑ کر اسے واپس اپنی دنیا میں لوٹنا ہوگا۔ یہ فیصلہ کر چکی تھی مگر

اسے پتا تھا حریم سے جدا ہو کر اب وہ ساری عمر اس کی جدائی کے غم میں روتی رہے گی۔

☆......☆......☆

وہ اپنے کمرے میں شدید پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ یہ ہوا کیا تھا۔ یہ سب ہوا کیا تھا۔ وہ خرد احسان واپس اشعر کی زندگی میں آ گئی۔ نہیں' یہ ناممکن ہے۔ ہر بات کی سامنے تصدیق موجود تھی پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ زرینہ کی دی یہ بھیانک اطلاع کہ سارہ نے خود اپنی آنکھوں سے خرد اور اس کی بیٹی کو اشعر کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے دیکھا ہے۔ یہ خبر شمالی علاقہ جات میں ان کے سوشل ورک کے دوران انہیں ملی' ان پر بجلی گر گئی۔

ان کی آنکھوں کے سامنے وہ چٹ پڑی تھی جس پر اس اپارٹمنٹ کا پتا اور فون نمبر درج تھا جس میں پچھلے ایک ماہ سے بھی اوپر کے عرصے سے خرد اپنی بیٹی سمیت اشعر کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن اب بھی دل کو اس ناممکن ترین بات کا یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا۔ اشعر اس سے شدید نفرت کرتا تھا' وہ اس کی شکل دیکھنا تو کیا اس کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا تھا پھر اس لڑکی نے آخر ایسا کیا کیا جس سے اشعر کی کایا پلٹ گئی۔ اشعر اتنے دنوں سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا' ان سے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ دن کے جس بھی وقت گھر کا حال احوال معلوم کرنے کراچی اپنے گھر فون کرتیں' ملازمین سے بات کرتیں' اشعر گھر پر کبھی موجود نہ ہوتا لیکن اس میں تعجب کی کیا بات تھی۔ وہ تو ان کی موجودگی میں بھی اب ایک طویل عرصے سے گھر سے بہت دور' دور بلکہ دنیا ہی سے بہت دور دور رہنے لگا تھا۔ انہیں اشعر کے ساتھ اپنی کچھ دن پہلے کی وہ فون کال یاد تھی جس میں انہیں اس کے لہجے میں بے تحاشا خوشی کی جھلک محسوس ہوئی تھی اور اشعر کی وہ خوشی کیا اس بات کی تھی کہ اس کی زندگی میں اس کی بیوی اور بچی لوٹ آئی ہیں۔

وہ خرد احسان اشعر سے اپنا اور اپنی بیٹی کا وجود بھی تسلیم کروا گئی تھی۔ کیا خرد نے اشعر کو سب کچھ بتا دیا۔ ساڑھے چار سال پہلے جو

کچھ ہوا' وہ سب اور اشعر نے اس کا یقین بھی کر لیا۔

یہ سوچتے ہوئے ان کا دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ ''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ اشعر ماں کے خلاف اس لڑکی کی کسی بکواس کا بھی یقین نہیں کر سکتا۔'' لیکن پھر اس کے اتنے دنوں تک یہ ساری بات ان سے چھپائے رکھنے کا مقصد کیا تھا۔ انہیں ہر بازی الٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی

کیا بیٹی کی بیماری کا کوئی ڈھونگ کر کے اس لڑکی نے اشعر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ زرینہ نے ان کی کراچی واپسی سے کئی دن قبل ان کے کہنے پر اشعر کے اپارٹمنٹ کے نمبر پر کال کی تھی۔ وہاں کسی ملازمہ نے کال ریسیو کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ وہ لوگ ان دنوں ہسپتال میں ہیں۔ حریم کا آپریشن ہوا ہے' وہ وہاں پر ایڈمٹ ہے۔ خرد کی بیٹی کا نام حریم ہے' یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔ ہاں اتنا چار سال پہلے سے ضرور جانتی تھیں کہ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اس شروع شروع کے وقت میں انہوں نے زرینہ کے ذریعے بھی اور اپنے کچھ دوسرے ذرائع سے بھی کسی نہ کسی فرد کے ذریعہ طریقے سے خیر خبر رکھوائی تھی۔ جب یہ تسلی ہو گئی کہ وہ بیٹی کو لے کر اشعر کے پاس واپس نہیں آ رہی' تب انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ خرد کو اشعر کی زندگی سے نکال دینے کے بعد ان کا پکا ارادہ تھا کہ وہ اشعر کی فوراً کہیں اور شادی کروا دیں گی۔ اس وقت اشعر کو ایک جذباتی سہارے کی شدید ضرورت تھی اور اگر اس کی فوراً ہی شادی ہو جاتی تو وہ اپنی شادی شدہ زندگی' بیوی اور پھر بچوں میں مگن ہو جاتا۔

اشعر نے اس گھٹیا اور پنچ لڑکی کے پیچھے جوگ لے لیا تھا' اپنی زندگی تباہ کر دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ ہر کوشش کر کے دیکھ چکی تھیں' اسے اس تنہا اور خاموش زندگی سے باہر نکالنے کے لیے۔ اسے اتنا ٹوٹا' بکھرا' زندگی سے دور دیکھ کر کیا ان کا دل نہیں کڑھتا تھا۔ بہت دل کڑھتا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی عورت تھیں۔ عام عورتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے یا رونے پیٹنے' واویلا کرنے جیسی جذباتی اور احمقانہ حرکتیں انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھیں لیکن اب گزرے دو' تین سالوں میں وہ اشعر کو اتنا تنہا اور زندگی سے ناراض دیکھ دیکھ کر واقعی رویا کرتی تھیں۔

ان کے تین بچے تھے مگر جیسی شدید محبت انہیں اشعر سے تھی۔ ویسی اپنی دونوں بیٹیوں سے نہیں تھی۔ وہ ان کا اکلوتا' لاڈلا' چہیتا بیٹا جو صورت شکل سے لے کر اپنی بہت سی خوبیوں تک میں بھی ہو بہو انہیں جیسا تھا۔ وہ ان کی اپنی ماں کی طرح ہزاروں' لاکھوں بلکہ کروڑوں کے مجمع میں بھی الگ نظر آتا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی ان خوبیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود بے نیاز سا رہا کرتا تھا اور شاید اس کی یہ بے نیازی لڑکیوں کو اس کی طرف زیادہ ہی متوجہ کیا کرتی تھی مگر وہ اشعر کی طرح اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں سے کبھی بھی نہ لاپرواہ رہی تھیں' نہ بے نیاز۔ وہ اپنی نوعمری کے دور سے جانتی تھیں کہ وہ ایک انتہائی ذہین' غیر معمولی خوبیوں کی مالک اور بے پناہ صلاحیتوں کی حامل خاتون ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو حکمرانی اور لیڈر شپ کے لیے پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کے مدمقابل آ کر کھڑا ہو' ان کے کسی فیصلے کے برخلاف کچھ

کرے' یہ چیز ان کی برداشت سے باہر تھی۔ یہ غرور تھا' تکبر تھا یا جو بھی' بہر حال وہ خود کو ہمیشہ سب سے آگے اور سب سے اونچا دیکھنا چاہتی تھیں۔

اپنے گھر اور بچوں کی زندگیوں سے متعلق چھوٹے بڑے تمام فیصلے وہ کیا کرتی تھیں۔ بصیرت حسین نے صرف ان فیصلوں کو قبول کرنے کا کام کیا تھا۔ ان کا وہ گھر ان کی سلطنت تھا' ان کی ریاست تھا اور اپنی اس سلطنت کی وہ ملکہ تھیں مگر پھر ایک روز ان کی اس سلطنت کے بادشاہ نے ایک بہت معمولی' بہت حقیر' بہت کم تر لڑکی کو لا کر ان کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔

پینتیس سالہ خوشگوار شادی شدہ زندگی کا غرور' شوہر کے دل اور اس کے گھر پر حکمرانی کا فخر سب کچھ صرف ایک پل میں ان سے چھین لیا گیا تھا اور کس بات کے پیچھے۔ یہ کہ وہ اس معمولی لڑکی کو اپنے بیٹے کی بیوی کی حیثیت میں قبول کر لیں' اسے اپنی بہو بنا لیں۔ اس بات پر اگر وہ شوہر کے خلاف گئی تھیں' اس فیصلے کے خلاف بولا تھا تو کیا غلط کیا تھا۔ ان کا وہ لاکھوں' کروڑوں میں ایک بیٹا جس کے لیے ان کے ہم پلہ کیا ان سے بھی اونچے گھرانوں کے لوگ رشتے کے خواہش مند تھے۔ اس کا نصیب کیا وہ حقیر ترین لڑکی تھی۔

اشعر امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے آیا تو ان کے جاننے والے اور واقف کار کیا سرسری میل جول رکھنے والوں تک نے کسی نہ کسی انداز میں اپنی یہ خواہش ان تک ضرور پہنچائی تھی کہ اشعر کے لیے لڑکی کا انتخاب کرتے وقت ان کی بیٹیوں کو بھی ضرور زیر غور لایا جائے اور یہ سب وہ لڑکیاں تھیں جو ان ہی کی طرح اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسٹیٹس' تعلیم اور زندگی کے ہر معاملے میں ان لوگوں کی خصوصیت سے اشعر کے ہم پلہ تھیں اور وہ ان سب میں سے کسی لڑکی کو بھی اشعر کے لیے پسند نہ کر پائی تھیں۔

ان بہت خوبصورت اور بے تحاشا خوبیوں کی مالک سارہ اجمل جو اپنی ذات میں یکتا و بے مثال تھی' وہ تک اپنے بیٹے کے لحاظ سے کم تر لگا کرتی تھی۔ اگر اشعر خود سے بھی اپنے لیے کسی لڑکی کو پسند کر لیتا' وہ اس کی پسند کو بخوشی قبول کر لیتیں۔ ہاں بس وہ لڑکی ان کی فیملی کے ہم پلہ فیملی سے ہونا چاہیے تھی۔ خرد احسان کو اشعر کی بیوی بنانا' اس گھٹیا ترین لڑکی کو یہ منصب ان کے شوہر نے نجانے کس طرح کے جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر کے اشعر سے دلوایا تھا۔

اشعر باپ کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو گیا تھا مگر وہ اس بات پر کیسے چپ رہ سکتی تھیں۔ خرد احسان' وہ معمولی دو ٹکے کی لڑکی ان کی اس غریب نند کی بیٹی جسے رشتے دار کی حیثیت سے متعارف کراتے بھی انہیں سبکی کا احساس ہوتا تھا۔ ان حقیر ترین لوگوں سے ان کے بیٹے کا رشتہ جوڑ دیا جائے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ کہاں انہیں لندن کے بہت شاندار فیشن اسکول سے ڈگری لے کر آئی اپنی حسین اور ذہین بھانجی سارہ اجمل بیٹے کے لیے نہیں بھاتی تھی اور کہاں ان کے شوہر نے اس حقیر لڑکی کو ان کے بیٹے کے لیے منتخب کر ڈالا تھا۔

بہن نے بھی بھائی کی جذباتی کمزوریوں کا خوب بھرپور انداز میں فائدہ اٹھایا تھا۔ بہن نے بھائی سے کبھی پیسہ نہیں مانگا تھا۔ بڑی خوددار تھیں۔ ہاں بھائی کی سب سے قیمتی متاع ان کا بیٹا ضرور مرتے مرتے ان سے مانگ لیا تھا اور بھائی' بہن پر ایسے والہ وشیدا کے انکار کا کوئی جواز تھا ہی نہیں۔

ان کے انکار پر وہ زندگی میں پہلی بار بیوی پر چلا رہے تھے۔

''خبردار جو تم نے آگے ایک لفظ بھی کہا۔ یہ میرا گھر ہے' میں اس کا مالک ہوں اور جسے میں چاہوں' اس گھر میں رکھ سکتا ہوں۔ میرے اس گھر میں میری بہن بھی رہے گی اور بھانجی بھی اور میری بھانجی یہاں میری بہو بن کر ہی رہے گی۔ اور تمہیں اگر میرے اس فیصلے پر اعتراض ہے تو تم اس گھر کو چھوڑ کر شوق سے جا سکتی ہو۔''

شادی کے پینتیس سالوں بعد انہیں ان کے شوہر نے یہ اتنی بڑی بات کہہ دی تھی اور شوہر کی جانب سے یہ بے عزتی انہیں کس کے سبب ملی تھی۔ وہ حقیر ترین' کم تر ترین لڑکی۔ پہلے اگر وہ لڑکی انہیں صرف معمولی اور حقیر لگا کرتی تھی تو اس لمحے کے بعد سے انہیں اس سے نفرت ہو گئی تھی' شدید ترین نفرت۔ ان کے لیے خاموشی کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ وہ ایک سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی جسے ان کی اس ہائی سوسائٹی کے طور طریقے کچھ نہیں آتے تھے جسے اپنے ملنے والوں سے بہو کی حیثیت سے متعارف کراتے انہیں شرمندگی ہوتی تھی۔ کیا حق کے ساتھ ان کے اس غیر معمولی بیٹے کی بیوی بنی' ان کے گھر میں رہ رہی تھی۔ انہوں نے نہ شوہر کو معاف کیا تھا نہ اس لڑکی کو مگر وہ غلط وقت پر غلط انداز میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے والے لوگوں میں سے نہ تھیں۔ جب تک اشعر اسے منہ نہیں لگاتا تھا' اس سے دور دور بلکہ بے زار گھر ہی سے دور رہنے لگا تھا' تب تک پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ اس لڑکی کو دل پر جبر کر کے برداشت کرتی رہی تھیں مگر جب اس لڑکی کا جادو ان کے بیٹے پر بھی ویسے ہی اثر کرنے لگا جیسے شوہر پر کیا تھا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کے شوہر کو تو اس حقیر ترین لڑکی نے ان سے چھینا ہی تھا' اب ان کے اکلوتے بیٹے کو بھی اپنی محبت کے دام میں الجھا لیا تھا اور ان کا بیٹا وہ ایسا احمق کہ اپنی حیثیت اپنا مقام پہچانے بغیر اس لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا۔

اسے اپنے شوہر اور بیٹے کی مشترکہ والہانہ محبتیں یاد دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتی تھیں' وہ اس درست وقت کا انتظار کر رہی تھیں جب انہیں اس لڑکی کو اس کی اوقات یاد دلانی تھی اور پھر تقدیر نے وہ درست وقت انہیں جلد ہی فراہم بھی کر دیا تھا۔ مختصری علالت کے بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر نے آخری بات جو ان سے کی تھی وہ ان سے معافی مانگنا تھی۔ انہوں نے اشعر کی شادی کی بات کرتے ہوئے بیوی سے زندگی میں پہلی بار جو تلخ کلامی کی تھی۔ وہ اس کی ان سے معافی مانگ رہے تھے۔ وہ ان لمحوں میں شوہر کے قریب بیٹھی بظاہر روتے ہوئے یوں خاموش رہی تھیں جیسے انہیں شوہر سے کبھی کوئی شکوہ' کوئی شکایت رہی ہی نہیں تھی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ نہ اپنی بے عزتی بھولی تھیں نہ انہوں نے اس بے عزتی کے لیے شوہر کو کبھی معاف کیا تھا اور نہ ہی کبھی کر سکتی تھیں۔ انہیں شوہر کی موت کا ویسا صدمہ نہیں ہوا تھا جیسا ہونا چاہیے تھا۔

اس لڑکی کا تو ان کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اسے تو وہ چٹکیوں میں مسل کر رکھ سکتی تھیں۔ اصل مسئلہ اشعر کا تھا۔ وہ اس معمولی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ لیکن اگر محض باپ کے کہنے پر اس کے ساتھ اپنے رشتے کو نبھا رہا ہوتا تب بھی اس لڑکی کو اشعر کی زندگی سے نکالنا بہت زیادہ مشکل کام تھا۔ وہ ان کا اصولوں' قاعدوں اور وعدوں کو بہت اہم جاننے والا بیٹا کبھی باپ کے قائم کردہ اس رشتے کو ہرگز نہ توڑتا۔

اس مشکل ترین کام کو کرنے کے لیے جلد بازی کی نہیں سمجھداری اور تدبر کی ضرورت تھی۔

خضر عالم' زرینہ کی نند کے اس بیٹے کو وہ گزشتہ چند سالوں سے جب سے وہ کراچی میں مقیم تھا جانتی تھیں اس سے ملاقاتیں ہمیشہ سرسری نوعیت کی رہی تھیں۔زرینہ کے ہاں سرسری ملاقاتوں اور معمولی نوعیت کی گفتگو کے باوجود وہ اس لڑکے کی فطرت بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔وہ ترقی اور دولت کا بھوکا ایک انتہا درجے کا مطلبی اور موقع پرست انسان تھا۔

خضر عالم میتھس میں آنرز کر رہا تھا اور خرد نے اسی سبجیکٹ کے ایم ایس سی پریویس میں داخلہ لیا تھا۔یہ بات جانتے ہی ان کے ذہن میں ایک خیال آنے لگا' ایک منظر تخلیق ہونے لگا ایک پلان بننے لگا

ابھی خرد کی یونیورسٹی میں کلاسز شروع بھی نہیں ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنے ارادوں کو عملی شکل دینے کا آغاز کرتے آہستہ آہستہ ایسے کہ کوئی چونکے نہیں' اپنے گھر والوں کو مختلف مواقع پر خضر کی تعریفیں کر کر کے یہ باور کرانا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس لڑکے کو بہت پسند کرتی ہیں۔

کتنا ہی چاہنے والا شوہر کیوں نہ ہو بیوی کی بدکرداری سہہ نہیں سکتا۔مرد کی فطرت کے اس پہلو کو انہیں فائدے کے لیے بالکل درست انداز میں استعمال کرنا تھا۔وہ جانتی تھیں انہیں اپنے بیٹے کو جو اس لڑکی کی محبتوں کا دم بھرا کرتا ہے۔کس طرح اس سے بدگمان کروانا ہے۔خرد احسان کی انہیں فکر نہیں تھی۔وہ بے وقوف اور بے عقل لڑکی ممی ممی کہتے ان کے کسی سوچ تک کبھی نہیں پہنچ سکتی تھی' ہاں ان کو فکر تھی اپنے بیٹے کی۔ان کا بیٹا بے تحاشا ذہین اور ہر معاملے میں منطقی انداز فکر رکھنے والا تھا۔

اس کام کے لیے خضر عالم تو ان کی نگاہوں میں بہت پہلے ہی سے تھا اور دوسری ان کی بہن زرینہ اجمل' پیسے کی جن کے پاس قطعاً کوئی کمی نہیں تھی۔ہاں ان کا مسئلہ خرد احسان ضرور تھی۔خرد سے ان کی دشمنی کا سبب سارہ تھی' سارہ کی اشعر میں انوالومنٹ تھی۔وہ خرد کو اشعر کی زندگی سے نکلوا کر وہ جگہ سارہ کو پاتے دیکھنا چاہتی تھیں۔اپنے منصوبے میں شریک کرنے کے لیے ان دو لوگوں کا انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا۔زرینہ اجمل ہوں یا خضر عالم' وہ ان دونوں سے اپنا مطلب نکلوا رہی تھیں۔خضر کا منہ تو اتنے پیسے دے کر ہمیشہ کے لیے بند کروا رہی تھیں۔رہ گئیں زرینہ تو بعد میں ان سے انہیں کیسے پیچھا چھڑوانا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔سارہ کو اشعر اور خرد کی شادی کے وقت خرد کے متبادل کے طور پر تو وہ قبول کر سکتی تھیں' مگر سارہ کو وہ اپنی خوشی سے اشعر کی بیوی کے طور پر کبھی منتخب نہیں کر سکتی تھیں۔وہ اپنے بیٹے کی پسند بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔اشعر اپنی سوچ اور اپنے رویوں سے مشرقی انداز رکھنے والی لڑکیوں کو پسند کیا کرتا تھا۔یہی مشرقی ادائیں تو تھیں خرد احسان کی جنہوں نے اشعر کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

وہ اپنے بیٹے کی زندگی کی خوشیوں کو ختم کرنے کے لیے کچھ کر رہی ہیں ایسی کوئی سوچ دور دور ان کے ذہن میں نہیں تھی۔اس لیے کہ وہ اپنے بیٹے کے خلاف کچھ کر ہی نہیں رہی تھیں۔اپنے قدموں میں پڑے ایک پتھر کو جو وہ ہیرا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا وہ اسے صرف اس غلطی سے روکنا چاہتی تھیں۔

ان ہی دنوں ان کی تجربہ کار اور زیرک نگاہوں نے جب یہ بھانپا کہ خرد غالباً پریگنیٹ ہے تو وہ بری طرح بوکھلا گئیں۔ مگر وہ ان کی اب تک کی زندگی کی سب سے زیادہ احمق ترین دشمن اس سے ناواقف تھی۔

پھر اشعر بالکل ٹھیک موقع پر دبئی چلا گیا تھا اور وہ بھی اس بات سے آگاہ ہوئے بغیر۔ وہ لڑکی صبح شام ان کے ساتھ تھی اور اشعر کی ہر بات وہ کسی نہ کسی انداز میں انہیں بتا رہی تھی۔ خرد احسان اپنے ہی خلاف تمام معلومات انہیں بروقت اور بہم پہنچا رہی تھی۔ انہیں خوشی یہ بتا کر کہ اشعر اپنے طے کردہ پروگرام سے جلدی واپس آ رہا ہے خرد نے ان کے لیے مزید آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اشعر بغیر اطلاع دیئے یہاں اچانک پہنچے گا اور پھر خرد کو کسی ایسی جگہ پائے گا تو ان کا تخلیق کردہ منظر اور بھی زیادہ حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔

ان کا وہ پورا منظر پرفیکٹ ٹائمنگ کے ساتھ بالکل ان کے سوچے ہوئے طریقے کے مطابق عمل میں آیا تھا۔ ان کے اندازے نہ اپنے بیٹے کے اس منظر کو دیکھنے کے بعد کے ردعمل کے متعلق غلط ثابت ہوئے تھے نہ خرد احسان کے متعلق' سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق ہوا تھا۔ ان کا اپنے بیٹے کی نفسیات کو بخوبی جانتے یہ اندازہ کہ اشعر اس منظر کو دیکھنے کے بعد غم' غصے اور صدمے کا بری طرح شکار ہو کر خضر کے اپارٹمنٹ سے اسی وقت اور فوراً کہیں چلا جائے گا' سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ تب ہی تو انہوں نے پہلے ہی خضر کو سمجھا رکھا تھا کہ اشعر کے اس اپارٹمنٹ سے نکل جانے کے کچھ ہی لمحوں بعد وہ بھی نکل جائے اور جہاں اشعر جائے وہاں وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے جائے۔ اشعر جہاں پر بھی ہے وہاں وہ بالکل خیریت سے اور بالکل ٹھیک ہے انہیں صرف اور صرف یہ اطلاع چاہیے تھی' وہ اشعر کی آج رات گھر واپسی ہرگز نہیں چاہتی تھیں۔

انہوں نے صرف خضر کے گھر تک کا ہی نہیں اپنے گھر واپس آ جانے کے بعد کا بھی سارا منظر پہلے سے ترتیب دے رکھا تھا۔ اگر چاہتیں تو وہ خرد کو اسی وقت ہی گیٹ سے اندر داخل نہ ہونے دیتیں

مگر انہیں رات کا انتظار تھا اسی لیے انہوں نے گیٹ سے اندر اس لڑکی کو قدم رکھنے دیا تھا' انہیں بیٹے کی' اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کی بہت زیادہ پروا تھی اس لیے انہوں نے پہلے ہی گھر سے تمام ملازمین کو زرینہ کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ زرینہ جنہوں نے صرف اس کے دن انہیں گھر سے اپنے تمام ملازمین کو ہٹانے کا ایک معقول جواز فراہم کرنے کو اس رات اپنے گھر پر ایک بہت بڑی پارٹی دے رکھی تھی۔ چوکیدار اور نور افزاء دونوں ان کے بہت پرانے اور بھروسے کے ملازمین تھے اور پھر وہ سارے کے سارے نوکروں کو گھر سے بھیج کر خود کو ایک دم مشکوک بھی نہیں بنا دینا چاہتی تھیں

انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا' ان کی پلاننگ پرفیکٹ تو تھی مگر کسی بھی لمحہ اگر بات کچھ آگے پیچھے یا ان کے اندازوں سے غلط ہو جاتی تو سارا معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا' وہ خود بھی شک کی زد میں آ سکتی تھیں

پھر آخر کار اشعر گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ دیوانہ وار بھاگتی باہر نکلی تھیں۔ وہ کتنا نڈھال' کتنا کمزور لگ رہا تھا۔ اس گھٹیا لڑکی کی وجہ سے انہیں اپنے بیٹے سے کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے' اس کی انا' عزت اور وقار کو کتنی چوٹیں پہنچانی پڑ رہی

تھیں۔اسے چوٹ پہنچا کر وہ خوش نہیں تھیں۔مگر ان کے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا

''ممی! خرد کہاں ہے۔'' اپنے کمرے میں آجانے کے بعد وہ ان سے پوچھ رہا تھا

''میں وہ بیٹا تم پہلے کچھ دیر آرام کرلو۔آؤ چلو میرے کمرے میں۔'' اس کا ہاتھ پکڑ پیار اور لجاجت سے وہ یوں بولی تھیں جیسے ایک بہت ہی بری خبر ہر حالت میں اس سے چھپا لینا چاہتی ہوں

''ممی! خرد کہاں ہے۔'' وہ ان کے انداز میں موجود سنگینی اور بری خبر چھپانے کا تاثر فوراً بھانپ گیا تھا۔

''وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی اشعر۔'' اس کے پیہم اصرار کے بعد بالآخر اپنی نظریں اس سے چراتے وہ آہستہ آواز میں بولی تھیں۔اس بات کو سننے کے بعد اشعر کا ردعمل ان کی توقع کے مطابق تھا۔وہ روتے ہوئے نظریں جھکا کر اپنے مرتب کردہ باقی جملے بول رہی تھیں۔

''وہ اسی روز یہاں سے چلی گئی تھی۔جب تم خضر کے اپارٹمنٹ سے گئے' میں روتی اور بھاگتی ہوئی تمہارے پیچھے گئی۔مگر جب تمہیں روک نہ پائی تو صدمے سے چور گھر لوٹ آئی۔وہ مجھ سے پہلے گھر پر موجود تھی۔وہ اپنا سارا سامان جلدی جلدی پیک کر رہی تھی' گھر سے باہر گاڑی میں خضر اس کا انتظار کر رہا تھا۔میں نے اسے بہت روکا' بہت سمجھایا۔پیار سے' محبت سے' غصے سے' میں نے اس کے آگے ہاتھ تک جوڑے' وہ ہمیں اتنی بڑی ذلت دے کر نہ جائے۔مگر میری کوئی نصیحت' کوئی التجا' کوئی آنسو اس پر اثر نہ کر سکا۔مجھ سے بولی کہ جب تک بات چھپی تھی' چھپی تھی مگر اب جب ساری بات کھل چکی ہے تو وہ یہاں مزید ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی۔تم سے اس کی شادی اس کی ماں اور ماموں نے زبردستی کروائی تھی۔یہ ٹھیک ہے کہ ابتدا میں وہ اس رشتے سے خوش تھی' مطمئن تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔اب تک وہ صرف لوگوں سے ڈر کر' معاشرے سے ڈر کر' سمجھوتے سے بھری زندگی تمہارے ساتھ گزار رہی تھی۔مگر اب جبکہ سچائی تمہارے سامنے آہی چکی تھی تو وہ سمجھوتوں سے بھری' بٹی ہوئی زندگی مزید نہیں جینا چاہتی۔اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ آنے والے چند دنوں میں طلاق کے لیے تم سے رابطہ کرے گی۔اس کا نفس اس پر اتنا حاوی ہو گیا تھا اشعر! کہ وہ صحیح' غلط' گناہ' ثواب ہر چیز سے بے نیاز ہو گئی تھی۔''

لوہا گرم تھا۔خرد اور خضر کو تنہائی میں ملتے دیکھنے کے بعد یہ سنگین جملے اور سنگین صورت حال اس کے اور خرد کے رشتے کے تابوت میں آخری کیل ہی ثابت ہوئے تھے۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھیں۔مگر یہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس کا یوں نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ان کا اندازہ تھا کہ وہ بہت ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور ایسے وقت میں وہ اسے جذباتی سہارا فراہم کریں گی اور اس جذباتی کمزوری اور شکستگی کے ان دنوں ہی میں وہ اس کی بڑی سادگی سے دوسری شادی کروا دیں گی۔لیکن اشعر کا نروس بریک ڈاؤن' اس کا ہسپتال میں ایڈمٹ رہنا' اس کی بری طرح گرتی ہوئی حالت انہیں حقیقتاً پریشان کر گئی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ وہ خود کو سنبھال لے گا۔مگر ان کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔اشعر نے خود کو سنبھال تو لیا تھا مگر بہت عجیب انداز میں۔وہ دنیا میں رہتا تھا' وہ لوگوں کے درمیان رہتا تھا مگر کس طرح۔جیسے کوئی مردہ اس نے اپنی زندگی

کے ساڑھے چار سال اس گھٹیا لڑکی کی بے وفائیوں کے پیچھے برباد کر ڈالے تھے۔اشعر کو بدلنے' اسے پھر ہنسنا سکھانے' خوش رہنے پر آمادہ کرنے اور زندگی کی طرف واپس لانے کی ان کی ہر کوشش ناکام تھی۔

اس بار جب وہ اپنے سوشل ورک کے لیے زلزلے سے متاثرہ شمالی علاقوں میں جا رہی تھیں تب اچانک ہی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔اپنی بیماری ڈراوا دینے کے علاوہ ان کے پاس اشعر سے اپنی بات منوانے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

وہ اشعر کو اس بار اپنی کراچی واپسی پر سچ کے ساتھ یا جھوٹ کے ساتھ بہر حال شادی کے لیے کسی نہ کسی طرح ہر حال میں آمادہ کر لینے کا مصمم ارادہ کر چکی تھیں جب پتا چلا تھا خرد احسان واپس آ گئی ہے۔ان کی غیر موجودگی میں یہ اتنی بڑی قیامت آ چکی تھی اور انہیں پتا نہیں چلا تھا۔ان کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا وہ ایک ہی وقت میں نجانے کیا کیا کچھ سوچ رہی تھیں۔ان کے پاس دھرے فون کی بیل بج رہی تھی۔انہوں نے بے توجہی سے نمبر دیکھا۔یہ ان کی بہن زرینہ کا فون تھا' ساڑھے چار سال پرانے اس ماضی کی' ان تمام واقعات کی خضر عالم اور خرد احسان کے علاوہ واحد گواہ زرینہ اجمل تھیں' خضر تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ ہی میں مستقل رہائش اختیار کر چکا تھا۔اس نے وہاں ایک دولت مند امریکی بیوہ عورت سے شادی کر کے اپنا اسٹیٹس اتنا ہی اونچا کر لیا تھا جتنا ساڑھے چار' پانچ سال پہلے وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔وہ وہاں اس امیر عورت کے ساتھ مل کر اس کا بہت پھیلا ہوا کاروبار چلا رہا تھا' اس کی پاکستان واپسی کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔

آج کئی دنوں بعد ان کی زرینہ سے بات ہو رہی تھی۔سارہ ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی مگر اس کی حالت نارمل نہیں تھی۔اس نے گھر سے باہر نکلنا' لوگوں سے میل جول رکھنا سب کچھ ترک کر رکھا تھا۔زرینہ اس کی وجہ سے کافی زیادہ پریشان تھیں۔

''کچھ پتا چل سکا' آخر خرد یہاں واپس آ کیسے گئی۔'' زرینہ سارہ کے ذکر سے ہٹ کر موجودہ پیچیدہ ترین صورت حال کی طرف آئیں۔بیٹی کو نفسیاتی مریضہ بنتے دیکھنے کے بعد خرد احسان سے زرینہ کی نفرت غالباً مزید بڑھ چکی تھی' وہ بہن سے جاننا چاہتی تھیں کہ یہ سب کچھ جو بھی ہوا ہے اس سے وہ کیسے نبرد آزما ہوں گی۔

''نہیں۔ابھی کچھ پتا نہیں چلا۔ابھی کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔علاوہ اس کے کہ ساڑھے چار سال بعد سب کچھ بالکل ٹھیک کرنے کے بعد صرف ایک غلطی کر دی تھی۔اگر تب سوچ لیتی تو جب اسے طیبہ کے کلینک پر لے کر گئی تھی اسی وقت ہی اس ناگن کے سنپولیے کا پیدا ہونے سے پہلے ہی سر کچلوا دیتی۔اپنے لیے اس نیچ لڑکی کی اولاد کی صورت ایک اتنی بڑی مصیبت میں نے زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دی۔لیکن خیر جو بھی ہو زرینہ! میں نے زندگی میں کبھی کسی جگہ شکست نہیں کھائی ہے۔اس لڑکی کو ایک بار پھر اس کی اوقات یاد نہ دلا دی تو میرا نام فریدہ حسین نہیں۔''

☆......☆......☆

''اشعر! آپ کہاں ہیں۔آپ اس وقت کہاں ہیں۔آ کر دیکھیں تو سہی ہماری زندگی میں ایک کتنا بڑا طوفان آ رہا ہے۔آپ جہاں کہیں بھی ہیں وہاں سے جلدی سے واپس آ جائیں اشعر! مجھے ممی سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ممی مجھے گھر کے اندر نہیں جانے دے رہیں' میں باہر

سیڑھیوں پر بیٹھ کر یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں اس لیے کہ میرے پاس آپ سے رابطے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ دعا کر رہی ہوں میرے یہ لفظ لکھتے لکھتے آپ گھر لوٹ آئیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے' کیا ہونے والا ہے۔ ممی نے مجھے کہا ہے میں ایک گھنٹے کے اندر یہ گھر چھوڑ جاؤں۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر میں اس گھر سے چلی نہیں گئی تو وہ مجھے یہاں سے دھکے مار کر باہر نکال دیں گی۔ ممی کو مجھ سے اتنی نفرت کس بات پر ہوگئی ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اپنا کوئی قصور' کوئی غلطی مجھے یاد نہیں آ رہی تھی۔

آج خضر کے گھر وہ خود مجھے لے کر گئی تھیں۔ وہ خود مجھے وہاں چھوڑ کر آئی تھیں۔ وہاں زرینہ آنٹی بھی تھیں' ان کی ایک نوکرانی رخسانہ بھی تھی۔ مجھے نہیں پتا ممی نے ایسا کیا کیا کہ وہ دونوں میری لاعلمی میں وہاں سے چلی گئیں اور اسی وقت ممی آپ کو لے کر وہاں آ گئیں۔ میں کیا بولوں اشعر! اتنی گھٹیا' اتنی نیچ بات سوچتے بھی مجھے شرم آ رہی ہے جس کا ممی مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ لیکن آپ تو میرا یقین کرتے ہیں نا۔ آپ کو پتا ہے نا میں ایسی نہیں ہوں۔ آپ کو یاد ہے ایک بار آپ نے مجھ سے کہا تھا' تمہیں خود پر بھروسہ نہ ہو مگر مجھے میری خرد پر پورا بھروسہ ہے' پلیز آ کر یہی بات ایک بار پھر بول دیں۔ آپ کی خرد خود پر بھروسہ کھو رہی ہے آ کر اسے اس کا وہ بھروسہ لوٹا دیں اشعر۔

میں آپ کی تھی' آپ کی ہوں اور مرتے دم تک آپ کی ہی رہوں گی۔ جب تک میری سانسیں چل رہی ہیں' جب تک میرا دل دھڑک رہا ہے میں صرف اور صرف آپ کی رہوں گی۔

آپ تو ہمیشہ مجھے کہا کرتے ہیں کہ میں بہت خاص ہوں' میں سب سے سچی ہوں' میں سب سے اچھی ہوں۔ میں تو آج بھی وہی ہوں اشعر۔ میں نہیں بدلی آپ بھی مت بدلیے گا۔ اگر آپ نے میرا یقین نہیں کیا' میرا اعتبار نہیں کیا تو میں زندہ کس طرح رہوں گی۔ میرے پاس اس پوری دنیا میں آپ کے علاوہ اور کوئی بھی اپنا نہیں' میں بھری دنیا میں اکیلی ہوں' آپ کے سوا میرا کوئی بھی نہیں۔ میری زندگی آپ ہیں' میری دنیا آپ ہیں' میری کائنات آپ ہیں۔ ممی نے اگر واقعی مجھے گھر سے نکال دیا اگر تب تک آپ واپس نہ آئے تو میں کہاں جاؤں گی' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا

میں کہاں جاؤں گی۔ میں کس کے پاس جاؤں گی۔ میں کس کے پا...... نواب شاہ۔ کیا بتول خالہ کے پاس۔ بتول خالہ...... ہاں ان کے علاوہ میرا کوئی نہیں۔

آپ جب واپس آئیں گے اور اللہ نہ کرے میں آپ کو گھر پر نہ ملوں تو سمجھ لیجیے گا کہ ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اور میں بتول خالہ کے پاس نواب شاہ چلی گئی ہوں۔ صرف ان ہی کا گھر مجھے اس وقت سمجھ میں آ رہا ہے جہاں میں جا سکوں۔ اگر میں آپ کو گھر پر نہ ملوں تو آپ فوراً بتول خالہ کے گھر آ جایئے گا۔ لیکن میں اس حالت میں اس وقت اکیلی وہاں پہنچوں گی کیسے۔ میں دن کے وقت وہاں کبھی اکیلی نہیں گئی' رات میں کس طرح جاؤں گی۔ اللہ ممی کے دل میں رحم ڈال دے یا آپ واپس آ جائیں ورنہ میں اس حالت میں کیا کروں گی۔

میں پریگنٹ ہوں اشعر آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے فون پر کہا تھا آپ کی واپسی پر آپ کو ایک بات بتاؤں گی وہ بات یہی تھی اشعر۔ آپ کو یہ بات کسی اچھے موقع پر' اچھے انداز میں بتانا چاہتی تھی۔ ممی جانتی ہیں میں پریگنٹ ہوں' میں ان ہی کے ساتھ ڈاکٹر کے گئی تھی۔

ممی مجھے دھمکی دے رہی ہیں' میں زندگی بھر ہمارے بچے کو اس کی صحیح پہچان دلوا نہیں سکوں گی۔ اشعر! آ کر ممی کو اس ظلم سے روک لیں۔ کہیں ان کے ظلم کی بھینٹ ہمارا بچہ نہ چڑھ جائے۔ آپ جہاں کہیں بھی ہیں وہاں سے جلدی لوٹ آئیں اشعر۔ میرے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔

ممی کا دیا ایک گھنٹہ پورا ہونے والا ہے۔ میں یہ خط کہاں رکھوں' کس کو دوں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر آپ کی گھر واپسی پر میں آپ کو نہ ملوں تو اللہ کرے یہ خط آپ کو ضرور مل جائے۔ آپ گھر واپس آ جائیں۔ مجھے اس مشکل سے باہر نکال دیں۔ مجھے ممی سے بہت ڈر لگ رہا ہے اشعر۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اشعر۔ مجھے اور ہمارے بچے کو اپنے ہوتے تنہا مت کیجئے گا اشعر۔ میرے لیے قیامت کی گھڑیاں نزدیک آ رہی ہیں اشعر اگر آپ اب بھی نہ آئے تو قیامت آ جائے گی۔ آپ کی خرد ہمیشہ کے لیے مر جائے گی۔ مجھے مرنے سے بچا لیں۔ مجھے مرنے سے بچا لیں اشعر۔ مجھے بچا لیں اشعر۔ پتا نہیں میں نے کیا لکھا ہے۔ میں جانتی ہوں میری باتوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ مگر میں جانتی ہوں آپ میری ہر بات سمجھ لیں گے جو میں کہہ پائی وہ بھی اور جو نہیں کہہ پائی وہ سب بھی۔

صرف آپ کی خرد' وہ ٹوٹی پھوٹی شکستہ سی تحریر' وہ کسی کے آنسوؤں سے مٹے مٹے سے لفظ' وہ کسی سستی سی کاپی کے ہلکے ہلکے سے اوراق اسکے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گرے تھے۔ صرف کاغذ ہی نہیں گرے تھے' وہ خود بھی زمین پر گر پڑا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوا اپنے زور سے ان اوراق کو کمرے میں یہاں وہاں اڑاتی پھر رہی تھی۔ وہ ان اوراق کو بے یقینی سے' سکتے کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ باہر بادل بہت زور سے گرج تھے۔ آسمان پر بادلوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا آج خونی رشتوں کی حرمت کی پامالی پر آسمان بھی رو پڑنے والا تھا۔

اس کی ماں دنیا کی سب سے عظیم عورت جسے اپنے دل میں وہ اس عظیم الشان مقام پر بٹھا کر رکھتا تھا جس تک دوسرے کسی بھی انسانی رشتے کی رسائی نہیں تھی۔

وہ ماں کا سب سے زیادہ لاڈلا' سب سے زیادہ چہیتا ہے۔

''کیوں ممی کیوں۔'' وہ سسک اٹھا۔

''مجھے جس آگ نے جلایا وہ میری ماں نے لگائی تھی نہیں میں نہیں مانتا۔ میں تو آپ کا سب سے پیارا بیٹا ہوں نا! ساری دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز۔ ماں آ کر کہو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ہماری زندگیوں میں یہ آگ کسی اور نے لگائی تھی۔ بھلا ایک ماں خود اپنی اولاد کی زندگی میں آگ کس طرح لگا سکتی ہے۔''

وہ اٹھا لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ ماں کی محبت بھری آغوش ایک پل میں اس سے چھین لی گئی تھی پھر بھی چوٹ لگنے پر رونے کے لیے ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس جانے کی اسے عادت نہیں تھی۔ ماں یہاں نہیں تھی مگر اس کا احساس تو تھا۔ وہ ماں کی گود چھن جانے پر ماں کے کمرے ہی میں چھپ کر رونا چاہتا تھا۔

وہ ماں کے کمرے کے پاس آیا' وہ دروازے کے سامنے آ کر رکا' وہ دروازے کو کھولنے کے لیے اس پر ہاتھ رکھنے لگا' اسے اندر سے اپنی ماں کی آواز آئی۔ لیکن یہ آواز' یہ لہجہ زخموں پر مرہم رکھنے والا تو نہیں تھا۔ یہ آواز اس کی ماں کی ضرور تھی' مگر لہجہ تو نفرتوں میں سرتاپا

ڈوبی کسی دوسری عورت کا لہجہ تھا۔کسی بالکل انجان اور غیر عورت کا لہجہ تھا۔

''بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی تب مجھ سے۔آنے والے سالوں میں وہ نیچ لڑکی اشعر کی زندگی میں واپس آ سکتی ہے' اپنی اولاد کو ہتھیار بنا کر اشعر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے' کاش میں نے اس امکان پر تب غور کر لیا ہوتا' تب یہ بات سوچ لی ہوتی۔اگر تب سوچ لیتی تو جب اسے طیبہ کے کلینک پر لے کر گئی تھی اسی وقت ہی اس ناگن کے سنپولیے کا پیدا ہونے سے پہلے ہی سر کچلوا دیتی۔اپنے لیے اس نیچ لڑکی کی اولاد کی صورت ایک اتنی بڑی مصیبت میں نے زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دی۔لیکن خیر جو بھی ہو زرینہ۔''...... یہ اس کی ماں نہیں تھی۔واقعی یہ ظالم اور سفاک عورت کوئی اور تھی۔

اس کے سائیں سائیں کرتے کانوں میں ان لفظوں کی بازگشت ہو رہی تھی۔حریم صرف خرد کی تو نہیں میری بھی تو اولاد ہے۔آپ کے بیٹے کی اولاد۔آپ کے لاڈلے' چہیتے بیٹے کی اولاد۔میں یہ سچائی جان کر زندہ کس طرح رہوں کہ میری بیٹی سے دنیا میں جو سب سے زیادہ نفرت کرتا ہے وہ کوئی اور نہیں میری ماں ہے۔

یہ رشتوں کے اعتبار کھونے کا دن تھا۔یہ دنیا کے سب سے عظیم رشتے پر سے ہر بھروسہ کھو دینے کا دن تھا۔اگر ماں بھی بھروسے کے قابل نہیں تو پھر انسان اعتبار کس پر کرے' بھروسہ کس پر کرے' یقین کس پر کرے۔وہ بغیر دیکھے ایک وقت میں دو' دو' تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ رہا تھا۔اس کا راستہ کیا تھا' اس کی منزل کہاں تھی' اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''انہوں نے میرے' نور خان اور جمال کے علاوہ باقی سارے نوکروں کو اپنی بہن کے گھر وہاں کسی دعوت کی تیاری کرنے کے لیے بھجوا دیا تھا۔مگر جب شام میں کہیں سے گھر واپس آ کر انہوں نے مجھے اور نور خان کو الگ الگ بلا کر بہت سختی سے یہ کہا کہ آج کے پورے دن ہم صرف وہی کریں گے جو وہ کہیں گی اور ان کے علاوہ ہم کسی کی بھی کوئی بات نہیں سنیں گے تب مجھے ڈر لگا کہ پتا نہیں وہ کیا کرنے والی ہیں۔لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ آج خرد بی بی کے ساتھ کچھ کرنے والی ہیں۔''

وہ نور افزاء کے کوارٹر میں اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔وہ گھر کے اندرونی حصے سے نکل کر جس جگہ آ کر رکا وہ نور افزاء کا کوارٹر تھا۔اس کی وہ ملازمہ جس نے ساڑھے چار سال قبل کسی کا اس کے نام لکھا ایک خط اسے لا کر دیا تھا۔طوفانی بارش آج رات ہو رہی تھی' مگر ساڑھے چار سال پہلے اس گھر میں بغیر تیز بارش اور طوفانی ہواؤں کے ایک بہت خطرناک طوفان آیا تھا۔وہ اس طوفانی رات سے آج زندگی میں پہلی بار آگاہ ہو رہا تھا۔

''خرد بی بی شام سے رات تک سخت سردی میں گھر سے باہر سیڑھی پر بیٹھی رہی تھیں۔مجھے ان پر ترس آ رہا تھا مگر میں نوکر ذات کیا کر سکتی تھی۔جمال نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ وہ کاغذ اور قلم اس سے مانگا تھا۔انہوں نے بری طرح روتے ہوئے میری منت کی تو میں نے وہ خط ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔بڑا ظلم ہوا تھا خرد بی بی پر۔پتھر دل سے پتھر دل انسان بھی اس ظلم پر کانپ جائے مگر بیگم صاحبہ کو ان پر رحم نہیں آیا تھا۔وہ بیگم صاحبہ کی منت کر رہی تھیں کہ وہ انہیں صرف آج کی رات اس گھر میں گزارنے دیں' وہ وہ صبح سویرے ہی یہاں سے چلی جائیں

گی۔ مگر بیگم صاحبہ نے کچھ پیسے ان کے پاس پھینک کر نور خان کو انہیں گھر سے نکالنے کو کہہ دیا تھا۔

میں چارپائی پر آ کر لیٹ گئی تھی‘ مگر میرا دل بہت بے چین تھا۔ پھر مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے جمال کو اٹھا کر خرد بی بی کے پیچھے بھیجا تھا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ ابھی شاید وہ مین روڈ تک ہی پہنچی ہوں گی۔ میں نے جمال سے کہا وہ پیسے ساتھ لے کر جائے اور جہاں کہیں بھی وہ اس وقت جانا چاہتی ہیں انہیں وہاں چھوڑ کر آئے۔‘‘ نور افزا کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

جمال انہیں چھوڑ کر اگلے روز ڈرتا اور چھپتا چھپاتا گھر واپس آیا تھا۔ جمال نے واپس آ کر بتایا تھا کہ خرد باجی بہت ڈری ہوئی تھیں۔ انہوں نے سارے راستے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ دوسرے شہر گئی تھیں۔ جمال‘ میرے بھانجے قادر کے دوست کی گاڑی پر انہیں وہاں تک پہنچا کر آیا تھا اسی لیے اسے واپس آنے میں اتنی دیر ہو گئی تھی۔

جمال گھر واپس آ گیا اور کسی کو کچھ شک بھی نہیں ہوا تب میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

نور افزا بولتے بولتے پھر ایک پل کے لیے چپ ہوئی۔

’’مجھے اس عمر میں نوکری سے جانے اور دربدر ہونے سے ڈر لگ رہا تھا خرد بی بی سے خط میں نے لے تو لیا تھا مگر سچی بات یہ تھی کہ میرا وہ خط آپ کو دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب بھی میں نے اس خط کو پھاڑنے کا سوچا‘ میرے کانوں میں خرد بی بی کے رونے کی آوازیں آنے لگتیں۔ پھر بڑی مشکلوں سے ہمت کر کے اس رات جب مجھے پتا تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں سو چکی ہیں تو میں نے آپ کو وہ خط لا کر دیا تھا۔ اگر بیگم صاحبہ کو میری نمک حرامی پتا چل جاتی تو وہ مجھے چھوڑتی نہیں۔ میں اتنی زیادہ ڈر رہی تھی کہ اگلے پورے دن اپنے کوارٹر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ مگر پھر میں نے دیکھا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔

تھوڑے ہی دن بعد بیگم صاحبہ نے ایک ایک کر کے آگے پیچھے جب سارے پرانے نوکروں کو نوکری پر سے نکالنا شروع کیا تو مجھے پتا چلا ان سب کے بعد نور خان کی اور میری باری بھی آئے گی۔ وہ ہم تینوں کو بھی نوکری پر سے نکال دیں گی۔ وہ کسی پر بھی بھروسا نہیں کرتیں‘ انہیں ہماری زبان کھلنے کا ڈر ہے۔ نور خان کو نوکری پر سے نکالنے سے پہلے اللہ ہی نے اپنے پاس بلا لیا‘ جمال کو بیگم صاحبہ نے لاہور اپنے ایک جاننے والوں کے پاس ان کے گھر نوکری پر لگوا دیا یہ میرے لیے ایک چھپی ہوئی دھمکی تھی۔ تب تو ڈر کے مارے میں نے اپنے سے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ اس رات میں نے جو کچھ دیکھا اسے زندگی بھر کبھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔ آپ نے آج مجھ سے آ کر پوچھا ہے تو بتا رہی ہوں اگر نہ پوچھتے تو اللہ کی قسم زندگی بھر کبھی زبان نہیں کھولتی۔ اب بھی آپ کی منت کرتی ہوں یہ سب جو میں نے آپ کو بتایا ہے کسی سے بھی میرا نام مت لیجیے گا۔‘‘

وہ اس کی بات سنے بغیر چارپائی پر سے کھڑا ہو گیا۔

وہ بے سمت چلتا پتا نہیں کس سڑک پر نکل آیا تھا اس اندھیری اور طویل سڑک کے دونوں اطراف وہ وحشت کے عالم میں نگاہیں

دوڑا رہا تھا۔ وہ اس اندھیری رات کس طرف چلی ہوگی اس سرد اور اندھیری رات میں اسے کتنا ڈر لگا ہوگا۔ وہ تو ذرا ذرا سی بات سے ڈر جایا کرتی تھی۔

وہ نہ ہسپتال گیا تھا نہ کہیں اور ساری رات سڑکوں پر سر پٹختے' روتے' دیوانگی کے عالم میں ادھر سے ادھر پھرتے وہ آخر کار اپنے اپارٹمنٹ آ گیا تھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے' پوری رات طوفانی بارش میں خود کو زخمی کرتے' اپنے اپارٹمنٹ کے اندر آ گیا تھا۔ اس نے چابی سے دروازہ کھول لیا تھا مگر زینت اندر کہیں جاگی ہوئی ہی لیٹی تھی' وہ دروازے کی آواز سن کر فوراً اٹھ کر باہر آئی۔ اسے زخمی اور بھیگا ہوا دیکھ کر اس کے چہرے پر تشویش پھیلی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

''آپ کہاں تھے' خرد بی بی کا آپ کو پوچھنے کے لیے کل شام اور رات دو' تین بار فون آیا تھا۔ آپ کی بات ہوگئی ان سے۔'' وہ کمرے میں جاتے جاتے ٹھٹک کر رک گیا۔

''خرد۔ ہاں نہیں۔'' بے دھیانی سے اسے دیکھتے' اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی مشکلوں سے کچھ بے معنی لفظ نکلے۔ ماتھے پر ہاتھ لے جا کر جم جانے والے خون کو صاف کرنے کی کوشش کرتے وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے کے اندر آ گیا۔ وہ اس کا موبائل نمبر ملا رہا تھا' اس کی انگلیاں جو جگہ جگہ سے زخمی ہو رہی تھیں' جن سے جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔

پہلی ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔ ''ہیلو۔'' اس آواز کو سنتے ہی اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

''خرد۔'' اس کے لبوں سے بے آواز یہ نام نکلا۔

''ہیلو! زینت۔'' لائن کے دوسری جانب مسلسل خاموشی پا کر اس نے زینت کا نام لیا۔ شاید گھر کا فون نمبر دیکھ کر وہ سمجھی تھی کہ زینت فون کر رہی ہے۔

''میں ہوں اشعر۔'' بڑی مشکلوں سے آنسوؤں کو روک کر وہ بول پایا۔

''آپ کہاں تھے۔ حریم آپ کو بہت زیادہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے آپ کے موبائل پر کئی مرتبہ ٹرائی کیا' پھر گھر پر بھی فون کیا۔ زینت نے کہا آپ گھر بھی نہیں آئے۔ حریم رات آپ کا بہت زیادہ انتظار کر رہی تھی' سوئی بھی بہت دیر میں اور بہت مشکل سے ہے۔''

''وہ کل تمام رات کہاں تھا۔'' خرد کی بات کے جواب میں اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد آ گیا۔ وہ کل رات محبت کی عدالت میں مجرم کے کٹہرے میں کھڑا رہا تھا۔ کل رات اس نے محبت کی عدالت سے عمر بھر ایک احساس جرم' ایک کسک اور ایک کبھی نہ مٹنے والی خلش کے ساتھ زندہ رہنے کی سزا پائی ہے۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھا' اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر کچھ اشک اس کے چہرے کو پھر بھگونے لگے تھے۔

''میں آ رہا ہوں۔'' یہ تین لفظ بمشکل ادا کر کے اس نے فوراً ہی ریسیور واپس رکھ دیا۔

الماری سے ایک دوسرا لباس نکال کر وہ باتھ روم میں آ گیا۔ وہ پوری رات بارش میں بھیگا۔ صبح کے چار بجے شاور پوری رفتار سے

کھولے بالکل ٹھنڈے یخ پانی سے نہا رہا تھا۔ اس کے بالکل تازہ زخموں پر پڑتا وہ برفیلا پانی اسے ذرا سی بھی اذیت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اس سرد پانی کو اپنے زخموں سے اٹے جسم پر بہاتا رہا۔

وہ ہسپتال میں آ گیا تھا۔ حریم کے روم کا دروازہ کھول کر وہ آہستگی سے اندر داخل ہوا۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ حریم بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ خرد اس کے بالکل پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں سکا۔ وہ نظریں جھکائے اندر آ گیا تھا۔ وہ اس کی خود پر مرکوز نگاہوں کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ شاید اس کے چہرے' گردن اور ہاتھوں پر جا بجا نظر آتے تازہ زخموں اور چوٹوں کو دیکھ رہی تھی' وہ اس سے نظریں چراتا خاموشی سے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

خرد نے اس پر سے نظریں ہٹا کر حریم کی طرف چہرہ موڑ لیا تھا۔ وہ اسے نہ دیکھنے کے باوجود بھی اس کی ہر جنبش اور اس کے جسم کی معمولی سی حرکت تک کو محسوس کر رہا تھا۔

''حریم کی طبیعت رات میں کیسی رہی۔''

''حریم کی طبیعت الحمدللہ بالکل ٹھیک رہی۔ رات ڈاکٹر حریم کو دیکھنے آئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری آج ان شاءاللہ ڈسچارج کر دیں گے۔''

وہ حریم کی نیند خراب نہ ہو اس لیے بہت آہستہ بولی تھی۔ اس کا جواب اس نے ٹائلز پر نظریں جمائے ہوئے ہی سنا۔ کچھ پل ان دونوں کے بیچ مکمل خاموشی میں گزر گئے۔ پتا نہیں کتنے منٹ یونہی خاموشی میں گزرے ہوں گے' جب اس نے خرد کا کرسی پر سے اٹھنا محسوس کیا۔

وہ اس کے صوفے کے قریب رکھے سنگل صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب وہ بھی اسی کی طرح حریم سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ بہت آہستہ آواز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''باتیں تو مجھے بھی بہت سی کہنا ہیں۔ پر کہاں سے شروع کروں۔ تم سے پوچھوں کہ تم مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہو یا مجھے نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتیں۔ میں اپنے کس کس گناہ کی معافی مانگوں خرد۔''

''حریم ان شاءاللہ آج دن میں کسی بھی وقت ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو جائے گی۔ میں سمجھتی ہوں اب ہمیں حریم کے مستقبل کی بات کر لینا چاہیے۔''

وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہے' وہ شاید یہ دیکھنے کے لیے ایک پل کو رکی۔ اس کے جھکے سر کو اس نے ایک پل کے لیے دیکھا پھر اسے کچھ نہ بولتا پا کر خود ہی آگے اپنی بات کی وضاحت کرنے لگی۔

''بہت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ حریم کی بہتری اور اس کا تحفظ آپ کے ساتھ رہنے میں

ہے۔ میں اسے وہ سب کبھی بھی فراہم نہیں کرسکتی جو آپ کر سکتے ہیں۔ حریم کا روشن کل اور اس کی زندگی کی دیرپا خوشیاں آپ کے ساتھ رہنے میں وابستہ ہیں۔ لہٰذا میں اپنی خوشی اور آمادگی کے ساتھ حریم آپ کو سونپ رہی ہوں۔ میں ہوسکا تو آج ہی نہیں تو کل اس شہر سے چلی جاؤں گی۔ حریم کو ابھی گھر جانے کے بعد بہت زیادہ کیئر کی ضرورت ہوگی لیکن میں سمجھتی ہوں اگر اسے ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنا ہے تو یہی وہ بہترین وقت ہے جب یہ فیصلہ کرلیا جانا چاہیے۔ جتنے زیادہ دن ہم دونوں ایک ساتھ اس کے ساتھ رہیں گے' اتنے ہی زیادہ دن پھر بعد میں حریم کو اس تلخ سچائی کو قبول کرنے میں لگیں گے کہ اسے ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنا ہے۔ وہ ایک وقت میں دونوں کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔ میں جانتی ہوں آپ حریم سے محبت کرتے ہیں۔ حریم اب سے صرف آپ کی ہے' میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ مجھے پتا ہے آپ اس کا بہت خیال رکھیں گے۔ وہ آپ کے ساتھ بہت زیادہ خوش رہے گی۔ آپ اگر مجھے اجازت دیں گے تو میں کبھی کبھار حریم سے فون پر بات کرلیا کروں گی اور اگر نہیں تو میں آپ کے فیصلے کو قبول کروں گی۔ آپ سے میری صرف اتنی سی درخواست ہے کہ حریم کے ذہن پر اس کی ماں کا کوئی برا خاکہ مت بننے دیجیے گا۔ اس کی ماں ایک بدکردار عورت تھی' اس احساس کو ساتھ لیے وہ زندگی میں سر اٹھا کر کبھی جی نہیں پائے گی۔ میں چاہتی ہوں حریم ہمیشہ سر اٹھا کر جیے۔ وہ اپنے ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کے بھی وجود سے کبھی شرمسار نہ ہو۔''

تند لفظوں کے اس کاری وار نے اس کے جھکے سر کو تکلیف کی شدت سے کچھ اور جھکا دیا تھا

اس کا دل چاہا' وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لے' خرد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہے' خدا کے لیے لفظوں کی یہ بے رحم تلوار مجھ پر نہ چلاؤ۔

''حریم! جب بھی تم مجھے پاپا کہتی ہو' میرا دل خوشی اور فخر سے بھر جاتا ہے۔ تم سے پہلی بار تعارف ہی اس لفظ سے ہوا تھا۔ اتنے حق سے 'آپ فوٹو والے پاپا ہیں۔'' کہنے والی میری بیٹی۔ پر اب سے جب بھی تم مجھے اس پیارے نام سے پکارا کرو گی تو خوشی کے ساتھ دل کو ہر بار ایک نیا درد یونہی ملا کرے گا' جیسے تمہاری ماں کے لفظوں میں چھپی کاٹ سے ملا ہے۔''

اسے پتا تھا خرد اپنی بات کا جواب پانے کے لیے اس کے کچھ کہنے کی منتظر ہے' مگر وہ کچھ بولے بغیر' اس کی طرف دیکھے بغیر ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں اپنی سوئی ہوئی بیٹی پر جمی تھیں۔ وہ بیٹی جو موت کے منہ سے نکل کر باہر آئی تھی' جسے اللہ نے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔ وہ بغیر قدموں کی کوئی آہٹ پیدا کیے اپنی بیٹی کے پاس آ گیا۔

''آپ حریم کی برتھ ڈے پر کیوں نہیں آئے۔ گفٹ بھی نہیں دیا۔''

اس کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی آہستگی سے گر کر اس کے گریبان میں جذب ہوئے' اس نے رخ موڑ کر اپنا چہرہ خرد سے مکمل طور پر چھپایا ہوا تھا۔ اس نے جھک بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کی پیشانی کو چوما۔

''تمہاری ماں سے معافی مانگنے کے قابل تو نہیں ہوں۔ مگر تم اپنے پاپا کو معاف کردو حریم! اس کی ہر زیادتی کے لیے۔ تمہارے پاپا تم سے وعدہ کرتے ہیں جو ان چار برسوں میں ہوا' وہ اب زندگی میں کبھی نہیں ہوگا۔ بس صرف ایک بار معاف کردو اپنے پاپا کو۔'' وہ بے آواز

اپنی گہری نیند سوئی بیٹی سے ہم کلام تھا' یوں جیسے اس کے دل سے نکلی یہ ساری باتیں سیدھی اس کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ سخت مضطرب تھیں' وہ کل رات سے کئی مرتبہ اشعر کے موبائل پر کال کر چکی تھیں۔ وہ ان کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اشعر سے انہیں کوئی کام نہیں تھا جو لائحہ عمل انہوں نے اس انہونی اور خطرناک صورت حال سے نمٹنے کے لیے طے کیا تھا اس میں اشعر سے نہیں' انہیں اس ذلیل لڑکی سے جا کر بات کرنا تھی جو اپنی اوقات بھول گئی اس بے حیثیت لڑکی کو اس کی اوقات یاد دلانی تھی۔

اشعر سے تو وہ صرف سلام دعا کر کے اسے اپنے واپس آنے کی اطلاع دے کر بہت روٹین کے سے انداز میں بات کرنا چاہتی تھیں۔ اگر اشعر ان سے یہ بات چھپا تا رہا تھا تو وہ بھی خود کو انجان ہی ظاہر کرنا چاہتی تھیں۔ وہ جلد بازی میں کوئی اوچھا کام کر کے اپنی عمر بھر کی ریاضت اپنا اکلوتا بیٹا کھونے کا سوچ بھی کیسے سکتی تھیں۔

کراچی واپس آنے سے پہلے پرسوں شام جوان کی اشعر سے آخری بات ہوئی تھی۔ وہ ان سے اسی محبت بھرے لہجے میں مخاطب تھا۔ جس میں ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ اگر خرد اسے کچھ بتا چکی ہوتی' تو اس کا لہجہ معمول کے مطابق کس طرح ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ہر انداز اور ہر ادا سے واقف تھیں۔

اگر اسے سچائی کا رتی برابر بھی علم ہو گیا ہوتا تو وہ ان کے ساتھ محبت اور چاہت سے باتیں کرنے کا ڈرامہ کبھی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کا مزاج ہی نہیں تھا۔

وہ صبح ساڑھے دس بجے اشعر کے دفتر فون کر چکی تھیں۔ اس کی سیکرٹری نے بتایا تھا کہ اس کا ابھی کچھ ہی دیر قبل فون آیا ہے کہ وہ آج سارا دن آفس نہیں آئے گا۔ اشعر کے آفس کے بعد انہوں نے پونے بارہ بجے کے قریب ہاسپٹل' اشعر حسین کی کوئی relative بن کر فون کیا تو وہاں سے پتا چلا کہ اشعر حسین کی بیٹی کو آج صبح ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جا چکا ہے۔

اب ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور وہ اس وقت کھڑکی میں کھڑی بے قراری کے عالم میں اشعر کا موبائل نمبر پھر ملا رہی تھیں' ان کی نگاہوں کے سامنے گارڈن کا کچھ حصہ اور پورچ پورا کا پورا واضح تھا۔ وہ اشعر کو کال ملاتی بے دھیانی سے پورچ کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ اچانک ہی ان کی نگاہ پورچ میں کھڑی سیاہ گاڑی کے اوپر پڑی۔ ان کی اچٹتی' بے دھیان سی نگاہ بے ساختہ ٹھٹک کر اس سیاہ گاڑی کے اوپر جم گئی۔ اشعر کی گاڑی۔

اشعر کی گاڑی یہاں کیسے۔ وہ کل دوپہر گھر واپس آئی ہیں اور کل دوپہر سے گھر پر ہی ہیں اور اس دوران اشعر گھر پر بالکل نہیں آیا پھر اس کی گاڑی کیسے۔ ان کے گھر میں جتنی گاڑیاں تھیں۔ سب کی سب انہیں نیچے اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر کھڑی نظر آ رہی تھیں۔

وہ تیزی سے نکل کر اپنے کمرے سے باہر آئیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین سے پوچھ ڈالا کہ کیا کل اشعر گھر آیا تھا۔ انہوں نے جھنجلا کر چوکیدار کو بلوایا۔ اس کا جواب اثبات میں تھا' چوکیدار اشعر کے آنے اور جانے کا جو وقت انداز اً بتا رہا تھا وہ دو ڈھائی

گھنٹوں پر مشتمل بن رہا تھا۔ وہ شام میں گھر آیا' یہاں دو ڈھائی گھنٹے تک رہا اور ان سے ملے بغیر چلا گیا۔ اور سب سے اہم سوال آخر وہ کیوں اتنی خاموشی سے آکر اتنی ہی خاموشی سے واپس بھی چلا گیا وہ بھی اپنی گاڑی یہیں کھڑی چھوڑ کر۔

اپنے ہاتھ میں موجود موبائل سے وہ ایک مرتبہ پھر اشعر کو کال ملا رہی تھیں۔ ان کے قدم اپنے کمرے کی طرف تھے۔ موبائل کان سے لگائے انہیں اشعر کے موبائل پر بیل جاتی سنائی دے رہی تھی لیکن اس بیل کے ساتھ ہی انہیں ایک رنگنگ ٹون بھی سنائی دی تھی۔ ان کے قدم بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ اشعر کے کمرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ موبائل ہنوز ان کے کان سے لگا تھا۔ ان کے موبائل سے جس موبائل پر کال ملائی جا رہی تھی اس کی گھنٹیاں اندر اس کمرے میں بج رہی تھیں۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ شدید بے قراری کے عالم میں بھاگتی ہوئی وہ کمرے کے اندر آئیں۔ اشعر کا موبائل صوفے پر الٹا پڑا زور زور سے بج رہا تھا۔ اس موبائل پر سے ہوتی ان کی نگاہیں کمرے میں قالین پر ادھر ادھر بکھرے کچھ کاغذوں پر پڑی تھیں۔

جس کاغذ تک وہ سب سے پہلے پہنچیں' انہوں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اس کاغذ کو انہوں نے اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور ان کا وجود ایک دھماکے سے اڑ گیا تھا۔

وہ خط نہیں ایک بم تھا' ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور ان کے جسم کے کسی نے پرخچے اڑا ڈالے تھے۔ وہ کاغذ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر واپس گرا۔ کیا ساری بازی الٹ گئی۔ کیا وہ ہار گئیں۔ کیا سارا کھیل ختم ہو گیا۔ کیا زندگی مکمل طور پر ان کے خلاف چلی گئی۔ ان کے دماغ میں زور زور سے دھماکے ہو رہے تھے' انہیں اردگرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے کمرے میں شکست خوردہ اور نڈھال بیٹھا تھا۔ صبح حریم کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا اور دن کے ساڑھے گیارہ بجے وہ لوگ گھر واپس آ چکے تھے۔ حریم کی معصومانہ باتوں کے جواب دینے اور ڈاکٹرز و ہسپتال کے دیگر عملے سے ضروری بات چیت' گھر جا کر حریم کو کس نوعیت کا احتیاط اور پرہیز وغیرہ کی ضرورت ہو گی' اس حوالے سے ہدایات لینے اور الوداعی کلمات کہنے کے سوا اس نے آج صبح سویرے سے اب تک کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ کل رات سے خاموش تھا' وہ آج صبح سے بالکل خاموش تھا۔ گھر آنے کے بعد کچھ دیر حریم کے پاس بیٹھنے اس کی بچکانہ' معصومانہ باتوں کو آنسو پیتے سنتے رہنے کے بعد اب جب وہ سو گئی تھی تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ ایک مکمل طور پر ٹوٹا اور بکھرا ہوا انسان تھا۔ اس نے دروازے پر بیل سنی تھی' لگتا تھا کوئی بیل دبانے کے بعد اس پر سے ہاتھ اٹھانا بھول گیا ہے۔ اٹھ کر جا کر دیکھنے کی اس میں سکت نہ ہوئی' وہ تھکے ہوئے' نڈھال سے انداز میں صوفے پر بیٹھا رہا۔

وہ سوئی ہوئی حریم کے پاس بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کی بیٹی صحت یاب ہو کر زندہ سلامت گھر واپس آ گئی تھی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتی سوئی ہوئی بیٹی کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اشعر اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ وہ صبح ساڑھے پانچ بجے جب ہسپتال آیا تھا اس وقت سے بالکل خاموش تھا۔ اسے وہ ایک مکمل طور پر بدلا ہوا اور مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔ لیکن اشعر سے کوئی جواب اس نے مانگا بھی

کب تھا۔حریم سے جدائی کا فیصلہ تو اس کا اپنا فیصلہ تھا۔اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ کس طرح زندہ رہے گی۔حریم کے بغیر اکیلی نواب شاہ واپس جا کر وہ زندگی کو نئے سرے سے پھر سے کس طرح شروع کر پائے گی۔ اس نے بیل کی زوردار آوازیں سنیں۔ زینت دروازہ کھولنے کے لیے گئی تھی۔ایک سیکنڈ بھی نہیں گزرا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ بہت زوردار دھماکے سے پورا کا پورا وا کرتا کوئی اندر داخل ہوا۔

اس اپارٹمنٹ کے دروازے پر آ کر انہوں نے بیل پر ہاتھ رکھا۔جنونی انداز میں وہ بیل کو اس وقت تک دبائے رہیں جب تک کہ دروازہ کھول نہیں دیا گیا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے۔'' اسے دھکیل کر سامنے سے ہٹاتی وہ اندر داخل ہو گئیں۔ وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح اسے تلاشنے لگیں۔

وہ فریدہ حسین ہیں کوئی معمولی عورت نہیں۔ وہ زندگی میں کبھی نہیں ہاری ہیں۔انہیں کبھی کوئی ہرا نہیں سکا ہے۔ وہ سیدھی اس کے سر پر جا کر کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر بیڈ پر سے اٹھ گئی تھی۔

''میرے بیٹے کو اپنی معصومیت کے جال میں پھنسا کر سمجھتی ہو اسے مجھ سے چھین لو گی۔ ساڑھے چار سالوں بعد کہیں سے منہ اٹھا کر آ گئی' اپنے گناہوں کی ایک نشانی اس کے سامنے رکھو گی اور وہ اسے اپنی اولاد مان لے گا۔میرا بیٹا ایسا احمق نہیں' میرا بیٹا ایسا پاگل نہیں۔''

وہ حلق کے بل پوری قوت سے چلائی تھیں۔کوئی بہت تیزی میں چلتا کمرے کے اندر آیا تھا۔انہوں نے گردن گھما کر آنے والے کو دیکھا۔ وہ ان کا بیٹا تھا' وہ ان کا اشعر تھا۔لیکن وہ انہیں کن نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھیں انہیں بتا رہی تھیں وہ ان کی بات سن چکا ہے۔اس کی آنکھوں میں موجود تاثر ان کے اندر خوف و دہشت کی ایک انتہائی سرد ترین لہر دوڑا گیا۔

وہ اشعر اور خرد کے بیچ کھڑی تھیں لیکن ان کا رخ اپنے بیٹے کی طرف تھا۔

''اشعر تم اس مکار لڑکی کے جال میں پھنس رہے ہو۔''

''ممی! آپ یہاں حریم کے سامنے کوئی بات نہیں کریں گی۔ میں گھر آؤں گا وہاں آ کر آپ سے بات کروں گا۔'' اس کا سرد لب و لہجہ ان کے حواس بالکل ختم کرنے لگا۔

''اشعر! تمہیں کیا ہو گیا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔ یہ لڑکی ساڑھے چار سالوں تک پتا نہیں کہاں کہاں منہ کالا کرتی رہی ہے۔ پتا نہیں کس کا گناہ اٹھا کر یہ تمہارے پاس تمہارے سر پر تھوپنے کے لیے لے آئی ہے۔ جسے تم اپنی اولاد کہہ کر گلے لگا بیٹھے......''

''بس ممی! آگے ایک لفظ مت بولیے گا۔ آگے ایک بھی لفظ میری بیٹی کے لیے مت بولیے گا۔''

ان کی چلاتی آواز کو اشعر نے سختی سے کاٹ دیا۔ وہ وارننگ دیتی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا

''اشعر تم۔تم اس لڑکی کی باتوں میں آ گئے۔ پوچھو اس سے کیا ثبوت ہے اس کے پاس اس بات کا کہ اس کی بیٹی کے باپ تم ہو۔''

''اگر حریم میری بیٹی ہے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تو ثبوت تو اس بات کا بھی کوئی نہیں ہے کہ میں بصیرت حسین ہی کا بیٹا ہوں۔''

اشعر ایک دم ہی یوں چلایا جیسے اندر ہی اندر پکتا کوئی لاوا اچانک ہی پھٹ پڑا ہو۔

''اشعر۔'' انہوں نے بے یقینی سے بیٹے کو دیکھا۔ ''اشعر تم مجھے اپنی ماں کو گالی دے رہے ہو۔'' ان کا طنطنہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

''آپ کو نہیں ممی! میں خود کو گالی دے رہا ہوں اور گالی تو ہر صورت مل ہی مجھے رہی ہے ممی۔ میں بصیرت حسین کا بیٹا ہوں یا نہیں گالی مجھے ہی مل رہی ہے' حریم میری بیٹی ہے یا نہیں گالی تب بھی مجھے ہی دی جا رہی ہے۔ کوئی میری ماں کو گالی دے یا میری بیٹی کو' گالی تو مجھے ہی دی گئی ناں۔''

وہ اس بار چلایا نہیں تھا' وہ ایک ایک لفظ توڑ توڑ کر بول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے زندگی میں کبھی اپنے بیٹے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو ساکت کھڑی دیکھ رہی تھیں۔

''ممی! کیا جب میں پیدا ہوا تھا ڈیڈی نے آپ سے گواہی مانگی تھی کہ میں ان ہی کا بیٹا ہوں۔ کیا دنیا کی ہر ماں سے یونہی گواہیاں اور ثبوت طلب کیے جاتے ہیں اس کے بچے کے باپ کے بارے میں۔''

بھرائی آواز میں اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا' پھر ایک ایک قدم اٹھاتا وہ ان کے قریب سے گزرتا خرد کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اگر یہ لڑکی باکردار نہیں ہے تو پھر میں اپنے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں دنیا کی کوئی بیوی' کوئی ماں باکردار نہیں۔ ساری دنیا بھی آ کر اگر اس کے خلاف گواہی دے' میں تب بھی یہی بات کہوں گا۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں لیکن اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''اشعر......!'' ان کے لبوں پر قفل سے پڑ گئے تھے' وہ کچھ بھی بول نہیں پا رہی تھیں۔ ان کا وجود کسی بھربھری مٹی کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔

''ایسا ظلم تو کوئی بے زبان جانوروں پر بھی نہیں کرتا ممی! جو آپ نے اس لڑکی پر جو میری بیوی ہے کیا۔ کیا بگاڑا تھا اس نے آپ کا۔ کون سا نقصان پہنچایا تھا اس نے آپ کو۔ آپ کو یہ اتنی ہی بری لگتی تھی' اتنی ہی ناقابل برداشت لگتی تھی آپ مجھ سے کہتیں۔ ''اشعر مجھ سے تمہاری بیوی برداشت نہیں ہوتی' اسے طلاق دے دو۔'' میں آپ کی خاطر اسے چھوڑ سکتا تھا' اس سے کہیں بہتر ہوتا آپ مجھ سے صاف لفظوں میں اس سے اپنی نفرت بتا دیتیں۔ میں ماں اور بیوی میں سے ماں ہی کو چنتا۔ پھر یہ سب کیوں ممی۔ آپ نے خرد کو نہیں آپ نے حریم کو نہیں' آپ نے تو مجھے اپنے بیٹے کو توڑ ڈالا۔ کیوں ممی کیوں۔ میں تو آپ کا بیٹا تھا نا۔ خرد سے نفرت تھی مجھ سے کیا دشمنی تھی آپ کو۔'' ان کے بیٹے کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے' وہ آنسو ایک' ایک کر کے اس کے گالوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔

''اشعر! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں نے ساری دنیا میں سب سے زیادہ تم سے محبت کی ہے۔'' وہ ٹوٹے ٹوٹے شکستہ انداز میں بولیں وہ رونا چاہتی تھیں مگر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل نہیں پا رہے تھے۔

''یہ کیسی محبت کی ہے آپ نے مجھ سے ممی۔ مجھے توڑ دیا' مجھے ختم کر دیا' مجھے اتنے لوگوں کا گناہ گار بنا دیا۔ مجھے ایک ہارا ہوا' ناکام اور گناہ گار انسان بنا دیا۔ یہ میری معصوم بیٹی اپنی زندگی کے چار سالوں تک باپ کے ہوتے یتیموں جیسی زندگی گزارتی رہی' یہ میری بیوی میرے ہوتے بے امان و بے سائبان اتنے برسوں تک زندگی سے تنہا لڑتی رہی۔ آج میں ان دونوں سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ ممی۔''

وہ زاروقطار روتا ان کا وہی چھوٹا سا چند برسوں کا بیٹا لگ رہا تھا جسے روتا دیکھ کر وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپالیا کرتی تھیں۔

''خرد نے مجھ سے بے وفائی کی ہے' آپ کے دکھائے اس جھوٹ کو سچ جان کر بھی جیتا رہا ہوں' میں اس بات کے بعد بھی ساڑھے چار برسوں تک زندہ رہا ہوں لیکن آج یہ جان کر کہ میری زندگی میں جو کچھ بھی ہوا' وہ سب کسی اور نے نہیں میری ماں نے' میری اپنی سگی ماں نے کیا ہے۔ کیسے زندہ رہوں گا ممی۔ بیوی تو دھوکا دے سکتی ہے لیکن ماں تو دھوکا نہیں دیا کرتی۔ سب کچھ اپنے کانوں سے سن لینے کے باوجود' جو بدترین لفظ ابھی آپ نے میری بیٹی کے لیے بولے انہیں جان لینے' سن لینے کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا کہ میری ماں ایسی ہو سکتی ہے۔ مجھ سے اتنی محبت کرنے والی ماں میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔''

وہ خرد کا ہاتھ چھوڑ کر روتے روتے فرش پر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ نے مجھے مار ڈالا ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں موت دے دی ہے ممی۔'' وہ گھٹنوں پر اپنا سر ٹکا کر چھوٹے سے بچے کی طرح رو رہا تھا۔

وہ ان کا پیارا سا' ننھا سا بیٹا وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھیں' وہ اسے گلے لگا کر اس کے تمام آنسو پونچھ دینا چاہتی تھیں۔ مگر وہ اس کے پاس کیسے جاتیں۔ وہ بیٹے کے قریب نہیں جا رہی تھیں' وہ الٹے قدم اٹھاتی' ایک ایک قدم اپنے بیٹے سے دور جا رہی تھیں۔

انہوں نے ایک نظر اپنے روتے ہوئے بیٹے پر ڈالی' انہوں نے ایک نظر اس کے قریب بالکل ساکت اور خاموش کھڑی اس لڑکی پر ڈالی۔ وہ لڑکی ان کے بیٹے کے بالکل قریب کھڑی تھی اور وہ بیٹے کے مقابل کھڑی تھیں۔

''تمہیں میرا کھلا چیلنج ہے یہ خرد احسان اگر اس زندگی میں تم یہ ثابت کر کے دکھا سکو کہ تمہاری کوکھ میں پلتا بچہ اشعر کا ہے۔ اگر اشعر تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہے نا تو تم جیتیں میں ہاری۔''

ان کی اپنی آواز یکلخت ہی ان در و دیوار میں چاروں طرف گونجنے لگی۔ وہ لڑکی نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی' وہ لڑکی اپنی شکست خوردہ دشمن کو دیکھ نہیں رہی تھی۔

''آپ نے مجھے مار ڈالا ہے ممی۔ آپ نے مجھے زندگی دی تھی اور آپ ہی نے میری زندگی ختم بھی کر دی۔'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اس اپارٹمنٹ سے باہر نکلیں۔ سامنے لفٹ تھی مگر وہ سیڑھیوں پر سے انتہائی تیز رفتاری سے یوں اتر رہی تھیں جیسے موت ان کے تعاقب میں آ رہی ہو۔ وہ تیزی سے بھاگتی اس بلڈنگ سے باہر نکل آئی تھیں۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑی تھیں' وہ خالی ہاتھ کھڑی تھیں۔

''کون جیتا فریدہ حسین۔ جیت کس کو ملی اور ہارا کون۔'' کہیں سے جیسے کسی غیبی آواز نے ان سے پوچھا تھا۔

''اس لڑکی سے سب کچھ چھین کر' اسے ایک روز خالی ہاتھ کھلے آسمان تلے دنیا کی ٹھوکروں میں بے آبرو کرکے ڈال دیا تھا۔ وہ لڑکی تو لیکن خالی ہاتھ نہیں رہی۔ خالی ہاتھ تو تم کھڑی ہو۔ اپنی زندگی بھر کی ساری پونجی اس آخری عمر میں آکر تو تم نے گنوائی ہے۔ تمہارے ہاتھ کیا آیا' تمہیں کیا ملا۔ تم نے سب کچھ گنوا دیا ہے اور اس نے سب کچھ پالیا ہے اس پاک دامن لڑکی پر تہمت لگائی' اپنی چالوں کی کامیابی پر بڑا اترائیں پر ایک چال وہ تھی جو تم چل رہی تھیں' اور ایک چال وہ تھی جو اللہ نے چلی۔ اس بچی کی وہ بیماری' اس میں اس خدا کی کیا حکمت پوشیدہ تھی۔ کبھی تم سے کوئی بات نہ چھپانے والا تمہارا بیٹا' بیٹی کا علاج تم سے خفیہ رکھ کر کروانے لگا' اسے اور اس کی ماں کو تم سے پوشیدہ رکھ کر کہیں اپنے ساتھ لے کر رہنے لگا' اس میں اس اللہ کی کیا مصلحت شامل تھی۔ اللہ نے تم سے تمہاری زندگی کا حاصل تمہارا بیٹا چھین لیا اور اس اللہ کی گرفت ایسی ہی سخت ہوتی ہے۔ وہ جب مظلوموں کا انتقام لیتا ہے تو تمہارے جیسے گناہ گاروں کو زمین اور آسمان کے بیچ کہیں پناہ نہیں ملا کرتی۔

آ جاؤ گے تقدیر کی زد پر جو کسی دن

ہو جائے گا معلوم خدا ہے کہ نہیں

''اگر یہ لڑکی باکردار نہیں ہے تو پھر میں اپنے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں دنیا کی کوئی بیوی' کوئی ماں باکردار نہیں۔ ساری دنیا بھی آکر اگر اس کے خلاف گواہی دے' میں تب بھی یہی بات کہوں گا۔''

وہ کھڑکی کھول کر کھڑی تاروں سے بھرے آسمان کو خاموشی سے تک رہی تھی' اس کی آنکھیں اشکوں سے بھری ہوئی تھیں۔

وہ قالین پر گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا' اس نے حریم کی آواز پر' اس کی کسی بات تک پر سر اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ نجانے کب کب کے اور کس کس بات کے آنسو تھے جو وہ بہائے جا رہا تھا۔

وہ حریم کو کھانا کھلا کر' دوا دے کر سلا چکی تھی' باہر بہت ٹھنڈی' خوشگوار سی ہوا چل رہی تھی' اس کے بدن کو چھوتی یہ ہوا آج سے پہلے کبھی ایسی اچھی نہیں لگی تھی' تاروں سے سجا یہ آسمان پہلے کبھی اتنا حسین نہیں لگا تھا۔

''خرد۔'' اس نے اس شخص کی آواز سنی اس نے گھوم کر اس شخص کو دیکھا وہ ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بکھرے آنسوؤں کو صاف کرتا قالین پر سے اٹھ کر اس کے قریب آنے لگا۔ اس کے دل کی زمین بنجر ہو گئی تھی' ویران ہو گئی تھی' وہاں پر پھر محبت کی فصل لگنا نئی کونپلیں پھوٹنا اور محبت کے پھولوں کا کھلنا نجانے اب ممکن بھی رہا تھا کہ نہیں۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی' اس بہت مشکل فیصلے کی کشمکش میں مبتلا وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ ایک دم ہی وہ اس کے پیروں کے قریب گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

''میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ جو میرا گناہ ہے وہ محبت کی عدالت میں قابل معافی ہو ہی نہیں سکتا۔ محبت کرنے والے مجھ جیسے سفاک اور تنگ دل نہیں ہوتے خرد۔ محبت کرنے والے مجھ جیسے ہرگز نہیں ہوتے۔ تم مجھے کبھی بھی معاف مت کرنا خرد'

لیکن صرف حریم کے لیے' ہماری بیٹی کے لیے مجھے ایک بار پھر قبول کرلو۔ اگر حریم ہماری زندگی میں نہ ہوتی تو میں خود کو ہمیشہ کے لیے تم سے کہیں دور لے جاتا۔ لیکن یہ ہماری بیٹی' اسے صرف محبت کرنے والے باپ کی نہیں' اسے بہت محبت کرنے والی اپنی ماں کی بھی ضرورت ہے۔ میرے لیے نہیں' اپنے لیے نہیں' صرف حریم کے لیے' صرف ہمارے بیٹی کے لیے خرد' صرف ہماری بیٹی کے لیے۔''

اس نے بھرائی آواز میں آہستہ آہستہ بولتے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ اس کے پیروں کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے ہوئے تھا۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا تھا۔ وہ ایک دم ہی اس کے سامنے فرش پر گر سی گئی تھی۔ اس کے بندھے ہاتھوں کو اس نے ایک پل میں کھول ڈالا تھا اور اگلے پل وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رو رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا مجھ سے کبھی محبت مت کرو اور محبت وہ تو ایک ہی پل میں کہیں سے نکل کر ان کے بیچ پھر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنی حیثیت منواتی ہوئی' اپنا وجود تسلیم کرواتی ہوئی۔

''ہر جذبہ فنا ہو سکتا ہے مگر میں نہیں' مجھے اللہ نے کبھی بھی نہ ختم ہونے کے لیے پیدا کیا ہے۔''

''میں تھک گئی زندگی سے اکیلے لڑتے لڑتے' تنہا ڈر ڈر کر جیتے جیتے۔ میں سونا چاہتی ہوں' پرسکون اور گہری نیند کوئی میری حفاظت کرنے والا ہو اور میں اطمینان سے سو سکوں۔''

اس نے اپنے سینے پر رکھا اس لڑکی کا سر اپنے ہاتھوں سے بڑی آہستگی سے اوپر اٹھایا۔ برسوں کی تھکن لیے جو آنسو اس لڑکی کی آنکھوں میں تھے وہی آنسو اس کی آنکھوں میں بھی امڈ آئے تھے۔ بہت لمبے' دشوار گزار سفر کے بعد آرام پانے کے لیے اس لڑکی نے اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا تھا

وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر رو رہی تھی اور وہ اس کے سر پر چہرہ ٹکا کر آنسو بہا رہا تھا۔ ان کے آنسو باہم گھل مل رہے تھے۔

کڑی مسافتیں طے کر کے آئے وہ دونوں مسافر بہت تھکے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں شل تھے اور جسم سفر کی صعوبتوں سے نڈھال تھا۔ ایک دوسرے کے وجود میں پناہ ڈھونڈتے وہ تنہا طے کیے سفر کی ساری تھکن اتار رہے تھے۔

ختم شد